ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before taking it out. You will be responsible for damages to the book discovered while returning it.

DUE DATE

Cl. No. ________ *Acc. No.* ________

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1**/- per day. Over Night Book **Re. 1**/- per day.

نیا دور

(دو ماہی)

ادارہ

م۔ جے۔ صادق
ایس۔ سی، ایل ایل بی

مولانا سرود
بی اے۔ (آنرز)

[illegible] ذر ایم اے (علیگ)

صمد شاہین بی اے، ایل ایل بی

سالانہ چندہ چھے روپے
فی پرچہ ایک روپیہ آٹھ آنے
1-8-0

نیا دور ۱ رانوجی راؤ روڈ۔ بسون گڈی، بنگلور سٹی

شکریہ

12/5/13

ساقی بک ڈپو دہلی، مکتبۂ اردو لاہور۔ ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد رسالۂ ہمایوں لاہور، ادبی مرکز بمبئی، اردو بک اسٹال لاہور وغیرہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمیں اپنی کاپی رائٹ چیزیں استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔

ہم جناب ماستی وینکٹیش آئنگار کے بھی ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمیں اپنی کاپی رائٹ کہانیوں کے ترجمہ کا حق عنایت کیا ہے۔

التماس

اہلِ قلم حضرات سے التماس ہے کہ "نیا دور" کے لئے مضامین کہانیاں ڈرامے، نظمیں اور تراجم ارسال فرمائیں۔

صمد شاہین ایڈیٹر اور پبلشر نے اقبال پریس بنگلور سٹی میں چھپوا کر
دفتر "نیا دور" ۱/۱ رانوجی راؤ روڈ۔ بسون گڈی بنگلور سے شائع کیا۔
کاتب عبدالمتین آری پیپ

اگست، ستمبر ۱۹۴۳ء

فہرست

	افتتاحیہ	ادارہ	۴

مضامین

	ترقی پسند ادب	فیض احمد فیض	۱۵
*	موجودہ اردو ادب اور اسکا پس منظر	عبدالقادر سروری	۳۶
	۱۹۴۲ء کے افسانے	ممتاز شیریں	۷۲
	جنگ اور ہندوستانی ادیب	کرشن چندر	۱۶۱

نظمیں

*	غزل جدید (قسم فاسقانہ)	حسرت موہانی	۹
	دریچے کے قریب	ن۔ م۔ راشد	۲۰
	اندھیرا	مخدوم محی الدین	۲۴
	شباب	اختر انصاری	۳۵
	قیامت	اختر الایمان	۵۱
*	ٹیپو کی آواز	آل احمد سرور	۷۰
*	سناٹا	مجروح سلطانپوری	۱۱۳
	کھنڈر	منیب الرحمٰن	۱۲۹
	عزم جوان	محمد علی کمال	۱۵۸
	زندہ و پائندہ رسول	خورشید الاسلام	۱۵۹

کہانیاں

آم	سعادت حسن منٹو	۲۵
+ دہی والی	ماستی ونگٹیش آینگار	۵۲
معجزے (ڈرامہ)	اوپندر ناتھ اشک	۱۱۴
* توہین	صمد شاہین	۱۳۲
نفرت	مائی کیل شالوخاف	۱۷۱

* پہلی اشاعت

+ پہلی دفعہ اردو میں

افتتاحیہ

ہندوستان کے اس دور و دراز گوشۂ ملک سے ایک اردو ادبی رسالہ کا اجرا شاید کسی معذرت کا طالب ہو۔ موجودہ سماج کا انتشار، زندگی کے نئے مسائل، ادب کے نئے تقاضوں، اور ترقی پسند ادب کے مقاصد کی ہمہ گیری نے کرۂ ارض کے مختلف حصوں کے باشندوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا ہے۔ آج سے دو ہزار سال قبل ارسطو نے "ریاستِ عینی" کے تصور پر بحث کرتے ہوئے کہا تھا کہ کوئی "بستی" اس قدر وسیع نہ ہو کہ اس کے "بسیا" چوراہے پر تقریر کرنے والے ان کے اپنے لیڈر کی آواز کو سن نہ سکیں۔ ارسطو کی یہ تمنا آج ہمارے لئے ایک حقیقت ہے۔ آج ہم اپنے گھر بیٹھے سرمایہ داری کے قہقہوں کو سن سکتے اور غربا کے کرب و اضطراب کو محسوس کر سکتے ہیں۔ آج ایک تحریک دنیا کے ایک سرے سے شروع ہوتی ہے اور چند گھنٹوں میں کرۂ ارض کے باشندوں کے خیالات کو متاثر کرتی ہوئی دنیا کے دوسرے سرے تک پہنچ جاتی ہے۔ آج کی دنیا ایک "بین الاقوامی اکائی" ہے۔

طبقاتی کشمکش اور انسانی "اشتہا" کو تسکین دینے والے نئے اور بدلتے ہوئے اقدار کے انکشاف نے نئے مسائل کو ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ ماہرینِ علوم کی مختلف جماعتوں نے اپنی تحقیقات کے ہمہ گیر نتائج کو بے لگام چھوڑ دیا۔ اپنی "تحقیقِ محض" کے بے پناہ شوق میں وہ اس بات کو نظر انداز کر گئے کہ اس سے برآمد ہونے والے نتائج کا انسانی زندگی پر کیا اثر ہوگا۔ تحقیقات کے مختلف نتائج میں ہم آہنگی پیدا کرنا، حیاتِ انسانی پر ان کی تطبیق کرنا اور زندگی کو آسودہ و خوش حال بنانا، ان امور سے وہ بالکل غافل رہے۔ آج کسی جماعت کو فرائڈ کی "نفسیاتی تحلیل"

میں اپنی تمام مشکلات کا حل نظر آتا ہے، تو کسی کو مارکس کے "تاریخ کا اقتصادی تصور" میں زندگی کے دائمی اقدار کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ ہماری سماجی زندگی ہی میں نہیں بلکہ مسئلۂ تدور میں بھی آج ایک وحشتناک پراگندگی نظر آتی ہے۔ تعجب نہیں اگر اس عہد کے ایک مشہور مفکر کو what are we to do with our lives کے مضحکہ خیز عنوان سے ایک بسیط مقالہ سپرد قلم کرنا پڑا ہو۔

ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادیب اپنے عہد کے مسائل سے خواہ وہ سیاسی ہوں یا اقتصادی آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ ہم کب تک اپنے کمرہ میں بیٹھے دنیا و مافیہا سے بے خبر خالص ادبی اور جمالیاتی شہ پاروں کی تخلیق میں سرگرم اور "ابہام کے سات اقسام" پر اپنا سر کھپاتے رہیں گے جبکہ پاس والے کمرہ میں ہماری تباہی و بربادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

ادب کو محض اقتصادی، نفسیاتی اور موجودہ جنگ کے مسائل تک محدود کر دینا، بے شک تنگ نظری کا ثبوت دینا ہے۔ لیکن کیا آجکل کا ادیب اپنے چاروں طرف نظریں ڈالنے کے بعد یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ مسائل اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے؟

ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک کو شروع ہوئے کوئی آٹھ نو سال کا عرصہ ہوا اور اس قلیل مدت میں اس تحریک نے ہندوستان کے ادب کو جس حد تک متاثر کیا ہے، وہ حیرت انگیز ہے۔ اردو اور بنگالی ادب کے علاوہ جنوبی ہند کا مرہٹی، تامل، تیلگو اور کنڑی ادب بھی ترقی پسندی میں کسی سے پیچھے نہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے نئے ادب کے بعض شہ پاروں کے تراجم وقتاً فوقتاً ان صفحات میں آپ کے ملاحظہ سے گزریں گے۔

نئے ادب کے علمبرداروں میں آج دو مختلف جماعتیں نظر آتی ہیں۔ ایک ادب اور زندگی کے مسائل میں انفرادی نقطۂ نظر کی حامی ہے اور دوسری اجتماعیت

کی پرستار۔ کسی ایک کی حمایت کرنا اور دوسری کی مخالفت، ادب کی ترقی کی راہوں کو مسدود کرنا اور فنی بلندی کو پستی کیطرف لیجانا ہے۔ دو اعلےٰ درجہ کے فنکار، جن میں ایک فن برائے زندگی کا حامی ہے اور دوسرا فن برائے فن کا معتقد، اپنے پیچھے ایسے لازوال فنی کارنامے چھوڑ جائیں گے جن پہ آنے والی نسلیں وجد کریں گی۔ لیکن فرق صرف یہ ہے کہ ایک کو اپنی نوع سے ہمدردی ہوتی ہے اور دوسرا اس سے بے نیاز ہوتا ہے۔ دوسرا ادیب آپ کو دوزخ کی سیر تو کرا سکتا ہے، لیکن جنت کی جھلک نہیں دکھا سکتا۔ اس کمی کو پہلا پورا کر سکتا ہے۔ گویا دونو ایک دوسرے کی تکمیل ہیں۔ غالبؔ نے اپنے زمانہ میں سسکتی ہوی انسانیت کی تصویر کشی تو کی، لیکن اس کا کوئی علاج تجویز نہ کر سکا۔ اس کے لئے ایک اقبال کی ضرورت تھی۔

انفرادی ادب میں سب سے بڑا خدشہ "فراریت" کا ہے جو بڑھتا بڑھتا ایک مرض کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ فرار یا گریز کبھی اپنے نفس کے اندر ہوتا ہے، کبھی شاہد و جام کیطرف، کبھی ماضی کی رنگین داستانوں میں اور کبھی ماورائیت اور روحانیت کی بھول بھلیوں میں۔ ادب میں ایسی "فراریت" سماج سے قوتِ عمل کو سلب کر کے اُسے تباہی کے غار میں ڈھکیل دیتی ہے۔ ادب کو فرار کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ زندگی کے منجدھار میں پیرنا چاہیئے۔ ہر نئی تحریک خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ وقت کی چھلنی سے نتھر کر افادیت کے ترازو میں تُلتی ہے۔ فن برائے فن کے معتقدین جو کچھ بھی کہیں وقت کا تقاضا یہی ہے اور ادب میں انفرادی نقطۂ نظر کی بیجا حمایت سے پیدا ہونیوالے خطرات کا سدّباب۔

کسی مصنف کے ادبی کارنامہ کا سب سے اہم عنصر جس سے اس کی وقعت ہماری نظروں میں بڑھ جاتی ہے، اس کا وہ "انداز" ہے جو وہ اپنے زمانہ کی سوسائٹی سے متاثر ہو کر اختیار کرتا ہے۔ دنیا کی تباہ کن قوتیں آج

ہمیں چیلنج دے رہی ہیں۔ سیاست و ادب میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے اس کو ایک بہانہ بنا کر ہم اس چیلنج سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔

زمانہ کا کرب و اضطراب نہایت شدت سے بڑھ رہا ہے۔ فاشیت کا عفریت زور و شور سے للکار رہا ہے اور ہماری صدیوں کی تہذیب و تمدن کے سرمایہ کو پامال کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ سماج کے ہر شعبہ میں آج انتشار ہی انتشار نظر آتا ہے اور بعضوں کے نزدیک نئی تحقیقات کی وجہ سے مختلف سمتوں سے جو فشار پیدا ہو گیا ہے وہ کسی ادیب کی تخلیقی قوتوں کو متزلزل کر دینے کے لئے کافی ہے۔

اس کرب و اضطراب۔ اس انتشار کی ایک جھلک دکھانا اور شاید کسی روشن مستقبل کیطرف اشارہ کرنا، یہ ہے نئے ادب کا تانا بانا۔ خواہ اس میں انفرادی نقطۂ نظر کی کارفرمائی ہو یا اجتماعی۔ مارکسیت ہو یا فرائیڈیت۔

شمارۂ حاضرہ میں نظموں اور مضامین (مطبوعہ اور غیر مطبوعہ) کے انتخاب میں حتی الامکان اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

حسرت موہانی

غزلِ جدید

قسم فاسقانہ

اُس شوخ کو رُسوا نہ کیا ہے نہ کریں گے
ہم نے کبھی ایسا نہ کیا ہے نہ کریں گے

محفوظ ہے یہ راز، ترے لطفِ ستم کا
اغیار میں چرچا نہ کیا ہے نہ کریں گے

بولے تو یہ بولے وہ تقاضائے کرم پر
یونہی سہی اچھا، نہ کیا ہے نہ کریں گے

نسبت ہے تعارف کی جو اُن سے وہ رہے گی
تخصیص کا دعویٰ نہ کیا ہے نہ کریں گے

ہے قول یہ اغیار کے قابو میں بھی اُن کا
حسرت سے تو پردا نہ کیا ہے نہ کریں گے

فیض احمد فیض

ترقّی پسند ادب

روحانیت، واقعیت، رجائیت، قنوطیت، ان سب کانٹوں سے ادبی مچھلیوں کا شکار کھیلا جا چکا ہے۔ آجکل ترقی پسند اور رجعت پسند کا چرچا ہے۔ لیکن حسبِ معمول ابھی تک ان الفاظ کی مکمل وضاحت نہیں ہوئی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ مختلف اصحاب ترقی پسند ادب کے مختلف تصوّرات قائم کئے بیٹھے ہیں اور اسکی حمایت پر کمربستہ یا مخالفت میں شمشیر بدست نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے ہوا سے لڑنے کے بجائے تحقیق اور انصاف سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ ترقی پسند ادب کوئی ایسا عجوبہ نہیں ہے۔ نہ اس نظریہ میں کوئی ایسی انوکھی بات ہے جس سے جہاد کرنا مذہبی فریضہ تصوّر کیا جائے۔ بہتر یہ ہوگا کہ سب سے پہلے ترقی پسند ادب کے مکمل اور مفصل معنی متعین کر لئے جائیں، اور اس مختصر عرصہ کے لئے ہم اپنی مدح یا مذمت اٹھا رکھیں۔ ظاہر طور پر ترقی پسند ادب سے ایسی تحریریں مراد ہیں جو :-

(۱) سماجی ترقی میں مدد دیں

(۲) ادب کے فنی معیار پر پوری اتریں۔ لیکن سماجی ترقی کسے کہتے ہیں؟ سماجی ترقی کوئی غیر منقسم چیز نہیں ہے۔ سماجی زندگی کے کئی شعبے ہیں، اور بہت ممکن ہے کہ کسی ایک شعبے کی ترقی کسی اور شعبے کے زوال کا باعث ہو۔ ظاہر ہے کہ ادب کا تعلق زندگی کے اس شعبے سے ہے جسے کلچر یا تہذیب کہتے ہیں اور اگر ہم ادب سے سماجی ترقی میں مدد چاہیں تو اس ترقی سے ہمیں کلچر یا تہذیب کی ترقی مراد لینی چاہئے۔ یہ کلچر بھی موہوم لفظ ہے۔ یوں سمجھئے کہ کلچر سے اقتدار کا وہ نظام مراد ہے،

جس کے مطابق کوئی سماج اپنی اجتماعی زندگی بسر کرتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری روزمرہ دنیوی زندگی میں بعض خیالات یا اشیاء اہم سمجھے جاتے ہیں، بعض غیر اہم۔ بعض کو ہم عزیز جانتے ہیں، اور بعض کو حقیر گردانتے ہیں۔ انہیں ترجیحات کو اقدار کہتے ہیں اور انہیں کے عملی اظہار سے ہماری سماجی زندگی کا نقشہ بنتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کلچر ہوا میں معلق نہیں رہ سکتا اور ایک مخصوص افق کے بغیر اس کا وجود ذہن میں آنا محال ہے۔ کلچر ہماری زندگی کا ایک کونہ ہے۔ اسلئے اسکی نوعیت اسکی ترقی اور تنزل بھی انہیں قوتوں کے قبضہ میں ہے، جو سماج پر حکمرانی کرتی ہیں۔ یہ سیاسی اور اقتصادی قوتیں ہیں۔ پس کسی ملک یا کسی قوم کا کلچر اسکی سیاسی اور اقتصادی نظام پر منحصر ہے۔ اور اگر اس نظام میں کوئی تبدیلی واقع ہو تو اس کے کلچر میں انقلاب لازمی ہو جاتا ہے۔ ذرا سے تفکر سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کلچر کی تاریخ بہت حد تک انہیں سیاسی انقلاب کی تاریخ ہے۔ جب بھی کسی ادارے، کسی نظریئے یا کسی مادی شئی کی سیاسی اور اقتصادی اہمیت کم ہو جاتی ہے، تو ہم اس کو عزیز رکھنا ترک کر دیتے ہیں۔ ہمارے نظام اقدار میں اس کا رتبہ گر جاتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں ہمارے کلچر کی ترکیب بدل جاتی ہے۔ اب ہم ترقی پسند ادب کی تعریف کو ذرا وسعت دے سکتے ہیں، اور یوں کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند ادب ایسی تحریروں سے عبارت ہے جن سے سماج کے سیاسی اور اقتصادی ماحول میں ایسی ترغیبات پیدا ہوں جن سے کلچر ترقی کرے، اور رجعت پسند ادب وہ تحریریں ہیں، جو ان رجحانات کی مخالفت کرے، اور جن کی وجہ سے کلچر کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا ہوں۔

اگلا سوال یہ ہے۔ کلچر کی ترقی سے ہمارا کیا مطلب ہے؟ کلچر کے دو پہلو ہیں۔ اسکی نوعیت اور اسکی وسعت، کلچر ادنیٰ اور اعلیٰ بھی ہو سکتا ہے۔ وسیع اور محدود بھی۔ پہلے اسکی نوعیت کو لیجیئے۔ ہم نے کلچر کو ایک نظام اقدار قرار دیا تھا۔ کس نظام میں ان اقدار کو زیادہ معقول اور تسلی بخش کہا جا سکتا ہے؟ یہ مسئلہ ذرا تفصیل طلب ہے۔ بعض اقدار بنیادی اور اہم ہوتی ہیں۔ بعض

فروعی اور نسبتاً غیر اہم۔ اگر ان اقدار کو ان کی اہمیت کے مطابق ترتیب دیا جائے تو یہ نظام معقول ہوگا۔ اب ان کی اہمیت جانچنے کے لئے کوئی معیار ہونا چاہیے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اقدار بنیادی اور اہم ہیں جن کے حصول پہ دوسری بہت سی اقدار کے حصول کا انحصار ہے۔ مثلاً ہم پیٹ بھرنے کو ایک خاص قسم کا کوٹ پہننے سے زیادہ ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس لئے اگر پیٹ میں روٹی نہ ہو تو ہم بڑھیا سے بڑھیا کوٹ پہن کر بھی زندگی کا حظ نہیں اٹھا سکیں گے۔ یہاں پر اگر اقدار کی مختصر تشریح کر دی جائے تو یہ بات غالباً آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی۔ ہم ایک چیز کو قدر کیوں دیتے ہیں، یا اسے کسی دوسری چیز سے عزیز اور اہم کیوں سمجھتے ہیں اس لئے کہ اس چیز کے حصول سے ہماری کسی خواہش یا کسی جذبے کی تسکین ہوتی ہے اور ایک دوسری چیز جسے کم عزیز رکھتے ہیں، یہ تسکین اسی حد تک ہم نہیں پہنچا سکتی۔ ہماری ضروریات اور خواہشات یکساں طور پر اہم نہیں ہوتیں۔ ان کی تسکین بھی یکساں ضروری نہیں ہوتی، اس لئے جو چیزیں ان خواہشات کو پورا کرتی ہیں ان کی اقدار میں بھی فرق ہوتا ہے۔ بنیادی اور اہم اقدار وہ انداز نظر ہیں جو بنیادی اور اہم خواہشات کو تسکین دیتی ہیں اور بنیادی اور اہم خواہشات وہ ہیں جن کی تسکین سے اور خواہشات کی تسکین وابستہ ہے۔ پس بہتر اور اعلیٰ نظام اقدار وہ ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے انسانی فطرت کی زیادہ سے زیادہ تسکین ممکن ہو اور کم سے کم خواہشات کا خون کرنا پڑے۔

کلچر کی ترقی کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ سماجی اقدار کی ترتیب میں مناسب تبدیلیاں کی جائیں، اور ترقی پسند ادب وہ ہے جو صحیح اقدار کا پرچار کرے۔ ہم ضمناً کہہ چکے ہیں کہ یہ اقدار اس وقت تک کلچر کا حصہ نہیں بن سکتیں جب تک ان پر اجتماعی طور پر عمل نہ کیا جائے اور

ایسا عمل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک سیاسی اور اقتصادی ماحول کو ان کے مطابق نہ بنایا جائے۔

رہا کلچر کی وسعت کا سوال۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ سماج جس میں دولت اور ذرائع پیداوار کسی محدود طبقے کے ہاتھ میں ہوں، زندگی کی باقی آسائشوں کی طرح اپنا مروجہ کلچر بھی اسی ایک طبقے کے حوالے کر دیتی ہے۔ اور باقی ماندہ طبقوں کو اس کلچر میں ذرا بھی حصہ نہیں ملتا۔ مثلاً جب ہم یونانی کلچر، ایرانی کلچر یا کسی اور قوم کے کلچر کا نام لیتے ہیں تو دراصل ہماری مراد اس قوم کے ایک نہایت ہی محدود خوشحال طبقے کے کلچر سے ہوتی ہے۔ لیکن کیا ہم کسی ایسی قوم کو مہذب یا کلچر یافتہ کہہ سکتے ہیں جس کی اکثریت کلچر سے محروم ہو۔ کیا ہم کسی ایسے کلچر کو مثالی قرار دے سکتے ہیں جو اکثریت میں نفوذ نہ کر سکے۔ وہ کلچر جو چند نفوس تک محدود ہے بنیادی طور پر ناقص ہے۔ مثالی کلچر کے لئے لازمی ہے کہ وہ ایک خوبصورت حاشئے کا کام دینے کے بجائے سماج کی تار تار میں بُنا جا سکے۔ چنانچہ کلچر کی ترقی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسے اقلیت کے چنگل سے نکال کر اکثریت کی ملکیت قرار دیا جائے۔ اس کے لئے ایک دہرے عمل کی ضرورت ہے۔

(۱) کلچر کی نوعیت بدلی جائے تاکہ وہ عوام کی زندگی کا جزو بن سکے۔
(۲) عوام کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا جائے تاکہ وہ اس کلچر کو قبول کر سکیں۔

اب تک جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کا خلاصہ یوں ہو سکتا ہے:۔

ا۔ ترقی پسند ادب وہ ہے جو کلچر کی ترقی میں مدد دے۔ کلچر کی ترقی کا یہ مطلب ہے کہ
(۱) سماجی اقدار کی ترتیب موزوں کی جائے اور صحیح اقدار کا پرچار کیا جائے
(۲) ان اقدار کو عوام کے لئے اجتماعی طور پر سہل الحصول بنایا جائے۔

دب ۔ یہ دونوں باتیں اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک سماجی نظام کی بنیادی طور پر اصلاح نہ کی جائے۔ یہی ترقی پسند ادب کا پہلا اور آخری مقصد بنیادی سماجی مسائل کی طرف توجہ دلانا ہے۔ ان مسائل میں سے غالباً طبقاتی کشمکش اور دنیاوی آسائشوں کی تقسیم سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اور سماج میں ایسے فکری جذباتی یا عملی رجحانات پیدا کرنا ہے جن سے ان مسائل کا حل نسبتاً آسان ہو جائے ۔

اب یہاں سے اختلافات شروع ہوتے ہیں۔ ہمارے بزرگوار فرماتے ہیں کہ آرٹ کلچر، ادب یہ سب خود رو پودے ہیں اور دین کی طرح ان میں جبر و اکراہ قطعاً جائز نہیں۔ ان میں رجحانات پیدا ہوتے ہیں، پیدا کئے نہیں جاتے۔ مان لیا صاحب، رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن آخر کیسے؟ یہی نا کہ کسی بڑے ادیب یا چند ادیبوں نے خاص حالات سے متاثر ہو کر خاص ڈھنگ سے کچھ لکھا اور دوسرے لکھنے والے ان کی پیروی کرنے لگے رجحان پیدا ہو گیا۔ لیکن کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس طرز یا اولین لکھنے والے یا لکھنے والوں نے یہ رجحان پیدا کیا۔ شاید آپ یہ فرمائیں کہ انہوں نے کیا نہیں، اُن سے ہو گیا۔ لیکن میں ادیب کو اتنا حقیر نہیں سمجھتا۔ وہ غیر شعوری جانور نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں کہ لکھتے وقت کوئی سماوی رُوح حلول کر جائے اور اسے طوعاً و کرہاً اسکی اطاعت کرنا پڑے۔ ایک اچھے ادیب کو اپنے ارادے اور اپنی قوتِ تخلیق پہ یقیناً اتنی قدرت ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ لکھے اپنے فلسفے اور اپنے نظرئیے کے مطابق لکھے۔ اگر اس نظریے میں خلوص اور جان ہے تو اس سے ایک نئے رجحان کی تخلیق بھی ناممکن نہیں۔ پس ادب میں رجحانات پیدا کرنا اور ادب کے ذریعہ سے سماج میں رجحانات پیدا کرنا اتنی مہمل اور لایعنی بات نہیں، جتنی ہم سے بعض حضرات سمجھتے ہیں۔ ادب کوئی بے جان کل نہیں ہے جسکے عمل پہ ہمیں اختیار نہ ہو ۔

انسان کے ہاتھ میں اس کی حیثیت چکنی مٹی سے زیادہ نہیں، اور اس کیلئے موزوں سانچے انتخاب کرنا انسان ہی کا کام ہے۔ لیکن اس ساری بحث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ میں ادب سے پروپگنڈے کا کام لینا چاہتا ہوں۔ کیا ادب کا مقصد پروپگنڈا ہے؟ جی ہاں قطعی! ادب کا جو نمونہ آپ سے کوئی تجربہ، کوئی نظریہ، کوئی حقیقت منوا نہیں لیتا۔ (ایک لمحہ کیلئے سہی) وہ بحیثیت ادب کے خاک بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ ادیب نے کچھ دیکھا ہے۔ کچھ محسوس کیا۔ کچھ سوچا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے، کہ آپ بھی وہی کچھ دیکھیں، وہی کچھ محسوس کریں، وہی کچھ سوچیں۔ اگر یہ پروپگنڈا نہیں ہے، تو جانے پروپگنڈا کسے کہتے ہیں۔ ترقی پسند ادب اور دوسری اقسام کے ادب میں یہ فرق نہیں ہے، کہ یہ پروپگنڈا کرتا ہے، اور وہ نہیں کرتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک پروپگنڈا صحیح اور مفید ہے، دوسرا گمراہ کن اور مضر یا غیر مفید، تو کیا ادب اور پروپگنڈا میں کوئی فرق نہیں ہے؟ پھر ہم سیاسی تقریروں اور صحافتی اداریوں کو ادب کیوں نہیں کہتے؟ اس لئے نہیں کہتے کہ ان میں ادب کی فنی خوبیاں نہیں پائی جاتیں۔ ان میں بجنسہٖ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انہیں ادب بننے سے روکے اور بعض اوقات سیاسی تقریریں اور صحافتی مضامین ادب کا بہترین نمونے ہوتے ہیں۔ لیکن لکھنے والوں یا بولنے والوں کی بے احتیاطی، خامیٔ اظہار یا قلتِ خلوص کی وجہ سے انہیں ادبی حیثیت نصیب نہیں ہوی۔ اسی لئے میں نے ترقی پسند ادب کی تعریف میں یہ بات شامل کرلی تھی کہ ترقی پسند ادب صرف ترقی پسند ہی نہیں، ادب بھی ہے۔

شاید اب کوئی صاحب یہ اعتراض کریں کہ ادب کے دور از کار اور غیر متعلق مقاصد سے بحث کر رہا ہوں۔ ادب کا مقصد صرف انسانی تجربات کی کامیاب ترجمانی ہے۔ یہ تجربات خارجی ماحول کے زیر اثر لکھنے والے کے ذہن پر منعکس ہوتے ہیں، لکھنے والے کو چاہئے کہ انہیں من و عن بیان کردے اور اس طریقے سے اپنے ماحول کا منظر ہو بہو ہمارے سامنے پیش کرے۔

میا دو

ان تجربات کی نوعیت کیا ہے اور ان سے ماحول کے کون سے پہلو پر روشنی پڑتی ہے
ہمیں اس سے سروکار نہیں ہے مثلاً اگر وہ گھریلو زندگی کا ایک معمولی سا واقعہ نہایت
خوبی سے بیان کرتا ہے تو اُسے کیا پڑی ہے کہ ترقی پسند مصنفین کی طرح گلے سڑے
مزدوروں کا رونا رویا کرے۔ مجھے تسلیم ہے کہ ادب کا فوری مقصد صرف تجربات
ترجمانی کرنا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ تجربات خارجی ماحول کے آئینہ دار ہوتے ہیں، اد
یہ بھی مانتا ہوں کہ ادبی نقطۂ نظر سے ایک حقیقی تجربہ جھوٹے اور من گھڑت تجربوں سے ز
قابل قدر ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی تجربے کا حامل ہے
آپ ان سب کو تو بیان کر نہیں سکتے۔ آپ کو لازماً ان میں انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ ا
سے بعض تجربات اہم ہوتے ہیں بعض غیر اہم۔ اگر ہم اپنے تجربات کو خارجی ماحول کا آئی
مانتے ہیں تو ان تجربات کی اہمیت خارجی ماحول کے اُن پہلوؤں کے مطابق ہوگی
کی آئینہ داری مقصود ہو۔ مثلاً ہمارے بہت سے ذاتی گھریلو تجربات اُن تجربات سے
اہمیت رکھتے ہیں جن کا سماج کی اجتماعی زندگی سے تعلق ہے۔ ایک ترقی پسند ادیب
اہم تجربات کو ترجیح دیتا ہے۔ اس لئے اُن کے تجربہ سے ترقی کے امکانات زیادہ ہو
ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے موضوعات پر کوئی قید عائد کر دی گئی
وہ ذاتی اور اجتماعی بنیادی اور فروعی اہم اور غیر اہم سبھی قسم کے تجربات بیان
سکتا ہے بشرطیکہ وہ ان میں کوئی ترتیب ملحوظ رکھے اور پڑھنے والے اُن کی اہمیت
غیر اہمیت کا اندازہ کر سکیں۔ تجربات تخلیق نہیں کئے جا سکتے۔ لیکن ان میں انتخا
کیا جا سکتا ہے اور ہم ترقی پسند ادیب سے صرف اتنا ہی تقاضا کرتے ہیں کہ اُن کا انتخاب گ
نہ ہو تاکہ اسکے پڑھنے والے زندگی کے اہم مسائل کو بھلا کر غیر ضروری تفصیلات میں آ

نہ رہ جائیں۔

لیکن کیا یہ کافی نہیں ہے کہ خارجی ماحول پر تنقید کرنے کے بجائے اس کا ہو بہو نقشہ کھینچ دیا جائے۔ یہ کافی شاید ہو، ممکن نہیں ہے۔ کسی منظر کی ہو بہو تصویر تو کیمرہ بھی نہیں لے سکتا۔ بعض چیزیں کیمرہ کے قریب ہوتی ہیں، بعض ذرا فاصلے پر۔ اس لئے فوٹوگراف میں ان کا تناسب زندگی سے مختلف ہو جاتا ہے۔ ایک اچھا فوٹوگرافر بھی اپنے مواد کو ترتیب دیتا ہے۔ کسی منظر کی تصویر لیتے وقت بعض نقوش کو نمایاں کرتا ہے، بعض کو دبا دیتا ہے تو کیا ادب میں یہ عمل لازمی نہیں؟ یہ صحیح ہے کہ ادیب کو محض تجربات کے اظہار سے سروکار رکھنا چاہیئے۔ لیکن ایک ہی تجربہ کئی طرح سے بیان ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک ٹی پارٹی میں محض روحانی چھیڑ چھاڑ بھی دکھائی جا سکتی ہے۔ گندۂ آرائش امراء کی ذہنیت کا نقشہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے سماجی تعلقات کا کھوکھلا پن بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ ماحول کو اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ آپ اسے قبول کر لیں، اور اس طرح بھی کہ آپ اس کے خلاف بغاوت کریں۔ ترقی پسند ادیب اگر اپنے ماحول کو تسلی بخش سمجھتا ہے تو پہلا پیرایہ اختیار کرتا ہے، غیر تسلی بخش خیال کرتا ہے تو دوسرا۔ وہ نقاش ہی نہیں، نقاد بھی ہے۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ تنقید ہمیشہ جلی حروف میں کی جائے، تنقید بین السطور بھی ہو سکتی ہے، لیکن اتنی بین السطور بھی نہیں کہ خوردبین کے بغیر نظر نہ آئے۔ ایک افسانے میں محض واقعات کے انتخاب اور ترتیب، اور کرداروں کی تفسیر و تجزیہ سے تنقید کا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس میں سیاسیات اور اقتصادیات پر مستقل لکچر بھی شامل کیے جائیں۔

اب شاید ہم یہ سمجھ لیں کہ ترقی پسند مصنفین زیادہ تر مزدوروں اور کسانوں کی کہانیاں کیوں لکھتے ہیں اور ان میں اصلاحی رنگ پیدا کرنے کی کوشش سے کیا مقصود ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے مزدوروں اور کسانوں کی کہانیاں لکھنے سے ترقی پسند مصنفین کو نہ نمائش اور فیشن پرستی مطلوب ہے نہ مغرب کے چند ادیبوں کی اندھا دھند تقلید سے واسطہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مزدوروں اور کسانوں کے مسائل ہماری سماج کے بنیادی مسائل ہیں اور انہیں حل کئے بغیر ہماری سماج آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ان کا فرض ان مسائل کو حل کرنا نہیں، محض ان کی طرف توجہ دلانا ہے تاکہ کم از کم ان مسائل کو حل کرنے کی خواہش پیدا ہو جائے۔ جیسے کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا۔ جب بھی آپ کوئی مسئلہ کسی خاص نقطۂ نظر سے پیش کرینگے تو اس میں اصلاحی اور تنقیدی رنگ کا پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے۔ یہی بات ان مصنفین کی تحریروں میں بھی ہے۔ شاید ان لکھنے والوں کو اپنے فن میں ابھی اتنی مہارت حاصل نہیں ہوئی کہ وہ آپ کے بلند ادبی معیار پر پورے اتر سکیں، لیکن اس صورت میں آپ انہیں ناکام کہہ سکتے ہیں۔ قابلِ نفرین اور موجبِ حقارت تو نہیں ٹھہرا سکتے۔ ادبی تجربات کو پنپنے دیر لگتی ہے۔ اگر آپ کو اس تجربے کی سماجی افادیت سے انکار نہیں تو آپ کو اس کی ادبی تکمیل کا انتظار بھی کرنا چاہئے۔ رہا یہ اعتراض کہ مزدوروں کی کہانیاں لکھنے والے مزدور نہیں ہیں ...... یا خوشحال طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اُن کی آواز مزدوروں تک نہیں پہنچتی اور جب تک وہ مزدوروں کی سی زندگی بسر نہ کریں، وہ مزدوروں کے مسائل کو سمجھ نہیں سکتے۔ تو اس کے متعلق میں صرف اس قدر عرض کروں گا کہ مزدوروں کو ہم نے اس قابل رکھا ہی نہیں کہ وہ اپنے متعلق کچھ لکھ سکیں۔ مزدوروں کے متعلق جو بھی لکھیگا، بہرصورت تعلیم یافتہ یا خوشحال طبقہ میں سے ہوگا۔ اور اگر آپ یہ نہیں چاہتے ہیں تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہماری سماج کے ایک بنیادی ظلم کے متعلق کوئی شخص کچھ کہنے کی جرأت نہ کرے۔ مزدوروں کی رہنمائی بہرصورت خوشحال طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کرنا پڑتی ہے۔ یہی نہیں۔ اگر وہ چاہیں تو مزدوروں کے مسائل بھی مزدوروں سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

آخر مارکس، اینگلز، لینن مزدور تو نہیں تھے۔ نہ انہوں نے کسی کارخانہ میں ایک دن بھی کام کیا۔ اگر یہ استدلال کیا جائے کہ مزدوروں کے متعلق مزدوری کئے بغیر کوئی ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا ہے، تو یہ ماننا بھی لازم آتا ہے کہ شکسپیئر کو چھٹی اور ساتویں صدی کے متعلق ڈرامے لکھنے سے پہلے اپنی تاریخ پیدائش بدلوانا چاہئے تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اگر ہم مزدوروں میں رہیں، ان سے تعلقات رکھیں تو ہم اُن کے مسائل کو بہتر سمجھ سکیں گے۔ لیکن اگر ہمیں قوتِ احساس، قوتِ تخیل اور قوتِ اظہار میں سے تھوڑا سا حصہ ملا ہے تو ہم تھوڑی بہت کامیابی کے ساتھ یہی کام یوں بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ترقی پسند مصنفین کی آواز مزدوروں تک نہیں پہنچتی تو نہ پہنچے۔ مجھ تک اور آپ تک پہنچتی ہے۔ اِن تحریروں سے اتنا بھی ہو جائے کہ ہم اور آپ ان مسائل پر غور کرنا شروع کر دیں، تو یہی غنیمت ہے، مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ صرف مزدور کی جنگ نہیں ہے، ہم سب کی جنگ ہے۔ ہمارے دوست دشمن بھی مشترک ہیں۔ مزدور اور کسان کی بہبودی، سماج کی اجتماعی بہبودی کے مترادف ہے۔ کیا ہم بھی اسی سماجی اجتماع کے ایک فرد نہیں ہیں؟

"نیا ادب کیا ہے"

نقشِ فریادی
فیض احمد فیض
اردو شاعری کے جدید اسکول کے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
قیمت ایک روپیہ ۸/
مکتبۂ اردو لاہور

نیا دور

ن م راشد

دریچے کے قریب

جاگ اے شمعِ شبستانِ وصال
محفلِ خواب کے اس فرشِ طربناک سے جاگ!
لذتِ شب سے ترا جسم ابھی چور سہی
آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے!

سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول مے رنگ جنوں خیز آنکھیں!
اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی

اسی مینار کے سایے تلے کچھ یاد بھی ہے :
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملّائے حزیں
ایک عفریت ـــــ اُداس
تین سو سال کی ذلّت کا نشاں
ایسی ذلّت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی !

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنّات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں !
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے اِن میں سے کوئی شعلۂ جوّالہ بنے

نیا دور

اِن میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں!

ایک بوڑھا ساتھکا ماندہ سا رہوار ہوں میں!
بھوک کا شاہسوار
سخت گیر اور تنومند بھی ہے
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شبِ عیش گذر جانے پہ
بہرِ جمعِ خس و خاشاک نکل جاتا ہوں
چرخِ گرداں ہے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ کہ میں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انہیں عالمِ رخصت میں شفق چومتی ہے!

"ماورا"

مخدوم محی الدین

اندھیرا

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے !
یہ دمکتا ہوا چاند !
بھیک کے نور میں، مانگے کے اُجالے میں مگن
یہی ملبوس عروسی ہے، یہی ان کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم
خندقیں ———
باڑ کے تار
باڑھ کے تاروں میں اُلجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گِدھ

وہ تڑختے ہوئے سر
میّتیں، ہاتھ کٹے، پاؤں کٹے،

لاشں کے ڈھانچے کے اِس پار سے اُس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سنّاٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچّوں کی
کبھی ماؤں کی
چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے۔
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

" سرخ سو

ہر قسم کی طباعت و کتابت کے لئے
کارخانۂ قومی پریس
معسکر بنگلور کو یاد فرمائیے
محمد عبدالمتین مالک مط

سعادت حسن منٹو

آم

خزانے کے تمام کلرک جانتے تھے کہ منشی کریم بخش کی رسائی بڑے صاحب تک بھی ہے۔ چنانچہ وہ سب اُس کی عزّت کرتے تھے۔ ہر مہینے اپنی پنشن کے کاغذ بھرنے اور روپیہ لینے کے لئے جب وہ خزانے میں آتا تو اس کا کام اسی وجہ سے جلد جلد کر دیا جاتا تھا پچاس روپے اس کو اپنی تیس سالہ خدمات کے عوض ہر مہینے سرکار کی طرف سے ملتے تھے۔ ہر مہینے دس دس کے پانچ نوٹ وہ اپنے خفیف طور پر کانپتے ہُوئے ہاتھوں سے پکڑتا اور اپنے پُرانے وضع کے لمبے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیتا۔ چشمے میں سے خزانچی کی طرف تشکّر بھری نظروں سے دیکھتا اور یہ کہہ کر "اگر زندگی ہوئی تو اگلے مہینے پھر سلام کرنے کے لئے حاضر ہوں گا۔" بڑے صاحب کے کمرے کی طرف چلا جاتا۔

آٹھ برس سے اس کا یہی دستور تھا۔ خزانے کے قریب قریب ہر کلرک کو معلوم تھا کہ منشی کریم بخش جو مطالباتِ خفیفہ کی کچہری میں کبھی محافظ دفتر ہوا کرتا تھا، بے حد وضعدار، شریف الطبع اور حلیم آدمی ہے۔ منشی کریم بخش واقعی ان صفات کا مالک تھا۔ کچہری میں اپنی طویل ملازمت کے دوران میں افسرانِ بالا نے ہمیشہ اس کی تعریف کی۔ بعض منصفوں کو تو منشی کریم بخش سے محبت ہو گئی تھی۔ اُن کے خلوص کا ہر شخص قائل تھا۔

اس وقت منشی کریم بخش کی عمر پینسٹھ سے کچھ اُوپر تھی۔ بڑھاپے میں آدمی عموماً کم گو اور حلیم ہو جاتا ہے، مگر وہ جوانی میں بھی ایسی ہی طبیعت کا مالک تھا۔

دوسروں کی خدمت کرنے کا شوق اس عمر میں بھی ویسے کا ویسے ہی قائم تھا۔

خزانے کا بڑا افسر منشی کریم بخش کے ایک مربی اور مہربان جج کا لڑکا تھا جج صاحب کی وفات پر اُسے بہت صدمہ ہوا تھا۔ اب وہ ہر مہینے اُن کے لڑکے کو سلام کرنے کی غرض سے ضرور ملتا تھا۔ اس سے اُسے بہت تسکین ہوتی تھی۔ منشی کریم بخش انہیں چھوٹے جج صاحب کہا کرتا تھا۔

پنشن کے پچاس روپے جیب میں ڈال کر وہ برآمدہ طے کرتا اور چق لگے کمرے کے پاس جاکر اپنی آمد کی اطلاع کراتا۔ چھوٹے جج صاحب اس کو زیادہ دیر تک باہر کھڑا نہ رکھتے فوراً اندر بلا لیتے اور سب کام چھوڑ کر اُس سے باتیں شروع کر دیتے:

تشریف رکھئے منشی جی صاحب۔ فرمائیے مزاج کیسا ہے؟

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے —— آپ کی دُعا سے بڑے مزے میں گذر رہی ہے۔“

”میرے لائق کوئی خدمت؟“

آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیے۔ خدمت گذاری تو بندے کا کام ہے۔“

”آپ کی بڑی نوازش ہے۔“

اس قسم کی رسمی گفتگو کے بعد منشی کریم بخش جج صاحب کی مہربانیوں کا ذکر چھیڑ دیتا۔ ان کے بلند کردار کی وضاحت بڑے فدویانہ انداز میں کرتا اور بار بار کہتا۔ اللہ بخشے مرحوم فرشتہ خصلت انسان تھے۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

منشی کریم بخش کے لہجے میں خوشامد وغیرہ کی ذرہ بھر ملاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ وہ جو کچھ کہتا تھا محسوس کر کے کہتا تھا۔ اس کے متعلق جج صاحب کے لڑکے کو جو

اَب خزانے کے بڑے افسر تھے اچھی طرح معلوم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کو عزت کے ساتھ اپنے پاس بٹھاتے تھے اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

ہر مہینے دوسری باتوں کے علاوہ منشی کریم بخش کے آم کے باغوں کا ذکر بھی آتا تھا۔ موسم آنے پر جج صاحب کے لڑکے کی کوٹھی پر آموں کا ایک ٹوکرا پہنچ جاتا تھا۔ منشی کریم بخش کو خوش کرنے کے لئے وہ ہر مہینے اس کو یاد دہانی کرا دیتے تھے "منشی صاحب دیکھئے اس موسم پہ آموں کا ٹوکرہ بھیجنا نہ بھولئے گا —— پچھلی بار آپ نے جو آم بھیجے تھے اُس میں سے تو صرف دو میرے حصے میں آئے تھے۔"

کبھی یہ تین ہو جاتے تھے کبھی چار اور کبھی صرف ایک ہی رَہ جاتا تھا۔

منشی کریم بخش یہ سُنکر بہت خوش ہوتا تھا۔ "حضور ایسا کبھی ہو سکتا ہے —— جونہی فصل تیار ہوئی میں فوراً ہی آپ کی خدمت میں ٹوکرہ لے کر حاضر ہو جاؤنگا۔ —— دو کہئے، دو حاضر کر دوں —— یہ باغ کس کے ہیں؟ —— آپ ہی کے تو ہیں۔"

کبھی کبھی چھوٹے جج صاحب پوچھ لیا کرتے تھے "منشی جی آپکے باغ کہاں ہیں؟"

"دینا نگر میں حضور —— زیادہ نہیں ہیں۔ صرف دو ہیں۔ اس میں سے ایک تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو دے رکھا ہے، جو ان دونوں کا انتظام وغیرہ کرتا ہے"

مئی کی پنشن لینے کے لئے منشی کریم بخش جون کی دوسری تاریخ کو خزانے گیا۔ دس دس کے پانچ نوٹ اپنے خفیف طور پہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کر اُس نے چھوٹے جج صاحب کے کمرے کا رُخ کیا۔ حسبِ معمول اِن دونوں میں وہی رسمی باتیں ہوئیں۔ آخر میں آموں کا ذکر بھی آیا جس پہ منشی کریم بخش نے کہا۔"

[illegible] نگر سے چٹھی آئی ہے کہ ابھی آموں کے منہ پہ چیپ نہیں آیا۔ جونہی چیپ آ گیا اور فصل پک کر تیار ہو گئی میں فوراً پہلا ٹوکرا دے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔۔۔ چھوٹے جج صاحب اس دفعہ ایسے تحفہ آم ہونگے کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ ملائی اور شہد کے گھونٹ نہ ہوئے تو میرا ذمہ۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ چھوٹے جج صاحب کے لئے ایک ٹوکرا خاص طور پر بھرا دیا جائے اور سواری گاڑی سے بھیجا جائے تاکہ جلدی اور احتیاط سے پہنچے۔ دس پندرہ روز آپ کو اور انتظار کرنا پڑے گا۔"

چھوٹے جج صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ منشی کریم بخش نے اپنی چھتری اٹھائی اور خوش خوش گھر واپس آ گیا۔

گھر میں اس کی بیوی اور بڑی لڑکی تھی، بیاہ کے دوسرے سال ہی جس کا خاوند مر گیا تھا۔ منشی کریم بخش کی اور کوئی اولاد نہ تھی مگر اس مختصر سے کنبے کے باوجود پچاس روپوں میں اس کا گذر بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ اسی تنگی کے باعث اُس کی بیوی کے تمام زیورات آٹھ برسوں میں آہستہ آہستہ بک گئے تھے۔

منشی کریم بخش فضول خرچ نہیں تھا۔ اس کی بیوی اور وہ دونوں بڑے کفایت [illegible] مگر [illegible] کفایت شعاری کے باوصف تنخواہ میں سے ایک پیسہ بھی اُن کے پاس [illegible] منشی کریم بخش [illegible] چند آدمیوں کی خدمت کرنے [illegible] تھا۔ ان چند خاص الخاص آدمیوں کی خدمت گزاری میں جو خوشی اسے [illegible] تھی۔

ان خاص آدمیوں میں سے ایک تو جج صاحب کے لڑکے تھے۔ دوسرے ایک اور

افسر تھے جو ریٹائر ہو کر اپنی زندگی کا بقایا حصہ ایک بہت بڑی کوٹھی میں گذار رہے تھے۔ ان سے منشی کریم بخش کی ملاقات ہر روز صبح سویرے کمپنی باغ میں ہوتی۔ باغ کی سیر کے دوران میں منشی کریم بخش ان سے ہر روز پچھلے دن کی خبریں سنتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ بیتے ہوئے دنوں کے تار چھیڑ دیتا تو ڈپٹی سوپرنٹنڈنٹ صاحب اپنی بہادری کے قصے سنانا شروع کر دیتے تھے کہ کس طرح انہوں نے لائلپور کے جنگلی علاقے میں ایک خونخوار قاتل کو پستول، خنجر دکھائے بغیر گرفتار کیا اور کس طرح اُن کے رُعب سے ایک ڈاکو سارا مال چھوڑ کر بھاگ گیا۔

کبھی کبھی منشی کریم بخش کے آم کے باغوں کا بھی ذکر آجاتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کہتے اب کی دفعہ فصل کیسی رہے گی؟"

"ڈپٹی صاحب پچھلی دفعہ چونکہ آم بہت ہوئے ہیں، اس لئے یہ فصل کچھ کمزور ہی رہے گی۔"

"پچھلے سال آپ نے جو آم بھجوائے تھے بہت ہی اچھے تھے۔ بیحد لذیذ تھے۔"

"انشاء اللہ خدا کے حکم سے اب کی دفعہ بھی ایسے ہی آم حاضر کروں گا — ایک ہی بوٹے کے ہوں گے، ویسے ہی لذیذ، بلکہ پہلے سے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی ہوں گے"

اس آدمی کو بھی منشی کریم بخش ہر سال موسم پر ایک ٹوکرہ بھیجتا تھا۔ کوٹھی میں ٹوکرہ نوکروں کے حوالے کر کے جب وہ ڈپٹی صاحب سے ملتا اور وہ اس کا شکریہ ادا کرتے تو منشی کریم بخش نہایت انکساری سے کام لیتے ہوئے کہتا۔ "ڈپٹی صاحب آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں — اپنے باغ ہیں اگر ایک ٹوکرہ یہاں لے آیا تو کیا ہو گیا — بازار سے آپ ایک چھوڑ کئی ٹوکرے منگوا سکتے ہیں —

یہ آم چونکہ پنے باغ کے ہیں اور باغ میں صرف ایک بوٹا ہے جس کے سب دانے گھلاوٹ خوشبو اور مٹھاس میں ایک جیسے ہیں، اس لئے یہ چند تحفے کے طور پر لے آیا۔

آم دینے کے بعد جب وہ کوٹھی سے باہر نکلتا تو اس کے چہرے پر تمتماہٹ ہوتی تھی۔ ایک عجیب قسم کی روحانی تسکین اسے محسوس ہوتی تھی جو کئی دنوں تک اس کو مسرور رکھتی تھی۔

منشی کریم بخش اکہرے جسم کا آدمی تھا۔ بڑھاپے نے اس کے بدن کو ڈھیلا کر دیا تھا۔ مگر یہ ڈھیلا پن بدصورت معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے تیلے تیلے ہاتھوں کی پھولی ہوئی رگیں، سر کا خفیف سا ارتعاش اور چہرے کی گہری لکیریں، اس کی متانت و سنجیدگی میں اضافہ کرتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑھاپے نے اُس کو نکھار دیا ہے۔ کپڑے بھی وہ صاف سُتھرے پہنتا تھا جس سے یہ نکھار اُبھر آتا تھا۔

اُس کا چہرے کا رنگ سفیدی مائل زرد تھا۔ تیلے تیلے ہونٹ جو دانت نکل جانے کے باعث اندر کی طرف سمٹے رہتے تھے۔ ہلکے سُرخ تھے۔ خون کی اس کمی کے باعث اس کے چہرے پر ایسی صفائی پیدا ہو گئی تھی جو اچھی طرح منہ دھونے کے بعد تھوڑی دیر تک قائم رہا کرتی ہے۔

وہ کمزور ضرور تھا۔ پینسٹھ برس کی عمر میں کون کمزور نہیں ہو جاتا، مگر اس کمزوری کے باوجود اس میں کئی کئی میل پیدل چلنے کی ہمت تھی۔ خاص طور پر جب آموں کا موسم آتا تو وہ ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کو آموں کے ٹوکرے بھیجنے کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کرتا تھا کہ بیس پچیس برس کے جوان آدمی بھی کیا کرینگے، بڑے اہتمام سے ٹوکرے کھولے جاتے تھے۔ اُن کا گھاس پھوس الگ کیا جاتا تھا۔

داغی یا گلے سڑے دانے الگ کیئے جاتے تھے اور صاف ستھرے آم نئے ٹوکروں میں گن کر ڈالے جاتے تھے۔ منشی کریم بخش ایک بار پھر اپنا اطمینان کرنے کی خاطر ان کو گن لیتا تھا تاکہ بعد میں شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔

آم نکالتے اور ٹوکروں میں ڈالتے وقت منشی کریم بخش کی بہو اور اُس کی بیوی کے منہ میں پانی بھر آتا۔ مگر وہ دونوں خاموش رہتیں۔ بڑے بڑے رس بھرے خوبصورت آموں کا ڈھیر دیکھ کر جب ان میں سے کوئی یہ کہے بغیر نہ رہ سکتی ”کیا ہرج ہے اگر اس ٹوکرے میں سے دو آم نکال لئے جائیں“ تو منشی کریم بخش سے جواب ملتا ”اور آجائینگے اتنا بیتاب ہونے کی کیا ضرورت ہے“۔

یہ سنکر وہ دونوں چپ ہو جاتیں اور اپنا کام کرتی رہتیں۔ جب منشی کریم بخش کے گھر میں آموں کے ٹوکرے آتے تھے تو گلی کے سارے آدمیوں کو اس کی خبر لگ جاتی تھی۔ عبداللہ نیچے بند کا لڑکا جو کبوتر پالنے کا شوقین تھا دوسرے روز ہی آدھمکتا تھا اور منشی کریم بخش کی بیوی سے کہتا تھا ”خالہ میں گھاس لینے کے لئے آیا ہوں۔ کل خالو جان آموں کے دو ٹوکرے لائے تھے۔ اُن میں جتنی گھاس نکلی ہو مجھے دیدیجئے“۔

ہمسائی نوراں جس نے کئی مرغیاں پال رکھی تھیں اُسی روز شام کو ملنے آجاتی تھی اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا کرتی تھی ”پچھلے برس جو تم نے مجھے ایک ٹوکرہ دیا تھا بالکل ٹوٹ گیا ہے، اب کے بھی ایک ٹوکرہ دیدو تو بڑی مہربانی ہوگی“۔

دونوں ٹوکرے اور ان کی گھاس یوں چلی جاتی تھی۔

حسب معمول اس دفعہ بھی آموں کے دو ٹوکرے آئے۔ گلے سڑے دانے الگ کیے گئے جو اچھے تھے ان کو منشی کریم بخش نے اپنی نگرانی میں گنوا کر نئے ٹوکروں میں رکھوا دیا۔ بارہ بجے سے پہلے پہلے یہ کام ختم ہو گیا۔ چنانچہ دونوں ٹوکرے غسل خانے میں ٹھنڈی جگہ رکھ دئے گئے تاکہ آم خراب نہ ہو جائیں۔

اس سے مطمئن ہو کر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد منشی کریم بخش کمرے میں گیا۔ چارپائی پر لیٹ گیا۔

جون کے آخری دن تھے۔ اس قدر گرمی تھی کہ دیواریں توے کی طرح تپ رہی تھیں۔ وہ گرمیوں کے موسم میں عام طور پر غسل خانہ کے اندر ٹھنڈے فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹا کرتا تھا۔ یہاں موری کے رستے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی آجاتی تھی۔ لیکن اب کہ اس میں دو بڑے بڑے ٹوکرے پڑے تھے' اس کو گرم کمرے ہی میں جو بالکل تنور بنا ہوا تھا چھ بجے تک وقت گذارنا تھا۔

ہر سال گرمیوں کے موسم میں جب آموں کے یہ ٹوکرے آتے اُسے ایک دن آگ کے بستر پہ گذارنا پڑتا تھا مگر وہ اس تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا تھا۔ قریباً پانچ گھنٹے تک چھوٹا سا پنکھا بار بار پانی میں تر کرکے جھلتا رہتا۔ انتہائی کوشش کرتا کہ نیند آجائے مگر ایک پل کے لئے بھی اُسے آرام نصیب ہوتا۔ جون کی گرمی اور گندی قسم کی مکھیاں کسے سونے دیتی ہیں۔

آموں کے ٹوکرے غسل خانہ میں رکھوا کر جب وہ گرم کمرے میں لیٹا تو پنکھا جھلتے جھلتے ایک دم اس کا سر چکرا گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا سانس اکھڑ رہا ہے اور وہ سارے کا سارا گہرائیوں میں

اُتر رہا ہے۔ اس قسم کے دَورے اُسے کئی بار پڑ چکے تھے، اس لئے کہ اس کا دل کمزور تھا، مگر ایسا زبردست دَورہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ سانس لینے میں اس کو بڑی دقت محسوس ہونے لگی، سر بہت زور سے چکرانے لگا۔ گھبرا کر اُس نے آواز دی اور اپنی بیوی کو بُلایا۔

یہ آواز سُن کر اس کی بیوی اور بہن دونوں دَوڑی دوڑی اندر آئیں، دونوں جانتی تھیں کہ اُسے اس قسم کے دَورے کیوں پڑتے ہیں، فوراً ہی اس کی بہن نے عبداللہ نیچے بند کے لڑکے کو بُلایا اور اس سے کہا کہ ڈاکٹر کو بُلا لائے تاکہ وہ طاقت کی سُوئی لگا دے۔ لیکن چند منٹوں ہی میں منشی کریم بخش کی حالت، بہت زیادہ بگڑ گئی، اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بیقراری اس قدر بڑھ گئی کہ وہ چارپائی پر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اُس کی بیوی اور بہن نے یہ دیکھ کر شور برپا کر دیا، جس کے باعث آس پاس کے کئی آدمی جمع ہو گئے۔

بہت کوشش کی گئی کہ اس کی حالت ٹھیک ہو جائے، لیکن کامیابی نصیب نہ ہُوئی۔ ڈاکٹر بُلانے کے لئے، تین چار آدمی دوڑائے گئے تھے، لیکن، اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی واپس آئے منشی کریم بخش اپنی زندگی کے آخری سانس لینے لگے، بڑی مشکل سے کروٹ بدل کر اُس نے عبداللہ نیچے بند کو جو اُس کے پاس ہی بیٹھا تھا اپنی طرف متوجہ کیا اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم سب لوگ باہر چلے جاؤ۔ میں اپنی بیوی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

سب لوگ باہر چلے گئے۔ اس کی بیوی اور لڑکی دونوں اندر داخل ہوئیں، رو رو کر اُن کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ منشی کریم بخش نے اشارے سے اپنی بیوی کو پاس

بُلایا اور کہا "دونوں ٹوکرے آج شام ہی کو ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کی کوٹھی پر ضرور پہنچ جانے چاہئیں، پڑے پڑے خراب ہو جائیں گے"۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر اُس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا: "دیکھو تمہیں میری قسم ہے۔ میری موت کے بعد کسی کو آموں کا راز معلوم نہ ہو۔ کسی سے نہ کہنا کہ یہ آم ہم بازار سے خرید کر لوگوں کو بھیجتے تھے۔ کوئی پوچھے تو یہی کہنا کہ دینا نگر میں ہمارے باغ ہیں۔ بس ..... اور دیکھو جب میں مر جاؤں تو چھوٹے جج صاحب اور ڈپٹی صاحب کو ضرور اطلاع بھیج دینا"۔

چند لمحات کے بعد منشی کریم بخش مر گیا۔ اس کی موت سے ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کو لوگوں نے مطلع کر دیا۔ مگر وہ دونو چند ناگزیر مجبوریوں کے باعث جنازے میں شامل نہ ہو سکے۔

(منٹو کے افسانے اور ڈرامے)

اختر انصاری

شباب

صنم تراش کا ذوقِ جمال آرائی
خیالِ شاعرِ رنگیں نوا کی رعنائی
شراب نوش کے مہکے ہوئے نشہ کی بہار
مغنّیٔ طرب افزا کے ساز کی جھنکار
تصوّراتِ مصوّر کی پیکر افروزی
ادا فروشیٔ رقّاص کی جگر دوزی

جب اتنی چیزیں ملائی گئیں شباب بنا
شباب کاہے کو، اک دل فریب خواب بنا

عبدالقادر سروری

موجودہ اُردو ادب اور اسکا پس منظر

اُردو ادب اور شاعری کا موجودہ دَور، اُن سیاسی اور سماجی حالات اور فکری رجحانات کا نتیجہ ہے، جو ہمارے عہد کی خاص پیداوار ہیں۔ اور جن میں سے بعض کسی خاص ملک یا قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، بلکہ عالمی مسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں مسائل کی آغوش میں موجودہ ادبی تصوّرات کا نشو ونما ہو رہا ہے۔ اس ادب کو اچھی طرح سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک ہم اپنے اطراف کی تحریکات اور ان کے اثرات کا جائزہ نہ لے لیں۔ تنقید کرنے والے بعض وقت اپنے زمانے کے ادیبوں کی کاوشوں کی پوری داد اسی وجہ سے نہیں دے سکتے کہ وہ ادب کو یا تو اس کے ماحول سے ہٹا کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، یا پھر ہر نئی چیز کو شبہ کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں اور یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ نوجوان ادیبوں کی فکر کا کوئی معیّن اصول اور کوئی پس منظر نہیں ہے۔

اُردو ادب اور شاعری کی اصلاح کی جو تحریک آزاد اور حالی کے زمانے میں اُٹھی تھی، اس کو اب تقریباً اسّی سال کا عرصہ گذر گیا۔ آزاد اور حالی کا

جو سیاسی، سماجی اور فکری ماحول تھا، اس میں اور موجودہ زندگی میں اِس ۸۰
سال کے عرصہ میں اتنی وسیع اور دُور رس تبدیلیاں رُونما ہوگئیں کہ بفرضِ
محال اگر اس وقت آزاد پھر سے دنیا میں آسکتے تو اصحابِ کہف کی طرح اپنے
آپ کو ایسے عالم میں پاتے، جس کی ہر چیز نئی ہے۔ اُس وقت فکر اور عمل کی دُنیا
بہت محدود تھی، تبادلۂ خیال کے وسائل اتنے وسیع نہیں تھے، اور اُس زمانہ کے
ادیبوں اور شاعروں کے لئے اِستفادے کی راہیں بھی ایسی کھُلی ہوی نہیں تھیں،
جیسی اِس وقت ہیں۔ ان ادیبوں کو زیادہ سے زیادہ انگریزی کی خوشہ چینی
پر قانع ہونا پڑتا تھا اَور ایک حد تک اب بھی یہی حال ہے۔ لیکن ایک فرق یہ
ہے کہ اب انگریزی کے توسط سے یا براہِ راست اِستفادے کا میدان وسیع تر ہو
گیا ہے۔ سائنس اور تخیلی علوم کی ترقی کی بدولت، ہمارے زمانے کی عام معلومات
میں جو اضافہ ہوگیا ہے، اس سے وہ دَور نا آشنا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ جو سطحیت آج
کل کے کارناموں میں عام طور پر دیکھی جا رہی ہے، وہ اُن کے پاس مفقود تھی۔ ادب سے
قطع نظر زندگی کے دوسرے قدیم اداروں کے خلاف بغاوت اور بعض وقت
محض بغاوت کی خاطر بغاوت کے تصوّرات سے بھی ان کے ذہن نا آشنا تھے۔
اسی لئے ان کی فکر پُرسکون، ان کی طبیعتیں اعتدال پسند اور ان کی زندگی ماحول
سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتی ہے۔

اس اسّی سال کے دَوران میں ہماری سیاسی اور معاشرتی زندگی ایک
سخت پیچ و تاب کے دَور سے گذرتی رہی۔ جدید دَور کے آغاز میں اُردو ادب
اور شاعری نے فطری شاعری اور قومی شاعری کے احساس کو اُبھرتے دیکھا تھا

اور اس کے ساتھ ساتھ وطنیت کے جذبات بھی جوش پر تھے، لیکن یا تو وہ محدود نظری کے سارے تلخ نتائج سے دوچار رہے۔ جن میں سے ایک ہندی اردو کا تصفیہ نامرضیہ بھی ہے۔ یا پھر وہ سطح سے نیچے نہ اتر سکے۔ اسی لئے اقبال کی مخصوص اسلامی تحریک پھیل جانے کے بعد جسے وہ انسانی تحریک سمجھتے تھے، قومیت اور وطنیت کے جوش کے ابھرنے کی زیادہ گنجائش نہیں رہی تھی۔ چنانچہ آج کا شاعر اگلے شعراء کی طرح ان جذبات کے راست اظہار کو قدامت پرستی اور رسمیت سمجھے گا کیونکہ ہماری دنیا میں قومیت بلکہ انسانیت کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہوتی جا رہی ہے اور ایسے جذبات کے نشو و نما کے لئے موجودہ رسل و رسائل کے سریع السیر وسائل بہت معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسی فضا میں قومیت پسندی کی تنگ نظری اگر کسی شاعر کے کلام میں نظر آئے تو وہ عموماً استعارے کے لباس میں پنہاں ہو جاتی ہے۔

موجودہ ادب میں جو تحریکیں برپا ہیں ان کے ماخذوں کی تلاش ہم کو دور دراز ملکوں تک پہنچا دیتی ہے۔ اور بعض ایسے واقعات تک رہبری کرتی ہے جو عالمی اہمیت رکھتے ہیں۔ پچھلی ربع صدی میں جو ہمارے موجودہ ادب اور ادبی تصورات کے نشو و نما کا زمانہ ہے، کوئی واقعہ اتنا اہم نہیں پیش آیا، جتنا کہ گذشتہ جنگ عظیم کا واقعہ ہے۔ یہ جنگ کہنے کو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک یورپ کی سرزمینوں میں لڑی گئی لیکن اسکی تباہ کاریوں کے اثرات جنگ کے زمانے میں اطراف و اکناف کے ملکوں تک پہنچتے رہے اور جنگ کے بعد اس کے مابعد اثرات نے ساری دنیا کو تہ و بالا کر دیا۔ اس پیچ و تاب سے جب یورپ کے اہل فکر متاثر ہونے لگے تو ان کے ادب کا ان سے محفوظ رہنا دشوار تھا۔ چنانچہ یہ اثرات چھن چھن کر اور چولا بدل بدل کر ادب میں رونما ہونے لگے، اور ان کی

پر چھائیں ہمارے اَدب پر بھی پڑنے لگیں، کیونکہ ہمارے موجودہ شاعروں، اَور ادیبوں کا رُخ، جدید دَور کے آغاز سے اسی طرف کو پھر گیا ہے ۔

جنگ کی تباہ کاریوں میں دو اثرات بہت اہم تھے ۔ ایک تو زمانۂ جنگ میں نوجوان طبقوں کی تباہی، جن میں ادیب اور شاعر بھی شامل تھے ۔ دوسرے معاشی افراتفری ۔ قوم کے نوجوان طبقوں کی مَوت ایک اَیسا سانحہ ہوتا ہے، جس سے کئی معاشی اور سماجی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں ۔ انفرادی حیثیت سے معاشی مسائل کی گتھی نوجوان لڑکیوں کو کام پر لگا دینے اور معیشت کے ذریعے پیدا کرنے سے کسی حد تک سُلجھ جاتی ہے، لیکن اس سے سماجی مسائل کی تلخیاں دُور نہیں ہو سکتیں، اور ایسی صورتوں کے پیدا ہونے کی روک تھام نہیں ہو سکتی، جو اخلاق اور مذہب کی رُو سے اور صدیوں کی قبول کردہ شائستگی کے نقطۂ نظر سے، مذموم سمجھی جائیں ۔ لیکن لوگوں کو جینا اور بہرحال جینا تھا اور اخلاق اور مذہب اور شائستگی کے ہوّا کو سَر پہ منڈلاتے ہُوئے، وہ خوش و خرّم زندگی نہیں گذار سکتے تھے ۔ اس لئے سوچنے والے ذہنوں نے کدوکاوش شروع کی اور سوچتے سوچتے بنیادوں ہی پر ضرب لگانی شروع کی ۔

معاشی افراتفری کی روک تھام کے لئے محاصل کے اضافے کی ایک صورت تھی ۔ اس سے قوموں نے فراخدلی سے کام لیا، پھر بھی مایحتاج زندگی کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافے کے باعث غریب اور مزدور طبقوں کی زندگی گذارنا ہی دشوار ہو گیا تھا ۔ صنعتی ملکوں میں ان کی تعداد اتنی ناقابلِ اعتنا نہیں ہوتی کہ ان کو بے چین چھوڑ کر کوئی حکومت اطمینان کا سانس لے سکے ۔ اس لئے بالآخر حکومتوں کو دخل

دنیا پڑا۔ اور کبھی آجروں پر زور ڈال کر اور کہیں قانون بنا کر، اجرتوں میں اضافہ کرنا اور اس خطرہ کو گھٹانے کی سبیل ڈھونڈنا ضروری ہو گیا۔ لیکن یہ چیز آجروں کے لئے مسرت کا باعث تو ہو نہیں سکتی تھی۔ اِس لئے ایک لامتناہی کشمکش کا آغاز شروع ہوا جس میں اہلِ فکر اور اہلِ قلم بھی شامل ہو گئے اور سارے معاشی مسئلے کی ازسرِنو چھان بین شروع ہو گئی۔

ایک وقت اور یہ آن پڑی تھی کہ جنگ زدہ قوموں نے اپنے موازنے کے مسلسل خسارے کو متوازن کرنے کے لئے دھڑا دھڑ کاغذ کے سکّے چلانے شروع کر دیئے جس سے سکّے کی قدر و قیمت میں گھٹاؤ لازمی تھا۔ جنگ کے بعد بے روزگاری کی وبا کا پھوٹ پڑنا بھی لازمات سے ہے۔ اِن گوناگوں اور پیچیدہ حالات نے قوموں میں ایسی ذہنی بل چل پیدا کر دی، جو رفتہ رفتہ بین قومی مسئلہ بن گئی۔

یُورپ کے نئے معاشی اور سماجی مفکر، اسی ماحول کی پیداوار ہیں۔ جن کے ذہن شعوری یا غیر شعوری طور پر ان مسائل کی چھان بین اور حل میں لگے ہُوئے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالات کو اپنے موافق بنانے میں ہم کو کامیابی نہیں ہو سکتی، تو ہم اپنے آپ کو حالات کے موافق بنا کر بھی خوش ہو لیتے ہیں، جیسا کہ کہا گیا ہے "زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ بساز" ورنہ ماحول سے ٹکراتے ہُوئے زندہ رہنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ ماحول سے ٹکرانا فطرت سے ٹکر لینے کے مُترادف ہے۔ یہی حال اس زمانے کے اہلِ فکر و اہلِ قلم کا تھا۔ چنانچہ کارل مارکس کا معاشی فلسفہ اسی زمانے میں مقبولیت حاصل کرنے لگا۔ اسی طرح آسٹری حکیم نفسیات، فرائیڈ کے جنسی نظریے، لوگوں کی توجہ کو سب سے زیادہ اسی

زمانے میں اُلجھانے لگے۔ انگلستان کا مشہور مفکر اور ادیب برٹرنڈ رسل، جو جنگ عظیم سے پہلے سماج کے مروّجہ عقائد اور رسوم کے خلاف لکھنے پہ نظر بند کر دیا جا سکتا تھا، اب اخلاق اور شادی بیاہ کے مسائل پہ دل کھول کر لکھ سکتا تھا کیونکہ حالات اس کے مساعد تھے۔

بعض ممالک، جیسے فرانس کو جنگ کی بدولت اپنے اچھے اچھے ادیبوں کو کھونا پڑا، جس سے اس ملک کے ادب سقل میں رخنہ سا پڑ گیا۔ جو لوگ محفوظ رہے، یا میدانِ جنگ سے بچ کر لوٹے، ان میں جنگ کی ہولناکیوں نے خواہشِ اظہار کو نہایت تلخ و تند کر دیا تھا۔ چنانچہ جب وہ ادبی تعمیر کے لئے اُٹھ کھڑے ہُوئے تو اکثر نوجوان اہلِ قلم اپنے آپ کو ایک نئی دنیا میں سمجھ رہے تھے، جیسے قدیم دُنیا سے کوئی واسطہ نہیں، اَور ہر چیز خود اپنے طور پر تعمیر کرنا چاہتے تھے، لیکن یہ ان کی بھُول تھی، کیونکہ وہ قدما کے اثر سے بالکل محفوظ نہیں تھے۔

اس نوجوان نسل کی ادبی پیداوار میں، فکر کی ہم آہنگی مفقود تھی، اور اردو ادب کے موجودہ دَور کی طرح ہر ادیب ایک نئے من مانے اصول کی پیروی کرنے پہ تُلا ہُوا تھا۔

جرمنی میں، جنگ عظیم نے، قومی اور وطنی جذبات کو بہت اُبھار دیا تھا، جس کے نتیجے کے طور پر بہت سا ادب پیدا ہُوا، جو وقتی دلچسپیوں کو تو رکھتا تھا، لیکن پائدار اور اہمیت کی کوئی چیز اس میں نہیں ہوتی تھی۔ اس وقتی جذبے کے گذر جانے کے بعد انسانیت کا وسیع احساس رُونما ہُوا۔ تاہم وقت کا تقاضا یہ تھا کہ ایسی پھلجھڑی کی سی چیزیں پیش کی جائیں، جن کا وقتی اثر تو بہت ہو، لیکن باقی رہنے والا نہ ہو۔ اَور ملکوں کی طرح جرمن اہلِ قلم کو بھی ادبی کیفیت اور عمومی مقبولیت کے درمیان

سمجھنے کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ نئے نئے ادبی نظریے جو آئے دن پیدا ہو رہے تھے، ان کی بدولت نفسیاتی اور حقیقتی نوعیتوں کے بہت سے تجربے کئے گئے جن کا سب سے زیادہ اثر ناول میں دکھائی دیتا ہے۔ ان تجربوں کی بدولت بے سُراپن اور لفاظی کی جھلک جرمن ادب میں بہت نمایاں ہوگئی، جس کا کچھ نمونہ ہمیں موجودہ دَور کے اُردو ادب میں نئی قسم کی تجربی کوششوں میں نظر آسکتا ہے۔

اس زمانے کی انگریزی شاعری کے متعلق ایک نقّاد کی رائے ہے کہ "وہ جذبات کے عمدہ اور اعلےٰ پایہ کارناموں کی کمی کے اوصاف سے ممیّز ہے۔ یہ تصادم اور انتشار کا دور ہے، تشکک، قنوطیت، تکان، بے حسی، عیش کوشی اور نئے مسلکوں کی تلاش میں سرگردانی کا دور ہے، جو بعض وقت دین دشمنی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔" اس خیال کی روشنی میں موجودہ اُردو ادب کا مطالعہ بھی مفید ثابت ہوگا۔

روس جیسی اشتراکی تحریک یورپ میں تو اتنی نہ پھیل سکی، لیکن ہندوستان کے بعض نوعمر پڑھے لکھے طبقوں اور متمول سیاست دانوں میں یہ ہر مرض کی دوا سمجھی جانے لگی ہے۔ بظاہر گذشتہ جنگِ عظیم سے اتنا متاثر نہیں ہوا، جتنا کہ ۱۹۱۷ء کے بعد بالشوی انقلاب کے بعد شکست و ریخت کا اکھاڑہ بن گیا۔ بالشوی انقلاب کی بنیاد کارل مارکس کے معاشی نظریے تھی جس کو روس کے قائدین نے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ اس [illegible] کی بابت کامیابی یا ناکامی سے یہاں بحث نہیں، لیکن اس کا ایک اثر ضرور ہوا کہ اس نے سارے عالم کو

چونکا دیا۔ یورپ کی قومیں خاص طور پر روس کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لئے اس کے حالات کا مطالعہ کرنے لگیں۔ اس طرح روسی ادب کے مطالعے کا بھی شوق بڑھا۔ اس سے بڑا ادبی فائدہ یہ ہوا کہ دنیا روس کے بعض بلند پایہ ادیبوں جیسے ٹالسٹائی، چیخوف، میکسم گورکی وغیرہ کے کارناموں سے واقف ہو سکی، جن کے ہاتھوں میں مختصر قصے نے ایک نئی فنیت کا جامہ پہنا تھا۔ روس یوں بھی اپنی قومی اور فطری خصوصیات کے سبب یورپ کی دوسری قوموں سے ایک الگ حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن اس کے ادب کے مطالعے سے اس کی فکر کی انفرادیت زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتی گئی، اور ایک حد تک یورپی ادب پر اثر انداز بھی ہو رہی ہے۔

اردو ادب کا یہ دور جو کم وبیش ربع صدی پر حاوی ہے، پچھلے تمام ادوار سے زیادہ وسیع پیداوار پر مشتمل ہے۔ اس میں ابتدائی زمانے کی سہل اور آسان رو ادبیت اور اعتدال پسند جدت طرازیوں سے لیکر حالیہ سالوں کی گھمسان پیداوار بھی شامل ہے۔ ادبیت کے اس نئے احساس کے آغاز میں ہم اپنے ادیبوں اور شاعروں کو جدت پسندی کے ساتھ ساتھ وضعداری کر قائم رکھتے ہوئے اور ہر اچھے یا برے موضوع پر طبع آزمائی کرنے کے لئے لپکتے دیکھتے ہیں۔ یہ دور اقبال کی شاعری کے عروج کا دور تھا۔ اور ان کے مخصوص اخلاقی فلسفے اور احیائے مشرق کی تحریکات کا اثر چھوٹے یا بڑے تمام شاعروں پر ایسا چھایا ہوا تھا کہ نئی ادبی تحریکیں کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہ کرسکیں۔ انہیں میں اشتراکیت کی تحریک بھی تھی۔ خود اقبال نے بھی بعض وقت ایسی نظمیں لکھیں، جن پر شاید اشتراکیت پسندی کا شبہ ہو سکے۔ چنانچہ ان کی نظم "فرمان خدا" اس سلسلے میں پیش کیجاتی ہے۔ لیکن یہ جاننا

دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس طرح کے جذبات کی بنیاد اقبال کے پاس کچھ اور تھی۔ یہ محض انسانی ہمدردی اور پس افتادہ انسانوں کی حمایت کا جذبہ تھا۔ اس کے پیچھے کوئی سیاسی مسلک نہیں تھا۔ لیکن اقبال کے اٹھتے ہی ایسا محسوس ہونے لگا کہ اردو شاعری کی ساری عمارت لڑکھڑا گئی۔ اور اس کا سب سے بلند بام بیٹھ گیا۔ جس کے بعد موسمی ہواؤں کی چیرہ دستیوں کے لئے راستہ کھل گیا۔ اور ہوا کا چھوٹا سا چھوٹا جھونکا بھی ہم کو متاثر کرنے اور بعض وقت اپنی جگہ سے ہلا دینے کے لئے کافی ثابت ہو رہا ہے۔

اس ابتدائی زمانے میں ہمارے ادب کی رفتار خود بہت دھیمی تھی۔ چند تخیلات، جیسے کسان مزدور اور سرمایہ دار کی اصطلاحات، جس کی نئی نئی درآمد ادب اور شاعری میں ہوئی تھی، گل و بلبل کے استعاروں سے زیادہ اجنبی تھیں۔ اور اب اکثر شاعروں کے پاس جنہیں نئی فنیت میں پوری دستگاہ حاصل نہیں ہوئی ہے، یہ اجنبی ہی ہیں۔ اس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ شعر و ادب کا نشو و نما قومی تصورات، تخیلات، اور معتقدات اور اس سے بڑھ کر مخصوص فلسفیانہ عقائد میں ہوتا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ ان کی نوعیت کیا ہے۔ مستعار تخیلات سے اگر کسی ادب کو ترقی نصیب ہو سکتی ہے تو دنیا کے شہ کاروں کا اپنے ادب میں ترجمہ کر لینا اس سے بہتر ہو سکتا لیکن تجربہ اس کی نفی کرتا ہے۔ اور یہ بتاتا ہے کہ قومی ادب کا نشو و نما باہر سے نہیں، بلکہ اندر سے ہوتا ہے۔ غیر زبان کے کتنے ہی بلند پایہ شہ کار اپنی زبان میں منتقل کیوں نہ کر لئے جائیں، وہ اپنے ادب کی ترقی میں شمار نہیں ہو سکتے۔ بجز اس کے کہ ہمارے ادیب بھی، اس کی ٹکر کے، اس کے مقابلے یا موازنے کے کارنامے

پیدا کرنے پر قادر ہو جائیں، یا اس سے متاثر ہو کر اپنے لئے نئے راستے پیدا کر لیں، جو فکر اور اظہار، ہر اعتبار سے اتنے ہی بلند ہوں۔

سرمایہ دار، کسان، مزدور، اور دوسرے ساری اشتراکی تصورات کی درآمد کے علاوہ ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے جس نئی طرز کو ترقی دینے کی کوشش کی، اس کے حسن و قبح کے متعلق ابھی کچھ کہنا قبل از وقت سمجھا جائے، کیونکہ یہ فیصلہ کہ کس طرز کو مقبولیت عام کا امتیاز حاصل ہوگا، اور وہ ادب کا سرمایۂ امتیاز بن جائے گی کسی فرد یا جماعت پر منحصر نہیں ہے، بلکہ اس کا فیصلہ زمانے کے ہاتھ ہے۔ بحالتِ موجودہ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ مذکورۂ بالا اصطلاحات کے علاوہ ہم کو اس زمانے کے ادب میں بہت کم آثار ایسے ملتے ہیں جن سے فکر کی بلندی، نظر کی گہرائی، اظہار کے خوش گوار تنوع اور تخیل کی دلفریب شگفتگی کا پتہ چل سکتا ہو۔ ہماری شعری پیداوار کا قالب تو بیشک اوقات بدلا ہوا نظر آتا ہے، لیکن شاعروں کے قلب کے بدلنے کے آثار نہیں دکھائی دیتے۔ دیہات پر ان کی جو نظر پڑتی، وہ بہت ہی اچٹتی ہوئی اور ایک پیٹ بھرے تماشائی کی نظر ترحم یا تمسخر ہوتی، یا پھر احتیاج اور افلاس کو دلکشی کا مشغلہ بنایا جاتا۔ چنانچہ "حسین بھکارن" "البیلی چمارن" "سندر مہترانی" اور ایسے بیسیوں (STEREO TYPED) موضوع ان کی پیش کشی کے انداز اور انداز کی یکسانیت، اسی طرزِ فکر کا نتیجہ ہیں۔ مثال کے طور پر اس گروہ کے کسی دو شاعروں کے کلام کے مجموعوں کو بالمقابل رکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں کس حد تک یکسانیت، اسی لئے رسمیت، اور کس حد تک حقیقی انفرادی فکر کا سرمایہ موجود ہے۔ میرے سامنے اس وقت اسی طرز کے ایک شاعر کے کلام کا مجموعہ

ہے، جس پر بعض معتبر اصحاب کی رائیں بھی ثبت ہیں۔ اس کی پہلی دو نظمیں ایک دنیا کا تصور پیش کرتی ہیں، گو دوسری نظم کو اس موضوع سے براہِ راست تعلق معلوم نہیں ہوتا لیکن اگر کھینچ تان کے اسے اس موضوع تک پہنچا بھی دیا جائے تو شاعر کے قول پر بھروسہ کر کے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ یہ ایک نئی دنیا ہے جو غالباً قدیم ہندوستانیوں کے عقیدے کے مطابق ایک [illegible] ہے یا ایرانیوں کے تخیل کے مطابق "نیا کوہِ قاف" جہاں کی ہر چیز [illegible] زمرد کے رنگین ہی رنگین ہے۔ اور ان دو نہایت مختصر نظموں میں یہ لفظ اور اس کے تقریباً تمام مشتقات کم سے کم پانچ موقعوں پر استعمال ہوئے ہیں۔ رنگین وادی، رنگینیاں، رنگین سائے (سایہ یعنی چھاؤں نہ کہ عورتوں کے پہننے کا لباس) رنگین فسانہ، رنگین فضائیں وغیرہ آگے کی نظموں میں بھی اس طرزِ فکر کو برقرار رکھا گیا ہے، چنانچہ اس ایک مجموعے میں جو کھلی تحریر کے زیادہ سے زیادہ پچاس صفحوں پر مشتمل ہے، اس لفظ کے حسبِ ذیل مشتقات اور مرکبات استعمال ہوئے ہیں۔ رنگ، رنگین (مجموعے میں ۹ دفعہ) رنگینی، رنگینیاں، رنگین دنیا رنگین خواب، رنگین بادل، رنگین گیت، رنگین تصور، رنگین جزیرا، رنگین راستہ رنگ لانا، رنگوں کی آمیزش۔

یہ صرف ایک لفظ کی مثال ہے۔ ایسے کئی اور الفاظ اس دور کے شاعروں کے پاس اس قدر مقبول ہو گئے ہیں کہ وہ ہر شائبۂ خیال کو اسی پیرایہ میں ظاہر کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ اگر فکر کی تہمت نہیں، تو اسے فکر کی بلندی کہنے میں شاید تامل ہوگا۔

اس ادب کی سب سے نمایاں خصوصیات، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی عملی زندگی سے بیگانگی، اس کی بوقلموں مظاہر، ان کے حسن و قبح اور ان کے صحت بخش

تأثرات، اور تاثرات کے دلکش اظہار سے پہلو تہی، اور محض چند Morbid پہلوؤں کی مکروہ منظر کشی پر قناعت، جس کو درحقیقت نشریہ بازی یا پروپگنڈا کہا جا سکتا ہے، اور بعض وقت بے دردانہ پردہ دری، اور ایسے جذبات کا راست اظہار ہے، جو استعارے کے پیرائے میں اور حسن گفتار کے ساتھ بھی ظاہر کئے جائیں تو شاید پسند نہ آئیں۔ اِس دَور کے بعض یورپی فن کار، جو مشاہدہ نگاری کے بڑے علمبردار ہیں، ان کے کلام کو اس سرے سے اُس سرے تک دیکھ جائیے مشاہدہ نگاری کے ایسے نمونے نہیں ملینگے جو ہمارے نوعمر شاعروں کے کلام میں ملتے ہیں۔ مُمکن ہے کہ یہ اپنے یورپی اساتذہ کو بھی، اس معاملے میں رجعت پسند تصوّر کرتے ہوُں۔

موجودہ ادب کا یہ عارضی دَور ادب میں بغیر کسی حقیقی اضافے کے گذر گیا لیکن اِس سطحیت اور رسمیت سے رفتہ رفتہ ایک مسلک ترقی پاتا دکھائی دینے لگا، جس کا مطمح نظر بظاہر ادنےٰ اور پس افتادہ طبقوں کے ساتھ ہمدردی، متمول طبقوں کے خلاف جہاد، اور سماجی زندگی کے مسائل کا نہایت جرأت اور بے باکی کے ساتھ اظہار دکھائی دیتا ہے۔ نظم میں اس مسلک کی خواہش ایک نئی فنیت کو نشوونما دیتا ہے۔ جس میں نئے اوزان کی ترویج اور قدیم اوزان کے نئے انداز استعمال اور قافیہ اور ردیف کو ترک کرنے یا انہیں قدیم اساتذہ کے اصول سے ہٹ کر استعمال کرنے کی خواہش بہت نمایاں نظر آ رہی ہے۔ موضوعات کی حد تک یہ کہنا کہ اس مسلک کے لکھنے والوں کو جو موضوعات کی تحدید ناگوار ہے، کوئی قابلِ تعریف بات نہیں، کیونکہ شعر کے ساتھ موضوع کی تحدید کا تصوّر ہی بے محل اور ایک بناوٹی

آدر فرضی چیز ہے۔ لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس مسلک میں زندگی اور اُس کی حقیقتوں کو نئے زاویۂ نظر سے دیکھنے، اس کی گہرائیوں میں گھسنے کی خواہش ایک ایسی خصوصیت ہے جو اسی دور کے ابتدائی لکھنے والوں میں اَور موجودہ اہلِ قلم میں نمایاں امتیاز پیدا کرتی ہے۔ رہی یہ بات کہ بعض نوجوان اہلِ قلم ہمیشہ ایک خاص پہلو کا انتخاب کر لیتے ہیں، اور پھر اسی میں اعتدال اور حسنِ فکر کا لحاظ نہیں رکھتے۔ کچھ تو عمر کے تقاضے کے باعث ہے، اور کچھ گندے مذاق کا کرشمہ۔ ایسے لکھنے والے ہر زبان میں اور ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہے، جن کے لئے ہیجان انگیزی بعض وقت مقبولیت اور بعض وقت تجارت کا ذریعہ بنی رہی۔ لیکن زمانے نے ہمیشہ ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا، جس کے وہ مستحق تھے۔ مثال کے لئے رینالڈس کا نام لینا کافی ہے۔

لیکن چونکہ موجودہ اُردو ادب کا سارا سرمایہ محض اس قسم کی تحریروں پر مُنحصر نہیں ہے، بلکہ اگلے دَور کے اساتذہ جو قدیم معیاروں کے پابند ہیں، لیکن حقیقت میں اظہار کی حد تک ماحول سے بہت کچھ جذب کر چکے ہیں۔ ابھی تک ادبی دنیا میں قدر و منزلت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے نئی تحریک کے علمبرداروں نے اپنے مسلک کے تشخص اور ان سے اپنے آپ کو ممیز کرنے کے لئے ایک خاص اصطلاح" ترقی ادب کی تجویز کی اور اس کی ضابطہ سازی کی بھی کوشش کی گئی حالانکہ اس طرح کے تشخ کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ہر ادیب و شاعر جس میں اظہار کا جوہر ہو، وہ اپ آپ کو کسی نام سے پکارے، خواہ وہ رجعت پسند ہی کیوں نہ ہو، اور وہ کسی مسلک سے وابستہ ہونے کی کوشش کرے، وہ ہر زمانے کا بڑا ادیب ہے اور زمانہ اس کے کارنا

کے تحفظ کا ضامن ہے۔ ایک اور بات بھی اس سلسلہ میں قابلِ توجہ ہے کہ بعض وقت اس طرح کے تشخص میں احساسِ پستی کا شائبہ سا نمایاں ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی احساس کا نتیجہ ہو یا پھر اس نام کو نئے مسلک کے سارے اجزا پر حاوی نہ جان کر کبھی کبھی "نیا ادب" "انقلابی ادب" یا "انقلاب پسند ادب" کی چند اصطلاحات بھی اس کے لئے استعمال کی جاتی رہیں اور شاید کئی اصطلاح اور وضع کی جائیں، لیکن بہرحال نام اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جتنا کہ خود کارنامے اور خود ان کی نوعیت ہے۔ ہمارے ادب کی رفتار، ترقی کا یہ دَور، آزادیٔ فکر کے وصف سے بالکلیہ خالی نہیں، گو "آزادیٔ عمل" ابھی ایک خوش آئند خواب ہے۔ اس آزادیٔ فکر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے موجودہ لکھنے والوں کو اُردو زبان کی کل ہند اہمیت اور اس کی وسعت کا بھی احساس ہے۔ چنانچہ اس دَور کے ادیب زبان کے لفظی خزانے کو ہر ممکنہ ذریعے سے مالا مال کرنے کے حامی ہیں۔ اور اکثر ایسے الفاظ یا الفاظ کی ایسی شکلوں کو، جو زندہ شکلیں ہیں استعمال کرنے سے (اور محض استعمال ہی نہیں کرتے بلکہ کتابی الفاظ اور قواعدی شکلوں پر ان کو ترجیح بھی دیتے ہیں) پس و پیش نہیں کرتے۔ اور انسانوں کا ایک بڑا طبقہ انہیں اظہارِ خیال کے لئے کام میں لاتا ہے۔ ممکن ہے وہ لوگ جو زبان کے ایک ترقی پسند جدید ہونے کی حقیقت سے ناآشنا ہیں، اس تجاوز کو مستحسن نظر سے نہ دیکھیں، لیکن نئے لکھنے والوں میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ وہ ان کی پروا نہیں کرتے۔ ان میں لاہور، دہلی، لکھنؤ، بہار، کلکتہ، سی پی، حیدرآباد، بمبئی، مدراس، میسور، غرض سبھی جگہ کے اہلِ قلم شامل ہیں۔

ادب کا یہ دَور سیاسی آزادی کے احساس سے بھی خالی نہیں ہے لیکن

اگلے دَور کے مقابلے میں نئے لکھنے والوں میں ایک خصوصیت جو خاص طور پر نمایاں ہے، وہ ایک ہندوستانیت کا احساس ہے، جس سے سارے ذہنی اختلافات گم کر دینے اور امتیازات کو ایک دوسرے کے ساتھ سمو دینے کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔

.... - انقلاب کی خواہش جو سیاسی آزادی کے احساس ہی کا نتیجہ ہے، بعض وقت حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتی ہے۔ لیکن اعتدال کے وصف کے ساتھ یہ موجودہ ادب میں ایک ایسی رجائیت کو نشو و نما دیتی ہے، جس کی موجودگی اس دَور کے ادب کو اگلے تمام دَور کے مقابلے میں ممتاز بنا دیتی ہے۔

غزل کی قدیم صنف نے اس عہد میں اپنے صُور کی لوازم کو برقرار رکھتے ہُوئے اپنی تصورات میں جو شکست و ریخت شروع کر دی ہے اور ماحول کے اثرات کو جذب کر کے تجدد پسندی کا ثبوت دے رہی ہے۔ وہ اس صنف کی بقا اور شاندار مستقبل کی ضمانت ہے۔ ممکن ہے کہ خود غزل گو شعرا کو اس تبدیلی کا احساس نہ ہو، لیکن دیکھنے والے اس تبدیلی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اخترالایمان

قیامت

بارگاہِ لافانی
بے خبر ہے جانے کیوں؟
ایک اشک بے مایہ
مُعتبر ہے جانے کیوں؟

ہم نفس دُعا مانگیں!
روشنی کے مینارے
ماہ و آسماں، تارے
ٹوٹ کر بکھر جائیں
کوہ و دشت و دریا سے
کانپتی صدا اُٹھّے
اے خدائے لافانی
مختصر جہانبانی

مدتوں کی تاریکی
روشنی سے دُھل جائے
چشمۂ بقا پھوٹے!
آسمانِ تازہ پر
آفتاب تازہ ہو
عارضِ محبّت پر
ماہتاب غازہ ہو!

ماستی ونکٹیش آینگار

مترجمہ
ممتاز شیریں

دہی والی

دہی والی منگماں برسوں سے ہمیں دہی دیتی آرہی ہے۔ اور شہروں میں یہ معمول ہے۔ دہی والی ہر روز دہی دے جاتی ہے اور مہینہ کے آخر میں دام چکائے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں تو نقد سودا ہے۔ مال لو' دام دو۔ اسپر فائدہ یہ کہ جس دن جتنا دہی چاہو لے کے کھاؤ۔ کبھی کبھار مہمان آگئے' زیادہ دہی لے لیا دام چکا دئے۔ یہ نہیں کہ ہر روز پاؤ پاؤ ڈیڑھ پاؤ ہی لو' تو یہ دہی والی اکثر ہمارے گھر پر سے گزرا کرتی ہے۔ اسوقت وہ اندر آکر پوچھ لیتی ہے کہ ہمیں دہی چاہئے یا نہیں ہمیں ضرورت ہے تو لے لیتے ہیں اور بازاری نرخ کے مطابق دام چکا دیتے ہیں۔ یہ دہی والی آوالور کے قریب ہی کسی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ ارے میں بھول رہی ہوں کوئی بھلا سا نام ہے اس گاؤں کا دنکا پور یا ایسا ہی کچھ اور۔ تم جانو' غریب بیچاری مجھے اس پر بڑا ترس آتا۔ اسکا دکھ درد پہچان کر میں نے ہمدردی جو جتائی تو گاؤں سے آتے جاتے دونوں وقت ہمارے گھر آنے لگی۔ وہیں انگنائی میں بیٹھ کر پان چباتی چباتی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتی۔ مجھے کبھی فرصت ہوتی' تو اپنی رام کہانی لے بیٹھتی۔ اپنے گھر کی تکلیفوں کا ذکر کر کرکے دکھڑا روتی۔ پھر مجھ سے پوچھتی اپنے گھر کے بارے میں کچھ کہوں۔ یہ لو مجھے کیا دکھ ہے۔ پرماتما کی دیا سے ہمارے گھر میں سب بخیر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتی "آج کہیں سے موٹی بلی آکر سارا دودھ پی گئی"۔ چوہے رات ہی رات گدڑی چٹ کر گئے'۔

میں اسے یہ چھوٹی چھوٹی باتیں سُنا چکتی تو وہ ایک سرد آہ بھر کر کہتی " امّاں یہی دُنیا کے طور ہیں"۔ اور اپنے تجربہ کی بنا پر مجھے بہت سی باتیں سکھاتی۔ یوں میں اور منگتاں گھل مِل گئے۔

ایکدن، کوئی ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔ منگتاں آئی اور پوچھنے لگی، " دہی چاہیئے"؟ میں کہیں اندر تھی۔ میرے چھوٹے لڑکے نے کہا "ہاں"، اس نے اپنے ننھے ہاتھ پھیلا دئے " ہمیں چاہیئے ہمیں دو"۔ منگتاں سر سے دہی کا ٹوکرا اُتار کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ دہی کا ایک موٹا سا چکتّہ نکال کر اس نے بچّے کے ہاتھ پر رکھا اور کہنے لگی " امّاں کو بُلا لاؤ۔ مجھے جلدی جانا ہے"۔ اتنے میں میں خود آ گئی۔ " اماں تم نے کیسا لعل پایا ہے، نیک مائی کا نیک سپوت، لیکن یہ سب کچھ چند دنوں کے لئے ہے مائی، جب بڑا ہوگا تو تمہاری پرواہ نہیں کریگا۔ ایک اور عورت اس کے دل پر قبضہ جما لے گی۔ وہی بیٹا جس کا ماں، ماں کہتے منہ نہیں سُوکھتا یہ بھی نہیں پوچھیگا کہ ماں زندہ ہے یا نہیں"۔

کیوں منگتاں؟ کیا ہوا آخر۔ کیا تمہارے بیٹے نے تمہاری کوئی بات نہیں مانی؟ " رہنے دو ماں"۔ منگتاں بولی " خود میرے آدمی نے میرا خیال نہیں رکھا تو بیٹے سے کیا امّید؟

" تمہارے پتی نے تمہارا خیال نہیں رکھا منگتاں"؟ میں نے پوچھا۔ " وہ ایک لمبی بپتا ہے۔ مائی" منگتاں بولی۔ " میں نے کبھی اچھّی بھڑکیلی ساری نہیں پہنی۔ ایک دوسری عورت پہنتی تھی۔ اس ساری کے چمکدار رنگ نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور وہ اس عورت کے پاس چلا گئے۔ میں پھر بھی چپ رہی۔ مرد کو اختیار ہے جیسا

چاہے کرے۔ عورت کے لئے یہی بس ہے کہ اس کا گھر ہے اور پتی جنہیں وہ اپنا کہہ سکتی ہے، اس لئے میں نے یہ خاموشی سے سہہ لیا۔ لیکن مائی میں نے گناہ کیا۔ میں نے اکسیر بیچی اور اپنے آدمی کو کھو دیا۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے، جو ہونا تھا ہوا۔

لیکن مائی! میری ایک پرارتھنا سنو۔ تم اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں بہت خیال رکھنا۔ شام میں تمہارے پتی کے آنے سے پہلے کوئی اچھی سی ساری پہن لیا کرو۔ مرد کا خیال یکساں نہیں رہتا مائی۔ تمہیں چاہئے کہ کوئی اچھی سی ساری یا پکے رنگ کی چولی پہنا کرو۔ ایسی جو تمہارے پتی کی آنکھوں کو بھائے، پھول عطر خریدو۔ ایسی بنی ٹھنی رہو کہ تمہارے پتی کا جی خوش ہو جائے۔ مثال کے طور پر یہ ساری جو تم نے پہنی ہے، یہ گھر کا کام دھام کرتے وقت پہننے کے لئے تو ٹھیک ہے، لیکن شام میں کوئی بھڑکیلی چیز پہننی چاہئے۔" میں منگتاں کی عقلمندی پر مسکرائی۔ مجھے احساس تھا کہ اس نصیحت کے پیچھے جو گہری دانشمندی تھی، وہ تجربہ سے پیدا ہوئی تھی۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ وہ تجربہ تلخ تجربہ تھا۔ اس غریب عورت پر مجھے ترس آیا۔ "ہاں منگتاں! تم سچ کہتی ہو" میں بولی۔ اس نے کہنا شروع کیا "دیکھو مائی، پتی کو بس میں کرنے کے لئے چار چیزیں ہیں۔ بیوقوف آدمی کہیں گے، جڑی بوٹی کھلاؤ، گولیاں دو۔ لیکن اس بارے میں یہ کہاوت سچی ہے کہ مرد کو جڑی بوٹیاں کھلاؤ اور ادھ موا کر دو۔

ان واہیات باتوں کو نہ سنو۔ اس سے بہتر مائی، کبھی کبھی کوئی لذیذ چیز پکا کر اپنے پتی کو کھلایا کرو۔ اچھے کپڑے پہنو۔ ہمیشہ مسکراتی رہو، ان کے سامنے ادا سے چلو پھرو گھر میں ضرورت کی چیزیں ایک ہی وقت منگا لیا کرو۔ یہ چاہئے وہ چاہئے سو بار نہ پوچھتی رہو۔ آج ایک پائی، کل ایک پائی کر کے کچھ نہ کچھ بچا رکھو۔ جب تمہارے

ں کو ضرورت پڑے تو اس میں سے کچھ دیا کرو۔ یہی مائی سب سے بہتر جڑی
ٹی ہے۔ اگر گھر والی ان باتوں کا خیال رکھے تو وہ گھر کے کتے کی طرح رہے گا۔
یں تو گلی کے کتوں کی طرح مارا مارا پھریگا۔" مجھے منگتاں کی عقلمندی کا بہت
ز ہُوا۔ پھر ہم نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ اور وہ چلی گئی۔

کوئی دو ہفتے بعد ایک دن منگتاں بہت اُداس نظر آتی تھی۔ "کیوں منگتاں
وں اتنی مایوس ہو؟" میں نے پوچھا۔ "آہ مائی! کیا کہوں مجھے کوئی نہیں پوچھتا۔"
اتھ ہی اس نے ایک گرتے ہوئے آنسو انگلی سے سنبھالا۔ میں گھبرا گئی۔ "کیوں منگتاں؟
ھ سے نہ کہو گی۔ تم پر کیا بیتی؟ کیا تمہارے بیٹے نے کچھ کہا؟" "ہاں مائی" منگتاں
لی "اس کی بیوی اپنے ننھے بچے کو مار رہی تھی۔ میں اسے یوں پٹتے دیکھ نہ سکی، سو
ں اس سے بولی "غریب بچے کو کیوں مار رہی ہے اے سنگدل عورت!" صرف
نی سی بات پر وہ مجھ پر برس پڑی، - وہ کوسنے دئے۔ میں نے ڈانٹا "ذرا سنبھل
بات کر۔ دیکھ کس کے سامنے بات کر رہی ہے۔ میں تیرے پتی کی ماں ہوں۔ اُسے
نے دے، سب کہدوں گی۔" پھر اس کا پتی آیا تو میں نے اس سے کہا "وہ بڑی بے رحمی
سے بچے کو مارتی ہے۔ میں کچھ کہوں تو مجھی پہ جھپٹ پڑتی ہے، ذرا نصیحت تو کر اسے"
و نے اسے بات تک نہ کرنے دیا" "وہ کیا نصیحت دیں گے مجھے۔ بچہ شرارت کرے تو
یا مجھے مارنے کا حق نہیں؟ کیا میں نے اسے نہیں جنا۔ جیسا تم نے میرے اس پتی
جنا ہے نصیحت وصیحت اسطرح کی فضول بکواس نہ کرو"۔ کیا بولوں مائی! تم
ا تو اس کے بعد کیا ہُوا۔ سب کچھ کہہ سننے کے بعد بھی میں تو صرف اس کی ماں ٹھہری،
ہ اس کی پتنی ہے۔ وہ اُسے ڈانٹے گا تو برابر کا جواب دے گی۔ لیکن مجھے

وہ بے دھڑک ڈانٹ سکتا ہے۔ بولا "ہاں ماں! وہ اپنے پیٹ کے بچے کو مارتی ہے تو تم کیوں دخل دیتی ہو۔ اگر کچھ کہنا ہو تو مجھ سے کہا کرو"۔ میں نے پوچھا "تو کیا میں غلطی پر تھی کہ اسے روکا؟" "صحیح یا غلط ماں، یہ دوسرا معاملہ ہے۔ مگر ایک عورت کو اختیار ہے کہ اپنے بچے کو مارے" میں صبر نہ کر سکی، مائی! چند الفاظ میرے منہ سے نکل گئے۔ "تو کیا کہہ رہا ہے لڑکے۔ تجھ پر تو جورو کا جادو چل گیا ہے۔ کیا تو تب بھی اسے چپ چھوڑیگا، چاہے وہ بچے کو مارے یا مجھے گالیاں دے۔ ہوں بات بہت بڑھ چلی ہے۔ اگر کل کا دن وہ مجھے گھر سے باہر نکالنے کے لئے کہے تو شاید تو وہ بھی کرنے کے لئے تیار ہے"۔ میرے بیٹے نے کہا "پھر کیا کروں ماں تم کہتی ہو، اگر وہ یہاں رہیگی تو تم نہیں رہ سکتیں۔ تم یہاں رہنا چاہتی ہو تو میری بیوی نہیں رہ سکتی۔ اس بے بس عورت کا کیا بنیگا، اگر میں اسے نکال دوں"۔ "تو کیا میں بے بس نہیں ہوں"؟ "نہیں ماں، تمہارے پاس روپیہ ہے، گائے بھینس ہیں۔ دہی بیچ لیتی ہو۔ اب تم میری روٹی کی محتاج نہیں ہو"۔ "لڑکے کیا تو مجھ سے الگ ہونے کے لئے کہہ رہا ہے"؟ "جیسی تمہاری مرضی ماں، تم الگ ہونا چاہتی ہو تو میں نہ نہ کہونگا۔ میں تمہارے جھگڑوں سے تنگ آگیا ہوں"۔ "اچھا اگر تو یہی چاہتا ہے تو آج کی دوپہر سے الگ رہوں گی۔ تو اور تیری جورو، میرے بنا چین سے رہو"۔ اور میں وہی لے کے چلی آئی مائی"! اپنی بپتا سنا کر منگتاں جی بھر کے روئی مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لئے ہمدردی کے چند الفاظ کہے۔ "ان باتوں پر زیادہ دھیان نہ دو، منگتاں سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا"۔ پھر میں نے دہی خریدا اور وہ چلی گئی۔

دوسرے دن وہ اتنی اداس نہیں تھی۔ مگر ہمیشہ کی طرح خوش بھی نہیں تھی،

لئے میں نے پوچھا' وہ پھر مل تو نہیں گئے؟" یہ کیسے ہو سکتا ہے مائی! وہ قطامہ بہو
پنے بیٹے سے ملنے دیگی"؟ میں جب ہی چپ کر لوئی" وہ میرے لئے ہانڈی برتن الگ کر
ی۔ اُس نے ایک بڑی سی ہانڈی میں راگی بھی نکال رکھی تھی' اور چھوٹی چھوٹی ہانڈیو
ں مرچ' سب کچھ تھوڑا تھوڑا نکال رکھا تھا۔ پتی پتنی دونوں کھانا کھا چکے تھے۔ وہ
بے پروائی سے بیٹھی تھی۔ ہم کیسے مل سکتے تھے مائی؟ میں نے گھر کے دوسرے حصہ میں
پکایا اور اکیلی ہی بیٹھ کر کھائی' میری ہی غلطی تھی کہ ایسا بولی۔ انہوں نے دیکھ کر
دوسرے سے کہا۔ "ہاں' یہی ٹھیک ہے' بیاہ کے بعد بیٹا بیٹا نہیں رہتا مائی: اس
نہیں چاہیئے تو میں کیوں اس پر بار بن کر پڑی رہوں۔ میں بولی' اچھا' اور اب
ہی رہا کروں گی۔ ہر روز جب میں گھر سے نکلتی تھی' تھوڑا سا دہی میرے پوتے کو دیتی
ھی' لیکن آج اس کی ماں اس سے پہلے ہی اسے کہیں بھیج چکی تھی۔ وہ ٹھان چکی ہے
بچے" کی صورت بھی نہ دیکھوں" مجھے بہت حیرت ہوی کہ اتنی چھوٹی سی بات یوں بھر
مگر میں اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ میں اس کے ساتھ دوسری باتیں کرتی رہا
سے بھیج دیا۔

دو تین دن تک گھر کی بات نہ اٹھی۔ مگر منگماں کے برتاؤ سے مجھے معلوم ہو گیا
ابھی تک الگ ہی بسر کر رہی ہے۔ تیسرے یا چوتھے دن منگماں پوچھنے لگی" مائی بیٹے
نے پہنا ہے کتنے میں گز آئیگا"؟ کیوں کسے چاہیئے منگماں؟ میں نے پوچھا' دیکھیے
میں نے آج تک پائی پائی جوڑ رکھی' اپنے بیٹے اور پوتے کے لئے۔ اب کیوں نہ خرچ
ں۔ میں بھی اسی طرح کا مخملیں کرتا پہنے پھروں گی"۔ میں نے اسے بتایا کہ ایسا کپڑا سات
روپیہ میں ملیگا۔ اسی دن منگماں نے وہ کپڑا خریدا اور درزی کو دے آئی۔ دوسر

دن جب وہ گاؤں کو واپس لوٹ رہی تھی، میں نے اسے مخملی جاکٹ پہنے ہوئے دیکھا۔ "دیکھو ماں! میں کیسی بھلی لگتی ہوں۔ جب میرا پتی زندہ تھا میں نے کبھی قیمتی ساری نہیں پہنی، وہ ایک دوسری عورت کے پاس گیا جو مجھ سے اچھا پہنا کرتی تھی۔ میں نے اس بیٹے کے لئے پائی پائی جوڑ رکھی اور پتی کو کھو لیا۔ اب یہی بیٹا میرے ہاتھوں سے نکل گیا ہے، اور اب دیکھو میری طرف نیا بناؤ سنگار کئے کیسی خوب صورت لگ رہی ہوں۔" مجھے احساس ہوا کہ بیٹے کی جدائی کا منگماں کے دماغ پر اثر پڑا ہے۔ زیادہ غصہ یا رنج آدمی کو پاگل سا بنا دیتا ہے۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ اس جاکٹ کی وجہ سے اس نے دوسروں سے بھی لڑائی مول لی۔ کہتے ہیں اس کے گاؤں کا ایک لڑکا شہر میں پڑھا کرتا ہے۔ تہذیب ہے۔ جیسا کہ پڑھے لکھے لوگ پہنتے ہیں، وہ بھی فرنگیوں کی طرح کالر اور ٹائی پہنا کرتا ہے، اُس نے منگماں کو دیکھا تو کہہ اٹھا۔ "او منگماں! تم تو فیشن ایبل بن گئی ہو، مخملی جاکٹ پہن کے!" "کیا ہے چھوکرے" منگماں ڈانٹ کر بولی۔ "تو ادب قاعدہ بھول رہا ہے۔ تو کیوں یہ چیز گردن میں پہنے ہوئے ہے۔ میری خواہش ہے تو میں کیوں نہ ایسی جاکٹ پہنوں۔" یونہی ان میں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں طرف سے باتیں چلنے لگیں۔ لوگ سُن کر ہنسنے لگے۔ اس واقعہ نے منگماں کو بہت چڑچڑا کر دیا تھا۔ دوسرے دن منگماں نے مجھے یہ سب قصّہ سُنایا۔ اسکی بہو بھی بہت کچھ کہتی تھی زور زور سے تاکہ منگماں کو یہ سُن کر دکھ پہنچے۔ "میری بوڑھی ساس کو دیکھو" وہ کہتی "جب ہم ساتھ رہتے تھے اس نے ایک سستی چولی تک نہ دی، اب الگ ہونے کے بعد دیکھو مخمل کی جاکٹ پہنے پھر رہی ہے۔"

منگماں اپنی بہو کے پہننے اوڑھنے کے بارے میں اتنی بے پرواہ نہیں تھی۔ وہ جب بہو کو گھر لائی تھی، اس نے اسے کرن پھول، پونچیاں، مالا، کمر پٹی، سر کے گہنے اور دوسری

دی تھیں جنہیں اس نے پہنے بغیر برسوں سے رکھ چھوڑا تھا۔ شادی کے بعد
ال وہ اپنی بہو کے لئے کوئی چھوٹا موٹا زیور بنا دیا کرتی تھی۔ مگر بہو تو یہ سب
ل گئی تھی اِسے تو صرف مخملی جاکٹ کی لگی تھی۔ غریب بڑھیا یہ طعنہ ایک دو دفعہ
چُپ ہو رہی، مگر جب بہو بار بار یہی بات دُہراتی رہی تو وہ صبر نہ کر سکی۔ اسی
نے بیٹے سے بولی، "تیری جورو طعنے دیتی پھر رہی ہے کہ میں نے اسے ایک چولی
بن دی، جس وقت ہم ساتھ رہتے تھے کیا میں نے اسے کچھ بھی نہیں دیا؟ کیا
، پونچیاں، کرن کمرپٹی اور دوسرے زیور نہیں دئے"؟ بیٹے کے منہ کھولنے سے
۔ بول اٹھی"۔ اگر ایک وِدوا عورت جس کا پتی مر چکا ہے کرن پھول اور مالا
اہتی ہے تو شوق سے پہنے، مجھے نہیں چاہیئے اس کا مال"۔ اسکے مرد نے ڈانٹا
ہ رہی ہے بہت بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی ہے" پھر اس نے ماں سے کہا "اماں
ارے روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آگیا ہوں۔ تم جو چاہتی ہو کرو۔ اگر
رن، کمر بند، اور گہنے چاہئیں تو لے لو"۔ منگاں نے مجھ سے کہا۔ "دیکھا مائی
پنی جورو سے اتنا بھی نہیں کہہ سکا کہ ہر کسی سے میرے بارے میں ایسی باتیں نہ
ہرے۔ لیکن مجھے وہ یہاں تک کہنے پر تیار ہو گیا کہ گہنے واپس لے لوں۔ اس
ی کو سُدھارنے کی بجائے غلطی میرے سر تھوپ دی۔ بیوی کو کچھ نہ کہا۔ اِس
ہیں کس لئے جئوں مائی"؟

مجھے منگاں کا حال سن کر بہت رنج ہوتا تھا۔ غریب بوڑھی بے بس تھی۔ اسکا
ہی بیٹا تھا۔ اسکی بہوئیں اپنے پتی اور ساس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرتی
ذرا ذراسی بات پر یہ غلط فہمیاں کیوں؟ صرف اس بات پر کہ بڑھیا نے

بیٹے کو پوتے کو مارنے سے روکا۔ لوگ کیوں ایسا برتاؤ کرتے ہیں؟ میں نے اپنے
آپ سے پوچھا۔ پھر مجھے خود احساس ہوا کہ جھگڑے اسی طرح اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔
جب دو آدمی ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں تو ذرا سی چنگاری سے شعلہ بھڑک اُٹھتا
ہے۔ جھگڑا بڑھتے بڑھتے بہت دُور تک پہنچ جاتا ہے۔ کوئی بات ہی نہیں ہوتی، پھر
بھی سب کو دُکھ اُٹھانا پڑتا ہے۔

چند دنوں بعد منگتاں مجھ سے کہنے لگی، مائی تم بڑی اچھی ہو۔ میرے پاس
کچھ روپیہ پیسہ ہے۔ [illegible] دوگی۔ یہ روپیہ کوئی ایسی جگہ جسے بنک کہتے ہیں جمع
کرا دو۔ گاؤں میں آدمی میرے روپیہ پر نگہ ڈالنے لگے ہیں۔"

میں نے پوچھا وہ کیوں ایسا کہہ رہی ہے؟ دیکھو مائی، ہمارے گاؤں میں ایک
ہے رنگیا۔ وہ اور دُوسرے لوگ جوّا کھیلتے ہیں اور لڑتے ہیں۔ کل جب میں دَہی لئے
آ رہی تھی۔ وہ مجھے راستہ میں ملا کہنے لگا "کیسی ہو منگتاں؟ خوش تو ہو"؟ میں بولی
"تجھے کس بات کی خوشی ہے رنگیا جو تم سے چھپی ہوئی ہے"؟ "سچ کہتی ہو" اس نے کہا۔
"اس زمانہ میں لوگ جیسا برتاؤ کرتے ہیں اس سے خوشی کی کیا اُمید؟ جوان چھوکرے
بڑوں کا ادب بھول بیٹھے ہیں۔ ہم بوڑھے دُکھ اُٹھانے اور صبر کرنے کے سوائے کیا کر سکتے
ہیں۔ نہ جانے دنیا کو کیا ہو گیا ہے" ہم کچھ دیر تک ساتھ چلتے رہے۔ راستہ میں ایک جگہ
درختوں کا جھنڈ اور ایک کنواں ہے سنسان سی جگہ ہے۔ میں ڈر رہی تھی کہ یہ آدمی
وہاں [illegible] اس لئے کہ اس تھیلی میں میرے [illegible] روپیہ تھا۔ ہم جب
اس جگہ پہنچے [illegible] نے مجھ سے جو [illegible] چھڑا دیا اور وہ لے کر چلا
گیا۔ آج پھر وہ [illegible] ملا۔ اور اس جھنڈ تک میرے ساتھ باتیں کرتا ہوا آیا اور بولا

"منگتاں مجھے کچھ روپیہ چاہئے۔ تم مجھے اُدھار دوگی؟ راگی کی فصل کٹتے ہی میں تمہارا روپیہ ادا کردوں گا۔" بھائی۔ میرے پاس روپیہ کہاں ہے کہ تمہیں اُدھار دوں"؟ کیا میں نہیں جانتا منگتاں؟ ایک جگہ روپیہ گاڑ رکھنے سے تمہیں کیا ملیگا۔ مجھے اُدھار دوگی تو میرا کام بھی چل جائے گا' اور تمہیں بھی کچھ سُود ملیگا۔" ایک لمحہ بعد وہ کہتا ہے" اگر تم اپنے بیٹے کے ساتھ رہتیں تو میں تم سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ بہو کو چھوٹا موٹا گہنا بنانے کے لئے تمہیں اس روپیہ کی ضرورت ہوتی' مگر اب تو یہ بوجھ بھی اُتر گیا ہے' اس لئے پوچھ رہا ہوں"۔ دیکھو مائی" منگتاں نے کہا۔" اکیلی دکیلی عورت پر کس طرح ہر کوئی نگاہ ڈالتا ہے'۔ میں نے منگتاں کو تسلی دی کہ میں اپنے پتی سے پوچھونگی کہ ہم اس کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ اس دن مجھے اپنے شوہر سے یہ بات کہنے کا موقع نہ ملا۔

دوسرے دن جب وہ دَہی دے چکی' اس نے روپیوں کی تھیلی نکالی اور کہا" یہ اندر لیجاکے دیکھو مائی' گن کے دیکھو کتنا روپیہ ہے"۔ میں نے کہا میں نے ابھی تک اِس بارے میں پتی سے بات نہیں کی ہے' وہ روپیہ کسی اور دن لائیے'۔" اوہ! نہیں مائی' میں یہ روپیہ ساتھ لئے پھرنے سے ڈرتی ہوں۔ آج بھی یہ رنگسیا مجھے راستہ میں ملا جب ہم اسی جھنڈ کے پاس پہنچے تو وہ ایک پتھر پہ بیٹھ گیا۔ اور مجھ سے بھی بیٹھنے کے لئے کہا۔" ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ کچھ دیر تو بیٹھو"۔ اور میرے پاس یہ روپیہ تھا۔ میرا دل دَھک دَھک کرنے لگا۔ اگر میں انکار کرکے چلدیتی' اور وہ مجھے زبردستی روک لیتا' تو میں کیا کر سکتی تھی' اس لئے بیٹھ گئی۔ پہلے اُس نے میرے گھر کی باتیں کیں۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا" تم کتنی حسین ہو"؟ سنتی ہو مائی! جب میں خوب صورت اور جوان تھی' اس آدمی نے جو میرا پتی تھا میرا ہاتھ پکڑنا چھوڑ دیا۔

اس کے بعد کوئی بھی مجھے چھو نہ سکا۔ اب برسوں بعد آج یہ تو میرا ہاتھ پکڑتا ہے۔ میں ہاتھ چھڑا کر بولی یہ کیا ہے رنگیا، کیا میں اور تو عاشق و معشوق ہو بیٹھے ہیں کہ ایسی بات کہہ رہا ہے"۔ میں اٹھ کر جلدی جلدی چلی آئی۔ کل اس نے میرا روپیہ مانگا تھا آج مجھی کو مانگتا ہے۔ وہ جو میرے ساتھ شادی کی گدّی پہ بیٹھے تھے مدّت گزری دوسری دنیا کو سدھار گئے، وہ مجھے چھوتے نہ تھے گو جب میں راضی تھی اگر دوسری عورت ہوتی تو کہتی" اگر شوہر نہیں تو دوسرا عاشق ہی سہی" اور نہ جانے کیا کیا کھیل کھیلتی لیکن میں نے اپنی عزّت کا خیال کر کے اس بے پروائی کو سہہ لیا۔ اب جبکہ میری جوانی ڈھل چکی ہے اور بوڑھی ہو چکی ہوں یہ شہدا آکر میرا ہاتھ پکڑتا ہے۔ جیسے وہ میرے شوہر سے زیادہ ہے۔ جیسے میں اس کی منکوحہ بیوی ہوں"۔

مجھے محسوس ہوا منگتاں کی کہانی عجیب شکلیں اختیار کرتی جا رہی ہے۔

"منگتاں!" میں نے کہا۔ "تم کیوں یہ سب اپنے سر لے رہی ہو۔ کیوں نہیں بیٹے کے ہاں واپس چلی جاتیں"۔

"میں جانے کے لئے راضی ہوں مائی! مگر بہو مجھے آنے دیگی؟"

"تمہارے بیٹے کو اس رنگیّا کے بارے میں بتلا دو"۔

"اوہ! مائی! یہ کیسی شرم کی بات ہوگی۔ میری بہو سن پائے تو گلیوں میں چھینٹی پھیرگی۔ مجھے ذات باہر کروا کے چھوڑیگی۔ اب دیر ہو رہی ہے مائی۔ مجھے جانا چاہئے۔ اتنی دیا کرو کہ یہ روپیہ بنک میں رکھوا دو"۔ غریب عورت چلی گئی۔ ایک گھنٹہ میں وہ پھر واپس آئی۔

"مائی! آج ایک بات ہوگئی مائی! میں کیا کروں مائی! اب کیا کروں"۔

"کیا ہوا منگتاں؟" "دیکھو مائی! میں نے بچے کے لئے تھوڑی سی مٹھائی خریدی اور اسے ٹوکری پر رکھ لیا۔" چونکہ منگتاں نے کہا تھا بہو بچے کو اس کے پاس آنے نہیں دیتی۔ میں اس کی بات سمجھ نہ سکی۔ میں نے پوچھا "تم تو کہہ رہی تھیں منگتاں! کہ بچہ تمہارے پاس نہیں آتا۔ پھر مٹھائی کیوں خریدی تم نے؟" "وہ کچھ دن کی بات تھی مائی۔" اگر اس کی ماں اسے میرے پاس بھیجنا نہیں چاہتی تو کیا بچہ میرا دامن چھوڑ دیگا؟ وہ میرے پاس آتا ہے مائی۔ ماں کی آنکھ بچا کر۔ میں اسے دودھ دیتی ہوں۔ وہ پی کر دہی پوچھتا ہے۔ وہ بھی دیتی ہوں تو خوشی سے ناچ اٹھتا ہے۔ جب زیادہ شور کرنے لگتا ہے تو میں ڈراتی ہوں "تمہاری ماں سن لیگی"۔ تم باور کرو گی مائی، وہ معاً چپ ہو جاتا ہے۔ بچوں کا کھیل کیسا پیارا لگتا ہے مائی! سو آج میں نے اس کے لئے مٹھائی خریدی اور ٹوکری پر رکھی۔ یہ شنکر پور کا نام تم نے سنا ہوگا، وہیں سے گزر رہی تھی۔ ایک کوا آم کی ڈالی پر سے اڑ کر میرے سر پہ آبیٹھا اور مٹھائی کی پڑیا اٹھا لے گیا۔ ہائے اب کیا کروں۔"

"ذرا سی مٹھائی کے لئے کیوں افسوس کر رہی ہو منگتاں، دوسری خرید لو۔"

"یہ بات نہیں مائی۔" لوگ کہتے ہیں کوا آدمی کے جسم سے نہیں چھونا چاہئے۔ اسی لئے پریشان ہوں"۔ کوے کے چھونے سے بھلا کیا ہوگا؟ میں نے پوچھا۔

"کہتے ہیں موت کی نشانی ہے"۔ منگتاں نے جواب دیا۔ مجھے خوف ہوتا ہے کہ میرے دن ختم ہو چکے ہیں۔ میں دل میں یہی کہتی ہوں کہ مر جاؤں تو بہتر ہے۔ کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ میں جیوں۔ میں ایشور کے چرنوں میں پڑی رہوں تو اس میں کیا برائی ہے۔" کیسی بے تکی باتیں کر رہی ہو منگتاں۔ تم خود سر پہ مٹھائی رکھ لیتی ہو اور راستہ سے

گذر رہی ہو تاکہ کوئی کوا دیکھ پائے۔ جب کوا بڑیا اٹھا لیجاتا ہے تو کہتی ہو میرے دن کم ہو گئے۔ ایسے بیہودہ خیالوں میں وقت نہ گنواؤ۔ جا کے اپنے پوتے کے ساتھ جی بہلاؤ۔" "تو کوئی ڈرنے کی بات نہیں مائی؟" بالکل نہیں۔ اب کوّے اور مٹھائی کو بھول جاؤ۔ ہنستی ہوئی اپنے گھر کی راہ لو۔"

منگماں اپنے گاؤں چلی گئی۔ میں اس غریب بیچاری کے خیالات کا اندازہ لگانے بیٹھی رہی۔ یہ غریب عورت جو کبھی اپنے بیٹے سے محبت کرتی تھی، کبھی بہو سے کبھی پوتے سے۔ مگر سب سے بڑھکر اس کے دل میں یہ خواہش تھی کہ وہ اسے مالکن سمجھیں۔ اس کا احترام کریں۔ سبھی کو اقتدار سے محبت ہوتی ہے۔ سبھی زندگی سے محبت کرتے ہیں۔ آدمی زندگی سے بیزار ہو کر بھی مرنا نہیں چاہتے۔ لیکن بظاہر یہ جتاتے ہیں کہ وہ مرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ تو سیدھے سادھے بھولے بھالے دیہاتی ہیں، ان کے دماغ میں بھی کیسے تہ بہ تہ پردے ہیں۔ ایک پردہ دوسرے پردہ کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ یہ کیسا ڈرامہ ہے؟

جب منگماں پھر آئی۔ وہ اپنی اس نئی زندگی کے اور قصّے سنانے لگی۔ کہ اس کے پوتے نے آج ماں باپ کے پاس جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اپنی دادی کے پاس ہی رہا۔ دادی منگماں اس دن بے حد خوش تھی۔ اس چھوٹے سے چھوکرے کی ہمت تو دیکھو" وہ بولی۔ دیکھنے کو صرف دو بالشت ہے مائی! کیا کوئی دوسرا بچہ اسقدر ڈھیٹ بنا اپنی ماں کو چھوڑ سکتا تھا۔ وہ کل دوپہر کو میرے پاس آیا۔ جب شام تک بھی نہ گیا تو اس کی ماں ڈانٹنے لگی۔ "اچھا گھر آ تو ایسا پیٹونگی" پھر بھی اس نے دلیری سے انکار کر دیا۔ اور میرے پاؤں سے چمٹا رہا۔ میں نے کتنی بار

اس سے کہا کہ اپنی ماں کے پاس جائے۔ اس کے باپ نے بھی آکر آواز دی مگر چھوکرا گیا نہیں۔ وہ دن بھر میرے ساتھ رہا۔ میں دس دن سے گھر میں اکیلی سویا کرتی تھی۔ مجھے ڈر سا لگتا تھا۔ اس ذرا سے لونڈے کے پاس سونے سے مجھے ہمت ہوی۔ کچھ بھی ہو، اماں، گھر میں مرد ہو تو ہمت بندھتی ہے۔ پرماتما کی دیا دیکھو مائی، اتنا چھوٹا لڑکا میرے ساتھ رہنے پر ڈٹ گیا۔ میرا بیٹا جیسے میں نے پال پوس کر بڑا کیا۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اب دیکھو تو یہ ذرا سا پوتا کہتا ہے "ڈرو نہیں"۔ وہ میری بہو رات بھر جھگڑا لے بیٹھی مگر چھوکرا اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ آج صبح جب یہاں آنے نکلی تو بول چال کر اسے اپنی ماں کے گھر چھوڑ آئی۔ وہ اندر چلا گیا۔ اور میں چلی آئی۔

"تم نے اچھا کیا منگا ماں" میں نے کہا "لیکن اگر اس کی ماں بچہ کو مارے تو؟"

"نہیں مائی" وہ کیوں مارگی۔ وہ خوش ہو گی کہ ایکدن کے لئے تو بچہ گھر آیا ہے۔ جب تمہارا بچہ ہمیشہ پیچھے لگا رہے تو کبھی کبھی مار بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اسوقت نہیں جب کبھی کبھی بچہ تمہارے پاس آئے تو۔ اب میری ہی مثال لو، جب بہو میرے ساتھ رہتی تھی میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ وہ خوبصورت ہے۔ اب دور سے دیکھتی ہوں تو وہ مجھے بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی بھوئیں سکیڑ لیتی ہے تو کچھ عجب سی نظر آتی ہے، مگر دوسرے وقت کیسی صورت، کیسی ادا، اب مجھے جان پڑا کیوں میرا بیٹا اس کا غلام ہو گیا ہے۔ بیٹے کی بات بھی یونہی ہے۔ جب میں اس گھر میں تھی، تب اس کے آنے جانے کا خیال نہ کرتی تھی۔ جب اس سے الگ ہوں تو باہر دیوڑھی میں بیٹھی پریشان ہوتی رہتی ہوں۔ وہ ابھی تک گھر کیوں نہیں لوٹا۔ وہ کھیتوں کو اتنا جلد کیوں چلا

گیا۔ بہو کا بھی یہی حال ہے۔ اگر وہ آج بچے کو مارے گی تو شاید کل وہ اس کے گھر نہیں جائے گا۔ میں اسے لے آؤں تو بہو چند گھنٹے بھی بچہ کے ساتھ نہ گذار سکیگی۔ اس نے مہینوں اسے پیٹ میں رکھا ہے۔ درد سہے ہیں۔ کیا وہ بچہ کو گنوا لیگی"۔

میں تعجب سے منگتاں کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے کتنی دور کی سمجھ تھی! مجھے خیال ہوا شاید جھگڑا ختم ہو جائے گا اور ماں بیٹا اور بہو مل جائینگے۔ ایسا ہی ہوا۔ دو دن تک بچہ صبح کو ماں کے گھر چلا جاتا تھا لیکن تیسرے دن اپنی دادی کے ساتھ شہر جانے ضد کرنے لگا۔ اسے ساتھ لانا بڑھیا کے لئے مشکل تھا۔ اس نے بچہ کو سمجھایا کہ ماں کے پاس رہے۔ پھر بھی وہ ضد کرتا رہا۔ اتنے میں اس کا بیٹا اور بہو آکر التجا کرنے لگے "ہم بیوقوفی میں کچھ کر بیٹھیں تو تمہیں معاف نہیں کرنا چاہیئے؟" گاؤں کے چار آدمی بھی آکر یہی بولنے لگے۔

اور منگتاں اپنے بہو بیٹے کے ساتھ رہنے لگی۔ مگر اس کا پوتا اپنی ضد پہ اڑا رہا کہ وہ اپنی دادی کے ساتھ شہر جائے گا۔ اب تک دہی بیچنے کا کام منگتاں نے اپنے ہاتھوں میں رکھا تھا۔ بہو کے آنے کے بعد بھی۔ بظاہر سب یہ تھا کہ بہو گھر کی مالکن ہے۔ گھر میں اسکا حکم چلیگا۔ ساس باہر پھرا کریگی۔ لیکن اصل میں وہ اس لئے دہی بیچنے جاتی تھی کہ گھر بیٹھے اس کا جی اکتاتا تھا۔ اور کچھ پیسہ ٹکے کا لین دین بھی کر سکتی تھی۔ جب اس کا پوتا دادی کے ساتھ جانے کے لئے ہٹ کرنے لگا تو بہو کہنے لگی۔ "تم دھوپ میں کیوں پھرتی ہو اماں۔ اس بڑھاپے میں! تم گھر میں مالکن بن کر رہو۔ میں شہر جاکر دہی بیچ آؤنگی"۔ منگتاں نے یہ بات مان لی۔ کبھی کبھی میں بھی لیجاؤنگی"۔

ایکدن ساس بہو دونوں ساتھ آئے۔ ایک نے دہی لئے رکھا تھا اور

دوسری کے گود میں بچّہ تھا۔ "مائی یہ میری بہو ہے۔ بڑی اچھی بہو ہے۔ اس نے مجھے پھر اپنے گھر بلا لیا ہے۔ اور اپنی بوڑھی ساس کو الگ پکا لینے کی زحمت سے بچا لیا ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ میں دُھوپ میں پھرا کروں۔ آج سے وہی تمہارے لئے دہی لایا کریگی"۔ میں نے دونوں سے ہمدردی کی باتیں کیں نصیحت کی کہ ہمیشہ آپس میں محبت سے رہا کریں اور انہیں پان سپیاری دے کر رخصت کیا۔ آجکل بہو ہمارے گھر دَہی لاتی ہے۔

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ساس کے نقطۂ نظر سے تھا۔ بہو کا کیا نظریہ ہوگا۔ ایکدن میں نے اس سے پوچھا۔ "ننجاں! تم ایسی سمجھدار معلوم ہوتی ہو، تم نے اس غریب عورت کو کیوں اپنے گھر سے نکالا؟" مائی ایسا نہ کہو مائی۔ کیا میں کوئی چڑیل ہوں کہ اپنی ساس کو گھر سے نکال باہر کروں۔ یہ میری ساس مجھے کچھ کرنے دیتی تھی؟ میری ہر چھوٹی سی بات میں ٹانگ اڑاتی تھی۔ میرے شوہر کو بھی گھر کے مرد کی طرح رہنے نہ دیتی تھی۔ وہ خود ہی مالک و مالکن تھی۔ اب تو یہ ٹھیک ہے لیکن جب وہ ہمیں چھوڑ جائیگی، تو میرے آدمی کو مالک بننے کا سلیقہ کیسے آئے گا۔ اگر ان میں مردانہ رعب نہ ہوگا تو میں کیسی بیوی ہونگی۔ مہینوں میں یہ سہتی رہی۔ یہ سوچکر کہ کچھ بھی ہو اسی نے میرے پتی کو جنا ہے، پالا پوسا ہے۔ اس لئے جب وہ گھر کی مالک بننا چاہتی تھی تو میں نے اسے نہیں روکا۔ مگر وہ اس سے بھی آگے بڑھ گئی۔ کہنے لگی مجھے میرے اپنے بچّے کو چھونے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ اگر میں اس پر بھی چپ رہوں تو میرے بہوپن میں بھی کیا رکھا ہے"۔ مگر تم یہ نہیں کہہ سکتیں ننجاں" میں نے کہا "کہ بچّے کو مارنا ہی اس پر حق جتانے کا ذریعہ ہے"۔ "اوہ مائی" مارنا یا لاڈ کرنا سب ایک ہی ہے۔ ایک

دن وہ مجھے بچہ کو مارنے پر روکتی ہے، تو دوسرے دن لاڈ کرنے پر بھی روکیگی۔ ساس کیا کچھ نہیں کرتی۔ اگر وہ مانے کہ بچہ میرا ہے تو وہ میرا ہے۔ اگر وہ میرے پتی کو اجازت دے کہ میرے ہو کر رہیں تو وہ میرے ہیں۔ کیا یوں بھی ہوگا؟ اگر وہ اس غریب بیچاری کو جو بہو بن کر آئی ہے اتنا بھی اختیار نہیں دیتی کہ وہ اپنے پتی سے کچھ نہ کہے یا بچے کو ایک مار نہ مارے، تو وہ کیسی بہو بنیگی"؟

جب منگتاں یہ قصہ سناتی تھی تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ منگتاں حق پر ہے، اور اب محسوس کرتی ہوں کہ نیجاں بھی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ "ہاں، تم جو کہہ رہی ہو وہ بھی ٹھیک ہے"۔ میں نے کہا۔ "تو اب تمہیں گھر میں کچھ اختیار ہے"؟ "ہاں مائی" نیجاں بولی" اس جھگڑے کے بعد سب سدھر گیا ہے۔ ہمیں کسی طرح سے بھی چلانا ہوگا مائی! اگر میں ساس کی باتیں نہ سہہ کر اس سے پھر لڑ پڑوں، تو کیا فائدہ ہوگا؟ کوئی اور اس کا روپیہ چھین لیگا۔ ہمارے گاؤں میں ایک ہے، رنگیلا۔ ان دنوں جب میری ساس الگ رہتی تھی وہ جا کر اس سے روپیہ ادھار مانگنے لگا، اور یہ راضی ہو گئی۔ جب رنگیلا نے یہ بات اپنے قرض خواہوں کو سنائی تو میں ڈر گئی۔ میں نے ننھے بچے سے کہا کہ اپنی دادی کے پاس جا کر رہے۔ وہ اسے مٹھائی اور دہی دیگی۔ میں نے اسے تاکید کی کہ جب تک میں نہ بلاؤں ہرگز واپس نہ آئے، یوں میں نے کچھ دن کے لئے بچہ کو اس کے پاس چھوڑ دیا، یہ سوچکر کہ شاید یوں ہم میں ملاپ ہو جائے"۔

"اوہ" میں نے کہا" تو بچہ آپ خود اپنی دادی کے پاس نہیں گیا"؟ "ہاں گیا تو مائی، لیکن میں نے اسے بھیجا"۔ کیا تم نے اپنے پتی کو یہ بات بتائی کہ تم نے

بچہ کو کیوں بھیجا؟" "نہیں مائی! "مردوں کو ایسی بات بتانے سے کیا حاصل؟ وہ ایسی باتوں کو سمجھ نہیں سکتے"۔

میں نے خیال کیا، رنجماں اپنی ساس سے کچھ کم سمجھدار نہیں۔ آج بھی ان کے گھر میں "بڑپن" کے لئے کشمکش جاری ہے۔ خصوصاً اس ایک آدمی پر حق جتانے کے لئے جو ایک کا بیٹا ہے، دوسری کا شوہر۔ ماں اس پر اپنا حق جتاتی ہے۔ بیوی اڑی بیٹھی ہے کہ وہ اس کے اختیار میں ہوگا۔ یہ جھگڑا سبھی گھروں میں جاری ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا، یہ کیسے ختم ہوگا۔ بہو اس مگرمچھ کے مانند ہے، جو پانی کے اندر بچہ کا پاؤں پکڑے ہوئے ہے، اور ساس اس ماں کی مانند ہے، جو بچے کے ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ رہی ہے۔ یہ بیچارہ شوہر ہی دونوں کے درمیان عجیب مصیبت میں ہے، ہر گھر میں یہی حالت ہے۔ گاؤں میں دہی بیچنے والی منگتاں کے گھر بھی یہی قصہ ہے۔ شہر میں دہی خریدنے والی رنگماں کے گھر بھی یہی قصہ ہے۔ شہر میں یا گاؤں میں ہر جگہ یہ ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے، جس کا کوئی آخری ایکٹ نہیں۔

آل احمد سرور

ٹیپو کی آواز

گو رات کی جبیں سے سیاہی نہ دُھل سکی
لیکن مرا چراغ برابر جلا کیا

جس سے دلوں میں اب بھی حرارت کی ہے نمود
برسوں مری لحد سے وہ شعلہ اٹھا کیا

پھیکا ہے جس کے سامنے عکسِ جمالِ یار
عزمِ جواں کو میں نے وہ غازہ عطا کیا

میرے لہو کی بوندیں رقصاں تھیں بجلیاں
خاکِ دکن کو میں نے فلک آشنا کیا

جس کو بھلا سکیں نہ کبھی شیخ و برہمن

ہندوستان کو وہ فرشا عطا کیا

ساحل کی آنکھ میں مگر آئی نہ کچھ نمی
دریا میں لاکھ تلاطم ہوا کیا

خوابِ گراں سے غنچوں کی آنکھیں نہ کھل سکیں
ایک شاخِ گل سے نغمہ برابر اٹھا کیا

یہ بزم ایسی سوئی کہ جاگی نہ آج تک
فطرت کا قافلہ ہے کہ آگے بڑھا کیا

مارا ہوا ہوں گرچہ بہت انتظار کا
مشتاق آج بھی ہوں پیامِ بہار کا

ممتاز شیریں

۱۹۴۳ء کے افسانے

۱۹۴۳ء میں اُردو افسانوی ادب نے گذشتہ دو سالوں کے مقابلہ میں کوئی ترقی نہیں کی اور نہ ہی شہ پارے پیش کئے۔ اِمسال ہمارے مشہور ترین ادیبوں میں سے اکثروں نے بہت کم لکھا یا کچھ لکھا ہی نہیں۔ سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، اشک، عسکری، اختر اورینوی، فیاض محمود، دہرم پرکاش آنند نے صرف ایک یا دو افسانوں پر اکتفا کی۔ رشید جہاں، احمد علی، اختر انصاری، اختر حسین رائے پوری، حیات اللہ انصاری اور عاشق حسین بٹالوی نے کچھ لکھا ہی نہیں۔ اس خاموشی کا ایک سبب شاید 'ساقی' اور 'نیا ادب' کا بند ہونا تھا۔ کیونکہ ان میں سے بعض 'ساقی' اور 'نیا ادب' کے مخصوص لکھنے والے تھے۔ لیکن دوسرے درجہ کے لکھنے والوں نے زیادہ سے زیادہ افسانے لکھے۔ 'ساقی' اور 'نیا ادب' جیسے اعلیٰ معیاری رسائل تو بند ہو گئے، لیکن بعض نئے رسائل ظہور میں آنے لگے۔ جن کا معیار اتنا اعلیٰ نہیں تھا۔ گو ان میں بھی کبھی کبھی بہت اچھی چیزیں شائع ہو جاتی تھیں۔ اس لئے معمولی فن کاروں کے افسانے بھی زیادہ تعداد میں شائع ہونے لگے۔ علاوہ ازیں ہمارے مشہور فن کاروں میں بھی — سوائے کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے — کسی نے ایسے افسانے پیش نہیں کئے جو ان کی پہلی تخلیقوں کے مقابلہ میں بلند پایہ کہلائے جا سکیں۔ بہ حیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۳ء کا افسانوی ادب اتنا شاندار نہیں۔

موضوع کے لحاظ سے ۱۹۴۳ء کے افسانوں میں بھی تنوع تھا۔ جنسیات

ر

محبت، نفسیاتی تجزیہ نگاری، بیکاری، بھوک، سرمایہ داری کا ظلم، استبداد، ان سب پر ہمارے ادیبوں نے خامہ فرسائی کی۔ "بیسوا" کو اس سال ادب میں بہت کم جگہ ملی۔ اس موضوع پر صرف تین افسانے لکھے گئے۔

"پہچان" (منٹو) "بیداری" (اختر اورینوی) "کسبی" (بلونت سنگھ)۔ یہاں تک کہ منٹو نے بھی اپنے اس 'فیوریٹ' کردار پر صرف ایک افسانہ لکھا۔ اقتضائے وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستانی ادیبوں کو جنگ کے بارے میں بھی لکھنا چاہئے تھا۔ جنگ اور اس کے اثرات افسانوں کے لئے بہترین مواد فراہم کر سکتے تھے، لیکن ہمارے لکھنے والوں نے وقت کا ساتھ نہ دیا۔ اور جنگ کے متعلق بالکل خاموش رہے۔ شاید اس لئے کہ ہر ہندوستانی ادیب کے دل میں شکوک و شبہات ہیں۔ ذہن میں الجھنیں ہیں۔ .. اس کے ہم وطن افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں تڑپ تڑپ کر جان دے رہے ہیں مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کے میدانوں میں ہندوستانی خون بہا ہے۔ اس خون کی قیمت؟ ہندوستانیوں کو اس کا کیا صلہ ملیگا؟ ان قربانیوں کے بعد بھی ہندوستان کی وہی حالت رہنے جواب ہے تو پھر اس جمہوریت اور فسطائیت میں کیا فرق ہے۔ اس سامراجی نظام میں تبدیلی نہیں ہوگی تو ہندوستانی اس فسطائیت کے خلاف جنگ میں کیوں دلچسپی لیں؟ کرشن چندر کہتے ہیں کہ انہیں شکوک اور شبہات نے ہندوستانی افسانہ نگاروں کی تخلیقی قوتوں کو جنگ کے بارے میں گنگ کر دیا ہے۔ یہی احساسِ کمتری پر ہندوستانی ادیب کے ذہن کو مفلوج کئے دیتا ہے۔ لیکن اس خاموشی کی وجہ یہ بھی ہے کہ سرزمینِ ہند ابھی جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں نہیں آئی۔ گو اس آگ کا ایک تیز بھبکہ آسام کی راہ سے اس کے دامن تک پہنچ چکا ہے۔ چند گنتی کے بم جو کلکتہ اور

بیا دو۔ مدراس کے ساحل پر گرائے گئے اس تباہی کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے، جو جنگ زدہ ملکوں پر چھا رہی ہے۔ ہندوستان جنگ کی زد سے ابھی تک محفوظ ہے۔ ی ہندوستانی ادیب جنگ کو اس شدت سے نہیں محسوس کر رہے ہیں -

صرف ہندوستان ہی کی بات نہیں۔ انگلستان، امریکہ اور یورپ کے اکثر ممالک میں بھی جنگی ادب قریب قریب ناپید ہے۔ جان لیہمن مرتب نیو رائٹنگ — NEW WRITING کہتے ہیں کہ انگلستان کے ادب پر جنگ کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ جنگ کے متعلق جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ ڈائریوں کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ اس میں افسانوی عنصر نہیں۔ چنانچہ پنگوئن رائٹنگ کا ایک خاص عنوان "The way we live now" "دی وے وی لیو ناؤ" ہے۔ اس عنوان کے تحت پرچٹ، ولی گولڈ مین، ہارڈن جیفری، ڈونلڈ سواسن، لوئی میک نیس اور کیت واگھن نے جنگ کے روزمرہ واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ صرف چین اور روس میں بہترین جنگی ادب پایا جاتا ہے۔ چین کی جنگ وطنی جنگ ہے۔ اور روس — جہاں جنگی افسانے اتنی بہتات سے لکھے جا رہے ہیں — روس میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ سٹالین گراڈ میں خون کی ندیاں بہی ہیں۔ روسی فاشی درندوں سے اپنے وطن کی ایک ایک انچ زمین کے لئے لڑ رہے ہیں وہ ایک انچ روسی خاک کے لئے اپنا خون کا آخری قطرہ بہانے کے لئے تیار ہیں۔ اس لئے کہ یہ ان کی اپنی جنگ ہے۔ فسطائیوں کے خلاف نفرت کی آگ ہر روسی دل میں بھڑک رہی ہے۔ وہ سچے دل سے اس جنگ میں حصہ لے رہا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ روسی ادیبوں نے جنگ کے متعلق شہ پارے پیش کئے ہیں۔ لیکن یہاں بھی ایسے افسانے بہتات سے لکھے جا رہے ہیں، جو فن کے اعلیٰ معیار

پر پورے نہیں اترتے۔ ان میں صرف پروپگنڈا ہی پروپگنڈا ہے۔ خصوصاً جو چھوٹے چھوٹے پمفلٹ مرتب ہو رہے ہیں، ان میں بہت سستا ادب پایا جاتا ہے۔ البتہ "Tales of The War" اور "Short Stories of the war" کے ناموں سے جو چھوٹی کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان میں بہترین ادب پایا جاتا ہے۔ روس میں جنگی افسانے لکھنے والوں کی فہرست میں چند ایسے روشن نام بھی ہیں جنہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ مائیکیل شالوخوف، الیا اہرنبرگ، اکزی ٹالسٹائی، ہیموناف، زوشخوف، کاٹیاف، وانداواسیلسکا۔ مائیکیل شالوغاف کا Hate "نفرت" وانداواسلیسکا کا "جھونپڑی" The Hut ہیموناف کا "His Only Son" "اسکا اکلوتا بیٹا"۔ اور کاٹیاف کا The Flag "جھنڈا" موجودہ ادب میں ہی نہیں، ہمیشہ کے لئے شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہندوستانی بھی اس بارے میں اتنے بے حس نہیں ہیں۔ ریڈیائی ڈرامے اور نظمیں لکھ کر عوام کو فسطائیوں کے خلاف ابھارا جا رہا ہے۔ بنگال سے ایک Periodical مجلہ S U نکل رہا ہے۔ اسمیں بہترین ادب اور بلند پایہ مقالے پیش ہوتے ہیں خصوصاً بنگالی نظمیں جنکا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے بہت ہی بلند پایہ نظمیں ہیں۔ اردو میں بھی فاشی درندگی پر اور روس اور چین کی جذبۂ وطن پرستی پر بہت سی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ اس قسم کا ادب پیش کرنے میں "نیا ادب" کا ادارہ پیش پیش ہے۔ انہوں نے حال ہی میں "زندہ روس" نامی کتاب مرتب کی ہے، جسمیں ایسی نظمیں، مقالات اور روسی افسانوں کے ترجمے درج ہیں۔ امسال کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے ادیب۔ رشید جہاں، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری نے اپنی تخلیقی قوتیں فاشی مخالف

جس کا ایک حصہ نیا ادب میں پیش ہوا تھا۔ ایک ادبی کارنامہ ہے۔ لیکن "نئی تصویریں" میں جو ڈرامے ہیں وہ کسی طرح سے بھی ادبی چیزیں نہیں کہلائے جا سکتے۔ لیکن یہ ریڈیائی ڈرامے ہیں اور عوام کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اسی لئے انہیں فن کارانہ انداز میں پیش نہیں کیا گیا۔

ہندوستان پر جنگ کا اثر صرف اشیاء کی گرانی کی صورت میں ہوا ہے۔ راشننگ سسٹم (راتب بندی) بھی غذائی مسئلہ کا ایک اہم جزو ہے۔ سب سے بھیانک نتیجہ بنگال کا قحط ہے۔ ہندوستان کی زمین سونا اگل رہی ہے۔ دھرتی کی ہری بھری کوکھ سے اناج کے ڈھیر پیدا ہو رہے ہیں، لیکن اس کے سپوت دانہ دانہ کو ترستے ہوئے بے بسی کے عالم میں دم توڑ رہے ہیں۔ ادب کے لئے یہ موضوع ہی کیا کم ہیں۔ اگر جنگ کے اثرات کو اس رخ سے دیکھا جائے تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ ہمارے چوٹی کے لکھنے والوں میں سے اکثر نے جنگ کے اثر کو قبول کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں جنگ کے اثر کے بارے میں کچھ نہ کچھ اشارے مل ہی جاتے ہیں لیکن سب سے زیادہ یہ اثر کرشن چندر میں پایا جاتا ہے۔ "بالکونی" میں انہوں نے جنگ کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ اور امسال "ان داتا" میں جو ادب لطیف کے سالنامے میں شائع ہوا ہے، انہوں نے بنگال کی زبوں حالی کی ہر پہلو سے تصویر کھینچی ہے مکمل تفصیل کے ساتھ۔ لیکن یہ تو سنہ ۱۹۴۴ء کی بات ہوئی۔ صرف ایک ہی ادیب جنہوں نے وقت کا ساتھ دیا اور جدید ترین موضوع پر افسانہ لکھا، وہ خواجہ احمد عباس ہیں۔ "ایک پائلی چاول" موضوع کے لحاظ سے جدید ترین کہانی ہے۔ یہ افسانہ انہوں نے اسی وقت لکھا جب راشننگ سسٹم نیا نیا رائج ہوا تھا۔ عباس نے موجودہ جنگ کے پس منظر میں ایک انگریزی ناول بھی لکھا ہے "*Tomorrow is Ours*"

لیکن یہ ناول کچھ پھسپھسا سا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں وہ گہرائی اور Poignancy نہیں جو جنگی ناولوں میں ہونی چاہیئے۔ ناول کے اس پھیکے پن کو احمد عباس کی زبان کی رنگینی بھی نہیں چھپا سکی۔ ہماری معاشرت کی سچی تصویر پیش کرنے میں یہ ناول دوسرے ہندوستانی ادیبوں کے انگریزی ناولوں سے — احمد علی کی "ٹوائی لائیٹ ان ڈلہی" راجہ راؤ کی "کانتاپورا" اور ملک راج آنند کے ناولوں سے کوسوں پیچھے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ احمد عباس کی ناول جذبات خیز ہے، رنگین ہے، بے حد دلچسپ ہے۔ اس کے باوجود اس جوہر سے خالی ہے جو اسے ادب میں مستقل درجہ دے سکے۔ لیکن صرف عباس ہی ایسے ادیب ہیں، جن کے دماغ نے اپنے ماحول کے اثر کو اسقدر جلد قبول کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ جرنلسٹ (صحافی) دماغ ہے۔ عباس کو اس ناول کے لئے زیادہ وقت لینا چاہیئے تھا۔ انہوں نے ناول کو بہت ہی جلد ختم کر لیا، ورنہ زبان پر اسقدر قدرت، یہ رنگین انداز بیان، اور اس بلا کی قوتِ اظہار اعجاز ہی نہ پیدا کر دیتے! احمد عباس نے "Tomorrow is Ours" میں جنگ کے بیشتر پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے۔ صرف ایک سرسری نظر۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ناول جنگ کے پسِ منظر میں لکھی گئی ہے۔ جسطرح میکسیم گارکی کی "مدر" "Mother" روسی انقلاب کے پسِ منظر میں یا راجہ راؤ کی "کانتاپورا" گاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی کے بیک گراؤنڈ میں لکھے گئے ہیں۔ یہ اسی وقت کہا جا سکتا تھا، جب موجودہ جنگ پوری ناول پر ایک سایہ کی طرح چھائی ہوتی۔ لیکن یہاں ایک سایہ، ایک بیک گراؤنڈ کی بجائے چند بکھرے ہوئے سیاہ ٹکڑے نظر آتے ہیں۔

؁۱۹۴۳ء میں سال بھر کے چھ بہترین افسانے ہیں۔ بالکونی، ٹریفیس، ننھی سی جان، مورا، ایک پائیلی چاول، کھلونے۔ اگر ان میں دس اور کا اضافہ کیا جائے تو۔

— نکڑ (کرشن چندر) لال دھرتی (دیوندر ستیارتھی) پہچان (منٹو) اُلجھن (احمد ندیم قاسمی) چاندی کے تار (مہندر ناتھ) ایک عورت (مدھوسودھن) بیداری (اختر اورینوی) سایہ (چندر کانت) تھکان (کوشلیا اشک) حماقتیں (شفیق الرحمٰن)

کرشن چندر نے بھی اس سال کے آغاز میں خاموشی اختیار کر لی تھی۔ لیکن جب سال کے وسط میں انہوں نے ادبی محفل میں قدم رکھا تو سب پہ چھا گئے۔ افسانہ، ڈرامہ، خاکہ، 'essay' ادب کے ہر شعبے کو ان کے قلم نے مزین کیا۔ 'گومتی کے کنارے' پڑھتے ہوئے ان کی طرز ادا پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ کرشن چندر افسانہ میں ہی نہیں خاکہ اور "essay" میں اتنی ہی دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں۔ 'گومتی کے کنارے' ایک خاکہ ہے لیکن افسانوں سے زیادہ دلچسپ۔ 'دشمن' ہلکی پھلکی سی چیز ہے۔ اس 'essay' میں بلا کا شستہ مزاح پایا جاتا ہے۔ 'Mild Humour' کی بہت اچھی مثال ہے۔

''ایک وحشی بمبئی میں'' یہ مضمون چند ماہ پہلے انگریزی میں "A Barbarian in Bombay" کے عنوان سے Bombay Chronicle میں شائع ہوا تھا۔ اردو میں قطع و برید اور کچھ اضافہ کے ساتھ "ساقی" میں شائع ہوا ہے۔ بہت دلچسپ essay ہے لیکن وہ انگریزی مضمون ہی زیادہ کامیاب تھا۔ اس کے انداز بیان میں زیادہ شگفتگی تھی۔ اردو میں کچھ پھیکا سا ہو کر رہ گیا ہے۔ کرشن چندر کی شگفتہ essays پر حیرت ہوتی ہے۔ انہیں اس فن پر بھی کتنا عبور حاصل ہے! ان کے essays میں بھی خشکی نام کو نہیں ہوتی۔ لیکن 'ساقی' کے سالنامہ میں کرشن چندر نے 'مثبت و منفی' کے عنوان سے کیا لکھا ہے؟ اس کا تو مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا۔

شروع سے آخر تک کچھ بے تکی سی باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ بیدی نے بھی 'ثبت و منفی' لکھا ہے لیکن وہ تو ایک فسانہ ہے اور بہت اچھا افسانہ۔ کرشن چندر کا ایک ڈرامہ بھی 'ایشیا' میں شائع ہوا ہے۔ "بھکاری" یہ بھی کچھ معمولی سا ہے۔ موضوع اچھا ہے، لیکن نبھایا نہیں گیا۔ صرف یہی ایک ڈرامہ نہیں، ان کے ڈراموں کا مجموعہ 'دروازہ' پڑھ کر ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ کرشن چندر ڈرامہ نگاری میں، اشکؔ، منٹوؔ اور بیدیؔ سے پیچھے ہیں۔ . . . . لیکن امسال اس ساحرانہ فن کار کا کمال اس کے افسانے ہیں۔ مقدس۔ نکڑ۔ بالکونی۔

تکنیک کے لحاظ سے نکڑ اردو میں ایک نئی چیز ہے۔ پانچ الگ الگ تاثرات ایک مرکز پہ جمع کئے گئے ہیں۔ وہ مرکز 'نکڑ' ہے اور مرکزی خیال وہ عجیب سی اجنبیت۔ وہ "پہلی بار دیکھنے" کا احساس۔ پہلی دو تمثیلیں اور چوتھی تمثیل نہایت کامیاب ہیں۔ لیکن تیسری اور پانچویں تمثیلوں میں (بھکارن اور زچّہ کے متعلق) پھیکا پن ہے۔ اگر وہ بھی دوسری تین تمثیلوں کے برابر ہوتیں یا صرف انہیں تین تمثیلوں پر افسانہ ختم ہو جاتا، تو 'نکڑ' بھی بلاشبہ اس سال کے شاہکاروں میں گنا جا سکتا۔ ان دو تمثیلوں نے اس کے مجموعی اثر کو بگاڑ دیا ہے، ورنہ تخیل کی نزاکت، خیالات کے اچھوتے پن اور زبان کی رنگینی کے لحاظ سے تو 'نکڑ' کو 'بالکونی' پر بھی فوقیت ہے۔ یوں تو کرشن چندر کی زبان میں شہد کی سی شیرینی، قوس قزح کی سی رنگینی ہے ہی کشمیر کے دلدادہ کرشن چندر کی زبان میں کشمیر کا حسن ہے۔ لیکن 'نکڑ' میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا نہایت آبدار موتی ایک خوبصورت ڈزائن میں مرصّع ہیں۔ یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجئے۔

"لیکن میں نے تمہیں اس سے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا۔ اور دیکھا تو اس وقت جب،

تمہاری شادی ہوچکی تھی۔ اور تمہاری ناک میں ہیرے کی شبنمی بوند جگمگا رہی تھی، تمہارے سنولائے ہوئے چہرے پہ گلاب کی سی موہنی آگئی تھی۔ تمہیں اس سے پہلے میں نے کیوں نہیں دیکھا تھا۔ تمہاری آنکھوں کی اس کجلائی ہوئی سندرتا سے کیوں آگاہ نہیں ہوا تھا؟ تمہاری شخصیت کی لَے، تمہارے جسم کی غنائی لذت، تمہاری ذات کے بے قرار آہنگ سے کیوں بے خبر رہا تھا؟ اور دیکھا تو اس وقت کیوں دیکھا جب یہ لَے، یہ نغمہ، یہ آہنگ غیر کی زینتِ آغوش ہوچکا تھا۔ اور پھر تمہیں اسطرح دیکھ کر حیرت کا احساس کیوں ہوا، کیوں تمہارے داہنے نتھنے میں وہ شبنمی بوند اب تک لرز رہی ہے۔ تمہارے سانولے چہرے پہ گلاب کی حیا نسیم صبحگاہی کی طرح جھلک رہی ہے۔ کیوں تمہاری نگاہ کے لوچ نے، اس کی ملائمت نے، اس کے ریشمیں گداز ملبس نے ایک ایسا میٹھا مکمل مستقل تاثر پیدا کردیا ہے جو مٹائے سے نہیں مٹتا"۔

اسقدر نازک احساسات اور تاثرات کو اتنے موزوں الفاظ میں اس خوبی اور نزاکت سے بیان کرنا کچھ کرشن چندر ہی کا حق ہے۔ یہ تاثر ہی کتنا اچھوتا اور نازک ہے پھر اس میں مہین باریکیاں کرشن چندر نے ان سب باریکیوں کے لئے الفاظ کو ہیرے کی کنی کی طرح کتنی نفاست سے تراشا ہے! "سنولائے ہوئے چہرے پہ گلاب کی سی موہنی"۔ "آنکھوں کی کجلائی ہوئی سندرتا"۔ اس مخصوص حسن اور چمک کے لئے جو کہ نئی شادی شدہ لڑکی کے چہرے پہ اور آنکھوں میں نکھر آتی ہے جو شرم اور بے باکی [illegible] پیدا ہوتی ہے جس میں ایک کنواری دوشیزہ کے حسن کی معصومیت سے زیادہ رنگینی ہوتی ہے۔ کتنے موزوں الفاظ ہیں! "گلاب کی سی موہنی"۔ "آنکھوں کی کجلائی ہوئی سندرتا"۔

مقدس خاکہ اور افسانہ کا امتزاج معلوم ہوتا ہے۔ اسمیں صرف ایک ہی کردار پیش کیا گیا ہے۔ مقدس کردار نگاری کی ایک اچھی مثال ہے۔ شاید کرشن چندر کا یہ پہلا نفسیاتی تجزیہ ہے تاہم بہت کامیاب ہے۔ موضوع اچھا ہے۔ اس موضوع کے لئے افسانے میں بہت اچھے لوازمات ہیں۔ لیکن ان لوازمات کو اتنی اچھی طرح پیش نہیں کیا گیا۔ افسانہ کے نقطۂ عروج (climax) تک کردار کو آہستہ آہستہ develop کرنا چاہیئے تھا۔ اس slow development سے افسانہ زیادہ پُر اثر ہوتا۔ "مقدس" پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار بہت جلدی میں ہے اور جلدی میں سب کچھ کہہ جانا چاہتا ہے۔ اس تیز رفتاری کا باعث افسانہ میں suspense مفقود ہے۔ اسی slow development suspense Element نے عصمت چغتائی کے افسانہ "ننھی سی جان" کو اسقدر بلند کر دیا ہے۔ "ننھی سی جان" میں آہستہ سے کڑی سے کڑی جوڑی گئی ہے۔ لیکن "مقدس" میں گویا بہت سا بارود جمع کرکے اسے دیا سلائی دکھا دی گئی ہے اور نقطۂ عروج ایک دھماکے کی صورت میں فوراً بعد ہی نمودار ہو جاتا ہے۔

افسانہ کا اندازِ بیان قدرے پُر زور ہے اور رفتار بہت تیز ہے۔ خصوصًا یہ خیال کرتے ہوئے کہ کرشن چندر نے افسانے کا دَوران چار سال کا عرصہ دیا ہے۔ چار سال کے عرصہ میں کردار کی تبدیلیاں رفتہ رفتہ بیان کی جاسکتی تھیں۔ اس افسانہ کے لئے لطیف طنز موزوں تھا لیکن کرشن چندر نے طنز کو بہت نمایاں کر دیا ہے۔ آہستگی اور سادگی افسانے کو زیادہ پُر اثر بنا دیتی۔ شاید ممتاز مفتی اسی مواد کو زیادہ اچھی طرح ڈھال سکتے۔

کرشن چندر کا ایک اور افسانہ "حادثے" 'زمانہ' میں چھپا ہے۔ یہ کرشن چندر کے اسلوب سے ہٹی ہوئی چیز ہے۔ اچھا افسانہ ہے، لیکن کرشن چندر کے دوسرے افسانوں کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

بالکونی ۱۹۴۴ء کا شاہکار ہے۔ اگر گذشتہ سال سال بھر کا ایک منتخب افسانہ "کلیاں اور کانٹے" تھا تو اس سال کا بلاشبہ "بالکونی" ہے۔ 'بالکونی' پڑھتے ہوئے مجھے کرسٹوفر اشر وڈ کا مشہور طویل مختصر افسانہ ' The Nawaks. ' یاد آگیا۔ دی نووکس — جس کے متعلق پنگوین نیو رائٹنگ کے مرتب جان لیہمن نے لکھا ہے کہ یہ Post war Period کی بہترین شارٹ سٹوری ہے۔ اِشر وڈ کا نام انگریزی ادب میں طویل مختصر افسانہ سے اسی طرح وابستہ ہے، جسطرح اُردو میں عسکری اور کرشن چندر کا — Sally Bowls اور Nawaks. عالمگیر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ 'بالکونی' نووکس کے طرز کا افسانہ ہے۔ نووکس ایک بہت ہی غریب جرمن فیملی کی کہانی ہے مصنف باہر کا آدمی ہے، یعنے فیملی کا آدمی نہیں لیکن ان کے گھر ایک لاڈجر کی طرح رہتا ہے۔ اس نے فیملی کی زندگی کا مرقع پیش کیا ہے اور Nawaks فیملی کے مختلف افراد کے کردار کا خاکہ کھینچا ہے تفصیل کے ساتھ۔ کرشن چندر نے ایک کشمیری ہوٹل کی زندگی بیان کی ہے۔ اور وہاں کے مختلف افراد۔ لاڈجرس، مینجر، بیرے، بہشتی ان سب کے کردار بہت کامیابی کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ اور یہاں بھی افسانہ کا 'میں' (یہ بات افسانہ میں واضح نہیں کہ یہ 'میں' مصنف ہے۔ Nowaks میں 'میں' خود مصنف ہے (Herr Christoph) ہوٹل کا لاڈجر ہے۔ کرشن چندر نے ہوٹل کی زندگی کا

Cross Section پیش کیا ہے۔ اس فسانہ میں جنگ کے متعلق بہت سے اشارے ہیں۔ بالکونی میں کردارنگاری اور طنز کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "گالی اور بخشش بیرے کی زندگی کے محور ہیں۔ کبھی اسے پہلے گالی ملتی ہے کبھی بخشش کبھی پہلے بخشش پھر گا ں، ہر حالت میں وہ خوش رہتا ہے۔ انگریزی سیاست کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے بیروں سے ہندوستانی قوم کا اندازہ کرتے ہیں۔ وہ ہندوستانی قوم سے بیروں کا سا سلوک کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہندوستانی بھی ان سے ان کے بیروں کی طرح خوش رہیں۔ اب ان ہندوستانیوں کی کورذوقی کو کیا کیا جائے کہ وہ کسی حالت میں بھی مطمئن نہیں نظر آتے۔ وہ نہ گالی پسند کرتے ہیں نہ بخشش"۔

ایک اور جگہ —— ہوٹل کا مالک مسلمان منیجر پر نگاہ رکھنے کے لئے ایک سکھ کو ملازم رکھتا ہے "پاکستان اور خالصتان ایک دوسرے سے قریب رہتے ہوئے ایک دوسرے سے خائف ہونے لگے"۔ ہوٹل کا بوڑھا بہشتی عبداللہ مرا پڑا ہے لیکن منیجر کو اس کی خبر نہیں، وہ کہیں دور سے پکارتا ہے "عبداللہ! ابے سور کے بچے۔ میجر صاحب پانی مانگ رہے ہیں"۔ کرشن چندر لکھتے ہیں "بول بول، ابے سور کے بچے، سپید سپید پتلیوں والے غلیظ بڈھے، گنجی چاند والے، کھردرے ہاتھ والے، نیم برہنہ، فاقہ مست انسان بول! کیا مرکر بھی تجھے گالی کا جواب دینا نہ آئے گا؟"

جی چاہتا ہے کہ کردارنگاری کی بھی کچھ مثالیں پیش کروں۔ لیکن طوالت کا خوف ہے۔ صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ ان سب خاکوں میں بیروں، ہوٹل کے بہشتی عبداللہ، اوبرائن اور میریا کی کردارنگاری بہت اچھی طرح کی گئی ہے۔ بیرے — جن کی

زندگی کے محور گالی اور بخشش ہیں ۔ بوڑھا بہشتی — جو اتنی مصیبتیں جھیل کر بھی زندگی سے چمٹا ہوا ہے امید کا ٹمٹماتا دیا لیے ۔ "ہوٹل کا فلسفی" اور برائن جو اپنی زندگی کے غم شراب میں گھولتا ہے ۔ اور میریا ۔ معصوم لڑکی جس سے زندگی کے تلخ تجربوں نے ساری شوخی چھین کر اسے اسی کم سنی میں قبل از وقت سنجیدہ بنا دیا ہے ۔

آل احمد سرور نے "تنقیدی اشارے" میں لکھا ہے "احمد علی کے شعلے پڑھئے، آپ کو افسانہ کی جگہ منتشر تاثرات نظر آئیں گے ۔" بالکونی میں منتشر تاثرات ہی تو ہیں ۔ لیکن پھر بھی یہ ۱۹۴۳ کا بہترین افسانہ ہے ۔ کرشن چندر نے منتشر تاثرات کو خوبی اور نزاکت سے جمع کیا ہے ۔ یہ بھی افسانے کی ایک نئی تکنیک ہے ۔ اردو میں نئی نئی ہیئتیں ایجاد کرنے کا سہرا کرشن چندر کے سر ہے ۔ کنہیا لال کپور کہتے ہیں کہ کرشن چندر نے اردو میں افسانہ کی ہیئت بدل دی ہے ۔ انہوں نے اپنے تازہ ترین افسانے "ان داتا" کو بالکل ہی نئی تکنیک میں ڈھالا ہے ۔ کرشن چندر میں جتنا تنوع ہے اتنا شاید ہی اردو کے کسی اور فن کار میں ہے ۔ صرف نئی تکنیک ہی نہیں، نئے موضوع بھی ۔ وہ جدید سے جدید موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھ لیتے ہیں ۔ چنانچہ جنگ کا اثر بھی انہوں نے زیادہ قبول کیا ۔ بنگال کے قحط کے بارے میں انہیں کا قلم سب سے پہلے اٹھا ۔ کرشن چندر ہمارے ادیبوں میں جدید ترین ہیں ۔ محمد حسن عسکری نے چیخوف کی سکول مسٹرس کی طرز پر "حرامجادی" لکھ کر اردو میں ایک بہترین نئی تکنیک کی بنا ڈالی . . . .

. . . .

. . . . لیکن وہ اس تکنیک کی بنا ڈالنے کے بعد رک گئے ۔ کرشن چندر ایجاد کرتے ہی جا رہے ہیں ۔ اور مغربی ادب کا ساتھ دینے میں پیش پیش ہیں ۔

'بیدی' کا 'ٹرمنس' بھی ایک شاہکار ہے اور بلاشبہ سال کا دوسرا بہترین افسانہ ہے۔ یہ ایک نفسیاتی تخلیق ہے اور بیدی نے اسے نہایت فن کارانہ انداز سے نبھایا ہے۔ بیدی صحیح معنوں میں آرٹسٹ ہیں۔ ان کی کہانیوں میں افسانویت کا عنصر سب سے زیادہ موجود ہے۔ کرشن چندر افسانہ کو نئی نئی ہیئتیں دیتے ہیں۔ کبھی وہ افسانہ اور خاکہ کا امتزاج ہوتا ہے کبھی صرف ایک کیرکٹر کی کردار نگاری یا منتشر تاثرات بعض اوقات ان کے افسانے افسانے نہیں معلوم ہوتے، ان میں کہانی کا عنصر بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن بیدی کا جو افسانہ بھی لیجئے صحیح معنوں میں ایک مکمل افسانہ معلوم ہوتا ہے، خواہ کسی قسم کا موضوع ہو، وہ اسے بہترین متناسب سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں زبان کی الجھن کے باوجود اسقدر دلچسپی ہوتی ہے۔ کرشن چندر کے افسانے رنگین اور دلکش ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں کشمیر کی حسین پہاڑی چوٹیاں ہیں، سبز وادیاں ہیں، زمرّدیں لہلہاتی کھیتیاں ہیں، نیلی جھلملاتی ہوئی جھیلیں ہیں، شفاف تالاب ہیں جن میں شفق کے عکس کی رنگینی ہے۔ جن پر ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں مچل رہی ہوتی ہیں سمندر میں سورج کی کرنوں نے سنہری جال بُن رکھا ہے۔ اور اس میں کوئی جل پری طلائی مچھلی کی طرح تیرتی آتی ہے۔ لیکن بیدی کے افسانوں میں یہ کچھ بھی نہیں ہے، رومان کی رنگینی نہیں ہے۔ قدرتی مناظر کا حُسن نہیں ہے۔ وہ نچلے متوسط طبقے کی خشک زندگی سے اپنے افسانوں کے لئے مواد لیتا ہے۔ لیکن اسی خشک مواد سے وہ کتنی دلچسپ کہانیاں تخلیق کرتا ہے! "گالی" کتنا ثقیل اور خشک موضوع ہے، لیکن بیدی نے اسے اتنی لطافت سے اتنے فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے، اس میں اسقدر دلچسپی پیدا کر دی ہے کہ یہ ادب لطیف کے سالنامہ ۱۹۴۲

کا دلچسپ ترین افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ گو اس میں رومانوی افسانے بھی ہیں۔ دوسرا کوئی فن کار اس موضوع کو اتنی اچھی طرح نبھا نہیں سکتا تھا۔ صرف بیدی ہی اور بیدی ہی اس کو اس نزاکت اور خوبی سے اتنے جامع انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔ کرشن چندر کبھی کبھی جذبات کی رَو میں بہ جاتے ہیں۔ ان کے اونچ نیچ پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن بیدی کے افسانوں میں سطحِ سمندر کی سی ہمواری ہوتی ہے۔ بیدی کا مشاہدہ گہرا ہے۔ بیدی ہمیشہ calm رہتے ہیں ۔

بیدی نے امسال چار افسانے لکھے ہیں۔ مثبت و منفی، ٹرمینس، بد دعا، چھپکلیاں اور ایک ڈرامہ رخشندہ۔ مثبت و منفی اچھا افسانہ ہے۔ لیکن پھر بھی ہمیں احساس ہوتا ہے کہ موضوع سے انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ اتنے اچھے موضوع سے ایک بہت ہی کامیاب فسانہ بن سکتا تھا۔ "بد دعا" بہت کامیاب افسانہ ہے۔ نورے کا کردار کامیابی سے کھینچا گیا ہے۔ ہمیں باقر حسین سے اتفاق نہیں کہ نورے کا کردار کارٹون معلوم ہوتا ہے۔ افسانہ کا آخری رُخ تو بہت ہی اچھا ہے۔ "چھپکلیاں" اور "بالکونی" ہم آہنگ ہیں۔ 'چھپکلیاں' میں بھی بیدی نے ہوٹل میں کافی پینے والوں کے الگ الگ [illegible] کا کردار کھینچا ہے۔ لیکن 'بالکونی' کی طرح یہ لاڈجرس نہیں ہیں، صرف وقتی گاہک ہیں۔ تینوں افسانے اچھے ہیں۔ لیکن "ٹرمینس" تو واقعی ایک ماسٹر پیس ہے۔ حسنِ موضوع، حسنِ تخیل، حسنِ ادا، تینوں خوبیاں اس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ موضوع بہت ہی اچھا ہے، اور بیدی نے اسے تخیل کی مدد سے کہیں کا کہیں پہنچا دیا ہے۔ جے رام سفر کر رہا ہے۔ اس نے زندگی بہت دیکھی ہے، اور اب وہ اس زندگی سے بیزار ہے۔ گاڑی تیزی سے ٹرمینس (آخری سٹیشن) کی طرف لپکی جا رہی ہے۔ جے رام

بھی اپنی زندگی کی ٹرمینس پر جلد پہنچنا چاہتا ہے۔ اس کی زندگی تلخیوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن، ہاں، اس نے زندگی میں صرف ایک بار مسرت دیکھی تھی۔ اس کی جوانی میں ایک نوجوان لڑکی اسکی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ گاؤں واپس ہو رہا ہے لیکن وہاں اس کا کوئی نہیں، اسے کون پہچانیگا۔ اسے محسوس ہوتا ہے، کاش وہ بھی زندگی کا ٹرمینس (آخری سٹیشن) پالے۔ لیکن جب وہ دوسروں سے گفتگو کرتا ہے، اسے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لئے زندگی میں خوشی ہے۔ وہ انہیں اپنی ہی طرح مایوس دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ مایوس نہیں ہیں۔ کوئی اپنی نوکری اور پرموشن کا ذکر کرتا ہے۔ کوئی اپنی تجارت اور دَولت کا۔ پھر وہ خوبصورت نوجوان —— اسے احساس ہوتا ہے۔ نہیں، زندگی میں جوانی ہے، مسرت ہے، صرف اسی کے لئے یہ خوشی فنا ہو چکی ہے لیکن جلد ہی وہ چونکتا ہے۔ اسے بھی زندگی میں کبھی مسرت کی کرن نظر آئی تھی۔ وہ اس کرن کی طرف لپکتا ہے۔ ٹرمینس جیجا گاؤں سے لوٹ کر کرتارپور کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ کرتارپور —— جہاں ایک لڑکی اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ یہاں بیدی نے کتنا اچھا بچ دیا ہے! وہ زندگی سے بیزار ہے۔ اسی لئے ٹرمینس کی طرف لپکتا ہے۔ لیکن اس ایک مسرت کی یاد سے اسے زندگی معنی خیز معلوم ہونے لگتی ہے تو وہ پھر آخری منزل سے زندگی کی گھما گھمی کی طرف لوٹتا ہے۔

منٹو نے اس سال بہت کم لکھا۔ وہ زیادہ تر ’ساقی‘ میں لکھا کرتے تھے۔ ساقی کے بند ہونے پر انہوں نے اپنی رفتار میں کمی کر دی۔ اس سال انہوں نے صرف تین چیزیں لکھی ہیں۔ ترقی یافتہ قبرستان، غسلخانہ، پہچان، ترقی یافتہ قبرستان افسانہ نہیں humour ہے۔ طنز اور مزاح کے عنصر نے مضمون کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ غسلخانہ ایک نئی قسم کی چیز ہے۔ موضوع انوکھا ہے۔ افسانہ میں جدّت

ہے۔ لیکن منٹو کے کونسے افسانے میں جدت نہیں۔ موضوع میں جدت، اندازِ بیان میں جدت، تشبیہوں میں جدت۔ منٹو تو مجسم جدت ہے۔ 'پہچان' اس سال منٹو کا سب سے کامیاب افسانہ ہے۔ ان کے خاص موضوع 'بیسوا' پر۔ افسانہ کے اختتام پر منٹو نے کمال کر دیا ہے۔ لیکن منٹو نے اس سال کوئی اعلےٰ ادبی تخلیق پیش نہیں کی۔

اوپندر ناتھ اشک صرف ڈرامے ہی لکھتے رہ گئے۔ معجزے، میمونہ، مقناطیس، صبح شام سبھی ڈرامے بہت کامیاب ہیں۔ ہمارے نئے ادیبوں میں شاید ہی کوئی ادیب ڈرامہ نگاری کے فن میں اشک کے پایہ کو پہنچتا ہے۔ معجزے میں تو انہوں نے اعجاز کر دکھایا ہے۔ 'معجزے' واقعی اشک کا معجزہ ہے۔ اشک زیادہ لکھنے پر بھی ہمیشہ اچھا لکھتے ہیں۔ ان میں سہل نگاری کی خامیاں نہیں۔ ہم نے یہ سمجھا تھا کہ وہ اس سال افسانہ کو بھول ہی گئے ہیں۔ لیکن 'ایشیا' میں ان کا ایک افسانہ کھلونے دیکھا۔ کھلونے کا اندازِ بیان بہت عمدہ ہے، خصوصاً Descriptive passages بہت اچھے ہیں۔ افسانہ میں poignancy ہے۔ یہ افسانہ بھی سال کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ "فرار" اور 'انٹرویو' ان کی ناول "گرتی دیواریں" کے باب ہیں۔ ان دو ٹکڑوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ناول کس قدر شاندار ہو گی۔ گو یہ ناول کے ٹکڑے ہیں لیکن اپنی اپنی جگہ مکمل افسانے نظر آتے ہیں۔ اگر وہ افسانے ہوتے تو ان کا شمار بھی سال کے بہترین افسانوں میں ہوتا۔ 'ہندوستان' ویکلی بمبئی میں اب تک جتنے افسانے شائع ہوئے ہیں ان سب میں 'انٹرویو' بلند پایہ ہے۔

عصمت چغتائی تو سال کے آغاز میں ایک بات کہہ کر خاموش ہو گئی تھیں۔ 'ساقی' کے ساتھ ان کا قلم بھی رک گیا۔ لیکن سال کے آخر میں ساقی کے دوبارہ اجرا کے بعد

انہوں نے ایک افسانہ لکھا "ننھی سی جان"۔ عصمت چغتائی نے صرف ایک بات کہی اور صرف ایک افسانہ لکھا، لیکن وہ ایک بات بڑی پتہ کی بات تھی، اور وہ افسانہ سال کا ایک بہترین افسانہ۔

ان کے دوسرے افسانوں کی طرح "ننھی سی جان" میں بھی موضوع کی بے باکی ہے شروع شروع میں تو یہ افسانہ معمولی سا نظر آتا ہے۔ موضوع بھی وہی جو عصمت کے کئی افسانوں کا رہ چکا ہے۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک ہی قسم کے موضوع کو طرح طرح سے ڈھالتی ہیں۔ طرزِ ادا اسقدر الگ ہوتا ہے کہ ہمیں محسوس "نہیں ہوتا" یہ چیز پرانی ہے۔ موضوع کی یگانگت کے باوجود افسانوں میں تنوع ہوتا ہے۔ اور اس دفعہ عصمت چغتائی نے افسانہ کو جو موڑ دیا ہے، وہ واقعی قابلِ ستائش ہے۔ افسانہ میں slow development ہے۔ کڑی سے کڑی جوڑی گئی ہے۔ اور فن کار نے نہایت کامیابی کے ساتھ آخر تک suspense کو قائم رکھا ہے۔ ہلکے ہلکے اشارے دئے گئے ہیں۔ مولانا صلاح الدین نے 'کنایت' کو عصمت کی سب سے بڑی خوبی کہا ہے۔ یہ خوبی "ننھی سی جان" میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ شروع شروع میں یہ افسانہ معمولی معلوم ہوتا ہے، لیکن آخر میں عصمت چغتائی نے اسے ایسی ٹوِسٹ Twist دی ہے، جو اسے بہت بلند پایہ بنا دیتی ہے۔ دین محمد کو سبھی گالیاں دیتے ہیں۔ کوستے ہیں۔ اسی کو رسولن کی تباہی کا سبب سمجھتے ہیں، لیکن آخر میں اسی دین محمد نے کس کمال سے رسولن کو بچا لیا۔ پھر کتنی معصومیت سے "نہ جانے میری دوسری آستین کہاں گئی" وہ اپنا لہجہ آخر تک درشت رکھتا ہے، تاکہ مالکوں کو کوئی شک نہ ہو۔ آخر تک بھی سب یہی سمجھتے ہیں کہ دین محمد رسولن کے خلاف کہہ رہا ہے۔ رسولن کو بچانے کے بعد بھی اسے گالیاں ہی ملتی ہیں۔

"واہ واہ، واہ نگوڑی میری لونڈیا کو ہلکان کر دیا۔ صدقے کیا تھا نگوڑا بوٹی کا تکہ ذرا سا مرغی کا بچہ اور اتنا شور۔"

رشید جہاں تو بالکل خاموش ہیں۔ ایک تو 'نیا ادب' بند ہو گیا تھا۔ دوسرے ان کی توجہ ناسیوں کی درندگی سے عوام کو آگاہ کرنے کے اہم فرض کی طرف رہی۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے 'یہ ڈرامے صرف عوام کے لئے لکھے جانے کا باعث فنی چیزیں نہیں کہلائے جا سکتے۔

عسکری نے بھی "وہ تین" لکھ کر اس دفعہ چپ سادھ لی۔ آخر ہمارے ان بلند پایہ آرٹسٹوں کو اس سال ہو کیا گیا تھا؟ 'وہ تین' — جب ہمیں یہ خیال آتا ہے کہ یہ اسی قلم کی تخلیق ہے جس نے "حرامجادی" "پھسلن" اور "ایک معمولی خط" جیسے شاہکار پیش کئے ہیں تو افسانہ بہت معمولی معلوم ہوتا ہے۔ عسکری اتنا کم کیوں لکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انہیں آٹھ ہی افسانوں میں وہ شہرت ملی جو اکثر لکھنے والوں کو برسوں سر مارنے پر بھی نہیں ملتی لیکن انہیں اردو ادب کا تو خیال رکھنا چاہیئے۔ اگر ان کے سے فن کار خاموش رہ جائیں تو ادب دن بدن کیسے ترقی کر سکیگا؟ اچھے لکھنے والوں کے خاموش رہنے سے ادب کی رفتار میں تو کمی نہیں ہوئی۔ افسانوں کے ذخیرہ میں نئے نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں لیکن دوسرے درجہ کے لکھنے والوں سے ہمیں یہ اضافہ نہیں چاہیئے! لیکن عسکری شاید "میری بہترین نظم" اور "میرا بہترین افسانہ" مرتب کرنے میں بہت مصروف رہے۔

ممتاز مفتی — ہمارے Psychologist سائیکالوجسٹ نے جب [illegible] کو کاٹ چھانٹ کر دیکھا۔ 'حد ہو گئی' 'مورا مہندی والا ہاتھ' الخ، الخ، [illegible] شاہکار میں شائع ہوا ہے۔ معمولی افسانہ ہے۔ موضوع اچھا ہے لیکن

بہت سطحی طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ایک بیسوا کے دو "selves" 'بیسوا' اور "عورت" جو ہر بیسوا کے اندر موجود ہوتی ہے۔ عورت جو کسی ایک کی محبت میں تڑپنے کی تمنا لئے ہوتی ہے۔ الجھن میں یہ دونوں selves ہیں 'مہندی والا ہاتھ' اور 'حد ہو گئی' مفتی کے وہی محبوب موضوع کی دو کڑیاں ہیں۔ ان میں انہیں احساسات کا ذکر ہے" جو لاشعور کی تہوں میں دبے پڑے ہیں مگر بھیس بدل کر شعور میں آجاتے ہیں۔ "مہندی والا ہاتھ" کے انداز بیان میں بلا کی روانی اور شگفتگی ہے۔ مفتی کے بعض افسانوں میں اس لاشعور والی بات کو سمجھنا مشکل ہے۔ مگر "مہندی والا ہاتھ" میں یہ بات جلد سمجھ میں آجاتی ہے۔ شاید بھائی جان کو کسی کے مہندی لگے ہاتھ سے عشق تھا۔ لیکن وہ بظاہر مہندی سے نفرت کرتے تھے۔ لیکن پھر جب انہوں نے مہندی والا ہاتھ دیکھا تو وہ لاشعور میں دبا ہوا عشق ایک وحشت کے عالم میں نمودار ہوا۔ حد ہو گئی میں یہ بات سمجھنی مشکل ہے۔ کیا یہ منٹو کے 'بانجھ' اور اختر انصاری کے 'زینت' کی طرح کا افسانہ ہے۔ کہیں افسانہ کے 'میں' نے یہ سارا قصہ دل سے گھڑ کر تو نہیں سنایا۔ یہ گمان اس لئے ہوتا ہے کہ مفتی نے کوئی دو صفحوں تک یہی لکھا ہے ....

....

کہ "میں" کے سب دوست عشقیہ افسانے سُناتے ہیں۔ سب کی کوئی نہ کوئی 'وہ' ہوتی ہے لیکن اس کی کوئی 'وہ' نہیں۔ کیوں نہ وہ خود بھی اوّلین فرصت میں ایسا قصہ تراشے جو مزے لے لے کر سُنایا جا سکے۔ کہیں یہ ایسا ہی تراشا ہُوا قصہ تو نہیں کہ کوئی 'وہ' اس عجیب طریقہ سے اس کی طرف کھنچ گئی کہ وہ بھورے بالوں اور نشیلی آنکھوں والے طاہر کو بھی بھول گئی۔ ممتاز مفتی نے اسی قسم کا عشقیہ قصہ گھڑنے والا کردار ہم دونوں

میں بھی پیش کیا ہے۔ ہم دونوں جو ادبِ لطیف کے "افسانہ نمبر" میں شائع ہوا تھا۔ افسانہ نہیں، ناول کا ایک ٹکڑا ہے ۔ میں نے بھی 'حد ہوگئی' میں یہ قصہ تو نہیں گھڑا ؟ کہیں یہ منٹو کے 'بانجھ' اور اختر انصاری کی 'زینت' کی طرح کا قصہ تو نہیں؟ اگر اسی طرح کا ہے تو وہ اس قدر بلند پایہ نہیں کہا جاسکتا۔ 'بانجھ' اور 'زینت' بلاشبہ اس سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ "زینت" ان سب میں بہترین فنکارانہ چیز ہے۔ گو منٹو کے بانجھ میں Piognancy زیادہ ہے۔ منٹو کے افسانے میں شروع ہی سے نعیم کو ایسا پیش کیا گیا ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس سے کسی نے محبت نہیں کی۔ اور جب اس کا گھڑا ہوا قصہ بیان کرکے منٹو آخر میں اس حقیقت کی خبر دیتے ہیں، تو ہمیں تعجب نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے برخلاف 'زینت' میں ہم بھی افسانہ کے ہیرو کے ساتھ وہی شیریں خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ اس دھوکہ میں کہ وہ حقیقت ہے، اور اسی وقت چونکتے ہیں جب مصنف آخر میں کہتا ہے۔ " اور حقیقت؟ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ میں نے زینت کو — یعنی اس لڑکی کو جس کا نام میں نے 'زینت' رکھ دیا ہے۔ صرف ایک یا دو بار موٹر سے اترتے یا موٹر پر سوار ہوتے دیکھا ہے"! لیکن شاید 'حد ہوگئی' اس قسم کا افسانہ نہیں ہے کیونکہ اس میں لاشعور کا ایک بہت نازک نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ اور صرف قصہ گھڑنے کے لئے اتنی اہم بات کا لانا ضروری نہیں تھا۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ مفتی نے 'حد ہوگئی' میں Dr. Rivers کی تھیوری کو پیش کیا ہے، کہ اسوقت جب آدمی خوف کے مارے ہوش کھونے لگتا ہے اور اس خوف سے اس کا دماغ بیکار سا ہو جاتا ہے، اسوقت جو چہرہ سامنے ہوتا ہے، اسی کی تصویر دماغ میں بیٹھ جاتی ہے، اور وہ اس کے علاوہ کسی کو پہچان نہیں سکتا۔ شاید یہی نظریہ صحیح ہو۔

'مورا' ان کی اس سال کی بہترین تخلیق ہے۔ یہ افسانہ ان کے 'آپا' اندھا

اور 'ماتھے کا تل' کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ سال کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ اس میں نفسیاتی الجھنیں نہیں ہیں، بلکہ ایک ریاکار مولوی صاحب کے کردار کو بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا ہے اور 'موزنام' اس افسانہ کے لئے کتنا symbolic ہے! ان کا ایک اور افسانہ 'الطّاف' ساقی کے سالنامہ میں شائع ہوا تھا۔ یہ بھی 'کرہی محل کے بھوت' کا سا افسانہ ہے۔ اس میں لاشعور کی گہرائیوں میں وہ کونسی بات چھپی ہوئی ہے ہمیں معلوم نہیں ہوتی۔ عام پڑھنے والوں کے لئے تو یہ ایک Super-natural مافوق الفطرت قسم کا افسانہ نظر آتا ہے اور موجودہ فن کے معیار سے گرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی مجھے افسانہ نگار سے زیادہ شاعر کی حیثیت سے پسند ہیں۔ جدید شاعروں میں سے مجھے انہیں کی نظمیں سب سے زیادہ پسند آتی ہیں۔ کیونکہ ان میں جدید شاعری کی پختگیٔ فکر کے ساتھ ساتھ قدیم شاعری کی چاشنی بھی ہے۔ دونوں قسم کی شاعری ان کی نظموں میں اسطرح تحلیل ہوتی نظر آتی ہے، جیسے دو خوشنما رنگوں کے ملنے سے ایک حسین تر سایہ پیدا ہو جاتا ہے! ان کی نظموں میں رومان اور حقیقت کا امتزاج ہے۔ طرزِ ادا اس قدر دلکش ہوتی ہے اور ایسے موزوں مترنم الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ کہ ان کے اشعار میں بلا کی رنگینی، ترنم ریزی اور مٹھاس ہوتی ہے۔

ان کے افسانوں میں بھی دیہاتی رومان کی رنگینیاں ہیں۔ لیکن اس سال انہوں نے جو افسانے لکھے ہیں انہیں پڑھکر یہ کہنا پڑتا ہے کہ افسانہ نگاری میں بھی ان کا پایہ اتنا ہی بلند ہو گیا ہے۔ 'الجھن' اور 'من کی ڈالی' اس سال کے اچھے افسانوں میں سے ہیں۔ یوں تو اس سال ان کے سب افسانے اچھے ہیں۔ سوائے ایک دو کے — 'نیم وا دریچے' اور 'پلکوں کے سایہ تلے' جو "پیام ادب" میں شائع ہوئے ہیں، بہت معمولی ہیں۔ "پیام ادب"

میں 'نئی سارنگی' بھی شائع ہوا ہے۔ لیکن یہی افسانہ گذشتہ سال 'ساقی' میں شائع ہوا تھا۔ 'پیام ادب' نے بغیر حوالہ کے اسی افسانہ کو شائع کر دیا ہے۔ 'کانی آنکھ' جو رسالہ 'کتاب' میں شائع ہوا ہے، کردار نگاری کی بہت اچھی مثال ہے۔ انہوں نے چودھری کے کردار کو نہایت کامیابی سے کھینچا ہے۔ اور آخری ٹچ تو بہت ہی اچھا ہے۔ 'کانی آنکھ' اور 'بوڑھا' انہوں نے اپنی طرز سے ہٹ کر لکھا ہے۔ دونوں نہایت کامیاب افسانے ہیں۔ 'من کی ڈالی' کا موضوع تو دلچسپ ہے ہی انہوں نے اسے نہایت فنکارانہ انداز سے پیش کر کے افسانہ کو بہت بلند کر دیا ہے۔ تکنیک بھی بہترین ہے۔ 'الجھن' ان کا اس سال کا بہترین افسانہ ہے۔ اور سال کے شاہکاروں میں گنا جا سکتا ہے۔ موضوع بیدی کے 'چیچک کے داغ' سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن یہ تصویر کا دوسرا رُخ ہے۔

بیدی کے افسانہ میں دلہن کو سب تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اس کے سسرال والوں کو اس کی ہر چیز پسند آتی ہے۔ لیکن آخر میں دولہا اسے پسند نہیں کرتا۔ وہ دُولہا جس کے چہرہ پر چیچک کے داغ تھے! 'الجھن' میں دُلہن سسرال میں آ کر بہت دُکھی ہوتی ہے۔ اس کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ بوڑھیاں اس پر طرح طرح کے فقرے کستی ہیں صرف ایک اُمید کی جھلک — اس کا دولہا کیسا ہوگا؟ جب وہ دولہا کو دیکھتی ہے، تو سب رنج بھول جاتی ہے۔ 'الجھن' میں دیہاتی گیتیں بھی ہیں۔ دیوندر ستیارتھی دیہاتی گیتوں کو ایک دلچسپ ہر صفحے میں جمع کر دیتے ہیں۔ لیکن احمد ندیم قاسمی انہیں دیہاتی افسانوں میں استعمال کر کے ان کا حسن اور بھی بڑھا دیتے ہیں۔

دیوندر ستیارتھی 'مفرور' 'دو بیٹے' 'لال دھرتی' اور 'بانسری بجتی رہی'

'مفرور' اچھا افسانہ ہے اور 'بانسری بجتی رہی' معمولی ہے۔ لیکن 'دو بیٹے' اور 'لال دھرتی'

بہت معیاری افسانے ہیں۔ 'دو بلیٹے' میں طنز اور مزاح کے امتزاج نے بہت کامیاب بنا دیا ہے۔ ہلکا پھلکا اندازِ بیان ہے۔ لیکن اسی ہلکے پھلکے انداز میں بہت پتہ کی باتیں کہدی ہیں۔ لال دھرتی — اس سال کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس افسانہ میں دیوندر ستیارتھی نے سُرخ رنگ کی symbolism کو شروع سے آخر تک بہت اچھی طرح پیش کیا ہے۔ "ہم آندھر دیش کے لئے اپنا لہو بہانے سے بھی گریز نہ کریں گے" لہو بہاؤ گے؟ پہلے ہی یہ زمین کیا کم سُرخ ہے" ۔ ۔ ۔ آندھر دیش کی سُرخ زمین، سُرخ کنگم، سُرخ خون کی مناسبت سے وہ کرشنا وینی کے رکھوالا ہونے کی رسم — ایک مرکب تاثر۔ پھر آخری پیراگراف میں وہ ان سب مختلف "تاثرات" کو یوں جمع کرتے ہیں" دائیں بائیں، آمنے سامنے، جہاں تک میرے ذہن کی پہنچ تھی، سُرخ زمین لیٹی ہوئی تھی۔ ایک رکھوالا کنہیا کی طرح آرام کر رہی تھی۔ وہ وقت مجھے قریب آتا دکھائی دیا جب اسکی کوکھ ہری ہو گی اور کوئی ایسا آدمی پیدا ہو گا جو باوازِ بلند پکار اٹھیگا "ہوں کی جے! اب ان کھیتوں میں غلام نہیں اُگیں گے۔ یہ لال دھرتی ہے" ۔

اختر اورینوی نے صرف دو افسانے لکھے' انارکلی اور بھول بھلیاں' بیداری۔ 'انارکلی اور بھول بھلیاں' کا موضوع بہت اچھا ہے۔ اس سے ایک ماسٹرپیس بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن اختر اورینوی نے اسے کچھ سطحی سا کر کے رکھ دیا ہے۔ افسانہ بذاتہٖ خود اچھا ہے۔ لیکن اس لئے معمولی معلوم ہوتا ہے کہ اختر اورینوی نے 'کلیاں اور کانٹے' لکھا ہے۔ جو کسی مخصوص سال میں نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے اردو ادب میں ایک بڑا شاہکار ہے ۱۹۴۲ء کا سب سے بلند پایہ افسانہ! مصنف کی سحر طرازی ہمیں کچھ ایسا مسحور کئے دیتی ہے کہ ہم 35 صفحوں کی جزئیات نگاری سے کبھی نہیں اکتاتے۔ البتہ 'بیداری' نہایت ہی کامیاب

افسانہ ہے۔ انہوں نے موضوع کو خوبی اور نزاکت سے سنبھالا ہے۔ باگیسری کی اس بیداری کو انہوں نے جسطرح آہستہ آہستہ Develop کر کے نقطۂ عروج کو پہنچایا ہے، وہ قابلِ داد ہے۔ بیداری کا اندازِ بیان بہت شگفتہ اور نکھرا ہُوا ہے۔ جنگ کے باعث اناج کی گرانی کا ذکر کر کے انہوں نے افسانہ کو جدید بنا دیا ہے۔ باگیسری کو' بازاری زندگی سے نفرت تھی۔ وہ اس گندگی سے نکل کر کسی ایک کی ہو جانا چاہتی تھی۔ یہ ایک کون ہوگا۔ ہرگوپال؟ ہرگوپال اس کے سینہ میں اَور ہی طرح کے جذبات بیدار کرتا تھا۔ وہ دوسرے کوٹھے پر آنے والے مردوں سے نفرت کرتی تھی۔ ان سے اسے کبھی جھجک نہ محسوس ہوئی تھی۔ **لیکن** ہرگوپال کو دیکھ کر وہ شرما جاتی۔ اسے خود پتہ نہ تھا کہ ایسا کیوں ہو جاتا ہے۔

"ہرگوپال سے وہ لاجونتی کے پتوں کی طرح شرماتی تھی۔ اچھوتی کنواری کی طرح لجاتی تھی۔ اس کی یہ نسائی لاج کشش وجذب کی وہ تمنّا تھی، جو نفاست اور لطافت کے آنچل میں منہ بند کلیوں کی طرح مسکراتی ہے۔ شرم ایک نازک ادائے قبولیت ہے"۔ کتنا نازک اور لطیف نفسیاتی نکتہ ہے' اور اختر اورینوی نے اسے کتنی لطافت اور رنگینی سے بیان کیا ہے!

یہ سال ایک اور بلند پایہ فن کار کے افسانوں سے بھی محروم رہا۔" وہ نوجوانوں کا آرٹسٹ" جس کے افسانوں میں زندگی کی تلخیاں اپنی ساری بھیانک تباہیوں کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ اختر انصاری ــــ اختر انصاری نے اسدفعہ ایک بھی افسانہ نہیں لکھا۔ سرف اپنی ڈائری کے ٹکڑے پیش کرتے رہے۔

سہیل عظیم آبادی۔ 'فجو' 'نانی' 'جہیز' ــــ جہیز بہت ہی معمولی افسانہ ہے فجو۔ اور نانی دونوں بہت اچھے افسانے ہیں۔ 'فجو' میں فجو کی کردارنگاری بہت کامیاب

ہے مجو ایک ڈاکو تھا۔ پھر بھی اسے اپنے ساتھی سے کیسی بے لوث محبت تھی۔ یہ سن کر کہ منّا ہسپتال میں بیمار ہے، وہ اپنی چوٹوں کے درد کی پروا نہ کر کے ہسپتال روانہ ہو جاتا ہے۔ پھر منا کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے کے لئے ایک جنون کے عالم میں ہسپتال سے نکل پڑتا ہے — دن کی روشنی میں، یہ بھی بھول کر کہ پولیس اس کی تلاش کر رہی ہے۔ آخر کار پکڑا جاتا ہے۔ اور مجو ایک ڈاکو تھا! 'نانی'، ان کا چھوٹا سا افسانہ جو 'ہمایوں' میں شائع ہوا ہے۔ بے حد دلچسپ ہے۔ کرشن چندر کے کہنے کے مطابق سہیل میں یہ بڑی خوبی ہے کہ ان کے مکالمے مصنوعی اور غیر فطری نہیں ہوتے۔ 'نانی' میں بوڑھی نانی کا dialogue بہت فطری ہے۔ نانی کے آخر ایک جملہ میں تو انہوں نے کمال کر دیا ہے۔ نانی خط لکھوانے آئی ہے"۔ بس دو کلم بٹیا۔ "بس دو کلم بٹیا" کہتے کہتے وہ اتنی باتیں کہہ جاتی ہے۔ پھر ایک ہی مضمون کو دہرا دہرا کر کہتی ہے۔ ممتاز تنگ آ جاتا ہے اور بڑی مشکل سے خط کو مختصر کر کے لکھ دیتا ہے۔ "اب پوسٹ کارڈ میں جگہ نہیں رہی"۔

"آئے بابو، کھتم پوسٹ کاٹ ابھی کتنا بات باکھئے رہ گئی۔ اب کا ہوگا۔ اچھا بابو پتلا پتلا چار ہرپ اور لکھ دو۔ کی روپیہ جلدی بھیج دو۔ اور کپڑا، صابن، بسکٹ مٹھائی (یہ بات پہلے بھی نانی نے لکھائی تھی) اور ہاں بٹیا ہمرے واسطے کٹھومولی کنگھی۔ بڑی سر میں جوئیں ہو گئیں ہے بٹیا کوئی نا دیکھے ہے۔ اپنی آنکھ سے تو سوجھے نا کرے ہے۔ ٹٹول ٹٹول کے مل جاہے تو ماریں ہیں۔ ہاں جیئو میرے لال جرا ایک بار پڑھ کے سنا دو۔"

ممتاز نے اپنی زبان میں پورا خط لکھ دیا تھا۔ نانی کی بکواس اسے یاد نہ رہی تھی۔ اس نے جو کچھ لکھا تھا پڑھ کر سنا دیا۔ 'نانی' کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ای تو کچھ نا ہوا بٹیا۔ مپھت میں پوسٹ کاٹ بھی کھراب کیا"۔ سہیل

اسی حیلہ پہ افسانہ کو ختم کر دیتے تو بہتر تھا۔ بجائے یہ لکھنے کے کہ "ممتاز سوچ رہا تھا ناول کا ایک باب لکھنا مشکل ہے یا نانی کا ایک خط"۔

اس میں شک نہیں کہ سہیل عظیم آبادی نے جن موضوعوں کا ان دو افسانوں کے لئے انتخاب کیا ہے۔ انہیں اتنی اچھی طرح نبھایا ہے کہ اس سے بہتر لکھنا ممکن نہ تھا۔ دونوں بہت اچھے افسانے ہیں۔ لیکن ان کی چمک 'الاؤ' 'جوار بھاٹا' 'جوانی' 'بخیر تمام' 'دو مزدور' جیسے نگینوں کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔ الآؤ کے متعلق مجھے عبادت بریلوی کی رائے سے اتفاق نہیں۔ بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں' جن کے دو یا تین افسانے ہمیں بہت پسند آتے ہیں لیکن پوری کتاب پڑھنے کے بعد ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہ بالکل اچھی نہیں۔ 'الآؤ' ان میں سے نہیں ہے۔ اس کتاب کے قریب قریب پورے افسانے بہت اچھے ہیں۔ اور اس کا مجموعی اثر بہت اچھا ہے۔ یہ ان چند کتابوں میں سے ہے جنہیں ختم کر کے ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے۔ اور احساس ہوتا ہے کہ آج واقعی ہم نے بہت اچھی کتاب پڑھی۔ 'الاؤ' 'جوانی' 'جوار بھاٹا' 'دو مزدور' شہ پارے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کے افسانے بہت مختصر ہوتے ہیں لیکن اسی اختصار میں وہ موضوع کو ایسے مکمل طور پر develop کرتے ہیں کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان کے بیان میں سادگی اور دلاویزی ہوتی ہے۔ 'جوانی' اور 'جوار بھاٹا' پڑھیے۔ انسانی فطرت کی کتنی سچی تصویریں ہیں۔ ان افسانوں کے کرداروں میں تبدیلی ایک طوفان کے ذریعہ نہیں۔ ہلکی ہلکی لہروں کی شکل میں پیدا ہوتی ہے۔ جس سے ان کی دلکشی دوبالا ہو جاتی ہے۔ 'جوار بھاٹا' کے نفسیاتی نکتہ کو انہوں نے کتنی لطافت اور نزاکت سے سنبھالا ہے۔ اس نزاکت کے باعث وہ افسانہ مفتی کے بعض افسانوں سے بھی بلند پایہ ہو گیا ہے۔ لیکن مفتی کے کردار اکثر Abnormal

ہوتے ہیں۔ اسی لئے نفسیاتی نکتوں کو اتنے ہلکے پھلکے انداز میں اتنی نزاکت سے نبھانا ممکن نہیں۔ چنانچہ پرچیٹ Pritchett کا مشہور افسانہ Miss Baker پڑھکر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ تصویر زندگی سے اتنی قریب نہیں، اس میں مبالغہ ہے۔ لیکن مس بیکر Abnormal قسم کی لڑکی ہے۔ بے حد مذہبی ایک راہبہ کی طرح کی۔ اس کے مذہبی جذبات بہت شدید ہیں۔ اسے ہمیشہ خدا، مسیح اور مقدس مریم کا ہی خیال رہتا ہے لیکن اس کا کچلا ہوا جنسی جذبہ ایک نامعلوم شکل میں ابھرتا آتا ہے۔ وہ خود معلوم نہیں کرسکتی کہ اس میں کیا تبدیلی ہو رہی ہے۔ آخرکار یہ مواد یوں پھٹتا ہے کہ وہ ایک موٹے سے غنڈے کو دیکھتی ہے تو وہ محسوس کرتی ہے کہ اس نے خدا کو دیکھ لیا۔ اور 'میرے خدا میرے خدا' کہتی ہوی اس سے لپٹ جاتی ہے۔ مفتی کے کردار بھی کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں اور مفتی اتنی ہی کامیابی سے ایسے کرداروں کو پیش کرتے ہیں۔ جتنا پرچیٹ۔۔۔ The Sailor اور Miss Baker میں۔ اور یہ دونوں بہت ہی مشہور انگریزی افسانے ہیں۔۔۔۔ جوار بھاٹا کی کملا Narmal عورت ہے۔ اسی لئے سہیل عظیم آبادی اس کی پرسکون زندگی میں یہ ہلکے سے 'جوار بھاٹے' کو اتنی نزاکت سے سنبھال سکے۔۔۔ 'دو مزدور' کو انہوں نے جس انداز سے نبھایا ہے، اور وہ ہلکا سوشلسٹک ٹچ، اس سے 'دو مزدور' میں مغربی افسانوں کی طرز آگئی ہے۔ اور اس افسانہ کو مغربی افسانوں کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اور 'الاؤ' ان کا سب سے طویل افسانہ تو شاہکار ہے — بات کہاں سے کہاں جا نکلی — تو سہیل نے بھی اس سال گذشتہ سالوں کی بہ نسبت اتنے اچھے افسانے نہیں لکھے۔

فیاض محمود نے بھی صرف دو افسانے لکھے۔ دو ٹکے کا دودھ اور

چھ روپئے۔ فیاض محمود اب اپنی طرز سے ہٹ کر لکھنے لگے ہیں۔ انہوں نے نئی شاہراہ پر قدم رکھا ہے لیکن اس پر ان کے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔ یہ افسانے معمولی تو نہیں، کہے جا سکتے۔ لیکن 'کامچور'، 'زبیدہ'، 'نفرت' اور 'صغریٰ' کے خالق کے لئے یہ معمولی ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں ہر ایک شہ پارہ تھا۔ فیاض محمود کے لئے وہی طرز موزوں تھی۔ جس میں وہ پہلے لکھا کرتے تھے۔ فیاض محمود نے اس طرز کو کیوں چھوڑ دیا؟ آخر ان افسانوں میں بھی تو اتنی ہی حقیقت نگاری تھی۔ ان کا قلم اسلامی گھرانوں کی محدود معاشرت میں ابن عم اور بنت عم کے لطیف معاشقے" کو بلا کی رنگینی اور لطافت سے بیان کر سکتا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے باکی اور عریانی کو صفحے پر کھینچتے ہوئے وہ کانپ سا جاتا ہے۔ 'رنگ و بو' واقعی رنگ و بو ہے۔ کتنے رنگین افسانے ہیں۔ ہمیں ان کے قلم سے ایسے اور افسانے چاہیئے۔ بے باک موضوعوں پر لکھنے والے فن کار تو بہت ہیں لیکن اس انداز میں لکھنے والے کوئی نہیں جس میں فیاض محمود کو ایک انفرادی حیثیت حاصل تھی۔

دھرم پرکاش آنند کا صرف ایک افسانہ شائع ہوا ہے۔ ادب لطیف کے افسانہ نمبر میں 'ذہین بیوی'، لیکن 'ایشیا' میں ان کے اور ایک افسانہ کا ترجمہ بلال احمد نے 'فاصلہ' کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ دونوں افسانے بے حد اچھے ہیں۔ فاصلہ میں مزاحیہ انداز ہے۔ 'ذہین بیوی' ان کے مخصوص طرز کا افسانہ ہے۔ اس میں رتنا کا کردار 'ایک خط' کی رتنا سے ملتا جلتا ہے۔ دھرم پرکاش آنند میں موضوع کی وحدانیت ہوتی ہے اور وہ سیدھے موضوع ہی پر لکھتے ہیں۔ ادھر ادھر بہک نہیں جاتے۔ ذہین بیوی نہایت کامیاب افسانہ ہے۔ ہر طرح سے ایک Finished piece ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے اس سال کے افسانے "یہ بھی اور وہ بھی" جدید اور جدید تر" کے سے شاہکار نہیں۔

ملک راج آنند کے انگریزی افسانوں کے تین ترجمے پیش ہوئے ہیں۔ ایک ہندوستان ویکلی بمبئی میں 'لوری'۔ اور 'ادب لطیف' میں 'کھویا ہوا بچہ' اور 'مونچھیں' ملک راج آنند ایک ہی خیال کو مختصر اور جامع طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان تینوں افسانوں میں بھی یہ خوبی نمایاں ہے۔ لوری اور کھویا ہوا بچہ بہت اچھے افسانے ہیں۔ کھویا ہوا بچہ تو نہایت بلند پایہ ہے۔ دُنیا بھر کے مختلف ملکوں کے ادب سے چند بہترین افسانے چن کر مرتب ہوئے تھے ملک راج آنند کا The Lost Child بھی ان میں سے ایک تھا اور ہندوستان کے آپ واحد نمائندہ تھے۔ اب اُردو میں اسکا ترجمہ ادب لطیف نے شائع کیا ہے۔ اور بے شک اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ ملک راج آنند ہمارے انگریزی لکھنے والے ادیبوں میں سب سے پیش پیش ہیں۔ احمد علی نے صرف ایک ناول Twilight in Delhi لکھا۔ راجہ راؤ Kanthapura لکھ کر خاموش ہو گئے لیکن آنند نے اب تک کتنی ہی ناولیں لکھ دی ہیں (۱) The Coolie، (2) The Village (3) untouchable (4) Two Leaves + a bud (5) Across the black waters (6) The sword + the sickle انکے افسانوں کے اردو ترجمے اردو ادب میں واقعی ایک گرانقدر اضافہ ہیں۔

احمد علی اُردو میں بہت کم لکھتے ہیں۔ گذشتہ سال ادب لطیف کے سالنامہ میں ان کا افسانہ 'مارچ کی ایک رات' شائع ہوا تھا — ایک شاہکار۔ اس دفعہ انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ شاید Tomorrow کے مرتب کرنے میں مصروف رہے۔

Tomorrow میں، جو وہ راجہ راؤ کے ساتھ مل کر مرتب کر رہے ہیں، اور جس میں Penguin New Writing کی طرح ہر ملک کا ادب پیش ہوتا ہے۔ انہوں نے فرانز کافکا کی طرز پہ Prison House نامی ایک انگریزی کہانی لکھی ہے۔ بالکل نئی قسم کی چیز ہے۔ میں نے اس قسم کی صرف ایک اور کہانی پڑھی ہے۔ بالکل اس طرح کی نہیں، لیکن اس سے کچھ ملتی جلتی ہے۔ Mice جو بنگال کے people's periodical 'U . S میں شائع ہوی ہے۔ احمد علی کی اس سٹوری کا اُردو ترجمہ ہو تو اردو ادب میں بالکل ہی نئی چیز ہو گی۔

احمد عباس - ماں - ایک پائلی چاول - احمد عباس نے معمار، پہلا پتھر اور فیصلہ جیسے شہ پارے پیش کئے ہیں جنہیں پڑھکر یہ رائے ٹھیک معلوم ہوتی ہے، کہ "احمد عباس دنیا کو حسین رنگ میں دیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں"۔ لیکن ان کے بعض افسانے پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کا مشاہدہ پیش کرنے کی بجائے اپنے تخیل کی مدد سے Forced Situation پیدا کرتے ہیں۔ 'ماں' بھی اسی طرح کا ایک افسانہ ہے۔ اس افسانہ میں بعض جگہ صحافی انداز بھی آ گیا ہے۔ چنانچہ رسالہ "جامعہ" میں ایک اہم ادبی تحریک کے عنوان سے لکھتے ہوئے باقر حسین نے لکھا ہے کہ نئے ادب کے بعض افسانوں میں خطابتی یا صحافتی انداز ہوتا ہے۔ مثلاً انہوں نے 'ماں' کا ایک ٹکڑا پیش کیا ہے۔ ان خامیوں کو نظر انداز کریں تو یہ کافی اچھا افسانہ ہے۔ لیکن ان کا "ایک پائلی چاول" جو 'نیا ادب' کی سہ ماہی کتاب میں شائع ہوا ہے .... اس سال کے پورے افسانوں میں ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ سال کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ احمد عباس وقت کا ساتھ دینے میں اور بدلتے ہوئے ماحول

کا اثر قبول کرنے میں سب سے پیش پیش ہیں۔ وہ جدید سے جدید موضوع پر لکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ کرشن چندر سے بھی جدید تر ہیں۔ 'ایک پائلی چاول' راشننگ سسٹم پر لکھا گیا ہے۔ عباس نے موضوع کو نہایت فن کارانہ انداز سے نبھایا ہے۔ مرقع نگاری اتنی اچھی ہے کہ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔

"ناگنوں کی طرح بل کھاتی، چیونٹوں کی رفتار سے رینگتی، شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح بھنبھناتی، دو لمبی قطاریں —— ایک مردوں کی، ایک عورتوں کی —— کئی سو عورتیں، ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی، یہودی، مسلمان عورتیں، برقعہ اوڑھے ہوئے اور بغیر برقع کے، کالے چکنے جسم والی مچھلی والیاں، جن کے بالوں کے پھولوں کی خوشبو ان کے کپڑوں کی مچھلی کی بو میں مل کر ہوا میں پھیل رہی تھی، فراک پہنے ہوئے، ننگی ٹانگوں، پاؤں میں چپل، غریب دیسی عیسائی عورتیں، گھٹیا قسم کے سینٹ اور پاؤڈر اور سینٹ میں نہائی ہوئی، نقلی سلک کی جرابیں اور اونچی ایڑی کے جوتے پہنے اینگلو انڈین لڑکیاں، پھولدار ریشمی شالیں، کاندھوں پر ڈالے گوری چٹی، کالے بالوں والی یہودنیں۔ سڈول جسم کی مرہٹنیں، بہت دبلی یا بہت موٹی گجراتنیں ...... موتیا کی کلیاں اور مرجھائے ہوئے پھول، سینٹ اور پسینہ، مچھلی کی بو، اور ناریل کے تیل کی بو —— اور دوپہر کی دھوپ میں ان مختلف خوشبوؤں اور بدبوؤں کے ملے ہوئے ابخرات اوپر کو اٹھتے ہوئے۔ مرہٹی، گجراتی، ہندوستانی اور انگریزی زبانوں میں گفتگو کا ایک ناقابلِ فہم سٹور —— کئی لاکھ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔"

غلام عباس نے سمجھوتہ اور تحفہ دو افسانے لکھے ہیں۔ دونوں بہت معمولی

ہیں۔ کیا آنندی کے غلام عباس ماضی کی بات ہو کر رہ گئے ہیں؟

علی عباس حسینی نے 'منشی اور وکیل' اور 'حسن راہگذر' لکھا ہے۔ دا
اسقدر معمولی اور فرسودہ ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کہ یہ علی عباس ہی کے لکھے ہ
ہیں؟ علی عباس حسینی جن کے سب مجموعوں 'آئی سی ایس اور باسی پھول' ر
تنہائی' اور 'کچھ ہنسی نہیں ہے' میں کتنے ہی شہ پارے ہیں لیکن انہوں نے 'با
بھی لکھا ہے۔ 'باسی پھول' جو باسی پھول ہی ہے جس کی موجودگی نے کتاب کے م
اثر کو بگاڑ دیا ہے اس سے ساری دلکشی چھین لی ہے' گو اس کے دوسرے اف
بہت اچھے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے اس فرسودہ افسانہ کو جو نہ جانے انہوں
کب لکھا تھا "ایسی اچھی" کتاب میں ٹھونس دیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے منشی
وکیل اور حسن رنگ بھی اپنے مبتدیانہ زمانہ میں لکھا ہوگا۔ اور رسائل کی فرما
پر کوئی نیا افسانہ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں کو اٹھا کر بھیج دیا ہوگا۔ ورنہ علی
حسینی کے نئی اور پرانی قسم کے افسانے بہت اچھے ہیں۔ آئی سی ایس میں منش
پریم چند کا رنگ ہے۔ باسی پھول اور رفیق تنہائی میں ایسے افسانے ہیں۔ جن
قدیم اور جدید ادب کا امتزاج ہے۔ "کچھ ہنسی نہیں ہے" میں تو وہ پورے ترقی
بن گئے ہیں۔ اتنی ترقی کے بعد یہ تنزل کیوں؟

شیر محمد اختر 'لہو' 'جراثیم' 'مشرق و مغرب' —— لہو میں بہت
زیادہ مبالغہ ہے۔ جراثیم کا مرکزی خیال اور مواد بہت اچھا ہے۔ شیر محمد ا
کی جدت کی داد دینی چاہیئے۔ لیکن انہیں اس مواد کو جامع طور پر پیش کرنا چا
تھا۔ دو خیالات کو الگ الگ پیش کرنے کی بجائے ایک میں سمو دیتے تو افسا

بھی کامیاب ہو جاتا۔ بالکل جدید قسم کا افسانہ ہے۔ اس سے زیادہ ان کا 'مشرق اور مغرب' اچھا ہے۔ پھر بھی ان میں سے کوئی 'سراب' اور 'پی سی ایس' کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ 'سراب' اور 'پی سی ایس' واقعی شاندار تھے۔

راماننَد ساگر — 'آبحیات' 'ساٹھ پیسے' 'زور شور' 'گلمرگ کے اڈے پر' — رامانند ساگر۔ زبان بہت اچھی لکھتے ہیں۔ ان کے بیان میں روانی اور شعریت ہوتی ہے۔ ان کے وہ افسانے بہت ہی بلند پایہ ہیں جو انہوں نے حسّاس طبیعت، دق کے مریض کے متعلق لکھا ہے۔ لیکن وہ کبھی کبھی بیکار سی چیزیں بھی لکھ دیتے ہیں۔ آبحیات بھی اسی قسم کا معمولی افسانہ ہے۔ اسمیں کرشن چندر کا انداز نظر آتا ہے۔ یعنی وہی Loose تکنیک۔ لیکن آب حیات میں اس تکنیک نے پھسپھسا پن پیدا کر دیا ہے۔ زور شور کا موضوع اس قدر اچھّا ہے کہ اس سے ایک شاہکار پیش کیا جا سکتا تھا۔ رامانند ساگر نے اس کے آخری آدھے حصّہ کو بہت ہی اچھا نبھایا ہے۔ خصوصًا آخری دو پیراگراف میں تو کمال ہی کر دکھایا ہے۔ لیکن اتنے اچھّے افسانے کا آغاز بالکل معمولی ہے۔ اگر افسانے سے پہلے دو تین صفحے نکال دئے جاتے اور افسانہ 'سوسی کی شلوار' والے نکتہ سے شروع ہوتا اور سوسی کی شلوار پر ختم ہوتا تو بہت ہی فن کارانہ چیز ہوتی۔ افسانہ کی خوبیوں کا لحاظ کرتے ہوئے شاید اس خامی کو نظر انداز کر دیا جاتا اگر اس میں ایک اور خامی نہ ہوتی جو بُری طرح سے کھٹکتی ہے۔ وہ خامی یہ ہے کہ جھینگر سارے افسانے پر چھایا ہُوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ جھینگر پڑھنے والے کے حواس پر ایسا مسلط ہو جاتا ہے کہ اس کی پکار میں موضوع کی اہمیت بھی دَب کر رَہ جاتی ہے۔ ایک جھینگر مسلسل ٹرررر کرنے لگا۔ گویا کہہ رہا ہے کے بعد جھینگر

کی ایک لمبی تقریر — رامانند ساگر کی یہ مخصوص طرزِ تحریر ہے۔ وہ زیادہ تر نگاہوں کے بارے میں یہ لکھتے ہیں 'اس کی نگاہیں گویا کہہ رہی تھیں' لیکن ایسے موقعوں پہ ان کا یہ طرز فن کارانہ ہوتا ہے۔ کیونکہ آنکھیں بول سکتی ہیں۔ ایک نگاہ میں کیا کیا نہیں پڑھا جا سکتا۔ لیکن جھینگر کی پکار سے ایک لمبی تقریر ادا نہیں کی جا سکتی۔ پھر انہوں نے افسانے میں کتنے ہی موقعوں پہ یہ کہا ہے کہ اچانک ایک جھینگر اپنی تیکھی آواز میں بول اُٹھا۔ ماحول کی چیزوں کو اپنے بس میں کر کے مخصوص موقعوں پہ ان کا استعمال کرنا فن کار کے تخیل کی خوبی ہے۔ لیکن یہ خامی بھی بن سکتی ہے۔ چنانچہ عصمت چغتائی کے 'ننھی سی جان' میں بھی یہ خامی ہے۔ 'ننھی سی جان' میں فن کار کی سحر طرازی ہمیں مسحور کیے دیتی ہے لیکن اس مسحور حالت میں بھی وہ چوہیوں والی بات کھٹکتی ہی رہتی ہے۔ تین لڑکیوں کی مناسبت سے تین ہی چوہیوں کا موجود ہونا۔ امّی کے آنے پر جب نزہت اور سلمہ دبک جاتی ہیں تو چوہیاں بھی بھاگ کر پیپوں کے نیچے دبک جاتی ہیں۔ پھر جب نزہت سلما اور رسولن کے گلے بھر آتے ہیں اور آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں" تینوں چوہیاں بھی شاید بھول سے مرچ کا دانہ چبا گئیں، آنسو بھری غمگین آنکھوں سے دُور بیٹھی سسکیاں بھرا کیں"۔ سب حقیقت نگاری سے دُور مبالغہ معلوم ہوتا ہے لیکن ممتاز مفتی نے اپنے شاہکار 'آپا' میں 'جلتے ہوئے اُپلے' اور 'بجلی کے بلب' کو کتنی اچھی طرح استعمال کیا ہے۔ مبالغہ معلوم ہونا تو درکنار ان کے برمحل ذکر سے افسانہ میں جان آ گئی ہے۔ ممتاز مفتی نے انہیں افسانہ میں ایسا کھپایا ہے کہ ہمیں محسوس ہوتا ہے اس کے بغیر افسانہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ عصمت چغتائی اور رامانند ساگر کے افسانوں میں چوہیاں اور جھینگر بالکل غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ رامانند ساگر نے دو اور

افسانے ہمایوں میں لکھے ہیں۔ باسٹھ پیسے اچھا افسانہ ہے لیکن 'گلمرگ کے اڈے پر' ان کی اس سال کی بہترین کوشش ہے۔ بے حد کامیاب افسانہ ہے' اور اس فن کار کے شایاں ہے جس نے 'جوار بھاٹا' میں 'موت کے بستر سے' کا سا شاہکار پیش کیا ہے۔

مہندر ناتھ نے اس سال بہت لکھا ۔ دو ڈرامے بھی لکھے 'آخری داؤں' 'اچھا یا بُرا' —— اچھا یا بُرا پڑھتے ہوئے میں نے تو سمجھا کہ شاید انہوں نے synge کے The Riders of The Sea کا ترجمہ کیا ہے لیکن آخر میں ایک الگ ٹوسٹ Twist بھی دیدی ہے۔ افسانے ۔ طوفان کے بعد، چاندی کے تار، ہاتھ کا بڑھنا، کاش وہ بیوقوف ہوتا، نئی بیماری، —— ان میں آخری دو افسانے معمولی ہیں۔ ہاتھ کا بڑھنا بہت ہی مولی ہے۔ لیکن 'طوفان کے بعد' اور 'چاندی کے تار' بہت بلند پایہ افسانے ہیں۔ ایک ہی موضوع کے دو رُخ ہیں اور ایک ہی تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔ ایک طویل خط کی صورت میں۔ ان کا 'چاندی کے تار' تو اس قدر بلند پایہ ہے کہ سال کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کے یہ دو کامیاب افسانے بھی ان کے پہلے شاہکار "روشنی اور تاریکی" کی برابری نہیں کرسکتے۔ یہ افسانہ اسقدر اچھا تھا کہ صرف اس ایک افسانہ کی بنا پر انہیں ہمارے چوٹی کے لکھنے والوں میں شامل کیا جاسکتا تھا۔ 'چاندی کے تار' اور ایک حد تک 'طوفان کے بعد' میں بھی انہوں نے اپنا پایہ قائم رکھا۔ اگر وہ اسی طرح لکھتے رہتے تو بہت جلد صفِ اول میں آجاتے۔ لیکن انہوں نے بہت لکھنا شروع کردیا ہے۔ اور شاید اس سہل نگاری کا باعث ان کے بعد کے افسانے معیار سے گر گئے ہیں۔

رسالہ 'آجکل' میں کوشلیا اشک کا 'تھکان' پڑھا۔ کوشلیا کا یہی پہلا افسانہ میری نظر سے گذرا ہے لیکن اس ایک ہی افسانے کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا

پایہ کس قدر بلند ہے۔ 'تھکان' سال کا ایک بہترین افسانہ ہے۔ یہ درمیانی واقعات کی بنا پر 'چاندی کے تار' سے کچھ کچھ ملتا جلتا ہے۔ اور کوشلیا نے انہیں اتنی ہی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ جتنا کہ مہندر ناتھ نے تکنیک کے لحاظ سے تو 'تھکان' 'چاندی کے تار' پر بھی سبقت لے گیا ہے۔

مدھوسودھن 'لاشیں' 'ایک عورت' 'نیلی آنکھیں' — 'لاشیں' اچھا افسانہ ہے 'نیلی آنکھیں' بہت معمولی ہے۔ 'ایک عورت' فن کاری کا بہت اچھا نمونہ ہے یہ افسانہ اس قدر کامیاب ہے کہ سال کے بہترین افسانوں میں اس کا شمار ہو سکتا ہے لیکن ان کا 'بھیو کے پاپ' جو گذشتہ سال 'ساقی' میں شائع ہوا تھا ایک بڑی، شاہکار رہے گا تنقید نگار مدھوسودھن اور مہندر ناتھ کے بارے میں ہمیشہ لکھتے ہیں کہ یہ ہمارے مستقبل کے اچھے لکھنے والے ہیں۔ وہ ان سے مستقبل کی امیدیں وابستہ کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان کا ماضی ہی زیادہ شاندار رہے۔

چندر کانت — 'آوارہ' 'سایہ' 'فائل' 'داہنی آنکھ' 'کھونٹا'۔ 'پردہ' — ان میں سے اکثر افسانے معمولی ہیں۔ 'کھونٹا'۔ اور 'پردہ' قدرے اچھے ہیں لیکن اس سال انہوں نے ایسی چیز بھی لکھی ہے' جو سال کے بہترین افسانوں میں شمار کی جا سکتی ہے 'سایہ' سایہ ایک شاہکار ہے۔ اس افسانہ میں ان کی فن کاری کمال کو پہنچ گئی ہے۔ سایہ زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ دیہات کی پہلی محبت پھر بابو کا شہر چلا جانا۔ دونوں کا دوسری جگہ شادی ہو جانا۔ بال بچے، پوتی پوتے۔ اتنی زندگی گذارنے کے بعد بھی بابو اور دھرم وتی کے دل سے پہلی محبت کی یاد نہ جانا۔ وہ بوڑھے ہو کر بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں کہ

Susan End

کے ناول *Madame claire* میں غیر محسوس طرز پر جیسی لطیف محبت ہے اور اس لطیف محبت کو چندر کانت نے جیسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ظاہر کیا ہے۔ یہ کسی معمولی فن کار کے بس کی بات نہیں۔ اس لطیف محبت کو پیش کرنے میں چندر کانت کا کمال دیکھئے:

بابو ہمیشہ گھوما کرتے ہیں کیسی سہانی یادیں۔ انہیں سردی اور اندھیرے کی پروا نہیں۔ عورتیں دھرم وتی کے گھر میں بیٹھی ہوئی بابو کے متعلق باتیں کر رہی ہیں" ہاں جاڑوں میں ایک قمیص پہنے جسطرح یہ گھومتے ہیں۔ کوئی اور ہو تو نمونیا ہو جائے"۔ "نمونیا"۔ دھرم وتی کا دل دفعتاً کانپ جاتا وہ فوراً ہی ان کو جھڑک دیتی" ایسا نہ کہو، راج کی ماں! منہ سے ایسی بات نہ نکالنی چاہیئے۔ وہ کسی کا کیا بگاڑتے ہیں" یہ چھپی ہوئی محبت کیسے بے ساختہ ابل کر ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور یہ چندر کانت نے افسانہ کے شروع ہی میں لکھا ہے ہمیں ان دونوں کی محبت کا پتہ دینے سے پہلے۔ وہ افسانہ آخر سے شروع کرتے ہیں۔ یعنی اُس وقت سے جب بابو بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔ اور ایک سایہ کی طرح منڈلاتا رہتا ہے۔ اور بوڑھی دھرم وتی اپنے مکان میں بیٹھی یہ باتیں کرتی رہتی ہے۔

پھر چندر کانت ان کے بچپن کا ساتھ اور جوانی کی محبت کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر ان کی ناکامیابی کا — اور آخر میں افسانہ پھر اسی سایہ کے منڈلانے پر ختم ہوتا ہے اس لحاظ سے افسانہ کیلئے تکنیک بہت اچھی ہے۔

اس لطیف محبت کی ایک اور جھلک — گو اس کے اپنے گھر میں لسی نہیں بکتی، وہ ایک گلاس لسی روز بابو کے گھر دے آتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ لسی کے بجائے

دودھ کا گلاس رکھنا شروع کر دیتی ہے۔

دھرم وتی بارہا بھولے پاس آتی اور چونکہ بابوجی کو ساتھ والے کمرے میں دیوار کے ساتھ کان لگائے کھڑے کئی مرتبہ دیکھ چکی تھی۔ اس لئے وہ اکثر اس کے متعلق سوچتی کہ "شیلا! بابو جی کا اچھی طرح خیال رکھا کرو بیٹی۔ بڑھاپے میں بہو بیٹے ہی بڑوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اس کی اپنی کون بیٹی ہے۔" اس خیال سے کہ وہ خود بابو جی کی 'بیٹی ہے' دھرم وتی کی آواز میں گرم جوشی آجاتی۔ بابو کا جسم بھی گرم ہونے لگتا۔

شفیق الرحمٰن ہمارے رومان نگار ہیں۔ رومانیت سے ان کے افسانوں میں بلا کی دلکشی اور رنگینی ہوتی ہے۔ اس دفعہ انہوں نے جو افسانہ لکھا ہے "حماقتیں" اس میں حقیقت نگاری بھی ہے۔ کتنے ہی ایسے نوجوان ہیں جو ایسی حماقتیں کرتے رہتے ہیں۔ بہت کامیاب افسانہ ہے۔

پرتھوی ناتھ شرما نے اگرچہ بہت لکھا ہے۔ سب کا سب بیکار۔ 'ڈھلوان' 'فرید آباد کی منارت' سر کا درد۔ 'دانے گر ذلیل نہ ہوتا' 'گر بزدل نہ ہوتا' کچھ کچھ اچھے ہیں۔ فرید آباد کی منارت میں وہ درخت کے بور والی تشبیہ تو اچھی ہے۔ لیکن یہ بات مضحکہ خیز اور ناقابل یقین ہے کہ ایک اکیس سالہ دوشیزہ اسقدر معصوم ہے

شمشیر سنگھ نرولا کا 'پتہ' بھی بیکار ہے۔ **بلونت سنگھ** کا 'کبھی' معمولی افسانہ ہے۔

تراجم - [illegible] مشہور مغربی افسانوں کے ترجم ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔ انہیں پیش کرنے کا [illegible] سعید کے سر ہے۔ ادب لطیف میں بہت ہی بلند پایہ افسانوں کے ترجمے پیش ہوتے رہتے ہیں۔ دوسرے رسالوں کو بھی اس طرف توجہ دینی

چاہیئے۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ ادبِ لطیف نے بھی دو تین ماہ سے ترجموں کو شائع کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ادبِ لطیف میں شائع شدہ تراجم اکثر پنگوئن نیو رائٹنگ کے افسانوں کے ہیں۔ ۱۹۴۳ کے تراجم میں سے یہ چند تراجم بہت بلند پایہ ہیں۔ اگنیزیو سلونی (Ignazio Silone) Fontamara اور Bread + wine کے مشہور ناولسٹ کے افسانہ کا ترجمہ لوہڑ بلال احمد نے پیش کیا ہے۔ وانڈا واسیلیکا مشہور پولش ادیبہ جس نے The Rainbow جنگی ناول لکھ کر سٹالن انعام حاصل کیا ہے ——— اس کا 'جھونپڑی' جس کا ترجمہ سبط حسن نے کیا ہے۔ لوئی گوئیلو مشہور فرانسیسی افسانہ نگار کا 'عورت' 'مرد' مترجمہ ممتاز شیریں

آخر میں چند ایسے افسانوں کا ذکر ناگزیر ہے جو ایسے افسانہ نگاروں کے لکھے ہوئے ہیں، جو شاید زیادہ نہ لکھنے کی وجہ سے اتنے مشہور نہیں ہوئے۔ لیکن یہ افسانے بے حد اچھے ہیں۔ عبدالحمید کا 'ماں' علی حسین جعفری کا 'ٹیومر' ——— مرغوب جوہری کا 'مزدوری' اور محمود ہاشمی کا "شہنائیاں بجتی رہیں"۔

اب ایک ایسے ادیب کا ذکر باقی رہ گیا ہے جو بہت بلند پایہ طنز نگار ہیں مگر جن کا شمار باقاعدہ افسانہ نگاروں میں نہیں ہوتا۔ کنہیا لال کپور۔ لیکن ان کے طنزیہ مضامین میں افسانویت کا عنصر بھی موجود ہوتا ہے۔ ان کے مضامین افسانے اور خاکہ کا امتزاج ہوتے ہیں۔ طنز کے ساتھ ساتھ ان میں لطیف شستہ مزاح ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے کنہیا لال کپور اردو کے Stephon Lea Cock کہلائے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے اس سال تین مضامین لکھے ہیں۔ شیشہ و تیشہ۔ زیبِ داستان کے لئے۔ کافی ہاؤس۔ کرشن چندر کہتے ہیں کہ غیر معین خصوصیت

کنہیا لال کے طنزیہ مضامین کا طرۂ امتیاز ہے۔ بسا اوقات یہ پتہ نہیں چلتا آیا مصنف موضوع کی حمایت میں یا مخالفت میں لکھ رہا ہے۔ یہ خصوصیت "شیشہ آ میں بہت نمایاں ہے"۔ "زیبِ داستاں کے لئے" اور "کافی ہاؤس" بھی اپنے انداز بہت خوب چیزیں ہیں

مجروح سلطان پوری

سنّاٹا

میرے گذرے ہوئے لمحات کے ویرانوں سے سسکیاں لینے کی مغموم صدا آتی ہے
ہائے پھر جانے کہاں سے مرے اشکوں کی طرف اُسکی اُلجھی ہوئی سانسوں کی ہوا آتی ہے

اور وہ دُھندلائی سی بے رنگ گھٹا کے گیسو اُنکی لہروں میں کوئی صبح کوئی شام نہیں
شب کے ہاتھوں میں یہ چھنتا کا ٹوٹا ہوا جام دعوتِ زیست نہیں موت کا پیغام نہیں

میرے ہونٹوں پہ تڑپتے ہیں ابھی تک شکوے جانے اُس کی وہی نیچی سی نظر ہے کہ نہیں
میری بے مائگیٔ غم کو تو وہ کیا جانے اُسکے عارض پہ وہ ٹوٹا سا گہر ہے کہ نہیں

زرد رو چاند بھی خاموش ہے بادل کے قریب
پھر وہ شعلہ سا گرا اوٹ کے جنگل کے قریب

اپندر ناتھ اشک

معجزے

افراد :- ترکی ٹوپی والا گھنٹی والا . . .
لمبی چوٹی والا بزرگ . . . .
کرپان والا . . . اور دوسرے لوگ

اسٹیج : پیش منظر

اسٹیج کے بائیں کونے میں بائبل سوسائٹی کا محراب اور دروازہ ہے، جس کی پیشانی پر موٹے موٹے حروف میں لکھا ہے۔ "یسوع مسیح نے کہا اُٹھ اور [illegible] لنگڑی ہوئی" یہ بائبل سوسائٹی ایک بازار میں ہے۔ دائیں کونے میں بائیں طرف کی دکان کا نصف بورڈ جس پر موٹے موٹے الفاظ میں [illegible] کو لکھا ہوا ہے اور نصف دروازہ دائیں کونے میں نظر آتا ہے [illegible] سوسائٹی کی محراب سٹیج کے درمیان آتی ہیں۔ بائبل سوسائٹی [illegible] اور دوسری دکان کا [illegible]۔ دونوں دکانوں کے آگے فٹ پاتھ [illegible] کے ساتھ دائیں طرف سے بائیں طرف کو یا بائیں سے دائیں کو جانے والی تارکول کی سڑک نظر آتی ہے۔

پردہ اٹھنے پر بازار عام طور پر چلتا نظر آتا ہے۔ دو چار آدمی اپنے خیال میں کھوئے ادھر سے ادھر جاتے ہیں۔ ایک شخص ایک سیڑھی بائیں طرف کی دکان میں جاتی ہے۔ ایک حبشی سا [illegible] بائبل سوسائٹی میں داخل ہوتا ہے۔

کچھ لمحے بعد دکان کی طرف سے ایک مجذوب سا شخص سر پر ترکی ٹوپی رکھے بدن پر پھٹے گریبان کی میلی پھٹی قمیص اور ٹخنوں سے اونچا قدرے تنگ پا[illegible] اور

کثرتِ استعمال کے باعث ذرا آگے کو بڑھا ہوا پاجامہ پہنے سگرٹوں کے ایک
خالی ٹین کے بکس کو رسی سے کھینچتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ اور دونوں کانوں
کے درمیان آکر کھڑا ہو جاتا ہے

لمحہ بھر کے لئے وہ راستہ چلتے لوگوں کو دیکھتا ہے۔ پھر باآواز بائیبل سوسائٹی
کے محراب در دروازے پر لکھے ہوئے موٹو کو پڑھتا ہے۔

ـــ "یسوع مسیح نے کہا اُٹھ اور دوشیزہ اُٹھ کھڑی ہوئی . . ." ـــ (بائیبل سوسائٹی کے دروازے کی طرف دیکھ کر) بلاؤ اپنے یسوع مسیح کو کہ اس مردہ مچھلی کو زندہ کرے (پھر دانت پیستا ہوا منہ چڑاکر اور راہ چلتوں کو سنا کر) یسوع مسیح نے کہا اُٹھ اور دوشیزہ اُٹھ کھڑی ہوئی (دروازے کی طرف دیکھ کر) بلاؤ اپنے اس مسیح کو کہ اس مردہ مچھلی کو زندہ کرے۔

(اس کی آواز سن کر تین چار راہ چلتے اکٹھے ہو جاتے ہیں جن میں ایک لمبی چوٹی والا بھی ہے۔)

ـــ بدستور راہ چلتوں کو سنا کر) مسیح کا سب سے بڑا معجزہ یہ تھا کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ یہاں آکر میری اس مچھلی کو زندہ نہیں کر دیتے (دروازے کی طرف دیکھ کر) بلاؤ اپنے یسوع مسیح کو کہ وہ اس مردہ مچھلی کو زندہ کرے۔

(کچھ اور لوگ آجاتے ہیں، جن میں ایک کرپان والا بھی ہے)

لمبی چوٹی والا: کیوں بھئی بات کیا ہے؟

ترکی ٹوپی والا: المبلغ میں میں نے ایک معرکہ کا مضمون سپرد قلم کیا تھا جس میں عیسائی مذہب کی بنیادی خامیوں سے نہایت مدلل بحث کی تھی۔ میرے اس مضمون

کا کوئی معقول جواب دینے کی بجائے (دروازے کی طرف دیکھ کر) پادری بدھاوا رام نے اپنے اخبار میں رسول پاک کے معجزات پر اعتراض کیا۔ معراج کی حقیقت کو سمجھنا پادری بدھاوا رام کے بس کی بات نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ خداوند کریم نے رسول پاک کو ساتوں آسمانوں کی سیر کرائی اور وہ بھی اس قلیل عرصے میں کہ جس دروازے سے رسول پاک گئے تھے۔ اس کی کنڈی ان کے واپس آنے تک بھی ہل رہی تھی۔ اس معجزے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن اس پر غور و خوض کرنے کی بجائے پادری بدھاوا رام نے بے معنی و لغو اعتراض کیا ہے۔

کرپان والا۔ (رکتے رکتے) لیکن میاں اس پادری کے ڈبے میں کیا ہے۔

ترکی ٹوپی والا۔ مچھلی

کرپان والا۔ مچھلی؟

ترکی ٹوپی والا۔ ہاں مردہ مچھلی — میں پادری بدھاوا رام کو چیلنج دینے آیا ہوں کہ اگر حضرت عیسیٰ میں یہ طاقت تھی کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے اور وہ سچ مچ خدا کے بیٹے تھے تو وہ اپنے اس خدا کے بیٹے کو بلائے کہ وہ آ کر میری اس مردہ مچھلی کو زندہ کر کے اپنی سچائی کا ثبوت دے۔

لمبی چوٹی والا۔ (نہایت [illegible] پادری بدھاوا رام [illegible] اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک دوسرے چوٹی والے آدمی سے) سنو یہ وہی بدھاوا رام ہے جسے ہم نے شدھ کیا تھا لیکن جو ہمارے گرو شردھانند کو نہ مان سکا تھا۔

[illegible] [illegible] [illegible] والے۔

[illegible]

(پادری بدھا وارام دروازے سے جھانکتا ہے)

— ہاں پادری صاحب بتائیے اپنے خدا کے بیٹے کو کہ وہ اپنا کرشمہ دکھا کر اس مچھلی کو زندہ کرے (لوگوں کو سنا کر) اگر خدا امر اور سرودیاپک ہے تو خدا کا بیٹا امر اور سرودیاپک کیوں نہ ہوگا۔ اور کیوں نہ یہاں آکر اس مردہ مچھلی کو زندہ کرے گا۔

(کچھ اور لوگ بھیڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ایک سفید ریش بزرگ چپ چاپ آکر بھیڑ کے ایک طرف کھڑے تماشہ دیکھنے لگتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں بیگ اٹھائے اور دوسرے میں گھنٹی لئے ایک شخص سب سے پیچھے آکر کھڑا ہوتا ہے۔

ترکی ٹوپی والا: (نعرہ لگاتا ہے) آئے خدا کا بیٹا اور میری اس مردہ مچھلی کو زندہ کرے

(پادری بدھا وارام پھر اندر چلے جاتے ہیں)

لمبی چوٹی والا: ایک جلسے میں پادری بدھا وارام نے آریہ سماجیوں کو ودیش بینیتی کہا تھا اور اس بات کا مذاق اڑاتے ہوئے پادری صاحب نے مہرشی کی ذات پر حملے کئے تھے (لکچر دینے کے انداز میں ہوا میں ہاتھ گھماتے ہوئے اور ایڑیاں اٹھاتے ہوئے) مہرشی دیانند پورن برہمچاری تھے۔ ان کے مکھ پر اَدبھُت تیج اور ان کے انگوں میں اپار شکتی تھی۔ اپنے یوگ بل سے وہ ایسی آشچریہ جنک باتیں کر سکتے تھے۔ جو دوسروں کو چمتکار معلوم ہوتی تھیں۔ جالندھر میں ٹکا صاحب کی گاڑی کو انہوں نے پیچھے سے پکڑ لیا۔ گھوڑے زور لگا کر تھک گئے لیکن وہ تو برہمچاری کا بل تھا۔ ٹس سے مس نہ ہوئی گاڑی۔ معجزہ یہ ہوتا ہے اسے عقل قبول کرتی ہے۔ لیکن . . .

کرپان والا: (جوش سے آگے بڑھ کر) انہی پادری صاحب نے ہمارے گورو نانک صاحب کے معجزوں پر بھی نکتہ چینی کی تھی۔ اور مودی خانے کی بات کو لے کر مذاق اڑایا تھا۔

کرپان والے کا ساتھی وہ تو سبھی داں یہ کہتے ہیں ننکانہ صاحب کے لوگ اچھی طرح اس بات کو جانتے ہیں۔

کرپان والا گرو نانک صاحب کے بہنوئی جے پال لودھی سلطان کے ہاں ملازم تھے۔ گرو نانک صاحب کے پتا کالو رام نے اپنے بیٹے کو آوارہ سمجھ کر جے گوپال سے کہا کہ بھئی یہ تو سادھو سنتوں کی صحبت میں رہ کر آوارہ ہو رہا ہے اسے کہیں ٹھکانے پر بٹھاؤ۔ جے گوپال نے گورو صاحب کی سفارش کر کے انہیں مودی خانے کا انچارج لگوا دیا۔ گورو صاحب دریا دل فقیر وہ کیا جانیں حساب کتاب۔ جو سائل آتا ان کے در سے خالی نہ جاتا۔ سادھو سنت بھی فقیر سب مودی خانے سے من مانی خیرات پانے لگے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر سلطان تک جا پہنچی کہ تمہارا تو مودی خانہ ہی لٹا جا رہا ہے۔ بس سلطان نے جانچ پڑتال کا حکم دیا۔ مودی خانے کا حساب ہونے لگا۔ گورو صاحب ترازو لیکر تولنے لگے۔ ایک دو تین بارہ۔ ۔ تیرہ پر جا کر انہوں نے آگے گننے کے بجائے تیرہ تیرا میں تیرا کا پاٹھ شروع کر دیا۔ سارا مودی خانہ تل گیا۔ اور جتنا گورو صاحب کے چارج میں دیا تھا اس سے بھی زیادہ نکلا (دروازے کی طرف دیکھ کر) پادری بدھاوارام ایک جلسے میں کہتے تھے۔ "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟" میں ان سے پوچھتا ہوں۔ یسوع مسیح نے کس طرح روٹی کے دو ٹکڑوں اور تین مچھلیوں کو برکت دے کر ان سے اپنے ہزاروں پیروؤں کی بھوک مٹائی تھی۔ اور سب کے کھا چکنے کے بعد بھی چھبے ٹوکرے بھر روٹیاں اور مچھلیاں بچ گئی تھیں۔

ترکی ٹوپی والا آئے مسیح اور اپنا معجزہ دکھا کر میری اس مردہ مچھلی کو زندہ کرے۔

سفید ریش بزرگ (جو بڑے انہماک سے ان لوگوں کی باتیں سنتے رہے ہیں) ارے

بھائی وہ زمانے اور تھے، اب وہ لوگ کہاں؟ ہے کسی میں ہمت کہ آج ایک بھی ایسا معجزہ دکھائے۔

(گھنٹی والا زور سے اپنی گھنٹی بجاتا ہے)

ترکی ٹوپی والا (پھر نعرہ لگاتا ہے) بلاؤ مسیح کو کہ میری اس مردہ مچھلی کو زندہ کرے۔

گھنٹی والا، (گھنٹی بجاتا ہوا اور بھیڑ کو چیر کر آگے آتا ہوا) میں مچھلی زندہ کرتا ہوں۔

(لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہیں)

—(بدستور گھنٹی بجاتا اور آگے بڑھتا ہوا) میں مچھلی زندہ کرتا ہوں۔ میں مچھلی زندہ کرتا ہوں۔ [بھیڑ کے درمیان آکر یہی صدا لگاتا ہوا گھومتا ہے، جس سے ایک چھوٹا سا دائرہ بن جاتا ہے اور ترکی ٹوپی والے میاں صاحب اور گھنٹی والا درمیان رہ جاتے ہیں۔ گھنٹی والے نے کشتی نما ٹوپی لیے حد نفیس کھلے کالر کی قمیص اور اس پر کوٹ پہن رکھا ہے۔ اسکی کمر میں بڑے پھیر کی شلوار ہے اور پاؤں میں چمکتے پمپ شوز مونچھیں اسکی بڑی بڑی ہیں اور نوکوں کو اس نے شاید موم لگا رکھا ہے ـــ اس کے مقابلے میں ترکی ٹوپی والا محض بھکاری معلوم ہوتا ہے۔]

— (درمیان میں اپنا بیگ رکھ کر اور ایک بار پورے زور سے گھنٹی بجا کر) میں مچھلی زندہ کرتا ہوں۔ میں مچھلی زندہ کرتا ہوں (ایک لمحہ تک صرف گھنٹی بجاتا ہے) اس دم آپ کے دیکھتے دیکھتے اس مچھلی کو، اس مردہ مچھلی کو زندہ کر دوں گا۔ صرف مجھ پر اعتماد رکھیے

سفید ریش بزرگ (جیسے اپنے آپ) ہم لوگوں میں اعتقاد ہی کی تو کمی ہے۔

گھنٹی والا: (ایک بار پھر گھنٹی بجاتا ہوا) لیکن مہربان حضرات اس سے پہلے کہ میں سگرٹ کے بکس میں پڑی ہوئی مردہ مچھلی کو زندہ کروں۔ میں مردہ اور بے جان انسانوں کو زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس کی جان ہزاروں

بلکہ لاکھوں مچھلیوں سے قیمتی ہے — مچھلی کو زندہ کرنے سے پہلے میں انسانوں کو زندہ کرنا چاہتا ہوں۔

کریانے والا: انسانوں کو؟

گھنٹی والا: مہربان آج زندہ انسان کہاں ہیں؟ سو میں سے ایک شخص کے چہرے پر زندگی کی رمق دکھائی دیتی ہے۔ مرجھائے ہوئے زرد چہرے، بے نور اُداس آنکھیں، سوکھے ہڈیوں سے جسم — یہ زندہ انسان ہیں — حضرات یہ چلتے پھرتے مُردے ہیں۔ وہ دم خم، وہ تاب و تواں وہ شجاعت و دلیری، وہ حوصلہ و ہمّت اب کہاں ہے؟ (گھنٹی بجا کر) اور حضرات ایسا کیوں نہ ہو۔ آج ہمیں ضروریاتِ زندگی ہی میسّر نہیں۔ (اور بھی اونچی آواز میں سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے) کتنے لوگ سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ خالص دودھ اور گھی استعمال کرتے ہیں۔ خالص دودھ اور گھی عام لوگوں کے لئے ایسی نعمتیں بن گئی ہیں، جن کا ملنا جنّت میں ممکن ہو تو ہو، اس دنیا میں تو ممکن نہیں۔

بزرگ: سچ ہے بھائی سچ ہے۔

(بازار چلتا رہتا ہے۔ کچھ لوگ آتے اور کچھ لوگ جاتے رہتے ہیں)

گھنٹی والا: دودھ گھی تو دور ہمیں خالص ہوا اور پانی بھی میسّر نہیں۔ یہ مچھلی مردہ ہے کیوں؟ اس لئے کہ یہ پانی کے باہر ہے۔ اسے اس کی غذا میسّر نہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ زندہ درگور ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہمیں ہماری غذا میسّر نہیں۔ دیہات میں جائیے۔ اب بھی آپ کو چھ چھ، سات سات فٹ اونچے سینتیس سینتیس انچ چوڑے سینوں والے جوان ملیں گے کھلی ہوا تازہ دودھ اور خالص پانی — لیکن کون ہے مائی کا لال جو سینے پر ہاتھ مار کر اس بات کا دعوےٰ کر سکتا ہے کہ اُسے یہ سب میسّر ہیں۔

ماسم

(بزرگ متاثر ہو کر سر ہلاتے ہیں کہ ٹھیک ہے بھائی تو جو کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے)

گھنٹی والا: (گھنٹی کو پھر ایک بار بجاتا ہُوا) لیکن یہ غریب جانور اپنی موت کا خود ذمہ دار نہیں۔ اسے میاں صاحب پانی سے نکال لائے ہیں۔ اس کا بس چلتا تو یہ اپنی زندگی اپنے ہاتھوں نہ دیتا۔ لیکن ہم اشرف المخلوقات انسانوں میں سے بیشتر اپنی زندگی کو زندگی کے بیش بہا جوہر کو اپنے ہاتھوں اپنے بچپن یا جوانی میں گنوا دیتے ہیں۔ صاحبان! جو غذا ہم کھاتے ہیں اس کا رس بنتا ہے۔ اس سے خون، خون سے چربی، چربی سے ہڈّی، ہڈّی سے گودا، اور گودے سے وہ جوہر بنتا ہے، جس سے ہمارے دل و دماغ اور اعصابی نظام کو تقویت پہنچتی ہے۔ جس سے مَرد مرد کہلاتا ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جو اپنی نادانیوں کے باعث ہم بچپن یا جوانی میں گنوا دیتے ہیں۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی مُردوں سے بدتر ہو جاتے ہیں۔ اس بات کا سہرا استاد مرحوم فخر الاطبّا مسیح الملک خدائے حکمت، جناب فخر الدین صاحب کے سَر ہے کہ انہوں نے اس جوہر کو برقرار رکھنے اور مرد کو پھر سے مَرد بنانے کیلئے وہ نسخہ حاصل کیا، جس سے مُردہ سے مُردہ انسان بھی زندگی کی انگڑائی لینے لگتا ہے۔

(پھر دائرے میں چکر لگاتا ہے)

—— میں مچھلی زندہ کرتا ہوں۔ میں مچھلی زندہ کرتا ہوں۔ میں مچھلی زندہ کرتا ہوں۔ . . (پھر اپنی جگہ کھڑے ہو کر گھنٹی بجاتے ہُوئے) میاں صاحب! اس مچھلی کو یہاں میرے سامنے لائیے۔ (میاں صاحب بکس کو کھینچ کر اس کے سامنے لاتے ہیں) ہاں مہربان! اس مَیدان میں اس مچھلی کو رکھ دیجئے۔ میں چشم زدن میں آپ سب کے دیکھتے دیکھتے اسے زندہ کر دوں گا۔ ایسی ایسی دوائیں استاد مرحوم نے تیار کیں کہ بارہا مرتے مرتے لوگ اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ سانپ کے زہر کی ایک دَوا میرے پاس ہے۔ مالوے اور ماجھے کے بنجر علاقوں میں بیسیوں تنومند

جاٹ ہر سال سانپوں کا شکار ہو جاتے تھے۔ استاد مرحوم کے حکم سے میں نے ایک جاگر دوا تقسیم کی۔ کیا مجال ہے کہ پچھلے دس سال میں سانپ کاٹے سے موت کی ایک واردات ان علاقوں میں ہوئی ہو (بیگ سے ایک نیلی سی ٹکیا نکالتا ہے) مہربان! لوہا لوہے سے کٹتا ہے، اسی طرح زہر کا اثر بھی زہر ہی سے زائل ہوتا ہے۔ استا کہا کرتے تھے "زہر کو کاٹنے کے لئے زہر مہابلی ہے"۔ اور اس لئے انہوں نے اہم زہ سانپ کے زہر میں کھرل کر کے، دن رات کی محنتِ شاقہ کے بعد، یہ ٹکیہ تیار کی۔ کہیں سانپ، بچھو، کن کھجورا، شہد کی مکھی، بھڑ یا کوئی اور زہریلا جانو جائے، لعابِ دہن یا پانی میں گھس کر اسے لگا دیجئے، منٹوں ہی میں زہر کا اثر زائل (گھنٹی بجاتا ہوا) جس بھائی کو ضرورت ہو ہاتھ کھڑا کرے۔ استاد مرحوم نے کہا تھ زندگی دینا ہے دام نہ لینا"! اس ٹکیا کی قیمت لینا میرے لئے حرام ہے (بیگ سے ٹکیاں نکالتے ہوئے) جس جس بھائی کو ضرورت ہو ہاتھ کھڑا کرے۔

(ٹکیاں بانٹنے لگتا ہے۔ آہستہ آہستہ سب ہاتھ کھڑے کر دیتے ہیں۔)

—— لیکن اب سب لوگوں نے ہاتھ کھڑے کر دئے (دی ہوئی ٹکیاں واپس لے کر) سب کو ضرورت ہے؟ (چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی طرف دیکھ کر) کیوں بے تجھے ک سانپ کاٹے جاتا ہے۔ (لوگ ہنستے ہیں، لڑکے خجل ہو کر ہاتھ نیچے کر لیتے ہیں)

—— حضرات! اس طرح کام نہ چلے گا۔ ضرورت اور غیر ضرورت مند کا پتہ لگا لئے استاد مرحوم ایک گر ہمیں بتا گئے ہیں۔ (گھنٹی بجاتے ہوئے) دیکھئے مہربان! ا کی قیمت چار آنے ہے۔ انسانی جان کی قیمت لاکھوں روپے سے بھی زیادہ ہے۔ لیک جان کو بچانے والی اس ٹکیا کی قیمت صرف چار آنے ہے۔ استاد مرحوم نے کہا تھا

زندگی دنیا دام نہ لینا۔ حضرات یہ دام نہیں۔ یہ صرف لاگت ہے۔ اس ٹکیا کی قیمت صرف چار آنے ہے۔ اب جن اصحاب کو ضرورت ہو ہاتھ کھڑا کریں۔

(کچھ لوگ ہاتھ گرا دیتے ہیں۔ کچھ اس تذبذب میں ہیں کہ ہاتھ کھڑا کرے، رکھیں یا نہ رکھیں۔ انہی کی طرف مخاطب ہو کر)

—— چار آنے! اس ٹکیا کی قیمت صرف چار آنے ہے۔ صرف ضرورتمند اصحاب ہاتھ کھڑا رکھیں۔ (صرف پانچ چھ اشخاص ہاتھ کھڑے رکھتے ہیں۔ باقی گرا دیتے ہیں۔)

—— لائیے جناب چار چار آنے (پیسے لیتا ہوا) لیکن ہاتھ کھڑے رکھئے گا مہربان۔ (سب کے پیسے وصول کر لیتا ہے اور عجیب فراخ دلی سے مسکراتا ہے) —— (ہاتھ سے پیسوں کو دیکھتے ہوئے) دیکھئے! جن اصحاب کو ضرورت تھی۔ انہوں نے قیمت دے کر بھی ٹکیا خرید لی۔ مہربانو! آپ کو سچ مچ ضرورت ہے۔ لیجئے پیسے بھی لیجئے اور ٹکیا بھی لیجئے،

(جن جن لوگوں نے پیسے دئے تھے ان کو پیسے اور ٹکیا دونوں چیزیں واپس کرتا ہے)

—— (پھر اپنی جگہ آ کر اسی فراخ دلانہ مسکراہٹ کے ساتھ) استاد مرحوم نے کہا تھا بیٹا زندگی دنیا دام مت لینا۔ (زور سے گھنٹی بجاتے ہوئے) ہاں تو میاں جی، آپ ہی اس مچھلی کو لائے ہیں نا۔

ترکی ٹوپی والا: ہاں بھئی میں ہی لایا ہوں۔

گھنٹی والا: زندہ لائے تھے یا مُردہ۔

ترکی ٹوپی والا: مُردہ!

گھنٹی والا: (عجیب اعتماد کے ساتھ) دیکھ لیجئے، زندہ تو نہیں ہو گئی۔

ترکی ٹوپی والا: (مچھلی کو اُٹھا کر پھر وہیں رکھتے ہوئے) نہیں جی! مُردہ ہے۔

گھنٹی والا: (مجمع کی طرف متوجہ ہوکر) راجہ بھرتری ہری نے ایک جگہ لکھا ہے — سمندر قطرہ بھر شہد سے میٹھا ہوسکتا ہے۔ بید مجنوں کو پھول آسکتے ہیں لیکن جاہل سے بات منوائی نہیں جاسکتی۔ وجہ کیا ہے مہربان؟ یہی کہ جاہل کو اپنی بات کے علاوہ کسی دوسرے کی بات پر یقین نہیں آتا۔ اور عقلمند کو اشارہ کافی ہے (گھنٹی بجاتا ہوا دائرے میں چکر لگاتا ہے) یقین کیجئے حضرات! یہ مچھلی جو اس وقت اس ٹین کے ڈبے میں بے حس و حرکت پڑی ہے، زندگی کی تڑپ سے اچھل اچھل پڑے گی۔ خود استاد مرحوم ایک بار اپنی جوانی میں اس مچھلی کی طرح بے جان سے ہو گئے تھے۔ انہوں نے خود ایک بار بتایا تھا کہ قبیح عادات کی وجہ سے وہ خود جوانی میں زندگی کے جوہر کا خاتمہ کر بیٹھے تھے۔ علاج معالجہ سے مایوس ہوکر وہ پہاڑوں کو نکل گئے تھے، تاکہ ممکن ہے کوئی قابل سنیاسی مل جائے تو ان کی مشکل کشائی ہو۔ ستمبر ۱۸۵۲ء کی بات ہے کہ وہ گڑھوال کے مشہور شہر کرن پریاگ میں پہنچے۔ وہاں سرائے میں انہیں اس خضر صورت فقیر کی ملاقات کا شرف ملا جس نے انہیں نہ صرف دوبارہ زندگی دی بلکہ طب کا وہ شوق عطا کیا جس کی وجہ سے استاد مرحوم نے ہزاروں مایوس انسانوں کی اُمید بندھائی۔ اور انہیں طاقتور اور توانا بنا کر زندگی کی کشمکش کے لئے تیار کیا۔ (بائیبل سوسائٹی کے دروازہ پر لگے ہوئے فوٹو کو دیکھ کر) یسوع مسیح نے کہا اُٹھ اور دوشیزہ کھڑی ہوئی۔ غالباً ان کے ہاتھ میں مسیحائی تھی۔ اس کے لمس ہی سے مُردے زندہ ہوجاتے تھے۔ لیکن یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے پاس کوئی ایسی تیر بہدف دوا نہ ہوگی جس سے مُردے تک زندہ ہوجائیں۔ ایسی ہی دوا اس سفید ریش سنیاسی نے استاد مرحوم کو مرحمت فرمائی تھی۔ (بیگ سے سنہری گولیوں کی ایک شیشی نکالتا ہے) یہ وہ تیر بہدف

مجرّب دوا ہے (گھنٹی بجا کر) گڑھوال کے اپنے ہم سفر کی رعایت سے اُستاد مرحوم نے ان کا نام "گڑھوالی گولیاں" رکھا ہے۔ انہی کی وجہ سے استاد خود ۱۰۵ برس کی عمر تک زندہ رہے اور بڑھاپے میں بھی وہ جوانوں سے زیادہ طاقت رکھتے تھے اور بینائی ان کی ایسی تیز تھی کہ دس تو کیا بیس فٹ کے فاصلے سے چارٹ پڑھ سکتے تھے۔ (زور زور سے گھنٹی بجاتا ہے) نہ صرف یہ بلکہ استاد مرحوم نے اس کے اصلی نسخہ میں اور ادویہ ملا کر اسے ہر قسم کی کمزوری کے لئے تیر بہدف بنا دیا ہے۔ کبھی سر میں یا جسم میں چوٹ لگ جائے اور انسان کمزوری محسوس کر رہا ہو۔ غش کی حالت طاری ہو رہی ہو، گرم دُودھ سے ایک گولی دیجئے۔ فوراً طاقت بحال ہو جائے گی۔ کام کی زیادتی اور غذا کی کمی کے باعث دماغ کمزور ہو گیا ہو، نسیان یا بے خوابی کی شکایت ہو، یادداشت کم ہو گئی ہو۔ چیز رکھ کر بھول جاتے ہوں، رات کو نیند نہ آتی ہو۔ پیشانی میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہو، اعصابی نظام کمزور ہو گیا ہو، سات دن صبح شام دُودھ کے ساتھ ان گڑھوالی گولیاں کا استعمال کیجئے، اور پھر دیکھئے کہ یہ ٹانک مسیحائی اثر رکھتا ہے یا نہیں۔ اور پھر وہ لوگ جو بچپن یا جوانی میں اپنی لاعلمی یا بے وقوفی سے اپنے جسم کا قیمتی جوہر گنوا بیٹھے ہوں جنہیں خوبصورتی سے، زندگی سے نفرت ہو گئی ہو۔ جو شرم کے باعث کسی سے اپنا راز نہ کہہ سکتے ہوں۔ کمزوری کا گھن جنہیں اندر ہی اندر بُری طرح کھائے جا رہا ہو۔ اگر ۲۱ دن تک صبح شام اس ٹانک کا استعمال کریں، ان کی رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑنے لگیگا۔ ...... ان کی سب اُداسی بے چینی کافور ہو جائے گی۔ زندگی اور اس کی خوبصورتی انہیں پیاری لگنے لگیگی۔ اور جینے کو ان کا جی چاہے گا ـــــ (بیگ سے شیشیاں نکالتے ہوئے) زندگی دینا دام

مت لینا' استاد مرحوم کہا کرتے تھے۔ میرے پاس اس اکسیر کی صرف چند شیشیاں ہیں' جن اصحاب کو ضرورت ہو ہاتھ کھڑا کریں۔ (بہت سے لوگ ہاتھ اٹھا دیتے ہیں)

--- ہنستا ہے) آپ سب لوگوں کو ضرورت ہے۔ کاش میرے پاس اتنی شیشیاں ہوتیں۔ آپ لوگوں میں جن کو اشد ضرورت ہو' وہی ہاتھ کھڑا کریں ورنہ کسی کو بھی نہ ملے گی۔ (کچھ ہاتھ گر جاتے ہیں)۔

—(ایک نظر اُٹھے ہوئے ہاتھوں پر ڈال کر) نہیں ابھی نہیں' مہربانو میرے پاس بہت کم شیشیاں ہیں' جنہیں اشد ضرورت ہو وہی ہاتھ کھڑا رکھیں۔

(دو چار ہاتھ اور گر جاتے ہیں)

— حضرات! مجھے استاد مرحوم کا بتایا ہوا گر آزمانا پڑے گا۔ ضرورت مند کو غیر ضرورتمند سے الگ کرنے کی ترکیب استاد مرحوم نے بتائی ہے (گھنٹی کو ایک بار زور زور سے بجا کر) اس زندگی بخش دوا کی قیمت فی شیشی ایک روپیہ ہے۔ دو ہفتوں کی دوا — تیس گولیاں اس شیشی میں بند ہیں۔ اب جس شخص کو ضرورت ہو طلب کرے۔

(کچھ ہاتھ گر جاتے ہیں)، — (ایک نوجوان سے) کیوں بے تیرے پاس روپیہ ہے؟

(کھسیائی سی ہنسی کے ساتھ نوجوان ہاتھ نیچے کر لیتا ہے)

—(باقیوں کو گنتا ہوا) ایک دو تین چار .... دس! اور شیشیاں میرے پاس صرف نو ہیں۔ (چوٹی والے سے) کیوں برہمچاری جی آپ کو کیا ضرورت پڑ گئی؟

چوٹی والا: (خفیف ہو کر) میرے ایک مِتّر کو چاہیئے۔

گھنٹی والا: (جیسے اپنے آپ) شیشیاں میرے پاس صرف نو ہیں۔ (مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے) حضرات کان کھول کر سُن لیجیئے۔ اس شیشی کی قیمت ایک روپیہ

ہے جس شخص کے پاس ایک روپیہ ہے' وہی ہاتھ کھڑا کرے۔ (سب ہاتھ کھڑے رکھتے ہیں)

ـــ استاد مرحوم نے کہا تھا کہ بیٹا زندگی دینا دام نہ لینا۔ یہ ایک روپیہ ان تیس گولیوں کی قیمت نہیں، یہ صرف لاگت ہے۔ گھڑوال کے پہاڑوں سے تازہ جڑی بوٹیاں منگا کر یہ دوا تیار ہوتی ہے۔ رفاہِ عام کے لئے اسے محض لاگت پہ بانٹا جاتا ہے۔ (ایک بار زور سے گھنٹی بجا کر اور دائرے کا چکر لگا کر) زندگی بخشنے والی ان تیس گولیوں کی قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔ (ایک لمحہ چپ کھڑا رہتا ہے) میں پھر ایک بار عرض کرتا ہوں کہ اس بار روپیہ واپس نہ کیا جائے گا۔ (کوئی ہاتھ نیچے نہیں کرتا)

ـــ تو لائیے روپیہ (روپے اکٹھے کرتا ہے)

ـــ جن اصحاب نے روپیہ دیا ہے' وہ مہربان اپنے ہاتھ کھڑے رکھیں۔ (ترکی ٹوپی والے سے) میاں جی دیکھئے۔ اس بیگ میں اگر ایک شیشی اور ہو (مجمع سے) میں نے اپنے لئے ایک شیشی رکھ چھوڑی تھی۔ لیکن استاد مرحوم کہا کرتے تھے "بیٹا کسی کی زندگی بچتی ہو تو اپنی زندگی کی پروا نہیں کرنی چاہئے"۔

(میاں جی شیشی نکال لاتے ہیں اور وہ دسوں شیشیاں بانٹ دیتا ہے)

ـــ صاحبان میں آپ لوگوں کا بڑا مشکور ہوں کہ آپ نے اتنا وقت مجھ خاکسار کو دیا۔ میری یہی دعا ہے کہ یہ زندگی بخش دوا آپ کو صحتِ کلی عطا کرے۔

(بیگ اٹھا کر چلنے کو ہوتا ہے)

چوٹی والا: (شیشی کو ایک بار ادھر ادھر سے دیکھ کر) لیکن مجھے تو یہ دوا نہیں ....

کرپان والا: ارے بھائی وہ پہلی ....

گھنٹی والا: (جاتے جاتے رک کر) گھڑوالی گولیاں پتھر تک میں جان پیدا کر سکتی

ہیں، پھر مچھلی تو چیز ہی کیا ہے۔ لیکن مچھلی دودھ کے ساتھ گولیاں نہیں کھا سکتی
می چلیئے' اسے ہمارے مطب میں لے چلیئے۔ وہاں ہم دریا کا پانی منگوائیں گے۔ اور انش
اس مچھلی کو پھر سے حیاتِ نو بخشیں گے ۔

(آگے آگے بیگ اٹھائے ہوئے گھنٹی والا اُس کے پیچھے ڈبے کی رسی تھامے میاں جی' ان کے پیچھے لوگ چلے جاتے ہیں۔)

لمبی چوٹی والا : (کُرتے کی آستین چڑھاتا ہوا ان کے پیچھے جاتا ہے) میں ا لیڈرے کو مزا چکھا دوں گا۔ میں ......

سٹیج پر صرف بزرگ رہ جاتے ہیں۔ کچھ لمحہ وہ دروازے پر لکھے ہوئے موٹو کو دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر جیسے اپنے آپ مسکراتے ہوئے ۔)

—— اعتقاد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ معجزے کیا آج نہیں ہو سکتے ۔

"ادبی دنیا"

نجیب الرحمٰن

کھنڈر

ظلمتِ شب میں صبحِ نو کی تلاش
کس قدر تیز گام ہے ہستی
اس گذرگاہِ عام پر ہر دم
وحشتوں کا ہجوم ہوتا ہے
کسکو فرصت ہے بات کرنے کی!
ورنہ یہ رازہائے سربستہ
حجلۂ دل میں چھپ سکتے تھے

سرنگوں ہوگئی ہیں دیواریں..
اور ویراں ہیں گنبد و محراب
ہر قدم خاکِ آستاں پہ مگر
اک نیا نقش چھوڑ جاتا ہے
سر تو جھکتے ہیں، سنگِ در نہ سہی
دیکھ کر اس کھنڈر کی ویرانی
کوئی سیّاح دل میں سوچے گا
"میرے ماضی کی یادگار ہے یہ!
جسکو تہذیب کے خداؤں نے
ایسی حالت میں چھوڑ رکھا ہے!"

پھر پسِ پردہ اُن جھروکوں میں
چند سائے لرزنے لگتے ہیں،
بے زبانی بنے گی رمز فروش
"آؤ! اے نور کے پرستارو!
تم ہی جانتے کہ ظلمت میں
کتنے آتشکدے فروزاں ہیں!
گو رہینِ شفق ہے پھول کا رنگ
پھر بھی اِس سے چمن کی زینت ہے"

ڈھونڈھ ہی لیں گی بیقرار آنکھیں
اپنے مسکن کو، اپنی منزل کو
(کتنے رہرو بھٹکتے پھرتے ہیں
ایک موہوم سی تمنّا میں
ظلمتِ شب میں صبحِ نو کی تلاش!)
آج بھی یہ خرابۂ ہستی
زائرینِ جہاں کا مرکز ہے
اِس کے ٹوٹے ہوئے در و دیوار
دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں

بڑبڑاتا ہے نیند میں کوئی
"جلد اس گندگی کو صاف کرو!

سَر پھٹا جا رہا ہے بدبُو سے
شہر میں ہے وبا کا زور، مگر
اِس حکومت کو کوئی فکر نہیں!

لگ کے چوکھٹ سے سو گئی اُمید
اور دہلیز پہ خموشی نے
بسترِ سحرِ خواب کھول دیا
اب یہاں کوئی بھی نہ آئے گا!
کہہ دو ان ٹمٹماتے تاروں سے
شبِ فردا کا انتظار کریں!

نیا دور

صمد شاہین

توھین

ہزار حیلے سوچ رکھے تھے کہ کس طرح اس مخمصے سے چھٹکارا ہو۔ چلو چھٹی ہوئی۔ خود انہوں نے اپنی طرف سے معذرت لکھوا بھیجی ہے کہ انہیں معاف کیا جائے۔ انہوں نے لڑکی کا رشتہ کلکتہ والے لڑکے سے طے کر دیا ہے۔ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔

پرشوتم کا خط پاکر حامد کو ایک گونہ اطمینان سا ہوا۔ اس کے سر سے گویا ایک بوجھ سا اتر گیا۔ خط دراصل اس کے نام نہ تھا، جاوید کے نام تھا، اور معاملہ بھی تو جاوید ہی سے متعلق تھا۔ لیکن جاوید کا معاملہ گویا اس کے اپنے معاملوں سے کوئی الگ ہوا! ان دونوں میں کوئی بات چھپی ہوئی نہ تھی۔ وہ ایک دوسرے کے خط پڑھ لیتے تھے۔ چنانچہ یہ خط پڑھکر حامد کو بہت ہی خوشی ہوئی۔ وہ سوچنے لگا خط پڑھکر واقعی جاوید کو کتنی خوشی ہوگی اب۔ اسی نے تو حامد سے کہا تھا نا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچنی چاہئے کہ بیجواڑہ جانے کی زحمت بھی اٹھانی نہ پڑے۔ ترکیب جو نکل آئی ہے یہ —— پرشوتم کا خط...

. . . . پرشوتم نے میسور سے رخصت ہوتے ہوئے کہا تھا

"میری طرف سے تو پورا اطمینان ہے۔ لڑکی کے گھر والے بھی مان جائینگے۔ سمجھ لیجئے۔ بات نوے فیصدی طے ہو چکی۔ پھر بھی چونکہ معاملہ لڑکی اور لڑکے کا ہے۔ ایک بار وہ مل لیں تو بہتر ہوگا۔ کیوں حامد صاحب؟ آپ بھی مسٹر جاوید کے ساتھ بیجواڑہ تشریف لائینگے نا۔ آئیے ضرور آئیے۔ بیجواڑہ پہنچ کے میں لکھونگا . . . .

پرشوتم سے آخری ملاقات رتن سوامی کے مکان پہ ہوئی تھی۔ وہاں سے واپس لوٹتے، حامد

ر جاوید کے درمیان راستہ بھر اسی معاملہ پر گفتگو رہی . . .

جاوید بولا "ایسا معلوم ہوتا ہے اُسے ہماری سب شرطیں منظور ہیں" "مجھے
اُمید نہ تھی پرشوتم ہماری ہر بات مان لیگا۔" "نہ جانے یہ چمگاڈر کی طرح ہم سے کیوں
ٹ گیا ہے"۔ . . ہاں 'یہ کیوں چمٹ گیا ہے'! حامد نے سوچا' وہ لاکھ برہمو سماجی سہی'
ر بھی ہندو ہیں۔ پرشوتم کا کہا ٹھیک بھی ہو کہ انہیں برہمنوں اور کٹر قسم کے ہندوؤں
ے نفرت ہے تو انہیں کوئی ایسا آزاد خیال نان برہمن ہندو ہی نہیں ملسکتا تھا؟
ب مسلمان کا کیسے خیال آسکا انہیں! اور پھر اتنی دُور' کہاں بیجواڑہ' کہاں میسور . . .
ر لڑکی کے والد وجیا نگرم سٹیٹ کے دیوان رہ چکے ہیں۔ پھر تو کافی مالدار ہوں گے۔
راس نے تو پرشوتم پر اپنی عزت جتانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ . . . اس کے
ے کی کیا ضرورت تھی؟ پرشوتم کو خود اس کا اندازہ لگ گیا ہوگا جب وہ اُن کے گھر
ا یا ہوا تھا . . . . . . حامد کے گھر سے کچھ اوپر تانگہ رُکا۔ اور اس میں سے' گرم
ٹ میں ملبوس' ادھیڑ عمر کا ایک کالا آدمی نیچے اُترا اور ایک موٹی سی لکڑی کا سہارا
' دوسرے ہاتھ میں ایک چرمی بیگ پکڑے' بائیں پیر کو کچھ گھسیٹتا حامد کے مکان
طرف آیا۔ حامد دروازہ ہی پر کھڑا تھا۔ اس نے سوچا' ہو نہ ہو یہی پرشوتم ہوگا۔ کل ہی
دید کے نام پرشوتم کا خط آیا تھا کہ وہ صبح کی گاڑی سے میسور پہنچ رہا ہے' اور
یب گیارہ' ساڑھے گیارہ ہی تو تھے جاوید کے مکان پر آکر ملیگا۔ ساڑھے گیارہ ہی تو
ے۔ پرشوتم وقت کا کتنا پابند تھا۔

"معاف فرمائیے۔ جاوید صاحب کا یہی مکان ہے"

"جی ہاں۔ آئیے۔ اندر تشریف لائیے' اور آپ غالباً مسٹر پرشوتم ہیں!" پرشوتم

نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور لنگڑاتے کمرہ میں داخل ہوا۔ بید کی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کمرہ پر ایک چلتی سی نگاہ دوڑائی۔ حامد اس درمیان کافی کے لئے نوکر سے کہہ کر کمرہ میں چلا آیا: "کیسے سفر خوب رہا۔ بیجواڑہ سے کب روانہ ہوئے آپ۔"

"تین دن ہوئے۔ ایک دن کے لئے مدراس ٹھہر گیا تھا۔ اب وہیں سے سیدھے یہاں آ رہا ہوں۔ پیر میں بہت تکلیف ہے۔ دو سال ہوئے "سنٹرل" پلاٹ فارم پر پھسل کے گر پڑا تھا۔ تب سے یہ درد چپٹا ہوا ہے"۔

"پھر تو آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی ...." حامد نہ جانے اور کیا کہنا چاہتا تھا، پرشوتم اسے سیدھے مطلب کی طرف کھینچ لایا۔ "شاید آپ ہی مسٹر جاوید ہیں"۔

"جی نہیں۔ مجھے حامد کہتے ہیں۔"

"تو اچھا آپ ان کے بڑے بھائی ہیں۔ مجھے معلوم ہے"۔

"جی ہاں"۔ حامد سوچنے لگا پرشوتم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ جاوید کا بڑا بھائی ہے خیر

"تو جاوید صاحب بھی یہیں ہونگے۔"

"جی ہاں۔ رہتے تو یہیں ہیں، لیکن باغیچہ کی دیکھ بھال کے لئے آجکل گاؤں گئے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا، وہیں چکمگلور گئے ہونگے"۔ ارے یہ شخص پرشوتم تو سبھی کچھ جانتا ہے! "کب تک لوٹینگے"؟

"شاید جلد نہیں۔" "تو ہاں حامد صاحب، مجھے مسٹر جاوید سے ایک ضروری کام تھا۔"

"کوئی ہرج نہیں، مجھ سے بیان کیجیے۔"

"جی یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ کچھ پرائیویٹ"

"جاوید تو مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے۔ یہ الگ بات ہے اگر آپ کہنا نہ چاہیں۔

..... میں مجبور نہیں کرتا آپ کو۔"

"جی نہیں۔ یہ بات نہیں۔ دراصل" پرشوتم نے چھت کی طرف نظر اٹھائی اور کن انکھیوں سے حامد کو دیکھتے ہوئے اپنا بیان شروع کیا۔ "دراصل معاملہ ان کی شادی کا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا مہینہ ڈیڑھ مہینہ پیشتر مدراس کے اخبار 'ہندو' میں مسلسل تین چار دن تک 'ضرورت رشتہ' کا اشتہار چھپتا رہا تھا۔ ایک ایم۔ اے بی' ای ڈی' برہمو لڑکی کی ضرورت بر کے لئے (چھپا ہوگا! حامد کو 'ضرورت رشتہ' کے کالم سے کوئی تعلق دلچسپی نہ تھی۔ ایک تو اس لئے کہ اس کی اپنی شادی ہو چکی تھی' اور دوسرا' اس کا خیال تھا' کہ ضرورت رشتہ کا اشتہار صرف انہیں لڑکیوں کی طرف سے ہوتا ہے جن کو کسی دوسری حیثیت سے بیاہے جانے میں رکاوٹیں درپیش ہوں) ... لڑکے کے لئے ذات پات' مذہب ملت کی کوئی تخصیص نہیں۔ جاوید صاحب کی بھی اس سلسلہ میں ایک درخواست آئی ہے۔ اس ضمن میں میں یہاں آیا ہوں'۔ دراصل لڑکی والوں کی طرف سے یہ اشتہار میں نے ہی چھپوائے تھے۔ ان لوگوں کا میں گویا فیملی اڈوائزر (Family Adviser) ہوں۔ لڑکی کا نام ہے اوشا دیوی ان کی ایک چھوٹی بہن ہیں' جن کی شادی ہو چکی ہے۔ اور ان سے چھوٹی اب آندھرا یونیورسٹی میں انٹرمیڈیٹ کے لئے پڑھ رہی ہیں۔ بس یہ تین ہی صاحبزادیاں ہیں۔ وجیانگرم کے سابق دیوان صاحب کی .....۔"

"وجیانگرم دیوان صاحب کی؟" "جی ہاں پہلے کے دیوان صاحب کی"۔

اجازت ہو تو ایک بات اور پوچھوں۔ یہ جو شادی شدہ صاحبزادی ہیں' دیوان صاحب کی' آپ نے کہا اوشا دیوی سے چھوٹی ہیں؟" "جی ہاں"۔

"وہ کیا پاس ہیں؟" "وہ بنارس میں انٹر کے لئے پڑھ رہی تھیں کہ گھر والوں نے شادی کر دی۔" "کئی سال ہوئے؟" "کوئی پانچ سال۔"

ایسی کیا جلدی تھی جو چھوٹی کی شادی کر دی اور بڑی بیٹھی ہے۔ حامد نے سوچا۔ کوئی اچھی سی نسبت آئی ہو گی۔ پھر اسے خیال آیا۔ لیکن ان کے ہاں تو لڑکی والے لڑکے کی تلاش میں جاتے ہیں۔ پرشوتم ہی سے پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔

". . . کوئی اچھی سی نسبت آئی ہوگی۔ لیکن آپ کے ہاں تو لڑکی والے دیکھنے جاتے ہیں نا۔"

پرشوتم نے خجل ہوتے ہوئے کہا۔ "ہونا تو یہی چاہئے۔ مگر آج کل کی لڑکیوں کے متعلق تو آپ جانتے ہی ہیں۔"

"شاید کوئی لو افیر (Love Affair) ہو گیا ہوگا۔ اس میں شرمانے کی کیا بات ہے مسٹر پرشوتم۔ پونا اور بمبئی میں تو اس کا بڑا عام رواج ہے۔ شادی سے پہلے کورٹ شپ کو میں برا نہیں سمجھتا۔ ہاں ان کی لو میرج ہوئی کس سے ہوئی؟" حامد نے بغیر سوچے، بے تکلفانہ سوال کیا۔ پھر خیال آیا کالج ہی کا کوئی خوش قسمت ہم جماعت لڑکا ہوگا۔

پرشوتم نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ حامد نے دیکھا۔ پرشوتم کی سیاہ، چمکتی پیشانی پر پسینہ کی چند بوندیں آ گئی ہیں۔ شاید وہ اپنی شرمندگی کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا . . . . اس میں شرمانے کی کیا بات تھی؟ حامد کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ اس دفعہ اس نے کچھ پہلو بدلتے ہوئے پوچھا "تو لو میرج نہیں ہوئی۔"

"نہیں" پرشوتم آنکھیں نیچی کرتے ہوئے بولا۔

لڑکی نے کہیں محبت کی ہو گی، حامد نے سوچا، اور پھر معاملہ طول پکڑنے سے پہلے ہی لڑکی والوں نے کسی دوسری جگہ اس کی شادی کر دی ہو گی ۔۔۔۔ جب پرشوتم نے اسے بتایا کہ لڑکا معمولی سی لیاقت رکھتا ہے، اور پہلے غریب تھا اور آج کل انہیں کے ہاں رہتا ہے ۔۔۔۔ وجیانگر کے دیوان کی لڑکی، انٹرمیڈیٹ کی متعلم — اور پھر ایک غریب لڑکا معمولی سی لیاقت اور انہیں کے ہاں رہتا ہے ۔۔۔۔ حامد کو یقین ہو گیا، کچھ دال میں کالا ضرور تھا۔ چونکہ پرشوتم شرمندہ سا ہو گیا تھا، اس لئے اس بارے میں حامد نے اسے کرید کرید کر پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ یہی کیا کم تھا کہ کچھ نہ بتاتے ہوئے بھی پرشوتم نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ ٹال مٹول کر کے پرشوتم نے یہ بات اڑا ہی کیوں نہ دی؟ سچ ہے آدمی کتنا ہی چھپا ہوا کیوں نہ ہو وقت پر منہ کھول ہی دیتا ہے۔

پرشوتم کے تسلسل بیان کو بری طرح دھکا لگا تھا۔

کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے۔ بغیر کسی خیال کے حامد نے اس خاموشی کو توڑا۔ "مسٹر پرشوتم۔ آپ نے کہا وجیانگر کے سابق دیوان ۔۔۔۔ تو آجکل دیوان نہیں ہیں وہ"

"نہیں۔ ان کو سبکدوش ہوئے پانچ چھے سال ہو گئے۔ البتہ ان کے دو لڑکے ہیں۔ ایک ایم۔ بی بی۔ ایس ڈاکٹر پرائیوٹ پریکٹس کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ جائداد بھی سنبھالتے ہیں۔ بیجواڑہ میں ان کے بہت سے بلڈنگ ہیں اور وہیں نواحیت ہی میں کافی زمینات بھی ہیں۔ چھوٹے لڑکے نے ابھی ابھی بی اے پاس کیا ہے۔ سمجھ لیجئے خیر سے وجیانگر کے ہونے والے دیوان ہیں۔" پرشوتم نے اپنے آپ میں دلبستگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

لیکن گفتگو اصل موضوع سے ہٹی جا رہی تھی۔ حامد سے زیادہ پرشوتم کو اس کا

احساس ہو رہا تھا۔ اس لئے اس نے سیدھے اوشا ہی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"تو میں یہ کہہ رہا تھا مسٹر حامد کہ اوشا دیوی کی شادی کے لئے میں نے مختلف اخباروں میں اشتہار چھپوائے تھے۔ اس سلسلہ میں بہت سی درخواستیں آئی ہیں۔ کوئی ساٹھ پینسٹھ کے قریب۔ ان میں سے تین ہم نے منتخب کی ہیں۔ ایک کلکتہ سے آئی ہوئی درخواست ہے۔ دوسری کٹک اوڑیسہ سے، تیسری یہ مسٹر جاوید کی، میسور سے۔ اور میں سب سے پہلے سیدھے یہاں میسور آیا ہوں۔ معاملہ یہیں اگر طے ہو جائے تو مجھے کلکتہ یا کٹک جانے کی ضرورت نہ رہیگی۔ بہت اچھا ہوگا اگر آپ جاوید صاحب کو دو ایک دن کے لئے یہاں بلالیں۔ کام کو ادھورا چھوڑ کر آنے میں تکلیف تو ہوگی ضرور۔ اس کا مجھے احساس ہے۔ لیکن کیا کیا جائے ....."

"آپ گھبرائیے نہیں۔ ابھی دو بجے کے اندر ہی میں انہیں تار دیدوں گا۔ کل شام یا پرسوں صبح تک وہ آجائینگے۔" حامد نے پرشوتم کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"بہت عنایت ہوگی۔ آپ کی۔ جی ہاں، ایسا کیجئے۔ شاید آپ اوشا دیوی کی تصویر دیکھنا پسند کریں۔" پرشوتم نے اپنا چرمی بیگ کھولتے ہوئے کہا اور ایک نہایت ہی خوشنما البم نکال حامد کے حوالہ کیا۔ اور پھر اپنی کرسی گھسیٹتے ہوئے حامد کے قریب آبیٹھا۔ "بہت سی تصویریں ہیں اس میں۔ آپ کو معلوم نہ ہوگا... کون کون ہیں۔ البم ذرا ادھر دیجئے، میں بتاؤں آپ کو" پرشوتم نے حامد سے البم واپس لیا اور دو چار ورق الٹنے کے بعد کھسیانی سی ہنسی ہنسکر ایک تصویر بتائی۔ یہ خود پرشوتم کی تصویر تھی۔ "ان کو تو آپ پہچانتے ہی ہوں گے"۔ پھر دو چار ورق الٹ کر "یہ ہیں سابق دیوان وجیانگرم، مسٹر گھوپنی .... یہ ان کے بڑے لڑکے سامبہ مورتی، یم۔ بی۔ بی۔ یس،"

یہ سامبہ مورتی سے چھوٹے سندر مورتی بی اے۔"

پرشوتم: سابق دیوان صاحب وجیانگرم کے خاندان کی تصویریں ہی نہیں بلکہ ان کے دوست احباب، خویش و اقارب کی تصویریں بھی بتائے جاتا تھا۔ اور پھر ساتھ ساتھ ہر ایک کی ہسٹری، ہر ایک کی تعریف و توصیف ـــ یہ بہت خلیق ہیں۔ یہ بڑے ملنسار ہیں . . . . یہ بہت یہ ہیں . . . . یہ بڑے وہ ہیں ـــ حامد کچھ اکتا سا گیا۔ اشارتاً اس نے پرشوتم کو سگریٹ پیش کیا۔ "معاف فرمائیے میں سگریٹ نہیں پیتا" "تو آپ کی اجازت سے . . ." "شوق سے، شوق سے"۔ حامد نے ایک سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کے حلقے بنا بنا کر چھت کی طرف چھوڑنا شروع کئے۔

پرشوتم نے اشارہ کو نہ سمجھا۔ وہ بدستور تصویریں بتائے جا رہا تھا۔ "یہ . . . . یہ . . . . مس رکمنی"۔ حامد نے اب توجہ کی۔ "یہ مس رکمنی، سابق دیوان صاحب جیانگرم کی چھوٹی لڑکی، آندھرا یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہیں۔ انٹرمیڈیٹ فیئل میں ہیں۔ اس کے بازو جو کھڑی ہیں، وہی مس اوشا ہیں۔ اور یہ مسز ساوتری راجہ راؤ، اوشا کی چھوٹی بہن ـــ کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے۔ یہ ـــ یہ اوشا کی ماتا ہیں۔ یہ زمیندار آف دیوندر پور، بڑے خوش باش انسان ہیں۔ . . ."

ساوتری حسین تھی۔ جبھی تو پریم کی نیا میں بہہ نکلی تھی . . . . اور رکمنی یہ بھی، خاصی اچھی تھی۔ ابھی تو وہ شگفتہ کلی ہی تو تھی۔ کون جانے آئندہ چل کر کیا گل کھلائے۔ اور مس اوشا، یہ تو پارسا ہی ہوگی ضرور۔ دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال و لمبوتری صورت، لمبی ناک اور لمبے لمبے آویزے، کان سے اتر کر کندھوں کو چھوتے ہوئے ـــ ان سب کو خمیدہ پشت پہ گردن کچھ عجیب انداز سے سنبھالی ہوئی۔

حامد کو "ہنتھ پرکولے" کی تشبیہ یاد آگئی۔ مس اوشا — اس کو تو پارسا ہی چاہیئے۔ لیکن حامد کی توجہ اس زمیندار آف دیویندرپور کی تصویر کی طرف کھنچ تھی، جس میں وہ دانت نکالے اپنی خوش باشی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ تصویر یہ شخص کتنا عیاش نظر آتا تھا۔ اس کی بوجھل آنکھوں سے، اسکی ہنسی سے عیاش پھوٹی پڑتی تھی . . . پرشوتم نے وہ ورق بھی الٹ دیا۔ پھر دوسری تصویر . . . . یہ لڑکی کے دادا ہیں، بہت بڑے رئیس۔ یہ ماموں ہیں، فلاں بڑے ع پر مامور۔ یہ چچا کئی زمینات کے مالک . . . . اُف! یہ چچا، یہ دادا، یہ ماموں حامد کو کیا پڑی تھی کہ ان سب کی ہسٹری سنتا جائے۔ رئیس اور عہدہ دار تو راجہ اور نواب ہوں، اس کی بلا سے، اسے کیا؟ اس نے تو لڑکی کی تصویر دیکھتے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ جاوید کا رشتہ اس سے نہ ہونے دیگا . . . . اُف! یہ نہ خ والا البم، اس پہ پرشوتم کی ہر تصویر کی لمبی چوڑی تشریح۔ حامد کے کان پک گئے۔ نے اکتا کر ایک اور سگریٹ سلگایا۔ اور اس کے اپنے خیالات میں محو ہو گیا۔ اب پرش کے الفاظ اس کے کانوں سے صرف ٹکراتے اور ہوا میں تحلیل ہو کر اس کے سگریٹ دھوئیں کے ساتھ فضا میں گم ہو جاتے۔

حامد سوچنے لگا۔ بیٹھے بٹھائے جاوید کو یہ کیا ہو جاتا ہے کہ سال دو میں ایک بار کسی ہندو لڑکی سے بیاہ رچانے کی اسے دھن سما جاتی ہے۔ کچھ اوپر سال ہی کا تو واقعہ ہے، جب وہ بی اے کے لئے کالج میں پڑھتا تھا، شانتا اس کا پریم ہو گیا تھا . . . . . . یہ کالج کے لڑکوں کا پریم بھی بڑا عجیب ہوتا ہے ان میں اکثریت تو پچاس فیصدی کی قائل نظر آتی ہے۔ یعنی رومیو کا اپنی طرف

پریم مکمل، پورے پچاس، بقیہ پچاس جولیٹ کی طرف سے۔ پریم کے خدا جانے۔ حامد کو نیاز محمد کا قصہ یاد آگیا۔ چار سال پہلے کا واقعہ تھا۔ نیاز تبھی تبھی بی اے کے دوسرے سال میں قدم رکھا تھا اور حامد بی۔ اے کے کانوکیشن (Convocation) کے لئے آیا تھا۔ نیاز سے پہلے کی جان پہچان تھی۔ لیکن بہت تھوڑی۔ کانوکیشن کے دنوں نیاز کے کمرہ میں ٹھہرنا پڑا تھا اور ڈگری لینے کے بعد بھی دو ایکدن نیاز کے اصرار سے ٹھہر گیا تھا۔ ایکدن شام میں جب حامد لوٹا تو نیاز کمرہ میں اکیلا بیٹھا تھا، چہرہ اترا ہوا، بال بکھرے ہوئے ..... "نیاز، کہو بھی تم آج اتنے اداس کیوں نظر آرہے ہو؟" بڑے اصرار کے بعد نیاز نے اپنی پریم بیتا کہنا شروع کی۔ حامد بڑے غور سے سُنتا رہا ۔۔۔ "تو ہاں تم جولیٹ۔ جولیٹ جو کہہ رہی ہو وہ کوئی اینگلو انڈین لڑکی ہے؟"

"نہیں یار، اس کا اصل نام گرجا دیوی ہے" پھر بعد میں حامد کو معلوم ہوا تھا کہ اس سال بی۔ اے کے نصاب میں شیکسپیئر کا ڈرامہ 'رومیو اور جولیٹ' بھی شامل تھا۔

"گرجا کے والدین کو پتہ ہے کہ تم اس سے پریم کرتے ہو؟" آگے چل کر حامد کو پتہ لگا کہ خود گرجا ہی کو اس کا علم نہیں، تو نیاز کو اس سے پریم کیسے ہوا؟ سنتے ہیں کانوکیشن ڈبیٹ کے دن چونکہ بھیڑ بہت تھی۔ ہال میں داخل ہوتے گرجا کی ساری کا پلو نیاز کے کوٹ کی آستین سے چھو گیا تھا۔ اور گرجا کی جھکی جھکی آنکھیں اُٹھیں ..... اور پھر جھک گئیں۔ گرجا ہال کے اندر چلی گئی اور نیاز دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا۔ دوسرے دن شام کے اندر اندر گرجا جولیٹ بن گئی۔ پھر کیا تھا۔ رومیو ہیں کہ جولیٹ کی تیر نیم کش کی خلش اپنے دل میں محسوس کر رہے ہیں۔ ہونٹوں سے کبھی کبھی ایک ہلکی سی آہ بھی نکل جاتی ہے۔ کمرہ میں کرسی پر اکیلے بیٹھے ہیں۔ سامنے میز پہ کتاب کھلی پڑی ہے اور آپ

سگریٹ سلگائے، دھوئیں کے حلقے بنا بنا کر اوپر چھوڑتے، محوِ تماشائے لبِ بام، پریم کی دنیا آباد کئے چلے جا رہے ہیں۔ ایک سال جب نیاز سے پھر حامد کی ملاقات ہوئی تو سب سے پہلی بات جو نیاز نے بتائی وہ گرجا کے متعلق تھی۔ "سنتے ہو حامد۔ گرجا کی شادی ہو گئی ... ... اس کے شوہر کا نام شاردا پرشاد ہے۔ انجنیئر ہے، ولایت پلٹ، آجکل بلگام میں رہتا ہے۔ گرجا اس سے ہرگز خوش نہیں ہے۔ کاش گرجا کو پتہ چل جاتا ..... پتہ چل جاتا کہ میں اس سے محبت کرتا تھا"۔ ہاں تو ایسا ہوتا ہے کالج کے لڑکوں کا پریم۔ پچاس فیصدی۔

لیکن شانتا سے جاوید کی محبت اس طرح کی نہ تھی۔ کیونکہ شانتا کو بھی جاوید سے محبت ہو گئی تھی۔ کیوں نہ ہوتی؟ اس سال جاوید یونین کا سکرٹری تھا۔ اس لحاظ سے دوسرے طالب علموں پر اُسے کچھ فوقیت حاصل تھی۔ وہ کالج کے اچھے مقرروں میں بھی تھا۔ کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ چھیڑ پہلے شانتا ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ شانتا بھی تھی متوالی، مدھ بھری مست آنکھوں والی۔ سوالِ آنکھوں کے اس میں دوسری کوئی جاذبیت نہ تھی۔ وہ ایک بید کی چھڑی تھی۔ لمبی، پتلی، عورت کی دوسری رعنائیوں سے محروم۔ اور چلتی ایسے گویا سانپ اپنی ٹوٹی ہوئی کمر کو لئے رینگ رہا ہو ... اس کے بعد جاوید کو معلوم ہوا کہ شانتا کوچۂ محبت سے ناآشنا نہیں۔ جاوید سے پہلے بھی وہ دو چار نوجوانوں سے عشق جتا چکی ہے۔ پھر جب شانتا نے اظہارِ محبت کے ساتھ ہی ساتھ شادی کی تجویز بھی پیش کی تو جاوید نے کہا تھا "میں مجبور ہوں"۔

اس کے پہلے بھی قریب تھا وہ کملا پر دل پھینک بیٹھتا۔ لیکن نہ جانے پھر کیا ہوا وہ سنبھل گیا اور ...... اور شاید یہ تیسری ہندو لڑکی ہے، جو اس کی راہ میں آ ٹپکی ہے ....

آخر جاوید کو ہو کیا جاتا ہے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ جاوید انٹرکمیونل میرج
امی ہے۔ حامد خود بھی پانچ چھے سال پہلے ایسی شادی کا بہت بڑا حامی تھا۔ نہ صرف
ولاً بلکہ عملاً بھی۔ وہ کسی ہندو لڑکی سے بیاہ کرکے مثال پیش کر دینا چاہتا تھا کہ
ب کے قیود اس معاملہ میں بے معنی ہیں۔ لیکن اسوقت تو وہ بالکل نوعمر تھا۔ انیس
ں سالہ۔ دن گذرنے پر اسے خود احساس ہو چلا تھا کہ سماج، پرانے رواج کی پابندیاں
ی زنجیریں ہیں۔ انہیں توڑنا بائیں ہاتھ کا کھیل نہیں۔ اگر کسی میں توڑنے کی ہمت
ہی تو وہ سماج سے بغاوت کرکے کہیں بھاگ نہیں سکتا۔ چاروں طرف سنگین دیواریں
ے گھیری ہوی ہیں۔ اسے وہیں زندگی گذارنی ہوگی، اسی سوسائٹی میں۔ اور سوسائٹی
، باغی سے ضرور بدلہ لیکر رہیگی۔ وہ انتقام لینا جانتی ہے۔ اس انتقام کی زد سے
بچ نہیں سکتا۔ اور یہاں تک تو نوبت پہنچی ہی نہ تھی کہ وہ ان سختیوں کو بھی سہنے
ادہ کر لیتا۔ اسے کسی ہندو لڑکی سے ایسی گہری محبت بھی نہ تھی، یونہی کچھ کچھ۔ وہ
دہ تو اصول کی خاطر غیر مذہب کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اور ہاں شادی
بعد ان کی خانگی زندگی اتنی خوشگوار بھی نہ ہو۔ کلچر مختلف، رسم و رواج جدا، مذہبی
ئیے الگ الگ۔ وہ کتنا ہی کوشش کریں ٹکر ہو ہی جاتی۔ یہ سب سوچکر اس نے یہ خیال دل
نکال دیا تھا اور کسی مسلمان لڑکی ہی سے بیاہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ کیا یہ فیصلہ اس کے
میں بہتر ثابت نہ ہوا تھا؟ اسے ایسی خوبیوں والی لڑکی جو ملی تھی: اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوب
رت، بلا کی ذہین اور رومانوی۔ ورنہ وہ اپنے "اصول" اور کاف لو (Calf
love) کی دھن میں جانے کیسی ہندو لڑکی سے شادی کر بیٹھتا۔ کالج میں تو ملی صرف
ہی لڑکی سے جان پہچان تھی نا۔ اس سے کوئی چھے سات سال بڑی ۔۔ کون جانے شاید

اسی سے بیاہ کر لیتا۔ ہاں اچھا ہی ہوا اس نے یہ فیصلہ کر لیا۔ تو اب جاوید کو بھی دھن لگی ہے کسی غیر مسلم لڑکی سے بیاہ رچانے کی! نہیں وہ اپنے بھائی کو یہ سب باتیں سمجھا دیگا۔

اصول سے قطع نظر آخر ہندو لڑکیوں کا ہی کیوں خیال کیا جائے! مسلمانوں میں حسین تعلیم یافتہ لڑکیوں کی کیا کمی ہے اور وہ کونسی امتیازی خوبیاں ہیں غیر مسلم لڑکیوں میں۔ ہاں یہ بات ہے کہ لو میرج ہو سکتی ہے اور جنوبی ہند میں پردہ اتنا سخت ہے کہ کسی مسلمان لڑکی سے اس قسم کی شادی ممکن نہ ہو۔ لیکن لو میرج ہی کیوں؟ یہ لازمی نہیں کہ ایسی ہی شادیاں کامیاب ہوں۔ اگر لو (Love) اور کورٹ شپ ہی کامیابی کے راز ہوتے تو یورپ اور امریکہ میں اتنے ڈی اورس کیس (Divorce Cases) کیوں! مہینوں ساتھ رہکر ایک دوسرے کے کیرکٹر، نظریئے، اور طبیعت کے رجحانات جان لینے پر بھی ان میں کتنی جلدی کشیدگی آجاتی ہے! کون یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ کورٹ شپ کے ذریعہ ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان سکتے ہیں۔ جان بوجھ کر وہ اپنی کتنی ہی کمزوریاں چھپاتے ہونگے۔ کورٹ شپ کے دوران میں اصلی قدوخال شاذ ہی سطح پر آتے ہیں۔ ایک ملمع کئے ہوئے کیرکٹر سے نظر چندھیا جاتی ہے۔ پھر جب شادی کے بعد یہ ملمع اتر جائے تو حقیقت کھل جاتی ہے۔ اب یہ جاوید اور شانتا ہی کا معاملہ! شانتا کیسی چھپی ہوئی نکلی۔ جاوید کو گمان بھی نہ تھا۔

حامد لو میرج کا قائل نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا، اس سے تو بزرگوں کی طے کی ہوئی شادیاں کہیں زیادہ کامیاب ہوتی ہیں۔ کیا اس کی اپنی شادی کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ ان کی خانگی زندگی کیسے خوشگوار تھی۔ ان دونوں میں کتنی محبت تھی ...... اور یہاں مہینوں کی کورٹ شپ کے بعد شادی ہو تو وہ اچھوتی لذت اور دلآویزی کہاں، جبکہ پہلے ہی آدھا حظ اٹھا لیا گیا ہو۔ مہینوں بلکہ برسوں کی دیکھی ہوئی صورت، جانی پہچانی ادائیں

— اِن میں وہ اچھوتاپن، وہ تازگی، وہ دلکشی کہاں — اُسے کتنی مسرت ہوئی تھی، جب گھونگھٹ اٹھاکر، اُس نے پہلی مرتبہ اپنی دلہن کا خوبصورت، فرطِ شرم سے تمتمایا ہُوا چہرہ دیکھا تھا . . . . حامد کو یکایک خیال آیا کہ وہ اِس لڑکی اوشا کا فوٹو اپنی دلہن کو دکھا لائے۔ ہاں اِس باتونی شخص کی صحبت سے کچھ دیر چھٹکارا تو ملیگا۔ یہاں اتنی دیر وہ بیٹھے تھکان سی محسوس کر رہا تھا۔

پرشوتم نے البم بند کر دیا تھا۔ وہ اب کمرہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ حامد کو خوف ہُوا! کہیں پرشوتم نے یہ بھانپ نہ لیا ہو کہ وہ اس کی باتوں کو بے توجہی سے سنتا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے چہرہ پر بناوٹی دلچسپی پیدا کرتے ہوئے کہا "یہ آپ کی بڑی عنایت ہوئی کہ آپنے تصویریں بتاتے ہوئے لڑکی کے خاندانی حالات سے بھی آگاہ کر دیا۔ میں آپ کا بہت مشکور ہوں"۔ "جی۔ اس میں شکریہ کی کیا بات ہے"، پرشوتم نے دانت نکال دئیے۔ حامد کو اطمینان ہوگیا کہ پرشوتم کو اس کی بے توجہی کا پتہ نہیں لگا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا "اجازت ہو تو یہ البم اندر بتا لاؤں"۔

"ہاں ہاں! ضرور لیجائیے۔ ہم سے زیادہ یہ باتیں عورتوں ہی کی طے کرنے کی ہیں نا۔" پرشوتم نے پھر دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "اور آپ کی بیوی تو سنا ہے بڑی قابل لڑکی ہیں"۔

حامد جلدی سے البم لئے اندر چلا آیا۔ اس کی بیوی مسہری میں بیٹھی ٹیبل کلاتھ کے کونوں پر پھول کاڑھ رہی تھی۔ حامد کے آتے ہی وہ تعظیماً اُٹھ کھڑی ہوئی اور ایک محبت بھری مسکراہٹ سے اُس کا استقبال کیا۔ حامد پرشوتم کی صحبت کی بدمزگی کو بالکل بھول گیا۔ اسے محسوس ہُوا کہ اس کی سب تکان دُور ہوگئی ہے۔ گویا اس مسکراہٹ نے اس میں ایک نئی جان ڈالدی ہو۔ اس نے پیار بھری نظروں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا "کل میں نے تم سے کہا تھا نا، زینی، کہ جاوید نے ضرورت رشتہ کا کوئی اشتہار دیکھ کر درخواست بھیجی ہے اور وہ لوگ آج یہاں آنے والے ہیں۔ میں انہیں سے باتیں کر رہا تھا ابتک، دیکھو، انہوں نے لڑکی کی تصویر بھی ساتھ لائی ہے" حامد نے البم کے ورق جلدی جلدی الٹ کر اوشا کی تصویر نکالی۔

"لائیے۔ دیکھوں تو جاوید میاں کی ہونے والی دلہن کو" زینت نے فرطِ اشتیاق سے، اس کے ہاتھ سے البم چھین لیا۔ حامد نے دیکھا۔ تصویر دیکھتے ہی زینت کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "او... ن! میں تو نہ ہونے دونگی جاوید کی اس لڑکی سے شادی۔ اتنے دنوں سوچ رہی تھی کہ جاوید میاں کے لئے کوئی چاند سی لڑکی ڈھونڈ لاؤں ..... یہ لڑکی تو خاصی بوڑھی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے تو تیس بتیس سے کم دکھائی نہیں دیتی۔"

"نہیں اتنا سن تو نہیں" حامد نے ہنس کر کہا "وہ لوگ ستائیس سال کی عمر بتاتے ہیں۔"

"ستائیس سال!" اور میری عمر تو صرف اٹھارہ سال کی ہے، چھوٹے بھائی کی بیوی ستائیس سالہ۔ اور جاوید کا خود بھی بائیس تئیس کا سن ہے نا۔ اس کا بھی خیال کیا تم نے ..... اور یہ پچکے ہوئے گال، لمبی ناک، اگر معمولی صورت شکل کی لڑکی سے شادی کرنی تھی تو میری سہیلیاں کیا کم تھیں۔ کئی ایک اچھی خاصی تھیں"۔

"ہاں۔ میں کب اسکی تائید کر رہا ہوں۔ جاوید ہی نے تو یہ بلا اپنے سر مَنڈھ لی ہے"۔

"کچھ بھی ہو، میں تو یہ رشتہ نہ ہونے دونگی۔ اور تم نے دیکھا" وہ فوٹو دکھاتے ہوئے بولی "لڑکی ایسی دکھائی دیتی ہے گویا عمر بھر بیمار رہی ہو۔ کتنا پھیکا چہرہ، کیسی بے جان سی۔ میں کہے دیتی ہوں، اس لڑکی کے جذبات مر چکے ہیں۔ یہ جو اس کے بائیں جانب کھڑی ہے۔ وہ بھی کوئی خاص خوبصورت نہیں۔ لیکن اس میں زندگی تو ہے۔ ہونہہ! یہ لڑکی"

اس نے بھوئیں چڑھا کر کہا۔ وہ کالی بھوئیں کس خوبصورتی سے کھنچی ہوئی تھیں اور ان کے نیچے وہ کالی آنکھیں قدرے جھکی ہوئیں، رسیلی، مدھ بھری! کتنی حسین تھیں وہ آنکھیں، اور وہ ہلکا سا خم جو اس کے بھرے ہوئے رسیلے ہونٹوں کے کونوں پر اپنے حسن کے احساس سے پیدا ہو گیا تھا۔ اپنے حسن کے احساس سے وہ اور زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ حامد مسحور ہو کر دیکھتا رہا۔ اپنی جھکی جھکی آنکھوں سے ہی زینت نے محسوس کر لیا کہ وہ محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے حامد پر ایک شوخ نگاہ ڈالی، پھر جلدی سے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ حامد نے دیکھا اس نگاہ میں شرم بھی تھی اور بے باکی بھی۔ اس شرم اور بے باکی کے امتزاج نے اسے پہلے سے زیادہ حسین بنا دیا تھا۔ وہ دیکھتا ہی رہا۔ پھر غیر ارادی طور پر اس کی نظر اوشا کی تصویر پر پڑ گئی۔ اسے یکایک احساس ہوا —— ان دونوں کے فرق کا۔ اس فرق کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے وہ اپنی بیوی کو اور پھر اوشا کی تصویر کو دیکھنے لگا۔ یہ گدرائے ہوئے گداز بدن کی تندرست اٹھارہ سالہ لڑکی اور وہ سوکھی سل کی مریض سی متوسط العمر عورت —— یہ آنکھیں جن میں وہ ہر جذبہ کا عکس دیکھ لیتا تھا اور وہ ڈھلتی ہوئی بے نور آنکھیں، جذبات سے عاری —— زینت کے گندم گوں چہرہ پہ گلاب کی سی موہنی، وہ تازگی جیسے ایک نوشگفتہ گلاب جس پر ابھی ابھی شبنم گری ہو، اور یہ اوشا کا پژمردہ چہرہ، لیکن یہ موہنی اوشا کے چہرہ پر کیسے آ سکے، یہ تو شاید شادی کے بعد ہی آتی ہے، جب ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی تو اس کی بیوی کے چہرہ پر بھی یہ نکھار نہ تھا۔ اس وقت وہ ایک نیم وا کلی نظر آتی تھی، خاموش، شرمیلی اور معصوم اور اب وہ ایک شبنم سے تر و تازہ کھلے ہوئے پھول کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اوشا کے چہرہ پہ معصومیت نہ تھی۔ اگرچہ وہ پارسا نظر آتی

تھی۔ ایک دوشیزہ کی طرح معصوم نہیں بلکہ ایک راہبہ کی طرح سرد گویا اس میں جذبات دبے ہوئے نہیں بلکہ سوکھ چکے ہوں۔

اسکی اپنی بیوی ایسی ہو اور اس کے بھائی کو ایسی لڑکی ملے۔ نہیں وہ جاوید کو اس پھندے سے ضرور باہر نکالیگا، جبکہ حامد کے لئے لڑکی کے انتخاب میں جاوید نے اتنی گرمی دکھائی تھی اور اس کے لئے ایسی اچھی لڑکی تلاش کی تھی تو حامد بڑا بھائی ہوکر، اس کا خیال نہ رکھیگا؟ یوں بھی اسے اپنے چھوٹے بھائی سے بیحد محبت تھی۔ نہیں، وہ جاوید کا بیاہ ایسی لڑکی سے نہ ہونے دیگا۔ حامد کے جی میں آیا کہ پرشوتم کو صاف جواب دیدے۔

”کیا سوچ رہے ہو“؟ بیوی کی آواز سن کر حامد چونکا۔ وہ سحر آگیں، محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

حامد مسکراتے ہوئے بولا ”یہی کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں۔ تم سی.....“

”اب چھوڑئیے بھی ان باتوں کو۔ زینت شرما کر، بات کاٹتے ہوئے بولی“۔ اس لحاظ سے میں تم سے کیا کم خوش قسمت ہوں! تم خود بھی اتنے خوب صورت ہو.... ہم تو دونوں خوش قسمت ہیں۔ اب جاوید میاں کی قسمت کا کیا ہوگا“؟

ابھی جا کے اس بڈھے کو جواب دیدونگا“ وہ مڑا۔ ”ارے ٹھہرو بھی“ زینت نے حامد کی شرٹ کا کونہ پکڑ لیا۔ ”کہیں ایسا نہ کرنا۔ ان کے دل کو ٹھیس لگیگی۔ اور انہیں ہم ٹکا سا جواب کیسے دے سکتے ہیں۔ درخواست ہمارے ہی طرف سے گئی ہے نا!“

”ہاں۔ تم ٹھیک کہتی ہو“ حامد نے پھر کچھ سوچ کر کہا“۔ اچھا تو اس سے ایسی باتیں کرونگا کہ اسے ناامیدی سی ہو جائے۔ اور پھر جب جاوید آئے گا تو ہم دونوں مل کر کچھ ایسی شرطیں پیش کرینگے کہ وہ ہماری طرف سے مایوس ہو کر چلا جائے۔“

وہ البم لئے کمرہ میں واپس داخل ہوا۔ اس کا نوکر تبھی دو پیالیاں کافی کی
لئے حاضر ہوا تھا۔ حامد نے نوکر سے ایک پیالی لیکر پرشوتم کی نذر کی، اور زیر لب
ہنسکر، نوکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" یہ ہمارا نوکر ہے۔ باورچی، نوکر، سب کچھ یہی
لیے تو ہے۔ اسی کو سب کچھ کرنا ہے ..... آپ نے اس چھوٹے سے کمرہ کا جائزہ تو لیا
ہوگا مسٹر پرشوتم، یہ جاوید کی اور میری بیٹھک ہے، .. یہی ہماری طرز زندگی ہے۔
راصل اس سے بہتر زندگی ہمیں میسر نہیں۔ چھپانے کی کوئی بات نہیں، ہم کوئی ایسے لدا
یں ہیں۔ ابھی ابھی پریکٹس شروع کی ہے، ہم نے، کچھ دنوں میں اچھے وکیل بھی بن گئے۔
پھر بھی ... آپ کو تو معلوم ہی ہے، ان دنوں وکالت کیسے چلتی ہے، تھوڑے بہت زمینات
یں۔ یہاں سے بھی کوئی خاص آمدنی ہوتی ہے آجکل"؟

" میں جانتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے" پرشوتم نے کافی کی خالی پیالی میز پہ
ھتے ہوئے کہا۔" کافی پی لیجئے، ٹھنڈی ہو رہی ہے"۔

پرشوتم نے حامد کو کافی پینے کی مہلت دی۔ اور کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر
ں نے اپنی چرمی بیگ سے ایک لفافہ نکالا اور حامد کو دیتے ہوئے بولا" حامد صاحب،
یئے یہ خط جو مسٹر جاوید نے درخواست کے طور پر بھیجا تھا۔ اس میں سب کچھ لکھدیا
ے انہوں نے۔ ورنہ آپکا نام سنتے ہی مجھے کیسے معلوم ہوتا کہ آپ اُن کے بڑے بھائی ہیں
ور آپکے زمینات چکمگلور میں ہیں ..... آپ کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے نا؟۔
ر آپ کی بیوی بھی گریجویٹ ہیں۔..."

حامد نے سر ہلایا اور پرشوتم کی صورت تکنے لگا۔ "دیکھئے۔ خط دیکھئے، مسٹر
وید نے سب باتیں بتا دی ہیں۔ کوئی چیز نہیں چھپائی۔ جتنے خط ہمیں موصول ہوئے،

اس میں سب سے زیادہ یہی خط ہمیں پسند آیا .. صاف گوئی اور صداقت، یہی وہ چیزیں ہیں جو آج کل کمیاب ہیں۔"

حامد خط کھول کر پڑھنے لگا۔ چھ صفحوں کا خط تھا اور واقعی جاوید نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ پرشوتم بولتے جا رہا تھا۔ "مسٹر رتن سوامی جو یہاں کالج میں لیکچرار ہیں۔ آپ انہیں جانتے ہونگے۔"

حامد نے خط کا صفحہ پلٹتے ہوئے غیر ارادی طور پر صرف 'ہاں' کہا۔ "وہ میرے دُور کے رشتہ دار ہیں۔ میں وہیں ٹھہرا ہوا ہوں۔ ان سے بھی میں نے دریافت کیا' انہوں نے بھی مسٹر جاوید کے بارے میں مجھے بہت ہی اطمینان دلایا۔ وہ ان کے سٹوڈنٹ رہے ہیں نا؟

... اب میسور چھوڑنے سے پہلے میں مسٹر جاوید کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ مہربانی کرکے اگر آپ ابھی تار دے دیں تو .... تکلیف نہ ہو تو کل شام آپ بھی مسٹر جاوید کے ساتھ رتن سوامی کے مکان پر تشریف لائیے۔ میں خود وہیں حاضر ہوتا۔ لیکن پیر کی وجہ سے مجبور ہوں اور پھر ..."

حامد نے خط پڑھتے پڑھتے ہی کہا "آپ تکلیف نہ کیجئے ہم خود وہاں پہنچ جائینگے۔" خط کا کچھ حصہ باقی تھا۔ اس کو ختم کرنے تک پرشوتم نے مزید مداخلت نہ کی۔

خط پڑھ چکنے کے بعد اس کو لفافہ میں ڈال کر' پرشوتم کو واپس دیتے ہوئے حامد بولا
" واقعی اچھا خط ہے۔ جاوید نے پہلے ہی آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔"

..... تو کل ملینگے۔ اچھا تو اب میں اجازت چاہتا ہوں"۔ پرشوتم خط اور البم چرمی بیگ میں رکھنے لگا۔

" میری ایک درخواست ہے۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو البم۔ یہیں چھوڑ جائیے۔ کل میں لوٹا دوں گا اس کو۔"

"لیجئے لیکن ذرا حفاظت سے رکھئے۔" "اچھا نمستے" "نمستے"۔

پرشوتم کو تانگہ تک چھوڑ کر حامد سیدھے ڈاک خانہ گیا اور جاوید کو جلد آنے کا تار بھیج دیا۔

دوسرے دن شام میں حامد اور جاوید رتن سوامی کے مکان کی طرف چلے .... جاوید دل ہی دل میں مسرت محسوس کر رہا تھا۔ جاوید کے لئے یہ کتنی فخر کی بات تھی کہ ایسی تعلیم یافتہ اور مالدار لڑکی کے لئے سب سے پہلے اس کا انتخاب ہوا ہو۔ اس نے درخواست ہی میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ وہ کوئی مالدار نہیں ہے۔ یونہی متوسط الحال.. پھر لڑکی کے لئے اتنی درخواستیں آئی ہوئی تھیں۔ ساٹھ پینسٹھ لڑکوں میں اُسے چنا گیا تھا۔ ... اور پھر خود لڑکی والے اتنی دور سے معاملہ طے کرنے کے لئے آئے تھے۔ جاوید کو دل ہی دل میں اپنی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا .... لیکن اس نے البم دیکھا تھا۔ اس کو لڑکی کی صورت شکل بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ وہ حامد کا ہم خیال تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس بلا سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہئے۔ اس کے لئے راستہ بھر دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے بہت سے حیلے سوچ لئے تھے ... جب وہ رتن سوامی کے مکان پر پہنچے۔ تو پرشوتم برامدہ میں بیٹھا ہوا تھا" آئیے بیٹھئے۔ میں آپ ہی کے انتظار میں تھا۔ رتن سوامی ابھی تک یہیں تھے۔ ابھی ابھی کہیں باہر گئے ہیں۔"

حامد نے پرشوتم کو البم دیتے ہوئے اس سے جاوید کا تعارف کرانے کی کوشش کی۔ پرشوتم بولا "ان رسمیات کی کیا ضرورت ہے حامد صاحب۔ مسٹر جاوید ہی کی وجہ سے تو مجھے بیجواڑہ سے یہاں تک آنا پڑا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں کی وجہ سے مجھے آپ کی ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔" وہ مسکرایا اور جاوید کی طرف ذرا غور سے دیکھنے لگا۔

"مسٹر جاوید۔ کل آپ کے بھائی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی .... لیکن معاملہ آپ سے متعلق

ہے۔ اس لئے آپ کو بھی تکلیف دینی پڑی ....." پرشوتم کچھ رُک رُک کر، یہ رسمی الفاظ ادا کر رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں"۔ جاوید صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ اُس کو اپنے اس بے تکے پن کا احساس بھی ہُوا۔ وہ کچھ سہما سہما سا تھا۔

پھر پرشوتم بالکل کاروباری انداز میں بولا "چونکہ میں آج رات کی گاڑی سے جا رہا ہوں۔ چاہتا ہوں دو ایک باتوں کے بارے میں آپ کے خیالات معلوم کرلوں..... آپ پردہ کے قائل ہیں"؟ حامد اور جاوید، دونوں کی طرف یکے بعد دیگرے دیکھ کر یہ سوال کیا گیا تھا۔ قبل اس کے حامد کچھ جواب دے، جاوید بڑی سنجیدگی سے بولا "ہم قائل نہ بھی ہوں، پھر بھی ہم ماحول کے اثر سے مجبور ہیں۔ فی الحال کے لئے تو ہم پردہ نہیں چھوڑ سکتے"

"خیر یہ کوئی ایسا ضروری مسئلہ نہیں تعلیم یافتہ گھروں میں رفتہ رفتہ لوگ پردہ کے مضر اثرات سے واقف ہو ہی جائیں گے۔ اب بتائیے سیول میرج کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے"؟ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پرشوتم بڑی جلدی میں ہیں، اور سبھی امور اسی وقت طے کرلینے پر مُصر ہیں۔

اس دفعہ بھی جاوید نے پہل کی اور کہا "سیول میرج سے تو ہماری اسلامی شادی اچھی ہے۔ پرشوتم کچھ سٹ پٹایا۔ "لیکن لڑکی والے شاید سیول میرج ہی کو فوقیت دیں"

اب حامد بولا "یہ جُدا بات ہے مسٹر پرشوتم۔ لیکن ہم تو مجبور ہیں۔ اس بارے میں بتائیے ہم خواہ مخواہ کوئی جدت کیوں کریں۔ آپ کو معلوم ہوگا سیول میرج کی طرح مسلم میرج بھی ایک قسم کا معاہدہ ہے"۔

لیکن ڈی اورس Divorce وغیرہ کے بارے میں شاید صرف مرد کو ہی اخت

ہے۔"

"نہیں۔ چاہے تو عورت بھی خلع مانگ سکتی ہے" اور حامد نے خلع کی تشریح کرتے ہوئے بتایا "... طلاق اور خلع میں فرق اتنا ہے کہ خلع مانگنے پر عورت کو اپنا مہر نہیں مل سکتا" اور پھر حامد نے مہر کی توضیح کی۔

"معاف فرمائیے۔ حامد صاحب ... میں پوچھ سکتا ہوں حامد صاحب، آپ کی شادی میں کیا مہر قرار پایا تھا؟"

ہنسی ضبط کرتے ہوئے حامد بڑی سنجیدہ صورت بنا کر بولا "ڈھائی کم سو روپیہ"۔

"اتنا کم۔" "جی ہاں۔ ہمارے خاندان میں یہی رواج ہے۔"

... پرشوتم نے اس مسئلہ کو بھی پرے ہٹاتے ہوئے کہا "آپ کے ہاں تو بیاہ لڑکی والوں کے ہاں ہوتا ہے ...؟"

حامد بولا "یہ کوئی ضروری نہیں۔ یہیں میسور میں ہو تو شاید ہمارے لئے بہت سی آسانیاں ہوں۔"

کچھ دیر سوچنے کے انداز میں پرشوتم چھت کی طرف گھورتا رہا۔ پھر بولا "آپ کی سب شرطیں تو مجھے ناقابل قبول نہیں لگتیں ... شادی یہیں میسور میں ہونے میں کوئی ہرج نہیں ... مہر بھی پھر طے کر لیا جا سکتا ہے ... پردہ کی بھی کوئی ایسی سخت شرط نہیں ... دراصل بات یہ ہے اوشا کے لوگ بڑے سمجھدار ہیں۔ ان کو ہر [illegible] قسم کے بندھنوں سے سخت نفرت ہے۔ وہ ان کے بنائے ہوئے بندھنوں کو توڑنا چاہتی ہیں ... اور اوشا خود بھی کسی غیر ہندو سے اور ہو سکے تو کسی مسلمان ہی سے شادی کرنا [illegible] ... مسٹر حامد کے بارے میں تو مجھے ہر طرح کا اطمینان ہے۔ اسلیے

جاوید کی طرف مخاطب ہوا۔ اور ایک ملاقاتی کارڈ اسے دیتے ہوئے بولا "لیجئے اس پتہ پر آپ کا کوئی فوٹو ہو تو بھیج دیجئے . . . اور ہاں حامد صاحب میں یہ کہہ رہا تھا میری طرف سے تو پورا اطمینان ہے۔ لڑکی کے گھر والے بھی مان جائینگے سمجھ لیجئے۔ بات تو سمجھئے طے ہو چکی۔ پھر بھی چونکہ معاملہ لڑکی اور لڑکے کا ہے ایک بار وہ مل لیں تو بہتر ہو گا۔ کیوں حامد صاحب! آپ بھی مسٹر جاوید کے ساتھ حیدرآباد تشریف لائینگے نا؟ آئیے ضرور آئیے۔ جواب دیجئے کہ میں لکھوں گا کہ آپ کب تک آئیں۔ آپ ایک خط کے ذریعہ آنے کی ٹھیک تاریخ معلوم کرا دیں۔ پتہ میں نے مسٹر جاوید کے پاس دیا ہے۔ میں خود اسٹیشن آپکو لینے آؤں گا . . . . اور ہاں۔ ان ٹرینوں کا کیا بھروسہ کبھی جگہ ملے کبھی نہ ملے اور شاید آپ کو ٹھیک تاریخ پر نکلنا ممکن بھی نہ ہو۔ مجھے خود اکثر ایسے حادثوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس لئے لیجئے۔ احتیاطاً رکھ لیجئے۔ یہ پتہ ہے ان کے مکان کا" یہ کہہ کر اس نے حامد کے ہاتھ میں ایک اور ملاقاتی کارڈ ٹھونس دیا اور یکا یک اپنا لمبا بیان ختم کرتے ہوئے بولا "شاید آپ کو دیر ہو رہی ہو گی شام ہو رہی ہے اور مجھے بھی کچھ سامان وامان درست کرنا ہے . . ."

"اچھا تو مسٹر پرشوتم۔ خدا حافظ" "خدا حافظ" "خدا حافظ"

وہ رتن سوامی کے مکان سے نکلے۔

جاوید سوچ رہا تھا۔ پرشوتم نے اسے اتنا پسند کر لیا تھا کہ اس نے اپنی ناقابل قبول شرطیں بھی منظور کر لیں۔ اپنی اہمیت کے احساس سے جاوید کے لبوں پر ایک فخریہ مسکراہٹ پھیل گئی "ایسے معلوم ہوتا ہے کہ پرشوتم کو ہماری سب شرطیں منظور ہیں۔"

"مجھے تو امید نہ تھی۔ وہ ہماری ہر بات مان لیگا۔"

"نہ جانے یہ چمگادڑ کی طرح چمٹ کیوں گیا ہے"۔ جاوید نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"اگر لڑکی والوں کو برہمنوں اور کٹر قسم کے ہندوؤں سے نفرت ہے بھی تو انہیں کوئی آزاد خیال نان برہمن ہندو ہی نہیں مل سکتا تھا۔ ایک مسلمان کا کیسے خیال آسکا انہیں"؟

"ہاں اس معاملہ میں تو میرا مسلمان ہونا میرے لئے پہلا minus point ہے تعلیمی حیثیت سے بھی لڑکی تجھ سے کچھ کم نہیں۔ اور پھر ان کے مقابلہ میں ہماری مالی حیثیت بھی کم ہے۔"

"ہاں ہاں۔ جب لڑکی کے والد وجیا نگر سٹیٹ کے دیوان رہ چکے ہیں تو وہ لوگ کافی مالدار ہونگے اور میں نے کہا تھا نا تم سے کہ ہماری غربت جتانے میں میں نے تو کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ میرے کہنے سے پہلے ہی خود پرشوتم نے اس کا اندازہ لگا لیا ہوگا جب ہمارے گھر آیا تھا"۔

"اور میں نے بھی اپنے خط میں یہ بات تفصیلاً بتا دی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں یہ ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔۔۔ کچھ بھی کہو بھیا' لڑکی مجھے پسند نہیں' تصویر ہی میں دیکھو کتنی بری نظر آتی ہے۔۔۔۔ پرشوتم کا رنگ تو دیکھو"۔

لیکن حامد نے اسے ایک دوسری ہی بات کی طرف توجہ دلائی۔ "پرشوتم خود کہتا ہے کہ لڑکی کی عمر ستائیس سال کی ہے۔ مجھے تو تیس کے اوپر نظر آتی ہے۔ مان لیں کہ ستائیس ہی ہے تو پھر بھی تم سے پورے چار سال بڑی۔۔۔ میں کہتا ہوں جنسیاتی اصول (Eugenic Principles) کی بنا پر بھی یہ جوڑا ٹھیک نہیں"۔

"میں نے تو کہا ہی کہ لڑکی بدصورت ہے اور پھر دق کی مریض۔ بھیا کوئی ایسی ترکیب سوچو کہ اس مخمصہ سے چھٹکارا ہو۔۔۔۔ بیچوارہ جانے کی بلا بھی ٹل جائے"۔

لیکن میں کہتا ہوں جاوید۔ ہماری طرف سے نفی کا جواب نہ ہونا چاہئے۔ پرشوتم کا سلوک ہم سے کتنا اچھا رہا ہے۔ بیچارے نے تو ہمارے لئے بجواڑہ سے یہاں تک آنے کی تکلیف بھی اٹھائی۔ ہماری طرف سے اُسے کچھ دکھ نہ پہنچے۔"

جاوید نے بے چینی کا اظہار کیا "بھیا! مجھے وہ لڑکی پسند نہیں کسی حالت سے یہ رشتہ نہ ہونے پائے۔"

"ہاں. ہاں. ٹھیک ہے لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یہ رشتہ بھی نہ ہو اور پرشوتم کے دل پر بار بھی نہ آئے۔ مجھے تو تم سے زیادہ اس بات کا احساس ہے کہ ایک ہندو لڑکی سے بیاہ کرکے تم اپنی زندگی یہاں نہیں بسر کر سکتے۔ ذات باہر ہو جاؤ گے مسلمان ایک طرف طعنے دینگے اور ہندو دوسری طرف بدظن ہو جائینگے۔ اور ہمارا معاملہ تو ہندوؤں ہی سے زیادہ ہے مسلمان تو پہلے ہی سے کٹے بیٹھے ہیں۔ بہرحال جینا دشوار ہو جائے گا۔ ہاں۔ "

"لڑکی بڑی بُری صورت کی ہے۔ مجھے مطلق پسند نہیں۔" جاوید نے پھر رٹ لگائی اور گڑگڑانا شروع کیا۔

"میں کب کہتا ہوں کہ تجھے پسند ہے۔ میں بھی تو وہی سوچ رہا ہوں اب۔ خوش سلوکی کو نبھاتے ہوئے بھی اس مخمصے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی بس ایک صورت نظر آرہی ہے مجھے۔ پرشوتم نے تمہارا فوٹو مانگا ہے نا؟ کوئی ایسا فوٹو بھیجو کہ اسے دیکھ کر لڑکی خود بخود تمہیں "رد" کردے۔"

اور جاوید نے اپنا سب سے بُرا فوٹو بھیجدیا تھا۔ جاوید کے چہرے پر چیچک کے داغ نہ تھے لیکن فوٹو میں منہ پھاڑے بڑے بھیانک طریقہ سے چہرہ کے اندر دھنسے

ر آتے تھے۔ جاوید میں یوں بھی ناک نقشہ کی کوئی خاص دلکشی نہ تھی پھر یہ چیچک
اور فوٹو میں چہرہ کا کالا رنگ ـــــ حال ہی میں نکالی گئی۔ روپیہ کی تین تصویریں
تصویر سب سے بری تھی . . . .

پرشوتم کو گئے ہوئے کچھ اوپر ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں اس کے خط کی انتظاری
کے بعد حامد اور جاوید دونوں قریب قریب اس قصہ کو بھلا بیٹھے تھے۔ پھر بھی
خوف ہوتا کہ اگر پرشوتم نے بیجواڑہ آنے کی دعوت دی تو یہ زحمت کون اٹھائے۔
اب پرشوتم کا یہ خط آیا تھا۔ اس نے لکھ بھیجا تھا کہ اسے معاف کیا جائے گھر والوں نے
ں کا رشتہ اسی کلکتہ والے لڑکے سے طے کر دیا ہے . . سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا !
امد دل ہی دل میں خوش ہو کر اپنے آپ کو اور جاوید کو شاباش دے رہا تھا۔ . . . کیا کیا
ئے تھے، کتنے حیلے سوچ رکھے تھے! چلو چھٹی ہوئی، انہیں کی طرف سے نفی کا جواب آ گیا ہے۔
شوتم کا خط پڑھکر حامد کو بے حد خوشی ہوئی۔ وہ اس خوشخبری کو سنانے کے لئے بڑی
ے جاوید کا انتظار کر رہا تھا۔
ب شام ہو چلی تھی۔ جاوید کورٹ سے لوٹا۔ حامد اسے خط دیتے ہوئے بولا "چلو
ہوئی۔ سانپ بھی مرا، لاٹھی بھی نہ ٹوٹی اور اب بیجواڑہ جانے کی مصیبت بھی ٹل

دید نے خط کھول کر پڑھا۔ اس میں وہی جملے تھے۔ لیکن بہت دیر تک وہ خط
ں پر نظریں جمائے رہا۔ پھر اس نے خط کو لفافہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔
" یہ میری توہین ہے "

محمد علی کمال

عزمِ جواں

دل جواں ہمت جواں بازو جواں فطرت جواں ● جب جوانی کا یہ عالم ہے تو ناممکن کہاں
یہ مقامِ شوق ہے راحت کہاں منزل کہاں نذرِ آتش کر دیا میں نے خود اپنا آشیاں
خون سے انسانیت کے دستِ انساں لال ہے حکم دیجے تو بدل ڈالوں یہ آئینِ جہاں
روح میری ہے جنوں ساماں مجھے یہ کیا خبر نام ہے انجام کس کا! اور کیا سود و زیاں
خوفِ ناکامی گناہِ سخت ہے میرے لئے ہوں عمل کی رزمگہ میں حق کی عزت تپاں
خون اتر آیا ہے آنکھوں میں کہ ہوں کیوں سست کوش کون کہتا ہے کیا ہے زخمِ دل نے نیم جاں
لذتِ صحرانوردی عشقِ بے منزل نہ پوچھ کیا بتاؤں کیوں مجھے بھاتا نہیں ہے گلستاں
میری رگ رگ میں تڑپ ہے عافیت سے کام کیا رہزنِ ذوقِ عمل ہے سستیِ عزمِ فغاں

تیری خاکستر سے پھر شعلے بھڑک اٹھنے کو ہیں
قسمتِ تاریک پر روتا ہے کیوں ہندوستاں

خورشید الاسلام

زندہ و پائندہ رہوں

کیوں فسوں کار، زمانہ کے فسوں یاد کروں
کس لئے شہر کے ویرانوں کو آباد کروں
اپنا غم کم ہے، جو اَوروں کے اَلم یاد کروں
بات تو یہ ہے، کہ میں زندہ و پائندہ رہوں

عیشِ پرویز میں بیداد رہے یا نہ رہے
اعتبارِ غمِ فرہاد رہے یا نہ رہے
درد میں ہمّتِ فریاد رہے یا نہ رہے
بات تو جب ہے کہ میں زندہ و پائندہ رہوں

دن کی گرمی سے پگھل جائیں یہ مینا و ایاغ
بجھ کے رہ جائیں سرِ شام ستاروں کے چراغ
چھین لے کوئی زمانہ کے خداؤں سے فراغ
سب گوارا ہے جو میں زندہ و پائندہ رہوں

غم بھٹکتا ہے بہک جائے سرِ جامِ شراب
عینِ مستی میں گوارا ہے تو ہو نامِ ثواب
میں نے مانگا ہے نہ مانگوں گا زمانہ سے حساب
مجھ کو کیا اس سے، جو میں زندہ و پائندہ رہوں

ہاں تصور میں وہ اگلے سحر و شام نہیں
تیری نظروں میں بھی فریاد ہے پیغام نہیں
دست بر جام نہیں پھر بھی تہی جام نہیں
یہ اشارہ ہے کہ میں زندہ و پائندہ رہوں

یہ سراپردۂ افلاک، یہ محمل نہ سہی
کوئی ہمدم، کوئی رہبر، کوئی منزل نہ سہی
میرا دل، میری نظر، ناز کے قابل نہ سہی
پھر بھی ممکن ہے کہ میں زندہ و پائندہ رہوں

یوں تو محراب کے سایہ میں کچھ اصنام بھی ہیں
شہریاروں کی نگاہوں میں ابھی دام بھی ہیں
زاویے بھی ہیں، ترانے بھی ہیں، پیغام بھی ہیں
سب مسخر ہوں جو میں زندہ و پائندہ رہوں

کرشن چندر

جنگ اور ہندوستانی ادیب

جب سے جنگ شروع ہوی ہے ہندوستانی ادیبوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ سب چپ ہیں۔ جنگ کے متعلق ایک لفظ تک اپنی قلم سے لکھنا پسند نہیں کرتے۔ اس میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں قسم کے ادیب شامل ہیں۔ جوش نے کمپنی کی حکومت کے عنوان سے ایک نظم کہی تھی۔ وہ ضبط کرلی گئی۔ مجاز نے دو ایک نظمیں کہیں۔ ساغر نے چین کا ترانہ گایا؛ نریندر شرما نے اسٹالن گراڈ پر قصیدہ کہا، دو ایک بنگالی ادیبوں نے اپنے ہم وطنوں کو جاپانی حملے سے آگاہ کیا اور بس۔ ان چند ایک فروعی ناتمام اور ناکام کوششوں کے بعد ایوان ادب میں ایسی خاموشی چھا گئی گویا جہاں بھر میں عشق و محبت کے فسانوں اور چاند تاروں کے نغموں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا ہندوستانی ادیب نزاکتِ حال کو نہیں سمجھتے۔ کیا وہ اس قدر جاہل اور غیر حقیقت پسند ہیں کہ وہ اس جنگ اور اس کے خوفناک اثرات سے واقف نہیں۔ کیا وہ فسطائیوں کی خون آشامی اور جاپانیوں کی وحشیانہ بربریت سے آگاہ نہیں۔ کیا جب چٹاگانگ اور ان کے نواحی علاقوں میں۔ آسام اور اس کے شرقی ضلعوں میں جاپانی بموں کی بارش ہوئی ہے اس وقت اُن کا دل اپنے مقتول ہموطنوں کی نوحہ خوانی کے لئے نہیں تڑپا تھا۔؟

یہ سب کچھ صحیح ہے۔ ہندوستانی ادیب اپنے فرائض سے اور اس جنگ کے خوفناک نتائج سے بخوبی آگاہ ہیں۔ پچھلے سال دہلی میں جون کے مہینے میں ہندوستانی ادیبوں کی کل ہند

کانفرنس ہوئی۔ اس میں ہندوستان بھر سے ادیب آئے تھے، ترقی پسند اور رومانی اور رجعت پسند ادیب اور ایسے ادیب بھی جو اپنے آپ کو صرف ادیب کہلانا ہی کافی سمجھتے تھے۔ اور کسی گروہ سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ یہ سب ادیب دہلی میں تین چار روز رہے۔ سب سے اہم موضوع جو زیر بحث رہا یہی تھا۔

فسطائی حملہ اور ہندوستانی ادیبوں کا فرض، بہت سوچ بچار اور بحث و تمحیص کے بعد یہی طے پایا کہ جہاں تک ہوسکے فسطائیت کے خلاف کہانیوں، گیتوں، ڈراموں، نظموں کے ذریعہ عوام کے ذہنی شعور کو بیدار کیا جائے اور انہیں دنیا کی سب سے بڑی جنگ میں فسطائیت کے خلاف اتحادیوں کے محاذ میں شامل ہونے کیلئے کہا جائے۔ اس مطلب کی کئی ایک قراردادیں پاس کی گئیں۔ کل ہند مصنفین کی کانفرنس میں بھی اور ترقی پسند کانفرنس میں بھی خوب ہنگامہ رہا۔ ہم سب لوگ بہت خوش تھے۔ اب ہندوستانی ادیب کی غیر فسطائیت مسلّم ہو جائیگی اور اب وہ اس تاریخی بہاؤ میں جمہوری قوتوں کا ساتھ دیگا۔

اسکے بعد پورا ایک سال گزر گیا اور جب ہم اس جون میں چوتھی ترقی پسند کانفرنس کے موقعے پر بمبئی میں اپنے ادب کا جائزہ لینے لگے تو معلوم ہوا کہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر باقی سب ادیب (ان میں ہندی گجراتی، مرہٹی، بنگالی، تامل، تلگو ہر زبان کے ادیب شامل تھے) جنگ کے متعلق بدستور خاموش رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے لئے اس دنیا میں جنگ کہیں نہیں ہے اور وہ جو چٹاگانگ اور آسام میں لوگ ہلاک ہوئے ہیں یا افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اپنی جان کھو بیٹھے ہیں محض دل کی حرکت بند ہو جانے سے اس جہاں سے رخصت ہوئے ہیں۔

صرف چند لوگوں نے اس ذہنی جمود کو توڑنے کی کوشش کی تھی لیکن ان لوگوں کی مساعی اس ذہنی انتشار کے صحرائے عظیم میں اک ذرہ بے مقدار کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہ یاد رکھنا

پڑے گا کہ بہ حیثیتِ مجموعی اس جنگ نے ہندوستانی ادیب کی تخلیقی قوتوں کو انگیخت نہیں کیا۔ ابھی تک نہیں کیا۔ مستقبل کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن جہاں تک تجربہ اور مشاہدہ کام کرتا ہے، یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک خود ہندوستان پر بڑے زور شور سے حملہ نہیں ہوتا، ہندوستانی ادیب کی موجودہ روش میں کسی بہت بڑی تبدیلی کا امکان بہت کم ہے۔ جہاں تک فسطائیت اور فسطائی نظام سے نفرت کا تعلق ہے، وہ باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی، اس کی شدت اور سچائی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ہندوستانی ادیب اس وقت فسطائیت کو نفرت سے دیکھتا ہے کہ جب نازی پارٹی جرمنی میں برسرِ اقتدار بھی نہ آئی تھی اور جب خود انگلستان اور امریکہ میں فسطائیت کے ہزاروں حامی اور مؤید تھے اور جب انگلستان میں مسٹر چیمبرلین کی قیادت میں Cliveden Set اور امریکہ میں German Bund عروج پر تھے، اس زمانہ میں روشن خیال ہندوستانی سیاست داں اور ادیبوں نے جس فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے اس کی نظیر سوویٹ روس کے سوا دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ملتی۔

لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو ہندوستانی ادیب ایک دم خاموش سے ہو گئے۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے۔ کاغذ گراں ہو گیا (رسائل بند ہونے لگے) اخبارات کا حجم گھٹ گیا۔ کتابیں کم چھپنے لگیں۔ جنگ ایک انفرادی حیثیت سے بھی ان کے سامنے آنے لگی۔ لیکن پھر بھی وہ خاموش رہے۔ چند روشن مستثنیات کو چھوڑ کر وہ اپنے کام میں لگے رہے۔ عشق و محبت کے فسانے، نفسیاتی تجزیہ نگاری، اپنے سماجی مسائل کا جائزہ۔ بھوک اور سرمایہ داری کی آویزش، ان سب امور پر ان کی نگاہ گہری، ان کا تجزیہ سچا، ان کے تخیل کی پرواز بلند تھی۔ لیکن جنگ کے متعلق وہ بدستور خاموش رہے۔ اب تک خاموش ہیں۔ جو لوگ ان کا کندھا جھنجھوڑ کر انہیں جگانا چاہتے ہیں، انہیں ان کے فرض سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں،

انھیں جواب میں ایک حزین تبسم ملتا ہے۔ جی ہاں۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ ہمیں اپنے حال پہ چھوڑ دو۔

حالات کی یہ روش اچھی نہیں خطرناک ہے لیکن ہمیں اس کا سامنا کرنا ہے۔ اس حقیقت کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اور اس کے لئے ہمیں ان تمام شکوک شبہات، اندیشوں، خطروں اور ذہنی الجھنوں کو منظر عام پر لانا ہوگا جو بیشتر ہندوستانی ادیبوں کے ذہن میں اور ان کے شعور اور لاشعور میں پیوست ہیں جنہیں وہ زبان پر لانا پسند نہیں کرتے لیکن جن پر وہ دن رات غور کرتے ہیں جنہوں نے ان کی ذہنی قوتوں کو اس قدر الجھا دیا ہے کہ وہ ہنوز کوئی فیصلہ نہیں کر سکے۔

جب جنگ شروع ہوئی تو چیمبرلین کی وزارت برسر اقتدار تھی۔ چیمبرلین نے میونخ میں فسطائی حکومتوں سے مفاہمت کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ بارہا ایسی کئی ایک کوششیں کرنے کے بعد ناکام رہ چکا تھا۔ ہندوستانی ادیبوں اور خود انگلستان کے ادیبوں کی نظروں میں وہ ایک نیم فسطائی جماعت سے تعلق رکھتا تھا جسے (Cliveden Set) کہتے تھے۔ اس لئے جب جنگ شروع ہوئی اور چیمبرلین نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو بہت سے ادیب جمہوریوں اور فسطائیوں کے درمیان حد فاصل نہ دیکھ سکتے تھے۔ بعد میں جب چرچل کی حکومت نے قیادت سنبھالی اور روزویلٹ نے جمہوریت کا راگ الاپنا شروع کیا اور روس نے جنگ میں حصہ لیا تو ہندوستانی ادیب چونکے۔ نہ صرف ہندوستانی ادیب ہی بلکہ انگلستان اور دوسرے ملکوں کے ادیبوں میں بھی فسطائیوں کے خلاف تخلیقی قوتیں بیدار ہونے لگیں۔ لیکن اہل قلم اور ارباب فکر لکھنے سے پہلے ہی یہ سوچنے لگے کہ جمہوریت اور فسطائیت کی اس جنگ سے عوام کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ ہم کس لئے سر مار رہے ہیں۔ کیوں لڑ رہے ہیں؟ اگر اس جنگ کا بھی وہی حشر ہونا ہے جو پچھلی جنگ عظیم کا

ہُوا تھا تو اس سے یہی بہتر ہے کہ خاموشی اختیار کر لی جائے۔ اسی زمانے میں دنیا بھر کے ادیبوں اور مفکروں نے کہنا شروع کیا کہ اس جنگ کے مقاصد کی تمیز کرو اور ان کا اعلان کر دو۔

حکومتوں نے جواب دیا۔ پہلے جنگ جیت لی جائے۔ مقاصد بعد میں طے ہوتے رہیں گے۔ تشکیک اور اندیشے دلوں میں اور بھی مضبوط ہو گئے۔ یہ جنگ ہماری جنگ نہیں ہے جنتا کی جنگ نہیں ہے کیوں نہیں جنگی مقاصد کا اعلان کیا جاتا۔ اسی زمانے میں بہت سے ادیب انگلستان سے امریکہ ہجرت کر گئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بمباری کے خوف سے بھاگ گئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ نہایت خلوص اور سچائی سے حکومت کے ہر مقصد پر شبہ کرتے ہیں۔

اس کے بعد اٹلانٹک چارٹر کا غلغلہ ہوا۔ جس میں پہلی بار جنگی مقاصد کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن مسٹر چرچل نے یہ کہہ کر کہ اس اعلان کا ہندوستان پر اطلاق نہیں ہوتا سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ ہندوستانی ادیبوں کی بدظنی اور بھی بڑھ گئی۔

انہیں دنوں ہندوستان میں چیانگ کائی شک آئے۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ سر سٹیفورڈ کرپس آئے اور واپس چلے گئے۔ ملک میں شورش ہوی۔ خون خرابہ ہوا۔ لیکن نتیجہ وہی صفر۔ ہندوستان وہیں ہے جہاں پہلے تھا۔ یہی احساس کمتری ہر ہندوستانی ادیب کے ذہن کو مفلوج کئے دیتا ہے۔

وہ سمجھتا ہے کہ اُسے فسطائیت کا مقابلہ کرنا ہے۔ جاپانیوں کو بنگال اور آسام اور برما کی سرحدوں سے پرے دھکیل دینا ہے۔ عراق، ایران اور بحیرۂ روم کے علاقوں سے نازیوں کو باہر نکال دینا ہے تاکہ ہندوستان پر حملہ نہ ہو سکے۔ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن ان تمام باتوں کے بعد اس کے ذہن میں ایک سوال آتا ہے۔ اس کے بعد؟ اگر ہم سب کچھ اس لئے کر رہے ہیں کہ بعد میں

ہندوستان کی وہی حالت ہے جو اب ہے۔ وہ بدستور اسی سامراجی نظام اسی استعماریت کی چکی میں اندھے بیل کی طرح جتا رہے گا تو پھر اس جمہوریت اور اس فسطائیت میں کیا فرق ہے؟

یہ وہ نازک شبہات ہیں جو ہر ہندوستانی ادیب کے دل میں الجھاؤ پیدا کر رہے ہیں۔ وہ انہیں زبان پر نہیں لاتا لیکن بلا شبہ وہ کچھ ایسے ہی جذبات ہیں جنہوں نے اس کی تخلیقی قوتوں کو اس قدر گنگ کر دیا ہے کہ وہ جنگ کے متعلق ایک لفظ بھی سچے دل سے نہیں لکھ سکتا۔

یہ وہ شبہات ہیں جو نہ صرف ہندوستانی ادیبوں کے دلوں میں جاگزیں ہیں۔ بلکہ بہت سے مغربی اور امریکی ادیبوں کے دلوں میں بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ جب سے جنگ شروع ہوئی برابر ذہن میں گردش کر رہے ہیں۔ اور ابھی تک ان کا کوئی حل دستیاب نہیں ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اور انگلستان اور امریکہ میں بھی ابھی تک جنگ کے متعلق کوئی ادبی اہم کارنامہ سرانجام نہیں دیا گیا۔ ([illegible]) کے مرتب جان لہمن نے خود اپنے مجلے کے تازہ شمارے میں اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ جنگ کے متعلق جتنی چیزیں لکھی گئی ہیں وہ اس قدر گھٹیا اور پست ہیں۔ ان کی حیثیت اس قدر غیر ادبی ہے کہ وہ محض جاہلانہ پروپیگنڈا معلوم ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکی اور مغربی ادیبوں کے روشن خیال طبقے کو اس امر کا یقین ہے کہ ان سیاست دانوں کے سامنے کوئی روشن اور واضح انسانی مستقبل نہیں۔ وہ موجودہ نظام میں معمولی تغیر و تبدل کر کے سامراجی گاڑی کو پھر سے چلانا چاہتے ہیں اور مسٹر چرچل نے تو اس کا باقاعدہ اعلان بھی کر دیا ہے۔ اُدھر امریکی کانگریس اور سینیٹ نے مزدوروں کے خلاف اینٹی سٹرائیک بل پاس کر کے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ برسر اقتدار طبقے ابھی تک پرانی

ڈگر پر چلے جا رہے ہیں اور دنیا — جنگ کے بعد کی دنیا کی تشکیل بھی اسی ڈھچر پر کرنا چاہتے ہیں۔

صرف روس میں ایسی چیزیں لکھی جا رہی ہیں جو جنگ کے متعلق ہونے پر بھی بہترین ادب کہلائی جا سکتی ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے ادیبوں کے دلوں میں کوئی ایسے شکوک شبہات نہیں۔ تذبذب (Dualism) کی خوفناک کشمکش جو تخلیقی ذہن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے ان کے شعور میں پیدا نہیں ہوئی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ روس میں ذہن اور عمل میں سو فیصدی مطابقت اور ہم آہنگی ہے۔ وہاں حکومت سامراجی یا سرمایہ دارانہ جمہوریت نہیں صحیح سچی سو فیصدی عمومیت ہے۔ روس کا ہر مزدور اور کسان جانتا ہے کہ وہ اپنی حکومت، اپنے گھر، اپنی خوشی، اپنے مستقبل کے لئے سر مار رہا ہے۔ روس کا ہر ادیب اس امر سے بخوبی واقف ہے۔ وہ اپنی روح کی پوری قوت سے لڑ رہا ہے۔ وہ ذہنی انتشار اور تذبذب وہ فکری دو راہا جو بیشتر مغربی، امریکی اور ہندوستانی ادیبوں کیلئے سوہان روح بنا ہوا ہے وہاں ناپید ہے۔ روس میں ناپید ہے اور چین میں بھی۔ چینی جنگ بھی سو فیصدی وطنی جنگ ہے۔ اس لئے چین کا ادب دیکھئے، موجودہ جنگ نے چینی ادب کی ہیئت بدل دی ہے۔ وہ آج کل دنیا کے بہترین ترقی پسند ادب میں ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ جب تک جنگ کا فکری اور جذباتی ماحول کسی ادیب کے ذہنی ماحول سے تطابق نہ پیدا کرے کسی تخلیقی کارنامے کا ظہور میں آنا ناممکن ہے۔

جہاں تک اتحادیوں اور محوریوں کا تعلق ہے، اس امر میں مجھے کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی ادیب کی ہمدردی اتحادیوں کے ساتھ ہے۔ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ نازیت، فسطائیت اور جاپانی سامراجیت کے مقابلے پر امریکہ برطانیہ روس اور چین جیت جائیں۔

لیکن جہاں تک اس کے اپنے ملک کی آزادی کا سوال ہے وہ اتحادیوں کی موجودہ روش کو ناپسند کرتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام کے متعلق اتحادیوں نے جو خاموشی اختیار کر رکھی ہے وہ اسے جنگ کے بعد کے زمانے کے لئے بے حد خطرناک اور نقصان دہ سمجھتا ہے۔ کم از کم اس کا دل اس بارے میں شک و شبہات سے خالی نہیں۔ یہی تضاد جو ہمدردی اور ناپسندیدگی کی جذباتی اور فکری کشمکش سے پیدا ہوتا ہے اسکی ذہنی الجھنوں کا منبع ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اتحادیوں کی حمایت کرے۔ جی جان سے اپنی روح کی پوری قوت سے فسطائیت کی تاریک اور گھناؤنی قبا کو چاک چاک کر ڈالے، لیکن پھر اس کا ذہن اُن حالات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اس کے اپنے ملک میں بلکہ پورے ایشیا میں پیدا ہو رہے ہیں اور وہ سوچتا ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ ناچار وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ تضاد کی یہ ذہنی کیفیت نہ صرف ہندوستانی ادیبوں میں پائی جاتی ہے بلکہ اُن تمام ترقی پسند مغربی ادیبوں میں بھی جنہیں انسان کا مستقبل عزیز ہے جو نفرت نہیں بلکہ الفت کی مضبوط دیواروں پر بشریت کے لئے ایک پائندہ مستقبل تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ انگریز ادیبوں میں جارج برنارڈ شا۔ ایچ۔ جی۔ ویلز۔ آلڈس ہکسلے اور آڈن۔ امریکی ادیبوں میں پرل بک اور اپٹن سنکلیر اور چینی ادیبوں میں لین یو تانگ اور اس کا پورا گروپ اس ذہنی خلفشار اور اضطراب کو اچھی طرح سے محسوس کرتے ہیں۔ ایشیا اور خصوصاً ہندوستان کے متعلق انہوں نے جن بصیرت افروز خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کی نظیر مغرب میں مشکل سے ملے گی۔

اور اگر اس تضاد کے بوجھل دباؤ سے کوئی اہم تخلیقی کارنامہ مکمل نہیں ہو سکتا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے کسی قسم کے ادبی نتائج مرتب نہیں کئے جا سکتے۔ جنگ کے

متعلق ہندوستانی ادیب کی مسلسل خاموشی اس کی ذہنی اور فکری کمزوری کی دلیل سمجھی جائے گی۔ آخر وہ کیوں چپ ہے۔ وہ کیوں اپنی رُوح کے سوہان کو، اپنے دل کی جلن کو، اپنے ذہن کے الجھاؤ کو لوگوں پر ظاہر نہیں کرتا۔ ایک مزدور مَر جاتا ہے۔ ایک سرمایہ دار ظلم کرتا ہے ایک عاشق اپنی محبوبہ کے فراق میں تڑپ اُٹھتا ہے تو اس کا قلم حرکت میں آ جاتا ہے۔ اس کی تخلیقی قوتوں میں شرارے دکھنے لگتے ہیں اور آج کروڑوں مزدوروں کی موت کے سامان ہو رہے ہیں۔ ہزاروں عاشق اپنے محبوبوں سے جُدا ہو کر موت کی آغوش میں جا رہے ہیں۔ فسطائی امیروں نے سارے یورپ کو ویران خانہ بنا دیا ہے لیکن وہ بدستور خاموش ہے؟ آخر کیوں؟

کیوں نہ وہ اپنے ذہنی اُلجھاؤ کو عوام پر ظاہر کرے۔ کیوں نہ وہ اپنی عقلیت کو کام میں لا کر اس ذہنی الجھاؤ کو سُلجھا لے۔ آخر اتحادیوں میں بھی تو بہت سے امور بناء نزاع ہیں۔ ہر بالغ نظر سیاست دان جانتا ہے کہ امریکہ اور انگلستان میں ہندوستان اَور مشرقِ بعید کے متعلق نہایت نازک اختلافات رَہ چکے ہیں۔ فرانس کی نئی سیاسی زندگی کے متعلق نقطۂ نظر اکثر مختلف ہوتا ہے۔ یورپ میں جرمنوں کے خلاف دوسرا محاذ قائم کرنے پر روس، انگلستان اور امریکہ میں اب تک شدید اختلاف رہا ہے۔ چینی قائد چیانگ کائی شیک آج تک شکوہ کر رہا ہے کہ اس کے اتحادیوں سے وہ فوجی کمک نہیں مل سکی، جس کا وہ شروع سے متمنی رہا ہے۔ یہ اور اس کے علاوہ اور بہت سے ایسے سیاسی، سماجی، اقتصادی مسائل ہیں جو اتحادیوں میں بناء نزاع ہیں۔ لیکن ان کے باوجود وہ مل کر کام کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہیں۔ کیونکہ دشمن ایک ہے اور جب تک دشمن نہ مٹ جائے کسی عمومی نصب العین کا پورا ہونا ناممکن ہے۔

ہندوستانی ادیب اپنے ذہنی تضاد ہی کو اپنی ادبی تخلیقات کا مرکز بنا سکتا ہے۔ وہ سامراج کے خلاف لکھ سکتا ہے، وہ فطائیت اور اس کے متعلقات سے بحث کرتا ہوا ان کے خلاف اپنے جذبۂ نفرت کی تشکیل کرتا ہوا، اپنے وطنی حالات اور اُن کے متعلق اپنے نازک احساسات کو عوام پر ظاہر کر سکتا ہے۔ لیکن وہ جنگ کے متعلق خاموش نہیں رہ سکتا۔ یہ جنگ جو نہ صرف کروڑوں انسانوں کے دلوں میں شگاف پیدا کر رہی ہے بلکہ اس کے وطنِ عزیز پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔ اگر اس کے دل میں انسان کے لئے محبت ہے، اپنے ملک کے لئے جذبۂ بہبودی ہے تو وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک ایسی غلطی، ایک ایسی فکری بددیانتی ہوگی جس کا خمیازہ نہ صرف اُسے بلکہ سارے ملک کو سالہا سال بھگتنا پڑے گا۔

شکست
ملک کے مشہور افسانہ نگار
مسٹر کرشن چندر ایم اے نے یہ ناول لکھا ہے
یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ "شکست" کو یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں کے اعلےٰ ناولوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔
ناول کا پس منظر بہشت نظیر کشمیر ہے۔ کرشن چندر نے اس سرزمینِ حسن میں زندگی کے رومانی پھول کھلائے ہیں۔
قیمت تین روپے
ساقی بکڈپو۔ دہلی

مائیکیل شولوخاف

مترجمہ:- سبط حسن

نفرت

.. . . دشمن کو تم اس وقت تک شکست نہیں دے سکتے
جب تک تہہِ دل سے اس سے نفرت نہ کرسکو"

اسٹالین

آدمیوں کی طرح درخت بھی دورانِ جنگ میں اپنے اپنے انجام کو پہنچتے ہیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ہماری توپوں کی گولہ باری نے جنگل کے ایک بہت بڑے خطہ کو صاف کردیا تھا۔ یہیں حال میں جرمنوں نے موضع ص ـــــ سے بھاگ کر پناہ لی تھی۔ اور طویل مدت تک قیام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر موت نے درختوں کے ساتھ ان کو بھی کاٹ کر رکھ دیا۔ صنوبر کے گرے ہوئے تنوں کے نیچے جرمنوں کی لاشیں پڑی تھیں، اور ہرے ہرے جنگلی پودوں میں ان کے گھایل بدن سڑ رہے تھے۔ گولوں سے پاش پاش صنوبر کے درختوں کی رال بھری خوشبو بھی سڑتی ہوئی لاشوں کے اس تیز تعفن پر غالب آسکی۔ بُو سے دم گھٹتا تھا اور قے ہونے لگتی تھی۔ خود زمین پر توپ کے گولوں نے جہاں جہاں بھورے ٹیلے، جھلسے ہوئے اور ناہموار گڑھے بنائے تھے، ان سے ـــــ گویا قبر کی مہک آ رہی تھی۔

ہمارے گولوں نے جتنے خطہ کو صاف کرکے گویا ہل چلا دیا تھا اس پر موت کا پُرسکوت شاہانہ دبدبہ چھایا ہوا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ ایک نقرئی برج کھڑا تھا جس کو کسی

ایک قسم کا درخت

معجزہ نے بچا لیا تھا اور گولیوں سے خراش کھائی ہوئی اس کی شاخوں کو ہوا جھولا جھلا رہی تھی اور تازہ، چمکتے ہوئے رس دار پتوں سے سرگوشی کر رہی تھی۔

ہم اسی کھلی جگہ سے گذر رہے تھے میرے آگے جو نوجوان سگنل والا تھا اس نے درخت کے تنے کو ہلکے سے چھوا اور خلوص اور شفقت بھری حیرت سے پوچھا:-

”میرے پیارے تم کیسے بچ نکلے“؟

لیکن گولہ کھا کر اگر صنوبر اس طرح مرتا ہے گویا درانتی سے اسے کاٹ دیا گیا ہو اور اس کی ابھری ہوئی چھید یا سے صنوبر کا رس بہتا رہتا ہے تو شاہ بلوط کی موت کسی اور ہی طرح آتی ہے۔

کسی گمنام ندی کے کنارے ایک پرانا شاہ بلوط کھڑا تھا۔ ایک جرمن گولہ اس کے تنے میں آکر بیٹھ گیا۔ اس شگاف پڑے ہوئے کھردرے زخم نے آدھے درخت کی جان لے لی لیکن دوسرا نصف دھماکے سے پانی پر جھک گیا۔ وہ بہار کے دنوں میں حیرت انگیز طور پر تر و تازہ ہو گیا۔ اور اس میں گھنے پتے پھوٹ نکلے اور آج تک اس ٹوٹے بلوط کی نچلی ڈالیاں بہتے پانی میں نہایا کرتی ہیں اور اوپر کی ڈالی اپنے کٹے ہوئے، بے دلی سے کھلنے پتوں کو لئے اشتیاق سے سورج کا منہ تکا کرتی ہے۔

* * * *

دراز قد، قدرے جھکا ہوا، پتنگ کے سے اونچے، چوڑے شانوں والا لفٹننٹ جیراسیموف خندق کے دہانے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تفصیل سے آج کی کارروائیاں سنا رہا تھا، کیسے اس کی پلٹن نے دشمن کے ٹینک کے حملوں کو پسپا کیا تھا۔

اس کے دبلے چہرے پر خوشی قریب قریب بے پروائی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی

مشتعل آنکھیں بیزاری کے ساتھ حرکت کر رہی تھیں۔ وہ پھٹی اور دھیمی آواز سے بات کرتا، اور رہ رہ کر اپنی بڑی گٹھیلی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا لیتا۔ ان حرکات و سکنات کو جو اس کے بے زبان رنج و الم یا گہری اور تکلیف دہ محویت کا پردہ فاش کر رہی تھیں —— —— اس کے طاقتور جسم اس کے مردانہ زندہ چہرے سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔

یکایک وہ چپ ہو گیا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کے زیتونی گالوں پر زردی چھا گئی۔ چہرہ پر تشنجی کیفیت پیدا ہوئی اور آنکھوں میں ایسی خوفناک اور نہ بجھنے والی نفرت کے آثار نمودار ہوئے کہ بلا ارادہ میں بھی اسی طرف دیکھنے لگا جدھر اس کی نگاہیں تھیں ہماری سب سے قریب کی مورچہ بندی کے پاس جنگل سے ہو کر تین جرمن قیدی گزر رہے تھے اور ان کے پیچھے سُرخ فوج کا ایک سپاہی تھا۔ اس کا گرمی کا لبادہ دھوپ سے قریب قریب بالکل سفید ہو چکا تھا اور برساتی ٹوپی سر کے پچھلے حصہ پر پڑی ہوئی تھی۔

سُرخ فوج کا سپاہی اطمینان سے آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق اس کے جسم کی نقل و حرکت کے ساتھ جھول رہی تھی اور سنگین کی نوک دھوپ میں چمک رہی تھی تینوں جرمن بھی دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ ان کے جوتوں پر زرد کیچڑ کی چھینٹیں پڑی تھیں۔ شاید وہ اپنے پیروں کو گھسیٹ رہے تھے۔ سب سے اگلا جرمن ایک سن رسیدہ آدمی تھا۔ اس کے گال دھنسے ہوئے تھے اور ان پر گھنی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ گذرتے ہوئے اس نے خندق پر قہر آلود، گرگ سیرت نگاہ ڈالی، پھر تیزی سے مڑ گیا اور اپنی کمر بند سے لگی آہنی کلاہ کو ٹھیک کرنے لگا۔ تب لفٹننٹ جیراسموف اچھل کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا، اور سرخ فوج کے سپاہی سے چیخ کر بولا:-

"تمہارا ارادہ کیا ہے؟ انہیں ٹہلانے نکلے ہو کیا؟ انہیں پھرتی سے لے جاؤ!"

بظاہر وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر مارے غصے کے وہ بول نہ سکا۔ تیزی سے گھوم کر وہ سیڑھیوں سے خندق میں اتر گیا۔ فوج کے سیاسی معلم نے جو وہیں موجود تھا میری سوالیہ متحیر نگاہوں کا دبی زبان میں جواب دیا "مجبوری ہے اس کے اعصاب پر پڑا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں؟ اسے جرمنوں نے قید کر لیا تھا تم کبھی اس سے باتیں کرو۔ وہاں اس کو بڑی مصیبت جھیلنی پڑی اور قدرتاً اس کے بعد وہ کسی زندہ جرمن کی صورت دیکھنا برداشت نہیں کر سکتا۔ مردہ جرمنوں کو دیکھنے میں اسے کوئی اعتراض نہیں، بلکہ میں تو کہوں گا اس سے اسے کچھ اطمینان سا ہوتا ہے۔ لیکن قیدیوں پر اس کی نظر پڑ جائے تو وہ اپنی آنکھیں بند کر کے سناٹے میں پڑ جائے گا اور اس کے چہرہ پر مُردوں کا سا پیلا پن چھا جائے گا۔ یا پھر گھوم کر وہ وہاں سے چلا جائے گا۔ سیاسی معلم میرے کچھ اور نزدیک آگیا اور دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ "میں دو بار اس کے ساتھ لڑائی پر گیا ہوں۔ اس میں گھوڑے جیسی طاقت ہے، اور تم دیکھتے رہ جاؤ گے کہ وہ کیا کرتا ہے . . . . میں نے زندگی میں دو ایک حیرت انگیز چیزیں دیکھی ہیں۔ لیکن جب وہ سنگین لگی بندوق اٹھاتا ہے . . . . میں کہتا ہوں، وہ بڑا دہشت خیز منظر ہوتا ہے!"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

اُس رات جرمن توپوں کی گولہ باری صبح تک جاری رہی۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کہیں فاصلہ پہ ہلکی سی گڑگڑاہٹ اور اس کے چند لمحوں بعد دور اوپر تاروں بھرے آسمان میں توپ کے گولے کی آہنی سنسناہٹ سنائی دیتی۔ یہ بھنبھناہٹ بڑھتے بڑھتے چیخ بنتی پھر رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی۔ حتیٰ کہ ہمارے پیچھے شاہراہ کی سمت میں جہاں دن کو میدانِ جنگ کو اسلحے پہنچانے والی گاڑیوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے، زرد بجلی کے سے شعلے پھوٹ پڑتے اور

اور بادل کی گرج کا سا زور کا دھماکا ہوتا۔

ان دھماکوں کے بیچ کے وقفوں میں جب جنگل پر پھر ایک بار سکوت چھا جاتا تو مچھروں کی بھنبھناہٹ اور قریب کے دلدل سے گھبرائے ہوئے مینڈکوں کی ڈرپوک ٹرٹر سنائی دینے لگتی۔ ہم لوگ ہیزل کی جھاڑی کے نیچے لیٹے ہوئے تھے اور لفٹننٹ جیراسیموف اطمینان کے ساتھ ہم لوگوں کو اپنی زندگی کا قصہ سُنا رہا تھا۔

"لڑائی سے پہلے میں مغربی سائبیریا کے ایک کارخانہ میں مستری تھا۔ فوج میں میری طلبی پچھلے سال ہوئی ۔— ۹ر جولائی کو۔ میرے اہل وعیال بھی ہیں۔ بیوی اور دو بچے۔ پھر میرا باپ بھی ہے۔ وہ معذور ہو چکا ہے۔ خیر جب میں روانہ ہونے لگا تو قدرتاً میری بیوی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور رخصت ہوتے وقت وہ مجھے سمجھانے لگی: "اپنے وطن اور اپنی قوم کی آخر وقت تک حفاظت کرنا۔ اگر ضرورت پڑے تو اپنی جان قربان کر دینا مگر اس جنگ میں ہمیں ضرور جیتنا ہے۔" مجھے یاد ہے میں ہنسنے لگا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم اپنے کو کیا سمجھتی ہو؟ تم میری بیوی ہو یا اُستانی؟ میں سمجھتا ہوں میں کافی بڑا ہو چکا ہوں۔ اور سمجھ بوجھ کے کام کرتا ہوں اور جہاں تک جیتنے کا سوال ہے ۔— ہم فاشسٹوں کا گلا گھونٹ دینگے، اس کی تم فکر مت کرو۔"

میرا باپ بے شک زیادہ کڑی طبیعت کا آدمی ہے۔ مگر چلتے چلتے مجھے اس سے بھی تھوڑی سی نصیحت مل گئی۔ "یاد رکھنا کوسٹیا" وہ بولا "جیراسیموف خاندان کا نام کوئی معمولی نام نہیں ہے۔ تم مزدوروں کی اولاد ہو۔ تمہارے پردادا اسٹروگانوف کے یہاں کام کرتے تھے۔ ہمارا خاندان سینکڑوں برس سے ملک کا لوہا ڈھالتا رہا ہے۔ تمہیں اس لڑائی میں خود لوہا بن جانا چاہیے۔ ہماری حکومت ہماری اپنی ہی بنائی ہوئی ہے۔ اس نے لڑائی

چھڑنے سے پہلے ہی تمہیں محفوظ فوج کا کمانڈر بنا دیا ہے اور تمہیں چاہئے کہ دشمن کو اچھی طرح مزا چکھا دو۔"

"ضرور" میں نے کہا۔

سٹیشن جاتے ہوئے میں ضلع پارٹی کمیٹی کے صدر دفتر میں بھی ذرا دیر کے لئے ٹھہر گیا۔ ہمارا سکریٹری ایک روکھا پھیکا خشک قسم کا انسان تھا۔ بحث کرنا اس کی عادت تھی میں سوچنے لگا۔ جب میری بیوی اور بڑے میاں چلتے چلتے مشورے دینے سے باز نہ آئے تو شخص کم از کم آدھ گھنٹہ بکواس کئے بغیر پیچھا نہ چھوڑے گا۔ مگر بات بالکل الٹی نکلی۔ اس نے کہا "بیٹھو جیراسیموف۔ اگلے زمانہ میں رواج تھا کہ سفر کرنے سے پہلے ذرا دو ایک منٹ بیٹھ لیتے تھے۔"

کچھ دیر ہم لوگ چپ بیٹھے رہے، پھر وہ کھڑا ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ اس کا چشمہ آنسو سے نم ہو گیا ہے۔ ارے میں نے آپ ہی آپ سوچا، آج تو گنگا الٹی بہ رہی ہے۔ اس نے کہا، "کامریڈ جیراسیموف، اب کہنے کے لئے کچھ رہا نہیں مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب تمہارا قد ذرا سا تھا، پائنیر[1] کا سرخ رومال لگائے بڑے بڑے کان لئے پھرتے تھے اور اس کے بعد مجھے یاد ہے کہ تم لیگ[2] کے ممبر ہوئے۔ اور اب دس سال سے میں تمہیں پارٹی کے ایک ممبر کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ جرمن سوروں پر کوئی رحم نہ کرنا! پارٹی کو تم پر اعتماد ہے۔ پہلی مرتبہ ہم نے اپنی زندگی میں پرانے روسی طریقے سے ایک دوسرے کا بوسہ لیا۔

"وہ جس شفقت سے ملا اس سے مجھ میں نئی جان آ گئی۔ اور جب میں ضلع کمیٹی کی عمارت سے باہر نکلا تو خوش اور متاثر تھا۔ میری بیوی نے بھی مجھے بشاش کر دیا۔ تم سمجھ

---

[1] کمیونسٹ بچوں کی انجمن [2] کمیونسٹ نوجوانوں کی انجمن

سکتے ہو۔ کسی آدمی کی بیوی کے لئے اپنے شوہر کو میدانِ جنگ میں روانہ کرنا کوئی بڑی خوشی کی بات نہیں ہے۔ خیر، میری بیوی بھی ذرا پریشان تھی۔ جیسے وہ واقعی کوئی بڑی اہم بات کہنا چاہتی ہو۔ مگر سب کچھ اس کے دماغ سے گم ہو چکا تھا۔ ٹرین چلنے لگی تھی۔ وہ اس کے ساتھ دوڑتی رہی۔ میرا ہاتھ نہیں چھوڑتی تھی، بار بار کہتی تھی :۔

"دیکھو، دتیا، اپنا خیال رکھنا۔ اور کہیں میدانِ جنگ میں تم سردی نہ کھا جاؤ"۔ خدا کی پناہ ندیا! میں نے کہا "تم مجھے کیا سمجھ رہی ہو؟ میں سردی نہیں کھاؤں گا۔ وہاں کی آب و ہوا صحت بخش اور معتدل ہے۔ اور ساتھ ہی مجھے اس سے الگ ہونے پر ملال بھی ہو رہا تھا اور اس نے پیار کی جو بھولی بھالی باتیں کیں، اس سے میری طبیعت کو کچھ خوشی ہوئی اور تب مجھ پر جرمنوں کے لئے خموش غصّہ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ چونکہ پہل انہیں نے کی ہے، اس لئے میرے دھوکہ باز پڑوسی، ذرا ہوشیار رہنا۔ ہم تمہاری ایسی مرمت کریں گے کہ تم زندگی بھر یاد رکھو گے"۔

وہ کئی منٹ خاموش رہا۔ دوسرے سرے پہ توپوں کی غیر مسلسل گولہ باری پہ کان لگائے رہا۔ گولہ باری جس طرح یکایک شروع ہوئی تھی رک گئی اور وہ کہنے لگا :۔

لڑائی سے پہلے ہمیں جرمنی سے مشینری ملا کرتی تھی۔ جب میں پرزوں کو جمع کرتا تو مجھے یاد ہے۔ میں ہر پرزہ کو پانچ چھ مرتبہ جانچا کرتا تھا، اُسے الٹ پلٹ کر کے ہر طرف سے دیکھا کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں، ان مشینوں کو ماہر ہاتھوں نے بنایا تھا۔ میں جرمن مصنفوں کی کتابیں پڑھا کرتا تھا اور نہ جانے کیوں میں جرمن قوم کی عزّت کرنے لگا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ میں کبھی کبھی سوچنے لگتا کہ کتنے شرم کی بات ہے کہ ایسی صلاحیت رکھنے والی اور محنتی قوم اس قابلِ نفرت ہٹلری طرزِ حکومت کو برداشت کئے ہوئے ہے۔ مگر، آخر یہ ان کا نجی،

معاملہ ہے۔ تب مغربی یورپ میں جنگ چھڑ گئی۔

"مورچہ پہ آتے ہوئے میں یہ سوچنے سے باز نہ آسکا کہ ان کی فوج خاصی اچھی ہے او فنی اعتبار سے بھی وہ بہت طاقتور ہیں۔ اور اگر سوچو تو ایسے دشمن سے لڑنے میں او اس کی ہڈی توڑنے میں مزا بھی آتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں ہم لوگ اس قدر بھولے بھالے بھی نہیر تھے۔ میں مانتا ہوں مجھے اس دشمن سے کسی قسم کی اخلاقی ایمانداری کی امید نہیں تھی۔ . . جب فاشزم سے مقابلہ ہو تو ایسی باتوں کی توقع بھی نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن پھر بھی مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ ہمیں ایسے بے اصولے مجرموں سے لڑنا پڑیگا۔ جیسے بعد کو یہ جرمن ثابت ہوئے۔ بہر حال یہ سوال بعد میں آئے گا۔

"جولائی کے آخر میں ہمارا دستہ مورچہ پہ پہنچ گیا۔ ہم لوگ ستائیس تاریخ کو علی الصباح میدان جنگ میں اترے۔ پہلے تو یہ چونکہ نئی نئی چیز تھی اس لئے ذرا وحشت ہوئی تھی۔ دشمن نے اپنی خندقی توپوں سے زندگی عذاب کردی۔ لیکن شام ہوتے ہوتے ذرا رنگت سمجھ میں آنے لگی۔ ہم نے بھی جواب دیا اور ایک گاؤں سے انہیں نکال باہر کیا۔ اس لڑائی میں ہم نے ان کے ایک گروہ کو پکڑا۔ کل پندرہ آدمی تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، گویا کل کی بات ہو۔ جب وہ لائے گئے تو وہ خوفزدہ ہو رہے تھے اور پیلے پڑ گئے تھے۔ میرے آدمیوں کا غصّہ اس وقت تک ٹھنڈا ہو چکا تھا اور ہر ایک سے جو کچھ بن پڑا اس نے قیدیوں کو لاکر دیا۔ تمباکو، سگریٹ اور کسی کسی نے چائے بھی لاکر دی۔ ان کی پیٹھ تھپکی اور انہیں 'کامریڈ' کہہ کر پکارا "کامریڈ تم کس چیز کی خاطر جنگ کر رہے ہو؟" . . اور اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔

ہمارے ساتھیوں میں سے ایک نے جس کو فوج میں کام کرتے کئی سال ہو گئے تھے، اس رقت انگیز نظارہ کو کچھ دیر تک دیکھا اور تب وہ بولا:۔ "اپنے ان دوستوں

پر رحم کرنا چھوڑ دو۔ یہاں یہ سب 'کامریڈ' بن گئے؟ جاؤ دیکھو کہ یہ اپنی صفوں کے پیچھے کیا کر رہے ہیں۔ ہمارے زخمی آدمیوں اور شہریوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔ اس کے الفاظ کا وہی اثر ہوا جیسے کسی نے ہم لوگوں پر ایک بالٹی ٹھنڈا پانی انڈیل دیا ہو، پھر وہ چلا گیا۔

" اس کے بعد فوراً ہی ہمارے دستے نے حملہ شروع کیا اور تب ہم نے دیکھا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔ گاؤں نیست و نابود ہو چکے تھے۔ سینکڑوں عورتیں بچے اور بوڑھے گولے سے اڑا دیے گئے تھے۔ سرخ فوج کے گرفتار شدہ سپاہیوں کی لاشوں کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا تھا۔ عورتوں اور لڑکیوں کی جن میں کئی بہت کم سن تھیں عصمت دری کی گئی۔

خصوصاً ایک واقعہ تو میرے دماغ پر نقش ہو گیا ہے۔ وہ کوئی گیارہ برس کی لڑکی ہوگی۔ وہ شاید اسکول جا رہی تھی جب جرمنوں نے اسے پکڑا، وہ اسے سرکاری کھیت میں گھسیٹ لے گئے اور اس کی عصمت دری کی اور پھر مار ڈالا۔ وہاں وہ لڑکی جو محض بچہ تھی، [illegible] آلو کے پودوں میں پڑی تھی۔ اسکول کی کتابیں اس کے آس پاس بکھری ہوئی تھیں اور ان پر خون کے دھبے پڑ گئے تھے۔ اس کے چہرہ پر تلوار کے بڑے بھیانک زخم لگے تھے۔ ابھی تک اس کا ہاتھ اپنے اسکول کے بستے پر تھا جو ہیں کھلا پڑا تھا۔ ہم نے اس کے بدن کو کوٹ سے ڈھانک دیا اور دو تین منٹ تک چپ چاپ اس کے پاس کھڑے رہے۔ اور لوگ تو اسی طرح خاموشی سے چلے گئے لیکن میں ٹھہر گیا اور مجھے یاد ہے کہ پریشانی کی حالت میں میں آپ ہی آپ بکتا رہا۔ بارکوف اور پولوونکن 'طبعی جغرافیہ۔ ایریسکولو کا نصاب' یہ گھاس پر پڑی ہوئی ایک کتاب کا نام تھا۔ میں یہ کتاب پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

کیونکہ میری اپنی لڑکی پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی - - - -

یہ روژین کے نزدیک کا واقعہ ہے۔ اسکوری کا مقتل ایک تنگ گھاٹ میں تھا یہیں سُرخ فوج کے سپاہیوں کو اذیت دے دے کر مارا جاتا تھا۔ تم کسی قصاب کی دکان پر ضرور گئے ہوگے، گئے ہو نہ؟ خیر اس سے تم سوچ سکتے ہو وہ جگہ کیسی تھی . گھاٹی میں جو درخت تھے ان کی شاخوں سے خون میں لتھڑے ہوئے آدمیو کے دھڑ لٹک رہے تھے۔ ہاتھوں اور پیروں کو کاٹ کر بوٹی بوٹی کر دیا گیا تھا اور آدھے بدن کی کھال کھینچ لی گئی تھی ... گھاٹی کے نیچے آٹھ اور آدمیوں کی لاشیں پڑ تھیں۔ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ کون اعضا کس کے ہیں۔ بس سمجھو کہ ذبح کئے ہوئے گوشت کا ڈھیر تھا۔ جس کے بڑے بڑے ٹکڑے کر کے ڈال دیا گیا تھا اور ان کے اوپر پلیٹو کی طرح ایک کے اوپر ایک سُرخ فوج کی آٹھ برساتی ٹوپیاں رکھی تھیں . . . . .

”کیا تم سمجھتے ہو، میں نے جو کچھ دیکھا ہے اسے الفاظ میں ادا کرنا ممکن ہے؟ نہیں یہ ممکن نہیں! اس کو بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں مل سکتے۔ تم آپ اپنی آنکھوں سے د تو سمجھو۔ بہر حال، اب ہم لوگ کوئی اور بات کریں“۔ اور بہت دیر تک لفٹننٹ جیرا سیمو کچھ نہیں بولا ۔

میں نے پوچھا ”یہاں سگرٹ پینے کی اجازت ہے“؟

”ہاں ضرور، مگر روشنی نہ ہونے پائے“ وہ بھرائی ہوی آواز میں بولا، اور خود سگرٹ جلا کر کہنے لگا :-

تم سمجھ سکتے ہو کہ جرمنوں کی ان حرکتوں کے بعد قدرتی بات ہے کہ ہم لوگ بھی کے پیاسے ہو گئے ہیں اور کیا ہو سکتا تھا؟ ہم میں سے ہر ایک نے سمجھ لیا کہ ہمیں انسا

سے نہیں بلکہ درندوں سے واسطہ پڑا تھا جو غصہ سے اندھے ہو رہے تھے۔ یہ بات صاف تھی کہ جرمن ہمارے ساتھیوں کو اس مہارت کے ساتھ مار ڈالتے، ان کی عصمت دری کرتے اور قتل کرتے ہیں جس مہارت سے وہ خراد اور مشنیری بنایا کرتے تھے۔ ہمیں اس کے بعد پیچھے ہٹنا پڑا۔ لیکن ہم لوگ پھر بڑی خونخواری کے ساتھ لڑتے رہے۔

ہماری کمپنی کے تقریباً سبھی آدمی سائبیریا کے رہنے والے تھے۔ لیکن ہم نے یوکرین کی ایک ایک چپہ زمین کے لیئے جاں توڑ لڑائی کی۔ ہمارے کئی آدمی یوکرین میں مارے گئے مگر جرمنوں کو اس سے بھی زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ سچ ہے کہ ہم پیچھے ہٹ رہے تھے مگر ہم نے ان کو خوب مزا چکھایا۔"

اس نے سگریٹ کے دو تین کش لیئے، پھر لہجہ بدل کر بولا :-

"یوکرین کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ وہاں کے مناظر بڑے پیارے ہیں۔ ہمیں ہر گاؤں، ہر بستی سے الفت ہو جاتی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم نے ان پر اپنا خون بہانے سے دریغ نہیں کیا تھا اور کہتے ہیں خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔ —— اور جب کبھی کسی گاؤں کو چھوڑنا پڑتا تو ہمیں بڑی تکلیف ہوتی اور افسوس بھی، —— گو ہم بعض مقامات کو عارضی طور پر ہی خالی کرتے لیکن پھر بھی ہم ایک دوسرے سے آنکھیں نہ چار کر سکتے۔

" اس وقت مجھے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ میں کبھی جرمنوں کا قیدی بھی ہو سکتا ہوں لیکن ہوا یہی۔ پہلی بار میں ستمبر میں زخمی ہوا۔ لیکن میں اپنی کمپنی کے ساتھ ٹھہرا رہا۔ لیکن ستمبر کو میں پولتاوا کے علاقے میں دینی سکووا کے نزدیک دوبارہ زخمی ہوا اور قید کر لیا گیا۔

پہلے جرمن ٹینک میسرہ کی سمت سے گھس آئے پھر ان کی پیدل فوج بھی اسی راہ سے داخل ہونے لگی۔ ہم گھر گئے تھے۔ لیکن پھر بھی لڑتے ہوئے نکل آئے۔ اس دن میری کمپنی کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ ہم نے ٹینک کے دو حملوں کو پسپا کیا۔ دشمن کے چھ ٹینکوں اور ایک مسلح گاڑی کو آگ لگا دی یا بیکار کر دیا اور مکئی کے کھیت میں کوئی ایک سو بیس ہٹلریوں کو ٹھکانے لگایا لیکن اس موقعہ پہ وہ اپنے خندقی توپ خانہ کو لے آئے اور ہمیں اس بلندی کو چھوڑنا پڑا جس پر ہم لوگ دوپہر سے چار بجے تک قابض تھے۔ موسم صبح ہی سے گرم تھا۔ آسمان پر ابر کا ایک ٹکڑا نہیں تھا اور سورج کی حدت اتنی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ دم گھٹ جائے گا۔ گولے بڑی تیزی سے گر رہے تھے اور ان کا تانتا بندھ گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ اتنے پیاسے تھے کہ سبھوں کے ہونٹ پھول کر سیاہ ہو گئے تھے۔ میں جیسی کرخت آواز میں احکام صادر کر رہا تھا وہ مجھے خود اپنی آواز نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ ہم لوگ جنگل کے بیچ میں ایک کھلی جگہ سے گذر رہے تھے کہ ایک گولہ ٹھیک میرے سامنے گر کر پھٹا۔ مجھے تھوڑا تھوڑا یاد ہے میں نے سیاہ مٹی اور غبار کا ٹیلہ اٹھتے ہوئے دیکھا ـــ اور بس۔ گولے کا ایک ٹکڑا میری آہنی کلاہ کے آر پار ہو گیا اور دوسرا میرے داہنے شانہ میں لگا۔

"نہ جانے میں وہاں کتنی دیر بے ہوش پڑا رہا۔ لیکن کسی کے پیروں کی چاپ نے مجھے جگا دیا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ میں جہاں گرا تھا وہاں نہیں ہوں۔ میرا لبادہ غائب تھا اور میرے شانہ پہ معمولی سی پٹی بندھی تھی۔ میری آہنی کلاہ بھی گم تھی۔ میرے سر پہ بھی ایک پٹی تھی مگر اسے ٹھیک سے باندھا نہیں گیا تھا اور اس کا ایک سرا میرے سینے پر پڑا تھا۔ مجھے یکایک خیال آیا کہ شاید میرے ساتھی مجھے میدان سے اٹھا لائے ہیں اور راستے میں انہوں نے یہ پٹی باندھی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اس امید میں سر اٹھایا

ساتھیوں کو دیکھوں۔ لیکن میری طرف جو لوگ دوڑتے آرہے تھے وہ میرے
نہیں بلکہ جرمن تھے۔ یہ اُن کے قدموں کی آواز تھی جس سے میں ہوش میں آگیا
ب وہ بالکل صاف نظر آرہے تھے جیسے سنیما کے پردہ پر ہوں۔ میں نے اپنے آس
ڈالا۔ مجھے پستول، بندوق، دستی بم کچھ نہ مل سکا۔ کسی نے —— شاید میرے ہی اپنے
تھی نے —— میرے ہتھیار اور ہتھیا رکھیں نکال لئے تھے۔

میں نے سوچا، بس اب خاتمہ ہے، میں اس وقت اور کیا سوچ رہا تھا؟ اگر تم
طے ناول کے لئے مسالا چاہتے ہو، تو بہتر ہے کہ تم خود ان خالی جگہوں کی خانہ پُری
چی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس وقت کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہ تھی۔ جرمن سامنے
رہے تھے اور میں پڑے پڑے مرنا نہیں چاہتا تھا، تم سمجھے؟ پس میں نے انتہائی کوشش
گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا، اپنے کو سیدھا رکھنے کے لئے میں زمین پر ہاتھ ٹیکے ہوتھا۔
جب تک وہ لوگ میرے پاس آئیں میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ قدرے
ن کے عالم میں مجھے فکر تھی کہ کہیں میرے گھٹنے جواب نہ دے دیں۔ اور جب میں
ں تو وہ لوگ اپنی سنگینوں سے میرا کام تمام کردیں۔ مجھے اب کسی کی صورت
ں ہے۔ وہ بات کرتے اور ہنستے میرے آس پاس جمع ہو گئے" مجھے مار ڈالو، اوکتو!"
ہ کہا "مار ڈالو، میرے گرنے سے پہلے میرا خاتمہ کر دو، ان میں سے ایک نے مجھے اپنی
سے مارا —— میں گر پڑا، مگر چشم زدن میں پھر کھڑا ہو گیا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے
اور ایک نے ہاتھ ہلایا۔ جس کا مطلب تھا "چلے چلو"۔ میں چل پڑا۔

"میرے چہرے پر سر کے زخم سے خون کی پپڑیاں جم گئی تھیں۔ زخم سے اب
کل تازہ خون بہہ رہا تھا۔ میرے شانوں میں درد تھا اور میں اپنا داہنا ہاتھ

نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے میری خواہش یہی تھی کہ لیٹا رہوں اور کہیں نہ جاؤں مگر پھر بھی میں چلتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔

"نہیں بے شک میں مرنا نہیں چاہتا تھا مگر قید رہنا تو بالکل ہی نہیں چاہتا تھا۔ بہ ہزار دقت جگر اور متلی کو روکتے ہوئے میں گھسٹتا چلا گیا۔ مجھ میں ابھی زندگی باقی تھی اور میں اب بھی حرکت کر سکتا تھا۔ لیکن اُف، مارے پیاس کے جان نکلی جا رہی تھی، حلق سوکھ کے کانٹا ہو گیا تھا۔ اگرچہ میرے پیر آپ ہی آپ اُٹھ رہے تھے۔ لیکن آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میرے ہوش و حواس جواب دینے لگے تھے۔ لیکن میں یہ سوچ کر چلتا گیا اگر مجھے تھوڑا پانی اور ذرا آرام ملے تو پھر میں کوئی صورت نکال لوں گا۔"

"ہم سبھی لوگ جو پکڑے گئے تھے جنگل کے ایک کنارے ایک صف میں کھڑے کر دئے گئے۔ وہ ہمارے پڑوس کی ایک پلٹن کے لوگ تھے۔ اپنی رجمنٹ سے میں نے تیسری کمپنی کے دو سرخ سپاہیوں کو پہچانا۔ زیادہ تر قیدی زخمی تھے۔

"ایک جرمن لفٹننٹ نے ٹوٹی پھوٹی روسی میں پوچھا "تم میں سے کون کون لوگ کمیسار یا کانڈر ہیں۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب اس نے حکم دیا "کمیسار اور افسران ـــــ دو قدم آگے بڑھ جاؤ"! کسی نے جرأت نہیں کی۔

"لفٹننٹ صف کے سامنے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس نے پندرہ سولہ آدمیوں کو چنا جو دیکھنے میں یہودی لگتے تھے۔ اس نے ہر ایک سے پوچھا 'یہودی'؟ اور جواب کا انتظار کئے بغیر اس آدمی کو صف سے نکلنے کا حکم دیا۔ جو لوگ چُنے گئے تھے ان میں صرف یہودی ہی نہیں بلکہ آرمینی، اور روسی بھی تھے، جن کا رنگ اتفاق سے سیاہی مائل تھا یا بال کالے تھے۔ یہ لوگ کچھ دُور لیجائے جا کر ہماری آنکھوں کے سامنے رائفل کی گولیوں

مار ڈالے گئے۔ تب ہم لوگوں کی تلاشی لی گئی اور ہماری پاکٹ بک اور دوسری بھی چیزیں
ن لی گئیں۔ میں اپنی پاکٹ بک میں اپنا پارٹی کارڈ رکھنے کا عادی نہ تھا۔ وہ میرے پتلون
ر کی جیب میں تھا۔ اور اسی لئے وہ اُسے پا نہ سکے۔ اگر سوچو تو آدمی بھی عجیب مخلوق ہے۔
جانتا تھا کہ اب جان بچنے کی کوئی اُمید نہیں اور بھاگنے کی کوشش میں اگر میں نہ بھی مارا گیا
ں پیدل چلتے چلتے خود ہ ائے گا کیونکہ جسم سے اتنا خون بہہ چکا تھا کہ میرے لئے
ں کے ساتھ چلنا مشکل تھا اور پھر بھی جب تلاشی ختم ہو چکی اور مجھے یاد آیا کہ میرا پارٹی
ابھی میرے ہی پاس ہے تو مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں اپنی پیاس بالکل بھول گیا۔

"ہم لوگوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے مغرب کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ایک کافی مضبوط
ہمارے ساتھ تھا اور ایک درجن جرمن موٹر سائیکلوں پہ پیچھے آ رہے تھے۔ ہم لوگوں کو
فتار سے چلایا جا رہا تھا اور میری طاقت تیزی سے گھٹتی جا رہی تھی۔ دو بار میں گرا مگر گھٹنے
ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا اور چلتا رہا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے چلنے میں ایک منٹ
ی تاخیر کی تو قطار آگے بڑھ جائے گی اور مجھے سڑک ہی پر گولی مار دی جائے گی۔ میرے
جو سارجنٹ تھا اس کا یہی حشر ہوا۔ اس کے پیر میں زخم تھا اور وہ بڑی مشکل سے
ں گھسیٹ رہا تھا۔ وہ کراہ رہا تھا اور کبھی کبھی درد سے چیخ اُٹھتا تھا۔ ہم لوگ تقریباً
کیلومیٹر گئے ہونگے کہ اس نے پکارا: "نہیں، اب مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوگا۔ رفیقو!
ت! اور وہ سڑک پہ بیٹھ گیا۔

"دوسروں نے اس کو ہاتھ کا سہارا دینا چاہا لیکن اُس میں اُٹھنے کی سکت ہی نہ تھی۔
وہ منظر یاد ہے۔ جیسے خواب دیکھا ہو ـــــ اس کا زرد نوجوان چہرہ، سکڑی ہوئی بھویں،
درد سے نم آنکھیں ـــــ قطار گذر گئی۔ وہ پیچھے چھوٹ گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، موٹر

سائیکل پر ایک آدمی اس کے قریب آیا، اپنا پستول نکالا اور سائیکل سے اُترے بغیر سارجنٹ کو گولی مار دی۔ دریا تک پہنچنے سے پہلے جرمنوں نے سُرخ فوج کے اور کئی آدمیوں کو جو پیچھے رہ گئے تھے گولی ماری۔

"پھر ہم لوگ دریا کے سامنے پہنچے۔ پل ٹوٹ گیا تھا اور جہاں سے دریا پار کیا جاتا تھا وہاں ایک ٹوٹی موٹر نے راستہ بند کر دیا تھا۔ میں وہیں منہ کے بل گر گیا۔ کیا مجھے چکر آ گیا تھا؟ نہیں میں لمبا لمبا ریت پر گر گیا اور میرے منہ میں مٹی بھر گئی اور میں غصہ میں دانت پیسنے لگا جو ریت کی وجہ سے کرکرا رہے تھے لیکن مجھ سے اُٹھا نہیں جاتا تھا۔ میرے رفقا میرے پاس سے ہو کر گذر رہے تھے۔ ایک نے ہانپتے ہوئے دھیمے سے کہا 'جلدی اٹھو نہیں تو وہ تم کو مار ڈالیں گے۔ میں انگلیوں سے اپنا منہ نوچنے اور آنکھیں ملنے لگا تاکہ تکلیف کی وجہ سے مجھ میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی سکت پیدا ہو جائے۔

"قطار گذر چکی تھی اور مجھے اپنی طرف آنے والی موٹر سائیکل کے پہیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کسی نہ کسی طرح میں زور کر کے کھڑا ہو گیا۔ موٹر سائیکل والے پر نظر ڈالے بغیر ایک شرابی کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے میں نے ہمت کر کے قطار کو پا لیا اور کہیں پیچھے صف میں شامل ہو گیا۔ دریا کو عبور کرتے ہوئے ٹینکوں اور ٹرک نے کیچڑ کر دیا تھا۔ لیکن ہم نے شکر گذاری کے ساتھ اُسے ——— اس گرم گرم گدلے کیچڑ کو پیا اور وہ ہمیں چشمہ کے شفاف ترین پانی سے زیادہ میٹھا معلوم ہوا۔ میں نے سر اور شانہ پر کچھ پانی ڈالا۔ اس سے میں تازہ دم ہو گیا اور چلنے کی سکت محسوس کرنے لگا۔ میں آہستہ آہستہ لیکن بہ دقت چل سکتا تھا۔ مجھے اب یہ امید ہو چلی کہ میں گر کر راستے میں چھوٹ نہیں جاؤں گا . . . .

ہم لوگ دریا سے کچھ ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ ہمیں درمیانی درجہ کے

جہ کے جرمن ٹینکوں کی ایک قطار ملی۔ سب سے اگلے ٹینک ڈرائیوروں نے جب یہ یا کہ ہم لوگ قیدی ہیں تو وہ ٹینک کے اوپر نکل آئے اور ہماری قطار پر پوری ی سے ٹینک دوڑا دیا۔ اگلی صفوں کے قیدی اس ٹینک کے نیچے کچل گئے۔ موٹر ئیکل والے اور بدرقہ کے لوگ اس نظارہ پر قہقہہ مار کر ہنسنے لگے اور ٹینک چلانے لوں سے جو کھلی کھڑکیوں سے سر نکالے ہوئے تھے چلّا کر کچھ بولے اور اپنے ہاتھ ہلائے۔ ے ہم لوگ پھر قطار میں کھڑے کر دئے گئے اور ہمیں سڑک کے کنارے کنارے چلنے کا دیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان جرمنوں کا ظرافت کا تصور ہی کچھ عجب ہے۔

"اس شام کو اور رات کو میں نے بھاگنے کی کوشش بیکار سمجھی، کیونکہ میں جانتا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے — خون بہہ جانے کی وجہ سے میں بہت کمزور لیا تھا۔ اس کے علاوہ ہم لوگوں کی بڑی سخت نگرانی کی جا رہی تھی اور بھاگنے کی کوشش م ہوتی لیکن بعد میں بھاگنے کی کوشش نہ کرنے پر میں نے اپنے آپ پر خوب ملامت کی۔ سرے دن ہم جس بستی میں گزرے۔ وہاں ایک جرمن دستہ ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ دستہ محاذِ جنگ بھیجا جا رہا تھا۔ اس دستہ کے سپاہی ہمیں دیکھنے کے لئے سڑک پر جمع ہو گئے۔ بدرقہ نے ہمیں اس ل میں گھٹنے کے بل چلنے پر مجبور کیا۔ وہ ہمیں اس جرمن دستے کے سامنے ذلیل کرنا چاہتے تا کہ محاذ پر جانے والے سپاہیوں کا دل بڑھے۔ ہم میں سے جو پیچھے رہ جاتا یا گر پڑتا اُسے گولی مار دی جاتی۔ شام ہوتے ہوتے ہم لوگ قیدیوں کے کیمپ میں پہنچ گئے۔

"یہ کیمپ دراصل مشین یا ٹریکٹر رکھنے کا صحن تھا جسے اب خاردار تاروں سے ی طرح گھیر دیا گیا تھا۔ ہم لوگوں کو کیمپ کے پہرہ داروں کے حوالے کر دیا گیا جو ہمیں، دوقوں کے کندوں سے مارتے ہوئے اندر لے گئے۔ اس کیمپ کو دیکھ کر جہنم بھی شرما جاتا۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ اس میں پائخانہ تھا ہی نہیں اور کیمپ قیدیوں سے اتنا کھچا کھچ بھرا تھا کہ جو شخص جہاں کھڑا تھا اسے وہیں رفع حاجت کرنی ہوتی تھی اور اسی غلیظ بدبودار کیچڑ میں بیٹھنا اور سونا پڑتا تھا۔ ہم میں سے جو لوگ کمزور تھے وہ وہیں ختم ہو گئے۔ بس دن میں ایک بار ہمیں کھانا اور پانی دیا جاتا تھا۔ کھانا کیا تھا ایک کٹورہ پانی اور ایک مٹھی گیلا باجرہ یا پھپھوندی لگا ہوا سورج مکھی کا بیج۔ کئی دن تو ہمیں پہرہ دار کھانا دینا ہی "بھول" گئے۔

دو ایک دن بعد زوروں کی بارش ہونے لگی اور کیچڑ اور پانی گھٹنوں گھٹنوں ہو گیا۔ عجیب منظر تھا۔ صبح کے وقت لوگ پانی میں شرابور گھوڑوں کی طرح پڑے رہتے تھے اور پانی تھا کہ بند ہی نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ہر رات کئی درجن قیدی مر جاتے تھے۔ جو بچتے وہ غذا کی کمی سے دن بدن کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ اب میرے زخم بھی مجھے بہت تکلیف دینے لگے تھے۔

چھٹے دن میرے سر اور کندھوں کا درد بہت بڑھ گیا۔ زخموں میں پیپ پڑ گئی تھی اور بدبو آنے لگی تھی۔ کیمپ کے متصل اجتماعی کھیت کے اصطبل تھے، جہاں سرخ فوج کے وہ سپاہی پڑے تھے جو زیادہ گھائل ہو چکے تھے۔ صبح کو میں پہرہ کے سارجنٹ کے پاس گیا اور ڈاکٹر سے ملنے کی اجازت مانگی جو پہرہ داروں کے بیان کے مطابق زخمیوں کے ہمراہ تھا۔ جرمن سارجنٹ روسی زبان خوب بولتا تھا۔ اس نے کہا کہ ارے او روسی تو اپنے ڈاکٹر کے پاس چلا جا وہ تجھے ابھی ٹھیک کر دیگا"۔ میں اس وقت اس کے طنز کو نہیں سمجھ سکا اور اجازت ملنے پر خوش خوش اصطبل کے طرف روانہ ہو گیا۔

"فوج کا ڈاکٹر مجھے دروازے ہی پر مل گیا۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ اب اس میں زیادہ دم نہیں رہ گیا ہے۔ وہ اتنا خستہ حال اور دبلا تھا کہ صرف ہڈی چمڑا رہ

گیا تھا۔ مصیبتیں جھیل جھیل کر وہ آدھا پاگل ہو چکا تھا۔ زخمی ادھر اُدھر گوبر میں پڑے تھے۔ ناقابلِ برداشت بدبو سے ان کا دم نکلا جا رہا تھا۔ ان میں سے اکثر کے زخموں میں کیڑے رینگ رہے تھے۔ جن زخمیوں میں تھوڑی بہت سکت تھی وہ اپنے ناخنوں سے یا لکڑی کے ٹکڑوں سے ان کیڑوں کو نکال رہے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ان کے پاس ہی مردہ قیدیوں کی لاشیں پڑی تھیں جنہیں اٹھانے کی کسی کو مہلت نہ تھی۔

”یہ دیکھو!“ ڈاکٹر بولا ”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ نہ میرے پاس پٹی ہے نہ اور کوئی سامان۔ خدا کے لئے یہاں سے جاؤ! ان گندی پٹیوں کو پھینک دو اور زخموں پر راکھ چھڑک لو۔ دروازہ پر کچھ تازہ راکھ پڑی ہوئی ہے۔“

میں نے یہی کیا۔ دروازے پر مجھے جرمن سارجنٹ ملا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ ”کہو کیسی گذری؟ تمہارا ڈاکٹر کتنا اچھا ہے! کہو اس نے کچھ مدد دی؟“ میں کچھ کہے بغیر چلا جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے میرے منہ پر ایک گھونسہ مارا اور چیخ کر بولا ”سُور! میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا!“ میں گر پڑا اور وہ میرے سینے اور سر پر ٹھوکریں مارنے لگا اور جب تک تھکا نہیں تب تک مارتا رہا۔ میں جب تک زندہ ہوں اس جرمن کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ہرگز نہیں! اس کے بعد اس نے مجھے اور کئی بار پیٹا۔ جیوں ہی اسکی نظر مجھ پر پڑتی وہ مجھے کانٹے دار تاروں کے پیچھے سے باہر آنے کا حکم دیتا اور بڑے اطمینان اور خاموشی سے مجھے پیٹنا شروع کر دیتا۔

”تمہیں حیرت ہے کہ میں نے یہ سب برداشت کیسے کیا؟

”لڑائی سے پہلے، اور ستری بننے سے پہلے، میں دریائے کاما میں ایک جہاز پر کام کرتا تھا۔ میں بیک وقت سوا سوا من نمک کے دو بورے لیجایا کرتا تھا، ہاں میں خاصا مضبوط تھا مجھے کوئی شکایت نہ تھی۔ اور یوں بھی میری تندرستی بہت اچھی ہے۔ لیکن قید سے

دلوں میں خاص بات یہ تھی کہ میں مرنا نہیں چاہتا تھا اور میری قوت ارادی بے حد مضبوط تھی۔ مجھے فوج میں لوٹ آنا تھا۔ ان لوگوں میں جو اپنے وطن کے لئے لڑ رہے تھے۔ اور بالآخر میں واپس آ ہی گیا تا کہ اپنے دشمنوں سے آخر دم تک انتقام لے سکوں۔

"وہ ایک مرکزی کیمپ تھا جہاں سے قیدی ادھر اُدھر بھیجے جاتے تھے۔ مجھے بھی وہاں سے دوسری جگہ، تقریباً سو کیلو میٹر کے فاصلے پر منتقل کر دیا گیا۔ دوسرا کیمپ پہلے کیمپ سے بالکل مختلف نہ تھا۔ وہی اونچے اونچے کھمبے جن کے گرد کانٹے دار تار لگے ہوئے تھے اور قیدیوں کو آسمان کی کھلی چھت کے نیچے رہنا پڑتا تھا۔ غذا بھی وہی تھی فرق صرف یہ تھا کہ کچے باجرہ کے بجائے پھپھوندی لگے اناج کا ایک کٹورہ ملتا جو ان کے خیال میں پکا ہوتا یا کبھی کبھی وہ کوئی مردہ گھوڑے کی لاش اندر لا کر ڈال دیتے تا کہ قیدی اس کا گوشت آپس میں تقسیم کر لیں۔ ہم لوگ اسے کھاتے تھے تا کہ بھوک سے نہ مریں۔ لیکن سینکڑوں آدمی اس کو کھا کر مر گئے۔

"پھر ہماری مصیبتوں میں اضافہ کرنے کے لئے سردی کا موسم آ گیا۔ اکتوبر کی بارش رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی اور صبح کو برف گرنے لگتی۔ غضب کی سردی تھی۔ ایک قیدی کے مرنے پر ایک جیفہ اور ایک کوٹ کسی طرح میرے ہاتھ لگ گیا۔ لیکن سردی سے بچنے کے لئے یہ بھی کافی نہ تھا۔ اس وقت تک ہم لوگوں کو فاقہ کشی کی عادت ہو چکی تھی۔

"ہم لوگوں کی نگرانی کے لئے جو سپاہ تھے وہ خوب سیر ہو کر کھاتے۔ یہ لوگ چوری کے مال پر پل رہے تھے۔ سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے تھے۔ گنڈوں کا اس سے اچھا جتھہ مشکل ہی سے ملے گا۔ ان کے تفریح طبع کا طریقہ یہ تھا:۔

صبح کو دفعدار کانٹے دار تار کے پاس آتا اور ترجمان کے ذریعہ اعلان کرتا کہ رسد ابھی ملے گی اور بائیں طرف سے تقسیم ہوگی۔ دفعدار چلا جاتا۔ ہر آدمی جس میں کھڑے ہونے کی سکت ہوتی بائیں طرف قطار میں کھڑا ہو جاتا اور انتظار کی گھڑیاں گذرنے لگتیں۔ —— ایک گھنٹہ دو گھنٹہ، تین گھنٹہ۔ سینکڑوں آدمی کانپتے ٹھٹھرتے۔ سرد ہوا کے تھپیڑے کھاتے انتظار کرتے رہتے۔

"یکایک جرمن دوسری جانب سے نمودار ہوتے، تار کی جالی سے وہ گھوڑے کے گوشت کے ٹکڑے پھینکتے۔ بھوک سے بیتاب سب لوگ ادھر دوڑ پڑتے اور کیچڑ میں لپٹے ہوئے گوشت کے ان ٹکڑوں کے لئے باقاعدہ چھینا جھپٹی ہونے لگتی۔

"جرمن گرجنے لگتے۔ اور دیر تک مشین گنوں سے گولیوں کی بارش ہوتی۔ چیخنے چلانے کی آوازیں آتیں۔ پھر مرے اور گھائل آدمیوں کو زمین پہ چھوڑ کر قیدی بے تحاشا بائیں جانب بھاگتے . . . تب لمبا اور دبلا پتلا فرسٹ لفٹننٹ جو کیمپ کا سوپرنٹنڈنٹ تھا ترجمان کے ساتھ کانٹے دار تار کے جال کے پاس آتا اور اپنی ہنسی کو بمشکل روکتے ہوئے کہتا :-

"مجھے اطلاع ملی ہے کہ خوراک کی تقسیم کے دوران میں کوئی شرمناک واقعہ پیش آیا۔ اگر پھر بھی ایسی بات ہوئی تو میں تم سب روسی کتوں کو گولی سے اڑا دوں گا۔ چلو، زخمیوں اور مُردوں کو اٹھاؤ"! اس افسر کے پیچھے جرمن سپاہیوں کی ٹولی ہنستی ہنستی بیدم ہو جاتی، ان کو اسی قسم کا مذاق پسند تھا۔

"کیمپ کے صحن سے ہم چپ چاپ مُردوں کو گھسیٹتے جاتے اور کچھ دُور گھاٹی میں دفن کر آتے . . . .

اس کیمپ میں ہم برابر پیٹے جاتے تھے۔ وہ گھونسے لاٹھی اور بندوق کے کندوں سے ہمیں پیٹتے۔ یہ زدوکوب کبھی تفریح کی خاطر اور کبھی صرف بیکاری سے اکتا کر کی جاتی۔ میرے زخم بھرنے لگتے۔ لیکن مستقل بھی یا مار پیٹ کی وجہ سے پھر ہرے ہو جاتے اور درد نا قابل برداشت ہو جاتا۔ لیکن میں یہ سب صعوبتیں جھیل گیا کیونکہ مجھ میں آزاد ہونے کی آس ابھی تک باقی تھی ...... ہم کیچڑ سے بھری زمین پر سوتے کیونکہ وہ ہمیں ذرا سا پیال دینا بھی گوارا نہ کرتے۔ ہم ایک دوسرے سے مل کر سو جاتے۔ رات بڑی بے چینی سے گزرتی۔ جو لوگ نیچے کیچڑ میں لیٹتے وہ بھی ٹھٹھر جاتے اور جو اوپر ہوتے وہ بھی۔ نہ نیند آتی نہ آرام ملتا۔ اذیت البتہ جھیلنی پڑتی۔

"دن گزرتے گئے۔ جیسے کوئی بھیانک خواب میں دن بدن کمزور ہوتا گیا۔ اتنا کمزور کہ ایک بچہ بھی مجھے دھکا دے سکتا تھا۔ میں اپنے پتلے بازوؤں کو دیکھ کر جہاں کھال ہی رہ گئی تھی کانپ اٹھتا اور سوچنے لگتا! میں یہاں سے کیسے نکل سکوں گا؟ اور پھر میں اپنے پر لعنت بھیجتا کہ پہلے ہی دن میں نے بھاگنے کی کوشش کیوں نہیں کی! اس کوشش میں اگر وہ مجھے مار ڈالتے تب بھی میں اس تکلیف دہ عذاب سے تو بچ جاتا۔

"سردیاں آگئیں۔ ہم لوگ برف کے ٹکڑوں کو صاف کرتے اور زمین پر سوتے ہماری تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی ... آخر یہ اعلان کیا گیا کہ چند دنوں میں ہمیں کام پر بھیجا جائے گا۔ ہمارے چہروں پر رونق آگئی۔ ہر ایک کے دل میں ہلکی سی امید مچلنے لگی۔ اور ہم سوچنے لگے کہ شاید بھاگنے کا کوئی موقع مل جائے۔

رات بڑی بھیانک تھی اور غضب کا پالا پڑ رہا تھا۔ پو پھٹنے سے پہلے تڑپ کی آواز آنے لگی۔ میرے آس پاس لیٹے ہوئے قیدیوں میں نئی جان آگئی۔ اور جب

پھر توپوں کی آواز آئی تو کوئی چلّا اٹھا۔

"ساتھیو، یہ ہماری فوجیں ہیں جو حملہ کر رہی ہیں۔"

"اس کے بعد جو کچھ ہوا اُسے تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیمپ کے سب لوگ اُٹھ بیٹھے تھے، وہ بھی جو کئی دن سے اُٹھ نہیں پاتے تھے — ہر طرف سرگوشیاں ہو رہی تھیں اور دبی دبی سسکیاں... میرے قریب ہی کوئی عورتوں کی طرح رو رہا تھا...

... اور میں بھی... میں بھی..."

یہ کہتے کہتے لفٹننٹ جیراسیموف کی آواز بھر آئی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے اپنے کو سنبھالا اور قدرے پُرسکون لہجے میں کہنے لگا:-

میرے گالوں پر بھی آنسو بہے اور ٹھنڈ کے باعث جم گئے... کسی نے دھیمی آواز میں انٹرنیشنل (مزدوروں کا بین الاقوامی گیت۔ مترجم) گانا شروع کیا۔ پھر ہم لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ سنتریوں نے رائفلوں سے ہم پر گولی چلانی شروع کر دی۔ حکم ہوا:- "لیٹ جاؤ!" میں لمبا لمبا لیٹ گیا، اور اپنے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیاں برف میں چبھو دیں اور بچّوں کی طرح رونے لگا۔ لیکن یہ آنسو خوشی اور فخر کے آنسو تھے۔ اپنی قوم کے کارناموں پر جرمن ہمیں قتل کر سکتے تھے، تنہا کر سکتے تھے۔ بھوک سے کمزور ہو جانے پر ہمیں اذیت دے سکتے تھے لیکن وہ ہمارے حوصلے پست نہیں کر سکتے تھے اور نہ کبھی کر سکیں گے!

اس رات میں لفٹننٹ جیراسیموف کے قصّے کا آخری حصّہ نہیں سُن سکا۔ ہیڈکوارٹر سے اس کی فوراً طلبی ہو گئی تھی۔ کئی دن بعد ہم پھر ملے۔ خندق سے پھپوندی اور صنوبر کے رس کی مہک آ رہی تھی۔ وہ آگے کو جھکا ہوا ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ اس کی زبردست

چوڑی کلائی گھٹنوں پر ٹکی ہوئی تھی اور انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ اسے دیکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ شاید اس کی نازی کیمپ میں اس طرح گھٹنوں بیٹھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ غمگین، تکلیف دہ، بے سود خیالات میں کھو جانے کی . . .

"تم میرے فرار کا قصہ سننا چاہتے ہو؟"

"ہوا یہ کہ جس رات ہم لوگوں نے توپ کے دھماکے سنے تھے اس کے فوراً ہی بعد ہمیں مورچہ بندی کے کام پر لگا دیا گیا۔ برفباری کے بعد اب برف پگھلنے لگی تھی۔ بارش ہو رہی تھی۔ ہمیں کیمپ اتر کی طرف لے جایا رہا تھا۔ سڑک پر کچھ لوگ تھک تھک کر گرنے لگے اور انہیں گولی ماری گئی اور وہیں چھوڑ دیا گیا۔ . . .

"ایک آدمی کو تو ایک آلو اٹھانے کے جرم میں گولی ماری گئی۔ ہم لوگ آلو کے کھیت سے گذر رہے تھے۔ جس آدمی نے آلو اٹھایا تھا وہ لوکرین کا رہنے والا ایک سارجنٹ تھا۔ گوتجر اس کا نام تھا۔ اس نے ایک آلو اٹھایا اور اسے چھپا لینا چاہا۔ جرمن پہرہ دار نے دیکھ لیا۔ وہ کچھ کہے بغیر گوتجر کے پاس گیا اور پیچھے سے اس کے سر میں گولی مار دی۔ قطار کو رک کر صف باندھنے کا حکم ملا۔ "یہ سب جرمن ریاست کی ملکیت ہے" پہرہ دار نے کھیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "اگر کسی نے بلا اجازت کسی چیز کو ہاتھ لگایا تو اس کا بھی یہی حشر ہوگا۔" راہ میں ہمیں ایک گاؤں سے ہو کر گذرنا پڑا۔ عورتیں ہمیں دیکھتے ہی باہر نکل آئیں اور روٹی اور بھنے آلو کے ٹکڑے ہماری طرف پھینکنے لگیں، کچھ لوگ ان چیزوں کو اٹھا سکے اور کچھ نہیں اٹھا سکے۔ بدرقہ نے گھروں کی کھڑکیوں پر گولیاں چلانی شروع کیں اور ہمیں تیز تیز چلنے کا حکم ملا۔ مگر لڑکے — انہیں کون ڈرا سکتا ہے؟ انہوں نے آلو اور روٹی کے ٹکڑے بہت دور سڑک پر

لے جاکر رکھ دئے تاکہ ہم لوگ جب وہاں پہونچیں تو ان چیزوں کو بلا توقف چلتے چلتے اٹھالیں۔ مجھے یاد ہے مجھے ایک بڑا سا آلو ملا تھا، میں نے ایک ٹکڑا اپنے پاس والے قیدی کو بھی دیا تھا۔ ہم اسے چھلکے سمیت کھا گئے۔ اس آلو کے ٹکڑے نے اس وقت بڑا ہی مزہ دیا۔ شاید میں نے ایسی لذیذ چیز اپنی زندگی میں کبھی نہیں کھائی!

" ہمیں جن مورچہ بندیوں پر کام کرنا پڑتا تھا وہ جنگل میں تھیں۔ پہرہ داروں کی تعداد بڑھا دی گئی تھی اور ہمیں پھاوڑے دئے گئے تھے۔ لیکن میں ان لمحوں میں تعمیر کی بات نہیں سوچتا تھا۔ میں تو ان چیزوں کو برباد کرنا چاہتا تھا۔

" اسی روز شام کو میں نے مصمم ارادہ کرلیا۔ ہم جس گڑھے کو کھود رہے تھے اس سے میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل باہر آیا۔ پھاوڑا بائیں ہاتھ میں لیا اور گارڈ کے پاس گیا۔۔۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ دوسرے جرمن پہرہ دار کچھ دور پر گھاٹی کے پاس تھے اور جو آدمی ہماری ٹولی کی نگرانی کر رہا تھا اس کے سوا وہاں اور کوئی پہرہ دار نظر نہ آتا تھا۔

" سپاہی کے پاس پہنچ کر میں بڑبڑایا 'دیکھو' میرا پھاوڑہ ٹوٹ گیا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ اگر میرا وار بھرپور نہ پڑا تو میری خیر نہیں۔ پہرہ دار نے شاید میرے چہرے سے بھانپ لیا کیونکہ اس نے پستول نکالنے کے لئے اپنے ہاتھ کو حرکت دی۔ معاً میں نے پھاوڑہ سے وار کیا جو ٹھیک اس کے منہ پر پڑا۔ میں اس کے سر پہ نہیں مار سکا کیونکہ وہ لوہے کی ٹوپی اوڑھے تھا۔ مجھ میں اتنی طاقت باقی تھی کہ اسے کس کے ماروں۔ وہ بلا شور مچائے پیٹھ کے بل گر پڑا۔۔۔۔

" اب مجھے ایک پستول مل گیا تھا۔ میں نے دوڑنا شروع کردیا۔ لیکن مجھے جلد

ہی محسوس ہو گیا کہ مجھ میں دوڑنے کی سکت نہیں رہ گئی ہے۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں رُک گیا۔ دَم لیا اور پھر دل کی چال سے دوڑنے لگا۔ گھاٹی کی دوسری جانب گھنا جنگل تھا۔ اس لئے میں نے ادھر کا رُخ کیا۔ مجھے اب یاد نہیں کہ میں کتنی بار گرا، اٹھا اور پھر گرا ... لیکن ہر لحظہ میں دشمنوں سے دور ہوتا جا رہا تھا، آخر کار جب میں پہاڑی کی دوسری جانب درختوں کے جُھنڈ میں پہنچا تو میرے پیچھے دُور سے مشین گن کے چلنے اور آدمیوں کے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ لیکن مجھے پکڑنا اب اتنا آسان نہیں تھا۔ "میں نے سوچا تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔ لیکن جرمنوں کو اگر میرا نشان مل گیا اور وہ قریب آ گئے ـــــ تو میں آخری گولی اپنے لئے محفوظ رکھوں گا۔ اس خیال سے میری ہمت بندھ گئی اور میں ذرا اطمینان اور احتیاط سے چلنے لگا۔

"وہ رات میں نے جنگلوں میں گزاری۔ نصف کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک گاؤں تھا، لیکن میں اس کے قریب جانے سے ڈر رہا تھا کہ کہیں پھر جرمنوں کی زد میں آ جاؤں۔ دوسرے دن مجھے چند چھاپہ مار سپاہیوں نے پا لیا۔ میں ان کے ساتھ ان کے خندق میں کوئی دو ہفتہ رہا۔ تا کہ جسم میں طاقت آ جائے۔ میں نے ان کو اپنا پارٹی کارڈ دکھایا۔ تب بھی ان کو مجھ پر کچھ شک سا تھا۔ میں نے یہ پارٹی کارڈ اپنے کوٹ کے استر میں سی لیا تھا۔ لیکن بعد کو جب میں نے ان کی لڑائیوں میں حصّہ لیا تو میری طرف سے ان کا رویّہ بدل گیا۔ اسی زمانہ سے میں ان جرمنوں کی فہرست بناتا جاتا ہوں جن کو میں نے مارا ہے۔ اور اب تک میں نے اس فہرست کو بڑی حفاظت سے رکھا ہے۔ تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ رفتہ رفتہ سو ہو جائے گی۔

"جنوری میں چھاپہ ماروں نے خفیہ طریقہ سے مجھے مورچہ کے اس طرف پہنچا دیا

تقریباً ایک مہینہ میں ہسپتال میں رہا۔ وہاں انہوں نے میرے شانہ سے لوہے کے ٹکڑے نکالے اور جہاں تک میری دوسری بیماریوں (کیمپ میں مجھے گٹھیا وغیرہ ہوگئی تھی) کا تعلق ہے۔ میں جنگ کے ختم ہونے کا انتظار کر سکتا ہوں۔ پھر مجھے صحت کی بحالی کے لئے ہسپتال سے گھر بھیج دیا گیا۔ میں ایک ہفتہ گھر رہا —— زیادہ رہا نہیں گیا۔ میں لوٹ آنے کے لئے بے چین تھا۔ آخر میری جگہ تو یہیں ہے۔"

خندق کے دہانہ پر ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے، جنگل کے درختوں پر سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ لفٹننٹ جیراسیموف نے نظر جھکا کر متفکرانہ لہجہ میں کہا:۔

اب ہم ٹھیک طریقہ سے لڑنا اور نفرت کرنا اور محبت کرنا جان گئے ہیں۔ جنگ ایک ایسی سان ہے جو سارے جذبات کو تیز کر دیتی ہے۔ تم سوچتے ہوگے کہ محبت اور نفرت پہلو بہ پہلو نہیں رکھی جا سکتیں۔ تم نے وہ کہاوت سنی ہے نا؟ "تنومند گھوڑے اور ڈرپوک ہرنی کو ساتھ نہیں جوتا جا سکتا۔" لیکن تم یہاں دیکھو گے کہ دونوں ساتھ جُتے ہوئے ہیں اور بڑی خوبی سے چل رہے ہیں۔ جرمنوں نے میرے وطن اور میرے ساتھ جو کچھ کیا اسکی وجہ سے میں ان سے انتہائی نفرت کرتا ہوں۔ ساتھ ہی مجھے اپنی قوم سے دلی محبت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ کبھی جرمنوں کی غلامی کی مصیبت نہ جھیلے، یہی چیز مجھے اور میرے تمام ساتھیوں کو اتنی خونخواری سے جرمنوں سے لڑنے پر آمادہ کرتی ہے۔ یہی دونوں جذبے ہیں جو عملی جامہ پہن کر ہمیں فتح کی منزل تک لے جائیں گے اور اگر وطن کی محبت ہمارے دلوں میں زندہ رہی —— جب تک ان دلوں میں حرارت باقی ہے یہ محبت ضرور زندہ رہے گی —— تو بھی ہم اپنی سنگینوں کی نوک پر اپنی نفرت کو لئے پھریں گے اگر یہ طریق اظہار درست نہ ہو تو مجھے معاف کرنا، لیکن میرا خیال یہی ہے"۔ لفٹننٹ

جیراسیموف نے بات ختم کی اور ہماری ملاقات کے بعد پہلی بار اس کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا — بچہ کا معصوم تبسم!

اور اب پہلی مرتبہ میں نے دیکھا کہ بتیس برس کا یہ لفٹننٹ، جس کے نت چہرہ پر ان دلخراش تجربوں کے آثار نمایاں تھے جن سے ہو کر اسے گزرنا پڑا تھا اب بھی بلوط کی طرح قوی ہیکل تھا اور اس کی پیشانی پر سنہرے بالوں کی سفیدی نظر کو خیرہ کر رہی تھی اور بڑی مصیبتوں میں حاصل ہوئی یہ قابل احترام سفیدی اتنی خالص تھی کہ مکڑی کے جالے کے سفید دھاگے اس کی برساتی ٹوپی میں الجھ کر اس کی شفاف سفید پیشانی میں ایسے کھو گئے تھے کہ میں بہت کوشش کے بعد بھی ان میں تمیز نہیں کر سکا۔

ماورا (ن۔م۔ راشد)

اس مجموعے میں راشد کی مقفیٰ نظمیں اور سانیٹ ہی تنہا نہیں بلکہ وہ جدید آزاد نظمیں بھی ہیں جنہوں نے راشد کو شاعر اور پیغمبر کی حیثیت سے ایک لازوال شہرت بخشی ہے۔ کرشن چندر کا تعارف، راشد صاحب کا دیباچہ جدید آزاد شاعری پر خاص روشنی ڈالتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ ۱۲ر

مکتبۂ اردو۔ لاہور

لکھنے والے

فیض احمد فیض سن پیدائش ۱۹۱۱ء۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۳۲ء میں انگریزی اور ۱۹۳۴ء میں عربی کا ایم اے پاس کیا۔ ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ اب فوج میں میجر ہیں۔ دور حاضر کے صف اول کے شاعروں میں سے ہیں۔ جدید شاعری میں ان کا نام راشد اور مجاز کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ نوجوان شاعروں میں پختگیٔ فکر انہیں کی نظموں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ "نقش فریادی"۔ اچھے نقاد بھی ہیں۔

ن۔ م۔ راشد ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے اقتصادیات میں ایم اے کیا۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں کام کر رہے تھے۔ اب یہ بھی فوج میں شامل ہو گئے ہیں۔ عہد حاضرہ کے شاعروں میں سب سے مشہور ہیں۔ "راشد کی شاعری اردو میں ایک نئے تجرباتی دور کی تمہید ہے۔" انہوں نے نظم کو ہیئت اور مادہ دونوں کے اعتبار سے بدل دیا ہے۔ بقول کرشن چندر "دریچے کے قریب" فکری و فنی اعتبار سے راشد کی بہترین نظم ہے۔ راشد کی نظموں کا مجموعہ "ماورا" کے نام سے مکتبۂ اردو لاہور نے شائع کیا ہے۔

مخدوم محی الدین عمر تیس سال۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ اشتراکی پارٹی کے سرگرم رکن ہیں۔ حال ہی میں نظموں کا مجموعہ "سرخ سویرا" شائع ہوا ہے۔ انکی شاعری "عصر حاضر کے اضطراب اور احساس کی آئینہ دار ہے۔ ان کے شعر میں ہر جگہ سماجی شعور کی روح تڑپتی نظر آتی ہے"۔ فنی اعتبار سے "اندھیرا" ان کی بہترین نظم ہے۔

ماستی وینکٹیش آئینگار۔ کنڑی زبان کے صف اول کے ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ شاعر، نقاد اور افسانہ نگار۔ کنڑی افسانہ نویسی میں انکا درجہ وہی ہے جو اردو میں منشی پریم چند کا تھا اور اب کرشن چندر کا ہے۔ ریاست میسور میں کمبائنڈ کمشنر تھے۔ دو سال ہوئے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کے چار مجموعے انگریزی میں منتقل ہوئے ہیں۔ ایک طویل مختصر کہانی "سبنا" بھی ناولٹ کی صورت میں شائع ہوئی ہے۔ "دہی والی" ان کی پانچ چھ بہترین کہانیوں میں سے ہے۔ ماستی کا انداز بیان بہت سادہ ہے۔ ان کے افسانوں

میں حقیقت نگاری بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے جنوبی ہند کی معاشرت کی اتنی اچھی تصویر کشی شاید ہی کسی اور فن کار کے افسانوں میں مل سکے۔

عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی۔ مہاراجہ کالج میسور میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ اس سے پہلے جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ اردو میں تھے۔ اچھے نقاد ہیں۔ "دنیائے افسانہ" اور "جدید اردو شاعری" ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا ہے "رات کا بھولا"۔

محمد علی کمال روزنامہ "آزاد" بنگلور کے ایڈیٹر ہیں۔ سنٹ جوزف کالج میں تعلیم پائی۔ اچھے صحافت نگار ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو نوجوان، باغی، جدت طراز ادیب، کرشن چندر اور بیدی کے ساتھ اردو کے بہترین افسانہ نگاروں کی تثلیث کو پورا کرتے ہیں۔ زیر نظر افسانہ "ہتک" ان کی مخصوص طرز تحریر کی نمائندگی نہیں کرتا لیکن اس وجہ سے منتخب کیا گیا ہے کہ یہ کردار نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ یہ افسانہ "منٹو کے افسانے اور ڈرامے" سے لیا گیا ہے جسے ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے دو اور مجموعے ہیں "دھواں" اور "منٹو کے افسانے"۔ منٹو ایک کامیاب ڈرامہ نگار بھی ہیں اور ریڈیو فیچر لکھنے میں کافی دسترس رکھتے ہیں۔ "آؤ" اور "جنازے" ریڈیو فیچر کے مجموعے ہیں۔ منٹو نے آل انڈیا ریڈیو میں کچھ دن کام کیا۔ کئی فلمی رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ان کی دو کہانیاں فلمائی گئی ہیں۔ "کیچڑ" اور "نوکر"۔

اوپندر ناتھ اشک اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں افسانے، ڈرامے اور ناول لکھتے ہیں۔ اب تک ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "ڈاچی"، "کونپل"، "قفس"، "چٹان"، "ناسور" وغیرہ۔ ان کے پہلے لکھے ہوئے افسانوں میں منشی پریم چند کا رنگ جھلکتا ہے۔ ایک ناول "ستاروں کے کھیل" چھپ چکی ہے۔ ایک دوسرا ناول "گرتی دیواریں" زیر طبع ہے۔ لیکن ان سب سے زیادہ اشک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے کامیاب ہیں۔ ہمارے نوجوان ادیبوں میں وہ بہترین ڈرامہ نگار کہلائے جا سکتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کا بھی ایک مجموعہ شائع ہوا ہے "پاپی"۔ "معجزے" ان کے بہترین ڈراموں میں سے ہے۔ یہ پہلے "ادبی دنیا" میں شائع ہو چکا ہے۔ جنوبی ہند کی پبلک کے لئے ہم اسے "نیا دور" میں دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔

کرشن چندر نومبر ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ فورمین کرسچین کالج لاہور سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔ لاء کالج لاہور سے ایل ایل بی۔ افسانوں کے تین مجموعے شائع ہوئے

"طلسمِ خیال" "نظارے" "ٹوٹے ہوئے تارے"۔ ایک اور طویل مختصر افسانوں کا مجموعہ "زندگی کے موڑ پر" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ "ہوائی قلعے" ان کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ایک ناول "شکست" بھی لکھی ہے جو اردو میں اپنی طرز کا پہلا ناول ہے۔

کرشن چندر موجودہ دَور کے سب سے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ہر حلقہ میں مقبول ہیں۔ کیونکہ جدید ادب کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں فطرت کے حُسن کی عکاسی اور رومان کی چاشنی بھی ہوتی ہے اور ان کی زبان کی رنگینی ایک جادو سا طاری کر دیتی ہے۔ کرشن چندر تنوع پسند ہیں۔ نئے نئے موضوع پا اور نئی نئی تکنیک میں لکھتے ہیں۔ آجکل افسانوں سے زیادہ مضامین پر توجہ دے رہے ہیں۔

مائیکل شالوخاف موجودہ سوویٹ روس کے مشہورترین ادیب ہیں۔
Quiet flows the Don
اور ان شہرہ آفاق The Don flows down to Sea
ناولوں کے مصنف The Virgin Soil upturned

ان کی یہ تازہ ترین کہانی "نفرت" جنگ کے متعلق لکھی ہوئی بلند پایہ افسانوں میں سے ہے۔ اس کے پہلے یہ پیپلز پبلشنگ ہاؤس سے ایک کتابچہ کی صورت میں شائع ہو چکی ہے

مولانا حسرت موہانی ولادت ۱۸۷۵ء میں قصبہ موہان میں پیدا ہوئے ۱۹۰۳ء میں علیگڑھ سے بی اے کیا۔ عرصہ سے وہ ملک کے سرگرم سیاسی کارکن رہے ہیں۔ کئی دفعہ نظر بند بھی ہوئے۔

حسرت موہانی کا نام اردو شاعری میں غزل کے احیا کے سبب ہمیشہ زندہ رہے گا۔ موجودہ زمانہ میں جب غزل گوئی کے تمام اسالیب ختم ہوتے نظر آ رہے تھے حسرت نے اس کی خدمت پہ کمر ہمت باندھ لی اور سنجیدگی کے ساتھ قدیم اساتذہ کے غزل اور ان کے اصول کا مطالعہ کیا اور غزل گوئی میں دوبارہ جان ڈال دی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے غزل کے لئے ایک نیا راستہ کھول دیا اور ایک طرح پہ غزل کے ایک نئے دبستان کے بانی بن گئے۔"

حال ہی میں انجمن اردوئے معلیٰ علیگڑھ کے ایک جلسہ میں انہوں نے اقسام غزل پر ایک مقالہ

پڑھا۔ انہوں نے غزل کی قسموں میں فلسفانہ بھی ایک قسم بنائی تھی۔ زیر نظر غزل قسم فلسفانہ کی مثال ہے۔

آل احمد سرور علیگڈھ سے اردو اور انگریزی میں ایم اے کیا اور اب وہیں اردو کے ریڈر ہیں۔ زیادہ تر تنقیدی مضامین لکھتے ہیں، شعر بھی کہہ لیتے ہیں۔ گذشتہ سال ان کی ریڈیو تقاریر کا مجموعہ "تنقیدی اشارے" شائع ہوا ہے۔

مجروح سلطانپوری یو پی کے رہنے والے ہیں۔ سال دو سال سے ان کی نظمیں ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو رہی ہیں۔

اختر انصاری بی اے آنرز "نوجوانوں کے آرٹسٹ"۔ صف اول کے افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ نظموں کے دو مجموعے "خوناب" اور "آبگینے" شائع ہوئے ہیں۔ اور افسانوں کے تین "اندھی دنیا" "نازو" اور "دو رخی"۔ "نئے ادب پر افادی ادب" کے نام سے سب سے پہلا مقالہ انہیں نے لکھا ہے۔ آج کل علیگڈھ کے ایک ہائی اسکول میں مدرس ہیں۔

ممتاز شیریں عمر انیس سال۔ مہارانی کالج بنگلور سے ۱۹۴۲ء میں بی اے کیا۔ کالج کی بہت ذہین طالب علم تھیں۔ .... ادبی زندگی کی ابتدا تراجم سے ہوئی۔ میسور کی صرف یہی ایک مسلمان خاتون ہیں جن کے تراجم اور طبعزاد افسانوں نے شمالی ہند کے معیاری رسالوں میں جگہ پائی۔ ممتاز شیریں نے صرف تین طبعزاد ...... افسانے لکھے ہیں۔ لیکن ان کی یہ پہلی کوشش ہی اس لئے ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئیں۔ شاہد احمد ایڈیٹر "ساقی" محمد حسن عسکری اور دیوندر ستیارتھی وغیرہ نے ان کے افسانوں کو بہت پسند کیا ہے۔

اختر الایمان ۲۷ ستمبر ۱۹۱۸ء کو سہارنپور میں پیدا ہوا تھا۔ بچپن کا زمانہ پنجاب کے دیہاتوں میں گذرا۔ فطرتاً سیلانی ہوں سنہ ۳۰ء میں گھر چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔ سنہ ۳۰ء سے ۳۲ تک کا زمانہ دہلی کے ایک یتیم خانہ میں گذرا اور اس وقت سے دلی ہی میں ہوں۔ فتح پوری مسلم ہائی سکول سے میٹرک اور اینگلو عربک کالج سے بی اے کرنے کے بعد ایک سال تک آوارہ

پھرتا رہا۔ اس کے بعد ایم اے کے لئے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ چلا گیا تھا اور اب وہ زمانہ بھی ختم ہو رہا ہے۔ شعر بھی کہتا ہوں اور نثر بھی لکھتا ہوں اور نظموں کا ایک مجموعہ "گرداب" کے نام سے ساقی بکڈپو سے شائع ہو چکا ہے۔

منیب الرحمٰن تاریخ پیدائش ۱۸ جولائی ۱۹۲۴ء مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے ۱۹۴۴ء میں تاریخ اور سیاست میں ایم اے کیا۔ پھر فارسی میں ایم اے کیا۔ ۴۳ء کے اوائل سے ان کی نظمیں باقاعدگی سے شائع ہو رہی ہیں۔

خورشید الاسلام سن تیئیس سال۔ علیگڈھ میں چھ سال رہے اور اب بھی طالب العلم کی حیثیت سے وہیں گذر رہی ہے۔ ایم اے اردو کے لئے پڑھ رہے ہیں۔ کچھ عرصہ سے ان کی نظمیں مختلف رسائل میں شائع ہونے لگی ہے۔

صمد شاہین پیدائش ۱۶ جون ۱۹۱۶ء مہاراجہ کالج میسور میں انگریزی ادب کے آنرز کے لئے پڑھا لیکن بی اے کی ڈگری لی۔ گو انٹرمیڈیٹ میں وہ انگریزی میں اول رہے تھے۔ علی گڈھ میں ایم اے کے لئے چار پانچ ماہ رہے لیکن تعلیم مکمل کئے بغیر واپس آنا پڑا۔ پھر لا کالج پونا سے ایل ایل بی کیا۔ اب ایم اے (سیاسیات اور معاشیات) اور ایل ایل ایم کی تیاری کر رہے ہیں۔ اچھے مقرر ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ میں ہی کئی دفعہ آل انڈیا ڈبیٹس میں اول انعام پایا۔ اردو کی بہ نسبت انگریزی میں زیادہ لکھتے ہیں۔ اردو میں بھی چند افسانے لکھے ہیں جو ایک مقامی رسالہ میں چھپ کر مقبول ہوئے۔ بنگلور سے صادق صاحب کے ساتھ ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار "میسورین" نکال رہے ہیں۔ اور اب "نیا دور" کی بھی ادارت کر رہے ہیں۔ ابھی ابھی وکالت شروع کی ہے۔ زیر نظر افسانہ "توہین" ایک بالکل نئی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ آلڈس ہکسلی کی مخصوص تکنیک جو ان کی "پائنٹ کاؤنٹر پائنٹ" میں بہت نمایاں ہے۔

بہترین کتابت و طباعت کیلئے اقبال پریس بنگلور سٹی کو یاد فرمائیے

بہترین سلائی اور کپڑوں
کیلئے
سید باقر
کمرشیل سٹریٹ۔ بنگلور
کا نام
ہندوستان بھر میں مشہور ہے

بڑے بڑے نوابوں اور راجاؤں نے
ہمارے کام کی داد دی ہے۔

نیا دور

ایڈیٹر — صمد شاہین

3

سالانہ چندہ
چھ روپے

فی پرچہ
1.|4|=

نیا دور ۔ بسون گڈی، بنگلور سٹی

عرضِ حال

اس نمبر میں سوائے تراجم اور احمد علی کے مضمون "ترقی اور ترقی پسندی" کے تمام مضامین نظم و نثر غیر مطبوعہ ۔ خاص 'نیا دور' کیلئے بھیجے گئے ہیں ۔ کرشن چندر نے بھی اپنی کہانی 'اکسٹرا لڑکی' دو ڈھائی ماہ پہلے 'نیا دور' ہی کیلئے بھیجی تھی ۔ لیکن رسالے کی اشاعت معرضِ التواء میں پڑ جانیسے یہ اب 'ادبِ لطیف' کے تازہ شمارہ میں شائع ہو گئی ہے —

بات یہ ہوئی کہ پیپر کنٹرولر سے ہمیں جنوری، فروری نمبر نکالنے کی اجازت نہ ملی کیونکہ پہلے دو نمبر ہم نے ۲۰۸ صفحوں کے نکال لئے تھے اور بعد میں 'نیا دور' کیلئے صرف ۱۶۰ صفحوں کی اجازت ملی چنانچہ 'نیا دور' کا تیسرا نمبر اب شائع ہو رہا ہے ۔ شاید پرچے کے نکلنے میں غیر معمولی تاخیر ہو جانیسے کرشن چندر نے یہی کہانی 'ادبِ لطیف' کو بھیج دی پھر بھی ہمیں مسرت ہے کہ 'نیا دور' کیلئے کرشن چندر کا تعاون حاصل ہے ۔ انشاء اللہ کتابت و طباعت کی دشواریوں کے باوجود، آئندہ رسالہ باقاعدہ ، پابندیٔ وقت سے قارئین کے ہاتھوں پہنچتا رہے گا ۔

پرچے کا حجم کم ہو جانے کی وجہ اب کے 'لکھنے والے' کا عنوان رد کر دینا پڑا — لیکن صرف اس دفعہ

ریویو کیلئے بہت سی کتابیں موصول ہوئی ہیں لیکن اس نمبر میں اس کیلئے بھی گنجائش نہ نکل سکی جس کا ہمیں بے حد افسوس ہے ۔ آئندہ نمبر سے اسکی بھی تلافی ہو جائیگی ۔

'نیا دور' کے آئندہ نمبروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوگی کہ ان میں مشہور لکھنے والوں کی تصویریں آرٹ پیپر پر شائع ہوتی رہینگی ۔

پہلی اشاعت ۲ ماہ اپریل ۱۹۴۵ء

فہرست

مضامین

ترقی اور ترقی پسندی — احمد علی — ۵
* اختر انصاری کی شاعری — عطا محمد — ۵۵
* چینی کہانی — تمنائی — ۱۱۵

نظمیں

* مشورہ — شہاب ملیح آبادی — ۱۰
* شکست و ریخت — احمد ندیم قاسمی — ۲۸
* بنگال — مجروح سلطان پوری — ۵۳
* اشارے — سلیمان اریب — ۵۴
* ایک آرزو اور قطعات — اختر انصاری — [illegible]
* رباعیاں — فراق گورکھپوری — ۷۹
* حسن و عشق — محمد حنیف — ۹۰
* معصیت — نوشابہ قدوائی — ۹۳
* پہچان — مسعود پرویز — ۱۱۲

* خاص "نیادور" کے لئے بھیجے گئے۔

کہانیاں

* آکسرا لڑکی	کرشن چندر	۱۱
لہ لومڑ (اطالوی)	اگنیزیو سلونے	۲۹
* گلابی شیڈ	مدھوسودن	۸۱
* پلکوں میں آنسو	صدیقہ بیگم سیوہاری	۹۴
سہ نفرت (چینی)	چینگ تیئں یہ	۱۳۲

---

* خاص 'نیا دور' کے لئے بھیجے گئے۔

لہ Penguin new writing No 2 میں شامل ہے

سہ Penguin new writing No 1 میں شامل ہے

صمد شاہین ایڈیٹر اور پبلشر نے ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس بنگلور سٹی میں چھپوا
دفتر 'نیا دور' بسون گڈی بنگلور سٹی سے شائع کیا۔

احمد علی

ترقی اور "ترقی پسند"

"ترقی پسند ادب" کی تحریک نہ صرف ہندوستان تک محدود تھی اور نہ ہندستان میں پیدا ہوئی۔ اس تحریک کا جذبہ روس کے انقلاب سے شروع ہوا۔ ۱۹۱۹ء کے (ECONOMIC SLUMP) کے بعد انگلستان یورپ اور امریکہ میں ایک نئے ادب کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اشتراکیت نے بھی خوش حال جماعتوں کے نوجوانوں میں ہر دلعزیزی حاصل کی۔ چنانچہ اس تحریک میں بیشتر حصہ ان ادیبوں اور شاعروں کا تھا جو خود خوشحال طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انگلستان میں آڈن۔ اسپنڈر۔ ڈے لوئس وغیرہ اس تحریک میں آگئے تھے۔ غلام ہونے کی وجہ سے ہندوستانیوں پر سب سے پہلا اثر انگریزوں ہی کا پڑتا تھا۔

۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں بھی اس تحریک نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی صورت میں باقاعدہ اپنا پلیٹ فارم قائم کیا۔ اسی سنہ میں انگلستان میں New Writing کی پیدائش ہوئی۔ یورپ، چین، روس، اور ہندوستان کے "ترقی پسند" ادیبوں کی تصانیف کو اس کتابی رسالے نے شائع کیا اور اس طرح یہ تحریک عام ہوگئی۔

اردو میں اس کی ابتدا ۱۹۳۲ء میں "انگارے" سے ہوئی۔ انگارے کے مصنفین کو اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ اردو ادب کی یہ نئی تحریک دنیا کے نئے ادب کا ایک جزو ہو کر انقلابی اور تاریخی حیثیت اختیار کرے گی۔ البتہ یہ خیال ضرور تھا کہ "انگارے" کی اشاعت پر شور مچے گا لیکن یہ خیال نہ تھا کہ اتنا ہیجان بپا ہوگا۔

مصنفین کا یہ ارادہ نہ تھا کہ انگارے کے ذریعے ہندستان میں آگ لگائیں یا اشتراکیت

[illegible]

پھیلائیں۔ ان کے جذبات میں وہ خیالات ضرور موجود تھے۔ جنہوں نے ساری دنیا کو ہلا دیا تھا لیکن انہوں نے محض ان خیالات کو پھیلانے کے لئے افسانے نہیں لکھے تھے۔ افسانوں میں اپنے مشاہدات اور احساسات کا ذکر کیا تھا۔ عوام الناس اور غربا کی حالت سے وہ نہ تو بے بہرہ تھے اور نہ وہ اشتراکی انقلاب کی بنیاد رکھ رہے تھے۔

[illegible] جیمس جائس، ورجینیا وولف اور ڈی ایچ لارنس سے متاثر ہوئے تھے اور ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ ان کے ملک میں بھی ادبی ترقی ہو اور نئے خیالات پھیلیں اس وقت تک آندرے وغیرہ کی شاعری کا بھی زیادہ چرچا نہیں ہوا تھا اور انگلستان کی شاعری میں ایلیٹ اور ایزرا پاؤنڈ کا اثر قائم تھا۔ صرف سجاد ظہیر اور محمود الظفر آکسفورڈ میں تعلیم پا چکے تھے۔ محمود الظفر کا افسانہ بالکل ضیر میں دوستی کی بنا پر شامل کیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ انگریزی زبان میں لکھتے تھے اور اردو سے بڑی حد تک ناآشنا تھے۔ جہاں سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفین کے دل میں اردو ادب میں ایک نئی تحریک شروع کرنے کا جذبہ تھا۔ وہیں اس بات کا بھی کہ ان کو اپنے خیالات کی انقلابی اہمیت کا اندازہ نہ تھا۔ رشید جہاں کے افسانوں میں کوئی زیادہ قابلِ اعتراض بات نہ تھی۔ ان پر اعتراضات زیادہ تر اسلئے ہوئے کہ عورت ہوکر "انگارے" جیسے مجموعہ میں شرکت کی۔ اُن کے افسانے اس وقت کے لئے "ترقی پسند" تھے اور "انگارے" کی فضا میں گھل مل گئے۔ سوسائٹی بھی اس وقت بے حد پست تھی اور چیخ اُٹھی۔

خیال سجاد ظہیر کا تھا اور میرے مکان پر اس مسئلہ پر پہلی بار گفتگو ہوئی اور آئندہ بھی بحث مباحثے ہوئے۔ جب دنیائے اردو اور مسلمانانِ ہند میں شور مچا تو آنکھیں کھلیں سماج کو درحقیقت ایسی چیز کی ضرورت تھی۔ قدامت پسندی اور جدیدیت یعنی والدین اور اولاد کے درمیان جو چھپی ہوئی خلیج حائل تھی۔ سمندر کی طرح موجزن ہو گئی۔ ابھی تک جد جاری ہے اور ہر روز گہری ہوتی جاتی ہے۔ گویا کہ "انگارے" کی لگائی ہوئی نہیں ہے۔ اس کا سبب

دراصل مغرب کا اثر اور مشرق کے معاشرتی نقشہ کو بدل جاتا ہے۔ اس میں دردناکی اور مزاحیانہ رنگ دونوں مضمر ہیں۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسندی کی تحریک ولایت سے ہوتی ہوئی ہندوستان آئی اسکے بعد کا حال گو سب کو معلوم ہے، اس بات کا علم بہت کم لوگوں کو ہے کہ ۱۹۳۸ء میں دہلی کے بعض ترقی پسندوں میں "ترقی" اور "ساکت" کھڑے رہنے کے پہلو پر بحثیں ہوئیں۔ کٹر "ترقی پسندوں" کا نظریہ تھا کہ ترقی کے معنے اشتراکیت کی طرف بڑھنا ہے، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جو اس نظریہ کو نہیں مانتے وہ رجعت پسند ہیں۔ اس گروہ میں سب ہی ترقی پسند ڈاکٹر ملک راج آنند کی امامت میں صف آرا تھے۔ صرف میں اکیلا مخالف تھا۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ صرف اشتراکیت کے بارے میں یا اشتراکی نقطۂ نظر سے لکھنا ہی ترقی نہیں ہے۔ اشتراکیت سیاسی اور اقتصادی مسئلہ ہے نہ کہ ادبی۔ محض اشتراکیت کو اپنے دماغ یا روح میں محسوس کر لینا ادبی ترقی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ ادب سماج اور زندگی یعنی انسانیت سے تعلق رکھتا ہے، اشتراکیت یا فاشیت یا جمہوریت سے نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سیاسی تحریکیں بھی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن ادب ان پر مبنی نہیں ہے۔

عالم میں صرف ایک سرخ ستارہ نہیں ہے۔ بلکہ "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"۔

میرا ہم خیال سوائے حیات اللہ انصاری کے اور کوئی ادیب نہ تھا۔ حالانکہ اس وقت حیات اللہ خود ادب کے میدان میں پوری طرح نہ آئے تھے۔ ابھی تک کوئی ایسا ادیب نہیں ہوا جس نے "ترقی پسندی" کے دائرے میں کھڑے رہ کر ترقی کی ہو۔ روسی ادیبوں کا تذکرہ کرنا بیکار ہے کیونکہ وہاں کے مسائل دیگر ہیں۔ بہرحال میں نے اس وقت اس تحریک کے بارے میں لکھنا مناسب نہیں سمجھا تاہم یہ باتیں اور میرا نظریہ میری تصانیف میں مضمر ہیں جیسا کہ (Twilight in Delhi) کے مطالعہ سے ظاہر ہو جائے گا یا میرے جدید ترین افسانوں کے مجموعے "قید خانہ" سے۔ ان چیزوں کے بارے میں لکھنے سے تو یہ بہتر ہے کہ خاموشی سے لکھتا رہے جو عقلمند ہیں انھیں سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو بیوقوف ہیں انہیں سمجھانے سے

بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میرا مقولہ ہے کہ "کرو زیادہ کہو کم"

"ترقی پسند" ادیبوں نے تو اشتراکیت میں ترقی حاصل کر لی۔ ان کو ادب میں دلچسپی نہیں تھی اور نہ وہ اس کے لئے اپنی جان قربان کرنے کو تیار تھے۔ اور جب تک کہ ایک شخص اپنے مقصد کے لئے (جو ادیب کے لئے صرف آرٹ ہی ہو سکتا ہے) جان دینے کے لئے تیار نہیں۔ وہ کسی بلندی پر نہیں پہنچ سکتا "ترقی پسند" ادیب چنانچہ یا تو ایک آدھ اچھا افسانہ لکھ کر خاموش ہو گئے یا سیاست میں ادب کو خیر باد کہہ دیا ع

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

صرف ایک دو ہی نے ترقی جاری رکھی (جس میں ایک حیات اللہ ہیں) اور زندگی اور ادب کے مسئلوں پر غور و فکر کرتے رہے۔ باقی سب نے یا تو افسانوی جرنلزم اختیار کیا یا اشتراکی جامہ پہن کر ادب کو طاقِ نسیان میں دھرا، پروپگنڈا کا دیا جلایا اور کچھ جنسی اور جسمانی مشکلات اور مسائل کی بھینٹ چڑھے۔ نام گنانے سے کیا فائدہ؟

اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک جماعت ان لوگوں کی بھی پیدا ہوئی جنہوں نے "ترقی پسندی" کو اپنا دیوتا مانا۔ اور اس نے مذہب کی تبلیغ شروع کی ان میں سے کچھ شعر کہنے کی آرزو رکھتے تھے، کچھ نقاد بننے کی اور کچھ محض لہو لگا کے شہیدوں میں شامل ہونے کی۔ یہ لوگ ترقی پسندی کے بارے میں مباحثے کرتے ہیں اور آجکل کی "منزل" سے گزرتے ہوئے رجعت پسندوں کو "نیا ادب" کی وحی کا پیغام سناتے ہیں۔ مگر جب ان کے مضامین پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے وہ ستاروں کی ہوس میں پتنگ اڑا رہے ہیں۔ ان کی بحث حقیقت سے کچھ تعلق نہیں رکھتی اور وہ بس ہوائی کرہ میں چکر کھاتے ہیں۔ وہ محض "ترقی پسندی" کے بارے میں بحث کرتے ہیں اور ترقی پسند "ادب" کے نمونے نہ تو پیش کرتے ہیں اور نہ ان کے حوالے ہی دیتے ہیں۔ شعر گوئی ہی ترقی پسندی نہیں ہے۔ افسانہ نگاری بھی اس کا جزو ہے اور بہت اہم جزو۔ مگر پہلے کے ترقی پسند" ادیب تو کھو گئے! اور یہ لوگ ایسے دیوتاؤں کی پرستش کر رہے ہیں۔ جن

کا وجود ہی نہیں۔

موجودہ جنگ کے دوران میں دنیا کے ادب میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوا ہے۔ موجودہ حالات کا اثر ہندستان پر بھی پڑ رہا ہے اور سچے ادیب زندگی کے مسائل پر غور کر رہے ہیں جو مصنف آرٹسٹ بننا چاہتا ہے۔ وہ گھڑے گھڑائے مسئلوں اور کھلونوں سے الہام حاصل نہیں کرتا اور نہ ایک ہی محور کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ زندگی بہت وسیع اور پیچیدہ ہے۔ اشتراکیت صرف اس کے چند مسئلوں کا جواب ہے۔ کل کا حل نہیں۔ ترقی کا مطلب آگے بڑھنا ہے۔ "ترقی پسند" ادب ایک ہی جگہ کھڑے ابھی تک مدت تک رہے ہیں۔ کارواں گذرا چلا جا رہا ہے۔ وہ اوروں سے تو کہتے ہیں آگے قدم بڑھاؤ۔ لیکن خود ساکت ہیں یہ ترقی کی راہ نہیں۔ ادبی خودکشی کا مقام ہے جس طرح زندگی کی تقلید نہیں کسی جاتی اسی طرح ادب اور آرٹ بھی "ترقی پسندی" کے کوزے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تحریک دنیا کی ادبی تحریک کی جلو میں آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ۱۹۳۹ء میں جدا ہوئی ع یاد ایام کہ رفت صد حیف

(ادبی دنیا)

زمانۂ جنگ کی سوویٹ نثر کی اہم تصنیفوں میں ممتاز پولستانی مصنف
وانڈا واسیلوسکا کا ناول
قوس قزح
خاص طور سے قابل ذکر ہے جس پر مصنف کو ۱۹۴۲ء کا اسٹالین انعام ملا۔
قوس قزح ان سوویٹ کسانوں کی زندگی کی معرکۃ الآرا داستان ہے، جو جرمن حملہ آوروں کے چنگل میں پھنس گئے تھے ساری کہانی گہرے حب وطن کے جذبہ سے رچی ہوئی ہے اور جو تصویریں اس میں کھینچی گئی ہیں ان کے بھیانک ہونے کے باوجود کہانی میں دلکشی ہوئی۔ [illegible] اور آخری فتح کے یقین کو بھی مدد ملتی ہے۔
نیا سنسار بانکی پور پٹنہ

شہاب ملیح آبادی

"مشورہ"

۱

جھکے ہوئے ہاتھوں سے اٹھا جام کہ انساں — بیچارہ ابھی دہر میں خورسند نہیں ہے
دنیا میں کہیں دولتِ اسبابِ تبسم — افسونِ مئے تلخ کی سوگند نہیں ہے
ہاتھوں میں اگر جام مئے تلخ نہ آئے — ہر ایک نفَس زہر ہے پھر قند نہیں ہے
اک بار لباسِ مئے گلگوں میں نظر آ — اِس پیرہنِ پاک میں پیوند نہیں ہے
ہو جلد غمِ جاں کے ہر اک بند سے آزاد — دربادہ و ساغر کا ابھی بند نہیں ہے
وہ روح کہ ہے فاتحِ اقلیمِ دو عالم — بے بادۂ دل سوز ظفرمند نہیں ہے
جو ذرہ کہ بیگانہ ہے آشوبِ ضیا سے
وہ مہرِ جہاں تاب کا فرزند نہیں ہے

۲

انساں کہ ہے خود دہر کا قانون شکن تاب — انساں کسی قانون کا پابند نہیں ہے
وہ مرد نہیں جو کہ سرِ راہِ روایات — خود اپنی شریعت کا خداوند نہیں ہے
وہ کچھ بھی نہیں جس کو یہ کہتا ہے زمانہ — خوش فکر و جواں کار و ہنرمند نہیں ہے
وابستہ جو زمزمۂ شعر و سخن سے ہے — یہ سازِ حقیقت ہے، کوئی پند نہیں ہے
ناموس جو اس بندۂ افسردہ نگاہی — نخلِ اثرِ آہ برومند نہیں ہے
آئینہ دکھاتے ہیں کسے دل کا شہاب آپ — یہ ہند کی مٹی ہے سمرقند نہیں ہے

کرشن چندر

اکسٹرا لڑکی

گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ کی دوپہر کا واقعہ ہے۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر اپنے دفتر کی میز پر سر ٹیکے اونگھ رہا تھا کہ کمرے میں ایک اکسٹرا لڑکی داخل ہوئی۔ یوں تو ایک ہیروئن اور ایک اکسٹرا لڑکی میں بہت سی باتیں وجہ تفریق ہیں لیکن ایک موٹی بات جو میرے ایسے کند ذہن کی عقل میں آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس آسانی اور ڈھٹائی سے اس روز وہ اکسٹرا لڑکی میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ کوئی ہیروئن اس طرح داخل نہیں ہو سکتی۔ جب کوئی ہیروئن یا کوئی اہم کردار ادا کرنے والی ممثلہ کمرے میں داخل ہوتی ہے تو تین چار آدمی اس کمرے میں پہلے ہی سے موجود رہتے ہیں۔ اسکی پیشوائی کے لئے، اس کی آمد کی خبر پہلے ہی سے ہو جاتی ہے اور اگر پھر بھی کسی کندۂ ناتراش کا سر میز پر اونگھتا ہوا نظر آ جائے تو اسے ٹھوکے دیکر جگا دیا جاتا ہے، "ہوشیار باش مردود، ممثلہ آ رہی ہے۔ ہوشیار باش!......" اور چونکہ اس دوپہر کو اس قسم کا کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ اس لئے یقیناً وہ لڑکی جو گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ کی دوپہر کو میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ ہیروئن نہ تھی ایک اکسٹرا لڑکی تھی۔ یعنی ایک ایسی لڑکی جو فلموں میں ہیروئن سے دور پس منظر میں مسکراتی ہوئی یا روتی ہوئی یا ہنستی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جب ہیرو، ہیروئن سے ملنے آتا ہے تو وہ دروازہ کھول کر اور بتی بجھا کر، میرا مطلب ہے، بتی جگا کر کمرے سے باہر چلی جاتی ہے۔ دور۔ کہیں دور ڈالی کے نیچے نیچے اور درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر ہیرو اور ہیروئن کا دوگانہ سنتی ہے۔ جب ہیرو اور ہیروئن کی شادی ہوتی ہے تو وہ ہیروئن کے گلے کو موتیا کے ہاروں سے مزین کرتی ہے۔ اور سہاگ رات یعنی شب عروسی کے بارے میں ایسے لطیف اشارے کرتی ہے۔ جسے تماشائی بے حد پسند کرتے ہیں

اور اپنے دل ہی دل میں اپنے آپ کو ہیروئن کا دولہا سمجھ کر محظوظ ہوتے ہیں اور جب ہیرو اپنی بے وفا عاشق اس گل خوبی میں اپنی محبوب گلعذار کو ٹھوکر لگا کر رخصت ہو جاتا ہے اور ہیروئن میرے ونود حمید یا بچتر سنگھ! کہہ کر چیختی ہے اور دھڑام سے بستر پر گر کر بیہوش ہو جاتی ہے تو اس وقت بھی جو لڑکی 'ہائے میری مالکن کو کیا ہو گیا؟' کہکر کمرے سے نکلکر بھاگتی ہے ایک اکسٹرا لڑکی ہی ہوتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک اکسٹرا لڑکی سب کچھ ہو سکتی ہے، وہ ماما ہو سکتی ہے نرس ہو سکتی ہے سہیلی ہو سکتی ہے، میری اور آپکی بیوی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہیروئن نہیں ہو سکتی اور یہی ایک اکسٹرا لڑکی کی صحیح تعریف ہے.....!

اس اکسٹرا لڑکی کا نام زبیدہ تھا، اور وہ ہنس کر مجھ سے کہنے لگی کہ گھر والے اسے "زیب" کہکر پکارتے ہیں۔ میں نے یہ کہکر ٹال دیا کہ اس طرح کہنا کچھ گھر والوں ہی کو "زیب" دیتا ہے، بہرحال ۔۔ "زیب" نام کی ایک اور لڑکی کو بھی جانتا ہوں لیکن اسکی کہانی پھر کبھی بیان کروں گا۔ کیونکہ اسکے ڈرامے میں حرف سوالیہ ابھی آیا ہے اور اس زیب کے افسانے میں حرف سوالیہ آکر گذر گیا ہے۔ یہ حرف سوالیہ زندگی میں کئی ڈھنگ سے آتا ہے کبھی تو یہ محبوب کے بوسے کی طرح شہد آگیں ہوتا ہے اور کبھی ناکام تمناؤں کی طرح تلخ کبھی اسکی تشکیل سرخ انگاروں سے ہوتی ہے اور کبھی آنسوؤں کے نمکین پانی سے لیکن زندگی میں ایکبار یہ حرف سوالیہ ضرور آتا ہے، یہ بڑا دلچسپ مرحلہ ہوتا ہے، زیب یعنی وہ زیب نہیں جسکی کہانی میں اب لکھ رہا ہوں۔ بلکہ وہ زیب جس کی کہانی میں پھر کبھی لکھونگا ابھی اس میں سے گذر رہی ہے اور میں بحیثیت ایک تماشائی کے اسے کسی قسم کا مشورہ نہیں دینا چاہتا، اس سے صرف یہ توقع رکھتا ہوں کہ اگر کبھی یہ سطور اس کی نظر سے گذریں تو وہ مسکرا کر خاموش ہو جائے اور اگر نہ مسکرائے تو اور بھی اچھا ہوگا۔

زبیدہ نوکری کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔ سٹوڈیو کے مالک نے [illegible] مجھے سب سے بھلا اور مہربان مرنجاں مرنج آدمی سمجھ کر [illegible]

کی شکل و صورت اور اس کی اداکاری کے امکانات کا صحیح جائزہ لوں یہ انداز اس نے میرے گنجے سر چیز عینک اور اس بے اعتنائی سے لگایا تھا۔ جس کا مظاہرہ میں اکثر صنفِ نازک کے سامنے کیا کرتا ہوں۔ اسے کیا معلوم کہ یہ تو محض ایک مدافعتی حربہ ہے ورنہ میری جلد کے نیچے بھی وہ تازہ و تیز رخشاں لہو دوڑتا ہے اور احساسات کے ہیولاؤں میں جنسی آگ روشن ہے اور ٹھنڈی یخ برفیلی نگاہوں کی بدلیوں میں بجلیوں کے کوندے مستور ہیں، شاید وہ بھی یہ سب سمجھتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی جانتا ہے کہ میں اسقدر کمزور ہوں کہ اپنی جھوٹی شرافت کے خول کو توڑنے کی سکت بھی مجھ میں نہیں۔ اسلئے درحقیقت بے ضرر ہوں، یہ حقیقت بڑی تکلیف دہ ہے اور داستان بیان کرتے وقت کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتی ہے ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ حقیقت میرے لئے وجہ مسرت ہے اور میں اس جھوٹی شرافت کے سرچشمے سے اپنے لئے کئی بار احساس برتری مستعار لیتا ہوں، شاید تم اس حقیقت کی الجھنوں کو نہیں سمجھو گے۔ لیکن وہ زیب ـــ میرا مطلب ہے کہ وہ زیب ضرور سمجھ جائے گی۔ جس کے لئے میں یہ کہانی لکھ رہا ہوں۔

ہاں تو زبیدہ اس روز دوپہر کو میرے کمرے میں ملازمت حاصل کرنیکی غرض سے داخل ہوئی۔ زبیدہ چھوٹی لڑکی تھی، جس سے اسی روز مجھے انٹرویو کرنا پڑا، سب سے پہلے جو لڑکی آئی تھی، وہ اپنے دو بھائی بھی ساتھ لائی تھی، ایک کا نام "بے بی لنگڑے" تھا دوسرے بھائی کا نام "جانی روبو" اس کا اپنا نام "اوشا" تھا۔ یعنی صبح۔ ایسی منحوس صبح میں نے آج تک نہیں دیکھی، وہ گجراتی لڑکی تھی اور جوان ہوتے ہوئے بھی پرانی کمان کیطرح ڈھیلی ڈھالی چال ڈھال ناک نقشہ بات چیت میں ایک غیر معین ناہمواری بے ڈھنگی بیزاری اور اکھڑا پن پایا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ عورت ابھی ابھی گیلی مٹی سے بنائی گئی ہے اور اسکے فوراً بعد ہی میرے کمرے میں انٹرویو کیلئے دھکیل دی گئی ہے میں نے اسے ملازمت نہ دینے کا فیصلہ کر لیا اور اسے کہا۔ آپکا پتہ میں نے نوٹ کر لیا ہے۔ جبکسی فلم میں ہمیں آپکی

ضرورت ہوگی۔ آپکو ضرور بلا لیا جائیگا۔ اور دل میں یہ کہا " جاؤ آفتاب کی کرنوں میں غسل کرو۔ اور زندگی کی ہواؤں میں اپنی نمناک شخصیت کو سکھالو۔ جب یہ گیلی مٹی سوکھ جائیگی۔ پھر یہاں آنا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گیلی مٹی کبھی نہ سوکھے گی۔ وہ بولی " میرا پتہ — میرا پتہ — آپنے نوٹ کرلیا ہے نا؟"

"جی ہاں"

اچھی طرح نوٹ کرلیجئے۔ وہ اپنے لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ للو بھائی سارا بھائی لین، مکان نمبر ۳۵۰/۵۳۳۔ مکان نمبر ۲۵۰/۵۲۲۳ نہ پھر لکھیگا۔ شہر احمد آباد .....

گھبرائیے نہیں آپ کا پتہ میرے پاس بالکل محفوظ رہے گا۔

تو آپ مجھے ضرور بلائینگے نا۔

ضرور تسلی رکھئے نہ بلانے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

اچھا تو —— وہ میرا پتہ .. میرا مطلب ——

نمستے! میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے کہا۔

وہ جلدی سے ہاتھ جوڑ کر الٹے پاؤں کمرے سے باہر نکلنے لگی گیلی مٹی تھی اس لئے اچھی طرح چل بھی نہ سکتی تھی۔ چلتے چلتے چوکھٹ سے ٹکرا گئی۔ اور پھر نظروں سے غائب ہوگئی۔ کون کہتا ہے وہ غائب ہوگئی؟ وہ ابھی تک میری نگاہوں میں محفوظ ہے، اس کمرے کی میز پر۔ اس فرش پر، اس چوکھٹ پر، اس دروازے کے شیشوں پر اس گیلی مٹی کے نشان ہیں، دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے۔

دوسری لڑکی بدھوار پیٹھ پونا سے آئی تھی، پونا سے بمبئی آئی تھی گلابی رنگ کی جارجیٹ کی ساڑھی اسکے جسم سے چپکی ہوئی تھی اور اس کے اندر سے اس کا جسم ایک خشک تنے کی طرح نظر آرہا تھا۔ اسکی نگاہیں ویران نہیں، اس کے لب ویران تھے، اور اس کا سینہ ویران تھا اور وہ۔

ہو۔ میں جانتی ہوں تم مجھے ملازمت نہیں دوگے، میں جانتی ہوں مجھ میں رس نہیں، شعریت نہیں، عورتیت نہیں، پھر بھی تمہارے پاس آئی ہوں، کیا اس بے حیائی، اس ڈھٹائی، "کوئی امید بر نہ آئی" کی داد نہ دو گے۔ میں نے دل میں کہا "مطلق نہیں" اور اس سے پوچھا

"تمھارا نام؟"

"کوشلیا"

"کہاں رہتی ہو؟"

پونا
اس نے ایک کارڈ آگے بڑھا دیا۔ اس پر لکھا تھا۔ کوشلیا۔ —— آرٹسٹ۔ بدھوار پیٹھ۔

"تم بدھوار پیٹھ پونا سے آئی ہو۔"

"ہاں!

ہاں! میں نے کہا۔ تم —— امرتسر کی رہنے والی معلوم ہوتی ہو۔

خوب پہچانا تم نے وہ ہنسی اور اس کے بھورے جبڑوں میں سیاہی مائل زرد دانت اکھڑی ہوئی جبڑوں کی طرح دکھائی دینے لگے۔

"پہلے کسی تصویر میں کام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

ہاں! حکم دائیہ نے جادوگر بات بابا دم ہو رجب بٹ ننگی، میں گاتی بھی ہوں۔ بدھوار پیٹھ میں اپنا کوٹھا ہے۔ کبھی آؤ وہاں!

میں نے پوچھا: "تم امرتسر سے پونا کیسے آگئیں؟"

رزق! اس نے آہستہ سے کہا۔ بے دلی سے کہا، بے بس، بے جان، بے نور لہجے میں کہا۔ اس کی نگاہوں میں، اس کے جسم میں، اس کی روح میں تاریکی ہی تاریکی تھی، اور اسے دیکھ کر میرے دل میں ایک کراہیت آمیز نفرت کا احساس پیدا ہوا، وہ عورت نہ تھی، گندے گدلے تاریک پانی میں پیدا ہونے والی جونک تھی جو میز پر دھری تھی، اور

جاؤ... جاؤ... میں نے چلا کر کہا۔

وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے معافی مانگتے ہوئے کہا "دراصل بات یہ ہے... نیا فلم دو ماہ کے بعد شروع ہوگا۔ اس وقت ہمیں یقیناً آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی اور بھی بہت سی لڑکیاں

وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ میری چھوٹی بہن گومتی — بھی میرے ساتھ آئی ہے۔ اسے بھی دیکھ لیجئے — اری او — گومتی

گومتی کمرے میں داخل ہوئی۔

بڑی جونک۔ پھر تی جونک، اس سے چھوٹی جونک......

میں نے کہا ہاں، ہاں۔ آپ کو اور آپ کو بھی ضرور بلاؤں گا۔ فی الحال —

اچھا نمستے۔

یہ بیے — توڑ ہیں چھوٹی جونک نے کہا۔

کوشلیا نے اٹھتے ہوئے اپنی گلابی ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے کہا۔ ہود پونا کدی آؤ تو ہمارے کٹھے ضرور آنا۔ اچھا۔

بڑی جونک اور چھوٹی جونک دونوں رینگتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ چوتھی لڑکی مرہٹی تھی۔ مرہٹی لڑکیوں کے بدن میں بالعموم ایک دلکش تناؤ ہوتا ہے اور آنکھوں میں بے بس ہرنی کی سی معصومیت ہوتی ہے۔ جسے مرد بالعموم بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ لڑکی بے بس ضرور نظر آتی تھی۔ لیکن ہرنی نہیں۔ تناؤ نگاہوں میں تھا۔ جسم میں نہیں کچھ عجیب بے ڈھنگی لگڑ بگڑ۔ چرخ کی سی چال چلتی ہوئی اندر آئی۔ اس کے ساتھ اس کا خاوند تھا۔ جو کمرے میں داخل ہوتے ہی دانت نکال کر مسکرانے لگا اور جب تک کمرے میں رہا اسی طرح مسکراتا رہا۔ خدا جانے یہ کمرے کی فضا کا اثر تھا۔ یا میری صورت کا یا اس خوش آئند تصور کا جو اس کی بیوی کے مشہور بن جانے کی صورت میں اس کے مستقبل کی ہوتی۔ کچھ بھی ہو وہ

سکرا رہا تھا۔ شاید اس کی مسکراہٹ اس حرف سوالیہ کا جواب تھی۔ جو آج اس بدنصیب وڑے کے سامنے تھا۔ اکثر اوقات آدمی کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ حرف سوالیہ اس کے سامنے ہے، اور اس سے زندگی، اس کی اہمیت، اس کے توازن اور بنیادی اخلاق کا جواب بتا ہے۔ اکثر اوقات مرد اس حرف سوالیہ کی موجودگی سے آگاہ نہیں ہوتا، اور یونہی قانہ طریق پر مسکرائے جاتا ہے۔ یہ آدمی یہی کر رہا تھا اس وقت، بیس سال جب اس کا سر گنجا ہو جائیگا۔ اور آنکھوں پر دبیز عینک چڑھی ہوگی تو میری طرح وئیگا۔ مسکرانے دو ابھی اسے......

یہ میرا بیوی ہے۔ وہ مسکرا کر بولا۔ نوکری کرنے ہوتا

ہندی یا اردو جانتی ہے؟

ہو! پھار چانگلا (بہت اچھا!)

اچھا تو پھر کہو۔۔ "ارے میں اس کلرک کے گھر کیوں...."

ناہیں... ناہیں... کہنے کو نہیں مانگتا۔ میرا بیوی زبانی یاد کرتا۔ تم اس کو نا۔ یہ یاد کرتا۔ اکرٹے ... پھاڑ چانگلا!

ہو! میں نے خوش ہو کر کہا۔ اچھا تو کہو "شب چراغ"

وہ بولی۔ "شب چراگ"

شب چراگ نہیں شب چراغ

شب چراگھ؛ اتنا کہکر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی؛

میں نے اس کے خاوند سے پوچھا۔ یہ ہنستی کیوں ہے۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا "یہ تم جو بولتا۔ ہمارے بولی میں اس کو گالی بولتا۔

گالی ہو!

ہو! میں نے کہا "اب کہو شب چراغ!"

"نہیں ... نہیں ..." اب وہ شرما گئی۔ اس قدر احمق معلوم ہو رہی تھی وہ! پہلے کسی تصویر میں کام کیا ہے۔ میں نے بات کا رخ پلٹتے ہوئے کہا

نا ہیں نا ہیں ہمارا بیوی کو ہر کام کرنے نہیں ہوتا۔ ام شیرپا لوگ اسے ۔ ایکسٹرے تکڑے ... ام بولا۔ اس کو۔ اس کمپنی کا لوگ بوہت اچھا اس کو مشکل سے راجی کرتا۔ میرا بیوی بولتا تم امارے ساتھ ہوتا تو ہم کرتا کام۔ ام پیلا پیلا۔ مکلا۔ ام بھی بہا سنگ ہوتا۔ ام اس کے سنگ آئی پریم کرتا۔

"بیچارہ چانگلا!" میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا پتہ میں نے نوٹ کر لیا ہے ۸۵ کالیا ویڑی لین پورانا مندر، بمبئی نمبر ۱۹ یہی ہے نا! میں تمہیں بہت جلدی بلانے کی کوشش کرونگا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ میں نے اپنا جواب دہرایا۔ وہ پھر بھی مسکراتا رہا میں نے انہیں رخصت کرنے کے لئے ہات بڑھایا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دئیے۔ اور مسکراتا رہا اس کے کوٹ کا کالر تین جگہ سے پھٹا ہوا تھا اس لڑکی کی دھوتی بوسیدہ اور تار تار تھی! اٹھتے وقت مجھے یہ باتیں معلوم ہوئیں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ سچ مچ ایک بے بس ہرنی تھی اس کی نگاہیں زمین پر گڑ گئیں۔ اور اس کا خاوند مسکراتا رہا۔ واپس جاتے ہوئے میری طرف دیکھتے ہوئے برابر مسکراتا رہا اور جب وہ میرے کمرے سے باہر چلا گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہنسی نہ تھی رونا تھا۔ اس کی شرافت بھی میری طرح جھولی تھی اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور وہ اس میں تبسم کا پیوند لگا کر اپنی غربت کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف اپنی بیوی کو بیچنے آیا تھا۔ اور مسکرا رہا تھا۔ اور اس کی مسکراہٹ میں انسانیت کا خون تھا...

یہ باتیں میں اب تم سے بیان کر رہا ہوں۔ ورنہ اس وقت تو میں نے اسے یہی کہا تھا کہ میں تمہیں پھر بلاؤں گا۔ میں جانتا ہوں یہ جھوٹ ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بلاؤں گا۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ ایک سیدھا سادا عام جھوٹ ایک جھوٹے آدمی نے دوسرے جھوٹے آدمی

سے بڑا تھا، بس اور کیا.....؟

پانچویں لڑکی لڑکی نہ تھی۔ ادھیڑ عمر کی عورت تھی، تین بچوں کی ماں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا، وہ بیوہ تھی۔ خوش رنگ اور فربہ اندام اور اس کا گلا بیٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آتے ہی پھکڑا مار کر کرسی پر بیٹھ گئی اور بیڑی نکال کر سلگانے لگی۔ بولی "کمپنی نے کاہے کو اشتہار دیا ہے؟

ایکسٹرا لڑکیوں کی ضرورت ہے۔

ہا ہا ہا! وہ بیڑی کا دھواں میرے چہرے پر بکھیرنے لگی۔

کتنے روپلے دوگے۔ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ تم نے کہیں کام بھی کیا ہے یا یونہی....!

وہ بولی "ساٹھ تصویروں میں کام کر چکی ہوں بیٹا، ساٹھ تصویروں میں، ہیروئن رہ چکی ہوں، آنند بالا کا نام نہیں سنا؟

"نہیں سنا" میں نے کہا۔

وہ مسکرانے لگی۔ "اچھے تاجر ہو" پھر بولی "خیر مجھے کیا لینا دینا گھر میں کھانے پینے کو بہت ہے۔ صرف اس لئے چلی آئی تھی کہ اگر کام اچھا ہو اور ڈھب کا ہو تو کر لونگی ورنہ اب یہ چھوٹے موٹے دو سطروں کے پارٹ تو مجھ سے نہیں ہوتے۔ بولو پارٹ اچھا ملیگا

بہت اچھا۔

کتنے سین ہونگے؟

کوئی آٹھ دس، ٹھیک طرح سے نہیں کہہ سکتا۔

کتنے دن کا کام ہے؟

آٹھ دس دن کا کام ہے۔

یا کل؟

بس:
اچھا تو کروں گی مگر بابا روپے کتنے دو گے؟"
پچھتر روپیہ ماہوار
باس؟
میں:
یہ تو بہت کم ہے بابا، میرے بچے ہیں، دو لڑکیاں ہیں، مجھے ان کا بیاہ کرنا ہے، کچھ تو سوچو بابا اور ——
نشہ اترنے لگا اور جب وہ چلنے لگی تو بالکل ہی اتر چکا تھا

* * * * * * *

چھوٹی لڑکی کا نام زبیدہ تھا۔ جسے گھر والے زیب کہہ کر پکارتے تھے۔ خیر یہ کوئی بری بات نہ تھی۔ وہ کنواری تھی۔ کم از کم اس کا بیاہ نہ ہوا تھا۔ زبیدہ کا جسم جوان تھا۔ اس کی آنکھیں جوان تھیں، اس کے ہونٹ جوان تھے، اس کی مسکراہٹ جوان تھی، اس کا ماتھا گھٹا ہوا تھا۔ اس کی ناک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو بدصورت ہوتے ہوئے بھی بدصورت نہ تھی۔ اور خوبصورت ہوتے ہوئے بھی خوبصورت نہ تھی۔ اس کے جسم کے خطوط میں، اس کے قہقہوں میں، اس کے نغمے میں شمال اور جنوب کے قطبین کی آمیزش تھی۔ آریائی خون دراوڑ جلد میں لہریں لے رہا تھا اور دراوڑی حدت آریائی برف کو پگھلا کر سیال بنا رہی تھی۔ اسی وجہ سے تو زبیدہ کے جسم کا اور اس کی روح کا صحیح تجزیہ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ ایک مسلسل تجربہ تھی۔ جیسے دو نسلیں، دو تہذیبیں، دو زمانے ایک سانچے میں کھولائے تھے۔ اسی لئے تو وہ خوبصورت تھی نہ بدصورت۔ جوان تھی نہ بڑھیا، کالی تھی نہ گوری۔ آریائی تھی نہ دراوڑی۔ کبھی تو اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور روشن معلوم ہوتیں دوسرے لمحے میں اس کی آنکھیں چھوٹی اور اس کا ماتھا گھٹا ہوا معلوم ہوتا۔ کبھی تو اس کی

جلد میں آریائی اجلاپن نظر آتا۔ دوسرے لمحے میں کالی ناگن کی سیاہ لطافت اس کی جلد میں عود کر آتی اور بیٹھی ہوئی ناک کے نتھنے خوفناک پھنوں کی طرح پھڑکنے لگتے۔

زبیدہ؟ —— تم کہاں کی رہنے والی ہو

بمبئی

باپ کیا کام کرتا ہے؟

وہ سوڈا واٹر کی دکان کرتا ہے۔ اور میری ماں ایک پارسی کے ہاں ملازم ہے۔

اور انہیں تمہارے —— میرا مطلب ہے —— اگر تم —— فلم میں کام کرو تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

مرہٹن نہیں صاحب

تم اردو تو بہت اچھا جانتی ہو

شکریہ مجھے غزلوں کا بہت شوق ہے۔ میرا باپ بڑا "عالم فاضل" ہے میرے پاس غالب، جگر، داغ، مینائی۔ سب کے دیوان موجود ہیں۔

جوش کا کلام دیکھا ہے

نہیں۔

کرشن چندر کے افسانے پڑھے ہیں۔

نہیں مجھے افسانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے بس غزلوں کا شوق ہے۔ داغ تھا اور جگر واہ۔ وا . . .

تم نوکری کیوں کرنا چاہتی ہو

یونہی۔ فلم میں کام کرنے کا شوق ہے

بڑی مصیبت کا کام ہے یہ۔

واہ اس میں کیا مصیبت ہے۔ میک اپ کیا اور کیمرے کے سامنے آ گئے۔ اس میں

کیا مشکل ہے وا ......

کبھی کسی تصویر میں ؟

نہیں، مگر شوق ہے، مجھے غزلوں کا بڑا شوق ہے آپ غزلیں کہتے ہیں

نہیں کہتا نہیں ہوں سنتا ہوں۔ سناؤ گی ؟

وا — میں کیوں سناؤں گی وا — میں شعر تو نہیں کہتی۔ دوسروں کے کہے ہوئے شعر پڑھتی ہوں۔ مجھے تم کوئی پارٹ دو نا۔ تمہارا کیا نام ہے ؟

جانی واکر!

جانی واکر! چھی چھی چھی جانی واکر بڑا برا نام ہے۔

کیوں برا ہے۔

میں جانتی ہوں، یہ ایک شراب کا نام ہے۔ اچھے آدمی شراب نہیں پیتے۔

چھی چھی چھی ... سنو مجھے جگر کی غزلیں بہت پسند ہیں۔

جگر شراب نہیں پیتا۔

مجھے معلوم ہے

تمہیں کیسے معلوم ہے۔

وا۔ مجھے مہتاب نے بتایا تھا۔ میں ایک روز مہتاب سے ملنے گئی۔ بیچاری بڑی اچھی طرح سے ملی چائے پلائی۔ اتنی بڑی ایکٹرس ہے وہ، پر غرور ذرا بھی نہیں۔ چھی چھی چھی نہ جانے بڑی بڑی فلم ایکٹرسوں کو کس بات کا غرور ہوتا ہے۔ کیوں جی اور میں نے جو دیوکا رانی کو ٹیلیفون کیا اور اس نے جواب نہیں دیا۔ کیوں جی یہ کیا بات ہے وا :

" میں اس کی ساڑھی کی طرف دیکھنے لگا۔ سفید وائیل کی ساڑھی جس پر فارسی نقش ونگار کا بارڈر تھا۔ میں نے کہا۔ بارڈر اچھا ہے یہ !

وہ بولی۔ شکریہ مجھے معلوم ہے۔

میں نے پوچھا تمہیں کیسے معلوم ہے۔ جگر نے بتایا تھا، کہ جناب نے، دیوکا رانی سے؟

وہ بولی۔ چھی چھی چھی۔ ایسی باتیں کہتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی وا، یہ کہکر اس نے اپنا ہات میرے ہات میں رکھدیا۔ اور پھر کہا "لائیے میں آپ کا ہاتھ دیکھوں۔"

میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیا دونوں ہاتوں میں بہت سی باتیں ہوئیں محبت کی باتیں۔ وصال کی باتیں، جسم کی لذت کی باتیں، ہمیشہ ہمیشہ زندہ اور جوان رہنے کی باتیں —— سب جھوٹی باتیں۔

میں بھی سمجھتا تھا وہ بھی سمجھتی تھی۔ آخر اکتا کر بولی "مجھے نوکری چاہیئے۔"

میں نے اپنا ہات پرے کھینچتے ہوئے کہا۔ میں نے تمہارا پتہ نوٹ کر لیا ہے اور ——

وہ بولی۔ نہیں مجھے نوکری ضرور چاہیئے۔ مجھے کل تک جواب دو۔

اس کے بعد وہ دوسرے دن آئی، تیسرے دن آئی، چوتھے دن آئی۔ پندرھویں دن بھی آئی۔ ہر روز اس کے ہات ایک نئی کتاب ہوتی اور اس کے جسم پر وہی پرانی ساڑھی ہوتی سفید وائل اور ہلکی دھانی نقش و نگار، ان کتابوں میں پرانے شاعروں کا کلام تھا۔ مطبع نولکشور پریس لکھنو۔ اور ان میں سے سوندھی سوندھی خوشبو آتی تھی۔ پرانے کاغذوں کی خوشبو، پرانے زمانوں، پرانی جوانیوں، پرانے آنسوؤں کی خوشبو، اور ہر بار اس کے بدن پر وہی ساڑھی ہوتی۔ اور وہی غزلیں بار بار پڑھکر سناتی تھی۔ اور ہر روز نوکری کے لئے التجا کرتی۔ یونہی باتوں باتوں میں سرسری طور پر ایک دفعہ کہہ دیتی اور پھر کسی دیوان کے ورق الٹ کر مجھے سنانے لگتی گویا اسے نوکری نہیں ان شاعروں کی زیادہ ضرورت ہے۔

ایک دن میں نے کمپنی کے مالک سے کہا۔ ایک ایکسٹرا لڑکی ہر روز آتی ہے نام ہے زبیدہ، تلفظ برا نہیں، گو ناک میں بولتی ہے۔ مگر —— چل جائیگی!

شکل و صورت کیسی ہے۔

بس یونہی۔ جیسے ایکسٹرا لڑکیوں کی شکل ہوتی ہے۔ مگر ذہین معلوم ہوتی ہے لکھتی ہے۔ اس کا باپ بڑا عالم فاضل ہے اور اس کی ماں ایک پارسی کے ہاں ملازم ہے۔

کون ہے وہ؟

میں نے کہا طوائف تو نہیں معلوم ہوتی۔ مگر——

جانے دو!

میرے انکار کرنے کے بعد بھی وہ آتی رہی، کسی نے اسے بتایا کہ سعید اسے نوکری دلا سکتا ہے، وہ سعید کے پاس بھاگی بھاگی گئی۔ کسی نے اسے بتایا کہ جمیل اس کا کام کر دیگا، وہ جمیل کے پاس گئی، کسی نے کہا لال جی کام کر سکتا ہے۔ وہ لال کے پاس گئی اور پھر ہر پھر کر میرے پاس آئی، اب وہ سارے سٹوڈیو میں بدنام ہو چکی تھی، کیونکہ وہ نوکر ہونا چاہتی تھی، اور اسے نوکری حاصل کرنے کا ڈھنگ نہ آتا تھا۔ اور وہ بے حیائی کے انداز میں کہہ رہی تھی، مجھے لیلو۔ مجھے لیلو کوئی اسے لینے کے لئے تیار نہ تھا۔

میں نے اسے دیکھتے ہی تیوری چڑھائی۔ میں اس کی مسلسل آمد و رفت سے عاجز آ چکا تھا، اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔

زیب!

جی!

تم گھر چلی جاؤ۔ اور یہاں کبھی نہ آؤ۔

بہت اچھا۔

جب تمہاری ضرورت ہوگی، تمہیں بلا لیا جائیگا

بہت اچھا

زیب!

جی!

تمہارا اس طرح خوشامد کرنا مجھے بالکل ......

میرا فقرہ نا تمام رہ گیا۔ کیونکہ وہ رو رہی تھی۔

وہ روتی رہی اور میں میز پر اپنی انگلیوں سے طبلہ بجاتا رہا۔ جب وہ رو رو کر چپ ہو گئی تو مسکرا کر کہنے لگی۔ یہ شعر آپ کو پسند ہے

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا رہ گزر یاد آیا

میں نے کہا غالب کا شعر ہے "

وہ بولی۔ اور مجھے یہ شعر بھی بہت پسند ہے

ہم نے بھی وضع غم بدل ڈالی
جب سے وہ طرز التفات گئی

میں نے جواب دیا۔ جگر کا شعر ہے

وہ بولی۔ میں جاتی ہوں۔ خدا حافظ

خدا حافظ

× × × × ×

زبیدہ چلی گئی۔ اس نے اپنی وضع غم بدل ڈالی۔ اب وہ ایک فلمی دلال بادامی کے پاس ہے۔ بادامی اسے ایک بہترین فلمی ایکٹرس کے سارے لوازم بہم پہنچانے کی فکر میں ہے۔ اب تک وہ تین چار لڑکیوں کو فلمی ستارے بنا چکا ہے۔ بادامی ہر سال ایک لاکھ روپیہ انکم ٹیکس ادا کرتا ہے۔ اس کا کام نئی لڑکیوں کو فلم ایکٹرس بنا کر بیچنا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ یہ بڑی اچھی تجارت ہے۔ ملک میں یہ تجارت اب پانچویں نمبر پر ہے۔ بادامی نے زبیدہ کو زندگی کے نازک ترین مرحلے میں سے بخیر و عافیت گزر جانے کا موقع دیا۔ زبیدہ اس کے لئے شکر گزار ہے۔ امسال وہ بادامی کے ساتھ ایک ناچ پارٹی میں شامل ہو کر پنجاب اور سندھ کا دورہ کر گئی۔ پچھلے سال بادامی نے اس

دوسرے میں تین لاکھ روپیہ اکٹھا کیا۔ اب کے اسے زیادہ آمدنی کی توقع ہے۔

اگلے سال زبیدہ فلم اسٹار بن جائیگی۔ پھر وہ اپنی آمدنی کا تیس فیصدی حصہ بادامی کی نذر کیا کریگی۔ کالج کے لڑکے اس کے گھٹے ہوئے ماتھے، بیٹھی ہوئی ناک اور گنگنے انداز تکلم پر قربان ہوا کرینگے۔ اس کی تصویریں اپنے البم میں سجائیں گے اور چاندنی راتوں میں آہیں بھرا کرینگے اور جس کمپنی کے مالک نے اسے پچہتر روپے کی اسامی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اسے دس ہزار روپے دیکر اپنی تصویر میں کام کرنے کی دعوت دیگا۔

اور اخباروں میں زبیدہ کی تصویریں چھاپی جائیں گی۔ اور لوگ اسے گالیاں دینگے اور اسے بے وفا، بے حیا اور ننگ انسانیت کے حوصلہ افزا خطابات سے نوازیں گے۔

یہ سب کچھ ہوگا اور بہت اچھا ہوگا اور خوب ہوگا اور محض اس لئے ہوگا کہ گیارہ ڈسمبر ۱۹۴۲ء کی دوپہر کو میں نے اور تم نے ایک عورت کو مار ڈالا تھا۔ اور ایک طوائف کو جنم دیا تھا۔ گیارہ ڈسمبر ۱۹۴۳ء کی دوپہر کو میں نے اور تم نے سورج کو ڈوب جانے دیا تھا۔ اور تاریکی کو بچا لیا تھا۔ گیارہ ڈسمبر ۱۹۴۴ء کی دوپہر کو میرے اور تمہارے سامنے اک حرف سوالیہ آیا تھا۔ اور اس کے جواب میں میں نے اور تم نے چھ لڑکیوں کے چہروں پہ کیچڑ تھوپ دی تھی۔۔۔۔۔۔۔!

کیونکہ زبیدہ ایک لڑکی نہ تھی وہ چھ لڑکیاں تھی۔ چھ نہیں بلکہ سات، کیونکہ ان ساتوں میں وہ زبیدہ یعنی وہ زیب بھی شامل ہے۔ جس کا اس کہانی سے کوئی تعلق نہیں!

(کردار فرضی ہیں)

نئے فسانے مرتبہ کرشن چندر ایم اے
یہ کتاب ہندوستان کے جدید فسانوی ادب کی تصویر ہے۔ اردو، ہندی، گجراتی، مراٹھی، تامل، تلگو، بہاری وغیرہ افسانہ نگاروں کے بہترین نقوش اس میں شامل ہیں۔ قیمت چار روپے
ساقی بک ڈپو دہلی — سنٹرل پبلشنگ ہوز سلور جوبلی پارک روڈ بنگلور سٹی

احمد ندیم قاسمی

شکست و ریخت

کاروانِ حیات مست قدم آرزو روح میں اڑانوں کی
پار ہوتی ہے تیر پر، جیسے بے نیازی نئی کمانوں کی

چاند، نیلے فلک پہ دم سادھے دیکھتا ہے تمدنوں کے نظام
اک طرف صبح کی حنا بندی اک طرف رینگتی، سسکتی شام

ایک بھونڈا سا مرمریں ڈھانچہ اور نیندوں میں چور سنگتراش
جیسے اک دیوتا کے چرنوں میں دیوداسی کی گلتی سڑتی لاش

معبدوں کے اندھیرے گوشے ہیں چند راہب تھکن سے اونگھتے ہیں
جیسے کوہسار کی گپھاؤں میں اژدہے اپنے جسم سونگھتے ہیں

اک فلک بوس محل میں، تنہا سیج پر سو رہی ہے شاہزادی
اور افلاس کے نشیبوں میں بلبلاتی ہے روحِ آزادی

درس گاہوں کے سرخ برجوں پر بھوکی چمگادڑیں تڑپتی ہیں
پتلی جھلی کی پھڑپھڑاہٹ میں علم کی بجلیاں کڑکتی ہیں

اک الاؤ کے گرد بیٹھی ہیں چند چرواہیاں ۔ بجھے ماہتاب
ٹھٹھری خاموشیوں میں کھوئے ہوئے اُجڑی پُجڑی جوانیوں کے خواب

تیرہ و تار تنگ کوچوں میں رینگتے، رکتے، مضطرب سائے
ایک جھنکار سی دریچے سے "اس کو لائے کہ یونہی لوٹ آئے؟"

ایک جانب سے کانپتی آواز "جاں لبوں پر ہے، رحم فرماؤ"
اک طرف سے صدائے زہرہ گداز "غلہ آنے کو ہے۔ بیچتے جاؤ"

دیکھتے ہی یہ شرمناک تضاد چاند بدلی میں منہ چھپاتا ہے
خون روتا ہے ابن آدم پہ کالے غاروں میں ڈوب جاتا ہے

میں کہاں یہ نظامِ خام کہاں کیوں نہ رسمِ جہاں بدل ڈالوں
نشتر اگر چبھوتے ہوئے جھجکیں
یہ پرانی کماں بدل ڈالوں

اگنیزیو سلونے

مترجمہ بلال احمد

لُومڑ

ڈینیل سورخانے میں بیٹھا سورنی کو بچہ جنانے میں مدد دے رہا تھا کہ اس کی بیوی فلومنا نے آواز دی۔ "ڈینیل، کوئی تمہیں ملنا چاہتا ہے۔" ڈینیل بے حد مصروف تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کوئی کسی حالت میں بھی اس کی مصروفیت میں مخل ہو۔ چنانچہ اس نے بیوی کی آواز سنی ان سنی کر دی۔ اور وہ ناچار کوئی جواب نہ پانے پر چپ ہو رہی۔

ڈینیل نے ہر ممکن انتظام کر رکھا تھا تاکہ سورنی کو کوئی جھول ڈالنے میں کوئی تکلیف نہ ہو لیکن ان معاملات میں کامل یقین نہیں کیا جا سکتا، اس نے ایک دن پیشتر ہی سورنی کو وہ چارہ دینا شروع کر دیا تھا جو حاملہ جانوروں کو دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے احتیاطاً کسٹر آئیل کی ایک خوراک بھی پلا دی تھی۔ اور اگاستینو کو اپنی مدد کے لئے بلا لیا تھا، اگاستینو رہنے والا تو برگامو کا تھا لیکن عرصہ سے قسنو میں مقیم تھا۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے تو معمار تھا مگر بیکاری کے دنوں میں جو کام بھی تھا کر لیتا تھا۔

بچوں کی پیدائش کا سلسلہ بخیریت شروع ہو چکا تھا، سورنی کے تین چوہے جیسے چھوٹے چھوٹے بچے باہر آ چکے تھے۔ اگاستینو کو کوئی اور کام تو تھا ہی نہیں، بچوں کے نام ہی رکھنے شروع کر دئے۔

"اس بدمعاش کا نام بینوڑ رکھیں گے۔" اس نے اس بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس نے پیدائش کے وقت کوئی پس و پیش نہ کی تھی۔

"ناممکن، اس بچہ کو تو انلی کی ایک قوم کے پاس بیچنا ہوگا۔" ڈینیل نے کہا۔

"بس تم تو اسی پھیر میں رہتے ہو، بانٹے کہیں گے۔" اگاستینو بولا۔

اس وقت ڈینیل کی چھوٹی لڑکی ونٹر کی آواز سنائی دی —— "ابا کوئی تم سے بات کرنا چاہتا ہے"۔ لیکن ڈینیل نے اس بار بھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ابھی تک اپنے سوروں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ اس نے گھر والوں کو متنبہ کر رکھا تھا کہ جب وہ کام کر رہا ہو تو کوئی بھی مخل انداز نہ ہو۔ اس نے ڈبے میں گھاس کی تہ جمائی۔ اور بڑی احتیاط سے سور کے بچوں کو وہاں رکھ کر کمبل کے ایک ٹکڑے سے ڈھانپ دیا۔ اتنے میں اس کی بڑی لڑکی سلویا کی آواز کان میں پڑی —— "ابا کوئی تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

ایک لمحے کے بعد سلویا کیسٹرنیا کو لئے سور خانے میں آئی، کیسٹرنیا لارنس کی رہنے والی ایک بوڑھی درزن تھی، جو دیر سے یہاں مقیم تھی، نئے کپڑے سینے کے بجائے مرمت کا کام زیادہ کیا کرتی۔ کیسٹرنیا کو دیکھتے ہی ڈینیل اپنی لڑکی پر برس پڑا —— "کیا تم اسی عورت کی خاطر گھنٹہ بھر سے میرا دماغ چاٹ رہی تھیں۔"

کیسٹرنیا کو یہ مرض تھا جو کچھ کہنا ہوتا فی الفور نہ کہتی۔

"کیسٹرنیا تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے!" سلویا نے باپ کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا، پھر وہ اکڑا سینہ کے ساتھ ڈینیل اور کیسٹرنیا کو تنہائی میں چھوڑ کر مکان کی طرف چلی گئی۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں اپنی مزدوری کے علاوہ کسی اور کام سے واسطہ نہیں رکھتی" کیسٹرنیا نے شروع کیا۔

"مجھے تمہارے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں" ڈینیل نے روکھے پن سے جواب دیا۔

"لیکن آپ یہ تو جانتے ہیں، کہ مجھے سنوز میں رہتے ایک زمانہ ہوگیا ہے۔ لیکن میں نے کبھی کسی کے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا؟"

"مجھے اس سے کیا؟" ڈینیل گھر کا رخ کرنے لگا۔

جونہی کیسٹرنیا نے دیکھا کہ ڈینیل اس کی باتوں پر کان نہیں دھر رہا۔ اس نے تمہید چھوڑ دی اور مطلب کی بات کہنے لگی۔

"ایک اطالوی میرے پاس آیا تھا۔ وہ مجھے جاسوس بن جانے کی ترغیب دے رہا تھا۔"

ڈینیل جوں کا توں کھڑا رہ گیا۔

کیٹرینا نے ایک گہری سانس لی۔ اور اس اطالوی کی باتیں کرنے لگی جس سے ایک مرتبہ لوکارنو کے دفتر میں اتفاقاً اسے ملنا ہوا تھا۔

"تم مدت سے تسنو میں رہتی ہو۔" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "اور یہاں کے ہر آدمی سے واقف ہو۔ اپنے پیشے کی بدولت تمہیں ہر جگہ آنے جانے کا موقع بھی میسر ہے۔ سینکڑوں گھروں میں تمہارا آنا جانا ہے، اور ہزاروں قسم کی باتیں سنتی ہو۔ اور پھر تم بوڑھی ہو، اور تمہاری موجودگی میں لوگ آپس میں باتیں کرنے سے یقیناً ہچکچاتے نہ ہوں گے۔"

"بے شک" میں نے جواب دیا۔ "ہر کوئی میری عزت کرتا ہے۔ کیونکہ میں ہمیشہ اپنے ہی کام سے کام رکھتی ہوں۔" وہ اطالوی بولا۔ "اگر تم اس علاقے کے فاشیت کے دشمنوں کی سرگرمیوں کے بارے میں خبریں مہیا کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لو تو بڑھاپے میں محنت اور مشقت کی مصیبت سے چھوٹ جاؤ گی۔"

ڈینیل نے گہری نظروں سے کیٹرینا کو دیکھا جو بات چیت کے دوران میں سسک اور ہانپ رہی تھی۔ "تم یہ داستان سنانے میرے پاس کیوں آئیں؟"

"آپ کا مطلب؟"

"میں ایک تسنوی ہوں اور مجھے تمہارے اطالوی فقیروں سے کوئی سروکار نہیں۔ تمہیں میرے پاس کس نے بھیجا؟"

"آپ مجھے تیس سال سے جانتے ہیں۔" عورت نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ایک باعزت طریقے پہ روٹی کماتی ہوں —— اپنے کام سے مطلب رکھتی ہوں......!"

"میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں۔" ڈینیل نے طیش میں آکر کہا۔ "کہ تمہیں میرے

پاس کس نے بھیجا؟

"آپ مجھے تیس سال سے جانتے ہیں۔" عورت نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ایک باعزت طریقے پر روٹی کماتی ہوں ——— اپنے کام سے مطلب رکھتی ہوں......"

"میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں۔" ڈینیل نے طیش میں آکر کہا۔ "کہ تمہیں میرے پاس کس نے بھیجا؟"

"کسی نے بھی نہیں۔" کیٹرینا نے جواب دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میری وجہ سے پریشانی ہوئی...... اب میں آپ سے کچھ نہ کہوں گی۔" وہ جانے کے لئے مڑی۔ ایک دو منٹ بعد ڈینیل نے بھی مورخانے سے نکل کر سڑک پر درزن کے پاس پہنچ گیا۔

"اگر تمہیں کسی نے نہیں بھیجا تو تم میرے پاس کیوں آئیں؟"

"میں تو محض مشورہ لینا چاہتی تھی۔" کیٹرینا نے چلتے چلتے سامنے دیکھتے ہوئے کہا

"کیسا مشورہ؟"

"یہی نا کہ اطالوی کی پیش کش کو منظور کروں یا نہ۔" کیٹرینا رک گئی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں! ساری زندگی میں مجھے کبھی ایسی پریشانی نہیں ہوئی۔ اگر میں مخبری کروں تو تھوڑے بہت پیسے تو میرے ہاتھ ضرور لگ جایا کریں گے۔ لیکن اس طرح میں ان لوگوں کے حق میں برائی کروں گی۔ جنہوں نے کبھی مجھے شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ اگر صاف انکار کردوں تو میرا نام فاشیت کے مخالفوں کی فہرست میں لکھا جائیگا۔ اور ہر ممکن طریقے سے مجھے ایذا پہنچائی جائیگی۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ نہ میں فاشی ہوں اور نہ فاشیوں کی مخالف۔"

ڈینیل کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

کیٹرینا سسکیاں لیتی ہوئی چلی گئی۔ ڈینیل بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ سڑک کے موڑ پر اگاستینو ملا۔ "سنو! میری بات سنو!" ڈینیل بولا۔ "گھبراؤ بالکل مت۔ بلکہ ہمارا

۳

اتھ انگا ستینو کو مناؤ، اور اس کی ہدایت پر عمل کرو۔"

ڈینیل خاموشی سے کھڑا ان دونوں کو دور جاتے دیکھ رہا تھا، پھر گھوما، اور دھیرے ھیرے چلتا ہوا اپنے سورخانے میں جا پہنچا۔

ایک روز ڈینیل اور اس کی لڑکی سلویا اپنی انگور کی بیلوں میں کام کر رہے تھے کہ انگا ستینو ا دکھائی دیا۔ سورنی کی بیانے کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔

ڈینیل اپنا خالی وقت انگور کی بیلوں کو کیڑوں کے حملے سے بچانے میں صرف کیا کرتا تھا۔ ں وقت وہ دھات کے ایک برش سے کرم خوردہ مقامات تلاش کر رہا تھا۔ اور سلویا ان کھولتا ہوا پانی ڈال رہی تھی۔ انگا ستینو اینٹوں سے بھری لاری چلاتا ہوا آیا اور لاری کو کتے ہوئے کہا۔ "ارے بھئی وہ کام ہو رہا ہے"!

"کونسا کام؟"۔ ڈینیل کی سمجھ میں نہ آیا

"تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو۔" انگا ستینو نے ہاتھ ہلایا۔ اور پھر آہستہ آہستہ موٹر کو چلا ھوڑ دیا۔ ڈینیل نے اپنا سر بات کو سمجھ کر ہلا دیا۔

بہت دنوں سے سلویا کے دل میں ایک بات تھی۔ آج اس نے ہمت کر کے کہہ ڈالی "ابا علم ہے کہ تم اٹلی کی آزادی کے لئے بڑا کام کر رہے ہو۔ اگرچہ تم کبھی اس سلسلے میں نہیں کرتے۔ میں بھی تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔"

"ان ٹہنیوں کو اکٹھا کرو اور جلا دو۔" اس کے باپ نے جواب دیا۔ فی الحال تمہارے یہی بہت کام ہے۔"

سلویا نے حکم کی تعمیل کی۔ ڈینیل اسے انگور کی بیلی بیلوں کے زیر سایہ واپس جاتے سے دیکھتا رہا۔ ابھی نومبر ہی میں گھر والوں نے سلویا کی بیسویں سالگرہ منائی تھی۔ باپ بیٹی کو فخر اور خوف کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ سلویا اس کے خزانے کا ایک بیش بہا ت ایسا موتی تھی۔ جسے زیادہ عرصے کے لئے قبضے میں نہ رکھا جا سکے۔

درس گاہوں کے سرخ برجوں پر   بھوکی چمگادڑیں تڑپتی ہیں
پیلی جھلی کی پھڑپھڑاہٹ میں   علم کی بجلیاں کڑکتی ہیں

اک الاؤ کے گرد بیٹھی ہیں   چند چرواہیاں ۔ بجھے ماتمات
ٹھٹھری خاموشیوں میں کھوئے ہوئے   اجڑی بچھڑی جوانیوں کے خواب

تیرہ و تار تنگ کوچوں میں   رینگتے، رکتے، مضطرب سائے
ایک جھنکار سی دریچے سے   "اس کو لائے کہ یونہی لوٹ آئے؟"

ایک جانب سے کانپتی آواز   "جاں لبوں پر ہے، رحم فرماؤ"
اک طرف سے صدائے زہرہ گداز   "غلہ آنے کو ہے۔ جیتے جاؤ"

دیکھتے ہی یہ شرمناک تضاد   چاند بدلی میں منہ چھپاتا ہے
خون روتا ہے ابن آدم پر   کالے غاروں میں ڈوب جاتا ہے

میں کہاں یہ نظام خام کہاں   کیوں نہ رسم جہاں بدل ڈالوں
تیر اگر چھوٹتے ہوئے جھجکیں
یہ پرانی کماں بدل ڈالوں

اگنز یوسلونے

مترجمہ بلال احمد

لومڑ

ڈینیل سورخانے میں بیٹھا سورنی کو بچہ جنانے میں مدد دے رہا تھا کہ اس کی بیوی فلومینا نے آواز دی۔ "ڈینیل، کوئی تمہیں ملنا چاہتا ہے۔" ڈینیل بے حد مصروف تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کوئی کسی حالت میں بھی اس کی مصروفیت میں مخل ہو۔ چنانچہ اس نے بیوی کی آواز سنی ان سنی کر دی۔ اور وہ ناچار کوئی جواب نہ پانے پر چپ ہو رہی۔

ڈینیل نے ہر ممکن انتظام کر رکھا تھا تاکہ سورنی کو کوئی جھول ڈالنے میں کوئی تکلیف نہ ہو لیکن ان معاملات میں کامل یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے ایک دن پیشتر ہی سورنی کو وہ چارہ دینا شروع کر دیا تھا جو حاملہ جانوروں کو دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے احتیاطاً کسٹر آئیل کی ایک خوراک بھی پلا دی تھی۔ اور اگاستینو کو اپنی مدد کے لئے بلا لیا تھا۔ اگاستینو رہنے والا تو برگامو کا تھا لیکن عرصہ سے قسترو میں مقیم تھا۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے تو معمار تھا مگر بیکاری کے دنوں میں جو کام بھی تھا کر لیتا تھا۔

بچوں کی پیدائش کا سلسلہ بخیریت شروع ہو چکا تھا، سورنی کے تین چوہے جیسے چھوٹے چھوٹے بچے باہر آ چکے تھے۔ اگاستینو کو کوئی اور کام تو تھا ہی نہیں، بچوں کے نام ہی رکھنے شروع کر دئے۔

"اس بدمعاش کا نام بینوٹ رکھیں گے۔" اس نے اس بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس نے پیدائش کے وقت کوئی پس و پیش نہ کی تھی۔

"ناممکن، اس بچہ کو تو اٹلی کی ایک فرم کے پاس بیچنا ہوگا۔" ڈینیل نے کہا۔

"بس تم تو اسی پھیر میں رہتے ہو، بانٹے کہیں گے۔" اگاستینو بولا۔

اس وقت ڈینیل کی چھوٹی لڑکی ونترا کی آواز سنائی دی — "ابا کوئی تم سے بات کرنا چاہتا ہے"۔ لیکن ڈینیل نے اس بار بھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ابھی تک اپنے سوروں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ اس نے گھر والوں کو متنبہ کر رکھا تھا کہ جب وہ کام کر رہا ہو تو کوئی بھی مخل انداز نہ ہو، اس نے ڈبے میں گھاس کی تہ جمائی۔ اور بڑی احتیاط سے سور کے بچوں کو وہاں رکھ کر کمبل کے ایک ٹکڑے سے ڈھانپ دیا۔ اتنے میں اس کی بڑی لڑکی سلویا کی آواز کان میں پڑی — "ابا کوئی تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے"۔

ایک لمحہ کے بعد سلویا کیتھرینا کو لئے سور خانے میں آئی، کیتھرینا لارنس کی رہنے والی ایک بوڑھی عورت تھی، جو دیر سے یہاں مقیم تھی، نئے کپڑے سینے کے بجائے مرمت کا کام زیادہ کرتی۔ کیتھرینا کو دیکھتے ہی ڈینیل اپنی لڑکی پر برس پڑا ——— "کیا تم اسی عورت کی خاطر گھنٹہ بھر سے میرا دماغ چاٹ رہی تھیں۔

کیتھرینا کو یہ مرض تھا جو کچھ کہنا ہوتا، فی الفور نہ کہتی

"کیتھرینا تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے"! سلویا نے باپ کے غصہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا، پھر وہ اکتاہٹ کے ساتھ ڈینیل اور کیتھرینا کو تنہائی میں چھوڑ کر مکان کی طرف چلی گئی۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں اپنی مزدوری کے علاوہ کسی اور کام سے واسطہ نہیں رکھتی" کیتھرینا نے شروع کیا!

"مجھے تمہارے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں" ڈینیل نے روکھے پن سے جواب دیا

"لیکن آپ یہ تو جانتے ہیں، کہ مجھے تسوز میں رہتے ایک زمانہ ہوگیا ہے۔ لیکن میں نے کبھی کسی کے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا"

"مجھے اس سے کیا؟" ڈینیل گھر کا رخ کرنے لگا۔

جونہی کیتھرینا نے دیکھا کہ ڈینیل اس کی باتوں پر کان نہیں دھرتا۔ اس نے تمہید چھوڑ دی اور مطلب کی بات کہنے لگی۔

"ایک اطالوی میرے پاس آیا تھا۔ وہ مجھے جاسوس بن جانے کی ترغیب دے رہا تھا۔"

ڈینئل جون کا توں کھڑا رہ گیا۔

کیٹرینا نے ایک گہری سانس لی۔ اور اس اطالوی کی باتیں کرنے لگی جس سے ایک مرتبہ لوکارنو کے دفتر میں اتفاقاً اس سے ملنا ہوا تھا۔

"تم مدت سے تسنو میں رہتی ہو" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "اور یہاں کے ہر آدمی سے واقف ہو۔ اپنے پیشے کی بدولت تمہیں ہر جگہ آنے جانے کا موقع بھی میسر ہے۔ سینکڑوں گھروں میں تمہارا آنا جانا ہے، اور ہزاروں قسم کی باتیں سنتی ہو۔ اور پھر تم بوڑھی ہو، اور تمہاری موجودگی میں لوگ آپس میں باتیں کرنے سے یقیناً ہچکچاتے نہ ہوں گے۔"

"ٹھیک ٹھیک" میں نے جواب دیا۔ "ہر کوئی میری عزت کرتا ہے کیونکہ میں ہمیشہ اپنے ہی کام سے کام رکھتی ہوں۔" وہ اطالوی بولا۔ "اگر تم اس علاقے کے فاشیت کے دشمنوں کی سرگرمیوں کے بارے میں خبریں مہیا کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لو تو بڑھاپے میں بڑھاپے میں محنت اور مشقت کی مصیبت سے چھوٹ جاؤ گی۔"

ڈینئل نے گہری نظروں سے کیٹرینا کو دیکھا جو بات چیت کے دوران میں سسک اور ہانپ رہی تھی۔ "تم یہ داستان سنانے میرے پاس کیوں آئیں؟"

"آپ کا مطلب؟"

"میں ایک تسنوی ہوں اور مجھے تمہارے اطالوی فقیروں سے کوئی سروکار نہیں، تمہیں میرے پاس کس نے بھیجا؟"

"آپ مجھے تیس سال سے جانتے ہیں" عورت نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ایک باعزت طریقے پر روٹی کماتی ہوں —— اپنے کام سے مطلب رکھتی ہوں ......"

"میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں" ڈینئل نے طیش میں آکر کہا۔ "کہ تمہیں میرے

پاس کس نے بھیجا؟"

"آپ مجھے تیس سال سے جانتے ہیں" عورت نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "آ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ایک باعزت طریقے پر روٹی کماتی ہوں ——— اپنے کا مطلب رکھتی ہوں........"

"میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں" ڈینیل نے طیش میں آکر کہا۔ "کہ تمہیں میرے پاس کس نے بھیجا؟"

"کسی نے بھی نہیں" کیٹرینا نے جواب دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میری وجہ سے پریشانی ہوئی...... اب میں آپ سے کچھ نہ کہوں گی" وہ جانے کے لئے مڑی۔ ایک دو منٹ بعد ڈینیل نے بھی سور خانے سے نکل کر سڑک پر درزن کے پاس پہنچ گیا۔

"اگر تمہیں کسی نے نہیں بھیجا تو تم میرے پاس کیوں آئیں؟"

"میں تو محض مشورہ لینا چاہتی تھی" کیٹرینا نے چلتے چلتے سامنے دیکھتے ہوئے کہ

"کیسا مشورہ؟"

"یہی نا کہ اطالوی کی پیش کش کو منظور کروں یا نہ" کٹرینا رک گئی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؛ ساری زندگی میں مجھے کبھی ایسی پریشانی نہیں ہوئی۔ اگر میں مخبری کر دو تو تھوڑے بہت پیسے تو میرے ہاتھ ضرور لگ جایا کریں گے۔ لیکن اس طرح میں ان لوگوں ک حق میں برائی کروں گی۔ جنہوں نے کبھی مجھے شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ اگر صاف انکار کر تو میرا نام فاشیت کے مخالفوں کی فہرست میں لکھا جائیگا۔ اور ہر ممکن طریقے سے مجھے ایذا پہنچائی جائیگی۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ نہ میں فاشی ہوں اور نہ فاشیوں کی مخالف۔"

ڈینیل کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

کیٹرینا سسکیاں لیتی ہوئی چلی گئی۔ ڈینیل بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ سڑک کے موڑ پر اگاستینو ملا۔ "سنو! میری بات سنو!" ڈینیل بولا۔ "گھبراؤ بالکل مت۔ بلکہ بیمار

واقعہ اگا سٹینو کو سناؤ، اور اس کی ہدایت پر عمل کرو۔"

ڈینیل خاموشی سے کھڑا ان دونوں کو دور جاتے دیکھ رہا تھا، پھر گھوما، اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا اپنے سورف شلے میں جا پہنچا۔

ایک روز ڈینیل اور اس کی لڑکی سلویا اپنی انگور کی بیلوں میں کام کر رہے تھے کہ اگا سٹینو آ نا دکھائی دیا۔ سورنی کی جانے کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔

ڈینیل اپنا خالی وقت انگور کی بیلوں کو کیڑوں کے حملے سے بچانے میں صرف کیا کرتا تھا۔ اس وقت وہ دھات کے ایک برش سے کرم خوردہ مقامات تلاش کر رہا تھا۔ اور سلویا ان پر کھولتا ہوا پانی ڈال رہی تھی۔ اگا سٹینو اینٹوں سے بھری لاری چلاتا ہوا آیا اور لاری کو روکتے ہوئے کہا۔ "ارے بھئی وہ کام ہو رہا ہے"!

"کونسا کام؟" ڈینیل کی سمجھ میں نہ آیا

"تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو۔" اگا سٹینو نے ہاتھ ہلایا۔ اور پھر آہستہ آہستہ موٹر کو ڈھلوان پر چھوڑ دیا۔ ڈینیل نے اپنا سر بات کو سمجھ کر ہلا دیا۔

بہت دنوں سے سلویا کے دل میں ایک بات تھی۔ آج اس نے ہمت کر کے کہہ ڈالی "ابا مجھے علم ہے کہ تم اٹلی کی آزادی کے لئے بڑا کام کر رہے ہو۔ گرچہ تم کبھی اس سلسلے میں بات نہیں کرتے۔ میں بھی تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔"

"ان ٹہنیوں کو اکٹھا کرو اور جلادو۔" اس کے باپ نے جواب دیا۔ "فی الحال تمہارے لئے یہی بہت کام ہے۔"

سلویا نے حکم کی تعمیل کی۔ ڈینیل اسے انگور کی بیلی جالوں کے زیر سایہ واپس جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ابھی نومبر ہی میں گھر والوں نے سلویا کی بیسویں سالگرہ منائی تھی۔ باپ اپنی بیٹی کو فخر اور خوف کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ سلویا اس کے خزانے کا ایک بیش بہا لیکن ایسا موتی تھی۔ جسے زیادہ عرصے کے لئے تیغے میں نہ رکھا جاسکے۔

تھوڑے دنوں کے بعد ایک اتوار کی صبح کو ڈینیل کی ملاقات اگاستینو سے ہوئی۔ ڈینیل اور فلومنا ایک لومڑ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ جس نے راتوں کو چپکے چپکے آس پاس کے قصبوں کے سینکڑوں چوزوں کو پھاڑ ڈالا تھا۔

"قریب قریب پچاس چوزوں کی گردنیں ٹوٹی پڑی تھیں"۔ بیوی بولی۔

"اگر چوزوں کی گردنیں ٹوٹی ہوئی پائی گئیں، تو پھر وہ لومڑ نہیں نیولا ہوگا"۔

اتنے میں کیڈنازو کا ایک موٹر ڈرائیور بھی آ پہنچا۔ اس کی رائے دریافت کی گئی۔ "نہیں وہ لومڑ تھا"۔ وہ کہنے لگا۔ "اور بہت ممکن ہے کہ ایک سے زیادہ ہوں۔ اور ایک ڈربے سوائے دم کے بالوں کے اور کچھ رہا ہی نہیں"۔

"ہمیں اپنے چوزوں کے متعلق خبردار رہنا چاہئے"۔ فلومنا نے اپنے شوہر سے کہا۔ "گزشتہ سال تو بیماری نے مرغی خانے کا صفایا ہی کر ڈالا تھا"۔

"ہم پھندے لگائیں گے"۔

عین اسی وقت اگاستینو بھی پہنچ گیا۔ وہ ڈینیل کو علیحدگی میں لیجا کر بولا۔ "بات یہ ہے۔ کسٹر نیا نے میرے کہنے کے مطابق عمل کیا۔ اب شکار دام میں پھنسا سمجھو۔ اب ہمیں چوکنا رہنا چاہئے"۔

"تمہارا کیا خیال ہے"۔ ڈینیل نے جوش کے ساتھ پوچھا۔

"ہمیں موقعہ سے فائدہ اٹھا کر جال بچھا دینا چاہئے"۔

لفظ جال پر ڈینیل ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ اس بات چیت میں یہی ایک ایسا لفظ جو فلومنا نے سن پایا۔ اور اپنے شوہر سے کہنے لگی۔ "صرف جال کافی نہیں ہو سکتا۔ لومڑ بڑ ہوشیار ہوتا ہے۔ شکار پر جھپٹنے سے پیشتر احتیاط سے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر بھی ایکا ایکی نہیں ٹوٹ پڑتا۔ بلکہ کوشش یہ کرتا ہے کہ شکار خود اس کی طرف کھسکے۔ لوہے کے پنجرے سے بے شک کام چل سکتا ہے۔ مگر اچھا ہے کہ کوئی کھانے کی چیز بھی زہر آلود کر کے

کھ دی جائے۔" فلومنا کی بات خاک بھی اگاستنو کی سمجھ میں نہ آئی

"لیکن زہر کے اثرات کے متعلق بھی تو یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" ینئل نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ "اگر لومڑ معمول سے زیادہ بھوکا ہو تو وہ کسی خوردنی شئی ے چھوٹے موٹے ٹکڑوں کو خاطر میں بھی نہیں لائیگا۔ اور اگر بالفرض تمہارے رکھے ہوئے ہریلے گوشت کا ایک آدھ ٹکڑا نگل بھی جائے تو کیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ ایک لومڑ کے ارنے کے لئے کتنا زہر درکار ہوگا۔ اگر لومڑ خوب موٹا تازہ ہو تو زیادہ سے زیادہ اس کے پیٹ یں مروڑ اٹھے گا۔ اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو اسے شکار پر حملہ کرنے سے باز رکھ سکے۔ بلکہ مروڑ ے بعد اسے قے ہو سکتی ہے۔ اور اس کی بھوک زیادہ بڑھ جائیگی۔"

"دوسرے لفظوں میں لومڑ کو پکڑنا ناممکن ہے۔" آخر اتنی دیر کے بعد اگاستنو میاں بیوی کی بحث کی تہہ تک پہنچ گیا۔

"ناممکن نہیں، البتہ محال ہے۔" ڈینئل نے جواب دیا۔ "اور آج تک کسی نے لومڑ کو صرف باتیں بنا کر نہیں پکڑا۔"

فلومنا واپس گھر چلی گئی۔ اور دونو باتیں کرنے کے لئے باغیچہ کی جانب چل دئے۔

"بڑی چالاکی سے کمٹرنیا کو کام کرنے پر آمادہ کیا ہے۔" اگاستینو بولا۔ "اطالوی جاسوس کل پھر اس سے ملا تھا۔ اور اس کے پاس پلانزا کا ایک پتہ چھوڑ گیا ہے کہ جب کوئی خبر ملے تو فوراً اس پتے سے روانہ کر دے۔"

"اس نے کسی خاص شخص کی خبرگیری کرنے کے لئے تو نہیں کہا۔"

"اس نے اسے ان تمام اطالوی مزدوروں کے نام کا کھوج نکالنے کی ہدایت کی ہے، جو روزانہ سرحد پار کرنے اور سیاسی جلاوطنوں اور پناہ گزینوں سے ملتے جلتے ہیں علاوہ ازیں اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر تم ان لوگوں کا سراغ لگا لو جو انقلابی کتابیں اور پمفلٹ چھاپ کر سوئٹزرلینڈ سے اٹلی میں لاتے ہیں تو تمہیں خوب انعام دیا جائیگا۔"

"اس نے کسٹرینا سے یہ تو نہیں کہا کہ فلاں شخص مشتبہ ہے؟" ڈینیل دریافت کیا۔

"ابھی تک تو نہیں، اس نے کیسٹرینا سے وعدہ کیا ہے کہ اگر یہاں اسے کوئی خطرہ پیش آئی تو پھر زیوریچ میں اس کے رہنے کا انتظام کر دیا جائیگا۔"

"کیسٹرینا کو یہ شک تو نہیں کہ میرا الماری انقلاب پسندوں سے کوئی تعلق ہے" ڈینیل نے پوچھا۔

"بالکل نہیں" اگاسٹنو نے اسے یقین دلایا "اس سے جب کبھی بھی ملتا ہوتا۔ بیچاری یہی کہتی ہے کہ میں کب کسی کے معاملات میں دخل دیتی ہوں۔ اور یہ سائنو ئیز شریف الطبع انسان ہیں۔ اور انہیں اٹلی کی سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں"

سلویا نے اپنے والد کو اگاسٹنو سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔

"کیا میں آسکتی ہوں؟" لڑکی نے اجازت چاہی۔

"کیوں نہیں"

سلویا باغیچے میں آگئی۔ اسے دیکھ کر دونوں نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ اور موسم متعلق باتیں کرنے لگے۔

ہر شام ڈینیل لوہے کا پنجرہ لگا دیتا اور زہریلا گوشت مرغی خانے کے باہر رکھ مگر کبھی لومڑ نہ پھنسا۔ اسی طرح اگاسٹنو والا لومڑ بھی کچھ ایسی جلدی جال میں پھنستا نظر نہ آتا تھا۔ کم از کم ڈینیل کی تو یہی رائے تھی۔

"ایک کسان کی زندگی ایک مسلسل جدوجہد ہے" وہ اکثر کہا کرتا "خراب موسم کے خلاف وباؤں اور نباتاتی آفتوں کے خلاف ــــ اور سب سے زیادہ لومڑوں کے خلاف"

انگوروں کے کیڑوں کو مارنے کی مہم ختم ہو چکی تھی چنانچہ ڈینیل اپنا زیادہ وقت پھلدار درختوں کی دیکھ بھال میں صرف کرنے لگا۔ اس نے گلی سڑی شاخیں چھانٹ ڈا

سوکھے ہوئے پتے صاف کر دئے۔ جلویا نے ایک تار کے ٹکڑے کی مدد سے تمام کیڑے مار ڈالے جب یہ سب کام ہو چکا تو فلومنا نے درختوں کے تنوں پر چونا ڈال دیا۔

"اب کیڑے مکوڑوں سے تو نجات مل گئی۔ لیکن آسمانی آفات سے پیچھا کیونکر چھوٹے" ڈینیل نے اپنی لڑکی سے کہا۔ اگاستنو دروازے میں کھڑا ڈینیل کے انتظار میں سلویا سے یونہی مذاق کرنے لگا۔

"کہو کیا خبر ہے، اگاستنو؟"

"پھندا لگا دیا گیا ہے۔" اگاستنو نے جواب دیا۔

"اور لومڑ؟"

"آج رات پکڑ لیا جائیگا۔"

"کاش سارے لومڑوں کی بابت یہی کہا جا سکتا۔"

اگاستنو نے لومڑ کو پکڑنے کے مجوزہ طریقے کی تفصیل بیان کی۔ "کرڑیتا نے اسے خط لکھ دیا ہے۔ کہ ایک ضروری معاملے کے متعلق تم سے بات چیت کرنا ہے اس نے اس سے آج رات نو بجے ریوا پیانا میں جھیل کے کنارے پرانے گرجا گھر کے پیچھے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ میں اور دو ایک اور وہاں پہنچ جائیں گے۔

"پولیس کو اطلاع تو کر دی جائے۔ کیا خیال ہے؟"

"اونہہ یہ تو کم عقلی ہو گی۔ اطالوی قونصل کو فوراً خبر ہو جائے گی۔ اور پھر ظاہر ہے کہ لومڑ دام میں آنے سے رہا۔"

ڈینیل لاجواب ہو گیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پولیس میں فاشی عنصر موجود ہے اسے پریشانی ہو رہی تھی کہ اس قضیے کے بعد اطالوی پناہ گزینوں پر نزلہ گرنے کا احتمال تھا۔

"یہ کام تستو کے لوگوں کے ہاتھوں انجام پائے تو بہتر ہے" اس نے کہا۔

اگاستنو نے اعتراض کیا۔ "اس طرح ضرورت سے زیادہ لوگوں کو ہمراز بنانا پڑے گا۔"

علاوہ ازیں اطالوی لومڑ کے لئے اطالوی شکاری ہی زیادہ موزوں رہینگے۔"

اسی شام ڈینیل ریل سے لوکارنو چلا گیا۔ تقریباً دس بجے شب وہ جھیل کے کنارے سیلگی کی جانب ٹہل رہا تھا۔ وہ اگاستنو کے انتظار میں تھا۔ جسے حادثہ کی تفصیلات سے آگاہ کرنے کی غرض سے آنا تھا۔ اگاستنو نہ آیا۔ اس کی اطالوی رفیق کار لوکا آگئی۔

"اگاستنو کا ہاتھ معمولی سا زخمی ہو گیا ہے۔ وہ آیا اس لئے نہیں کہ خواہ مخواہ لوگوں کا دھیان اس کی پٹی کی طرف جاتا ہے۔"

ڈینیل کو اپنے دل کی حرکت رکتی محسوس ہوئی۔ "اور جاسوس؟" اس نے پوچھا۔

"اسے وہیں بہنے دیا گیا۔ وہ مقررہ مقام پر دو دوسرے آدمیوں کے ہمراہ پہنچ گیا تھا۔ ہر کے ساتھی اسے اور کیسٹرنیا کو باتیں کرتے چھوڑ کر ایک گھنٹہ میں آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ ہم لوگ بھی گرجا گھر کی اوٹ میں تھے۔ وہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے اسی اثنا میں کیسٹرنیا نے ادھر ادھر کی بے معنی باتیں جاسوس سے کہہ ڈالیں۔ لگتا ہے لگتا ہے اسے یہ بھی بتاتی رہی کہ مجھے دوسروں کے معاملات میں دخل دینے سے کیا مطلب بس مجھے تو صرف یہ پتہ ہے کہ انقلابی کتابیں اور اخبارات وغیرہ فرالسکن کی خانقاہ واقع لوکارنو سے خفیہ طور پر اٹلی بھیجے جاتے ہیں۔"

کیسٹرنیا کی اس کامیاب دماغی اختراع پر ڈینیل نے قہقہہ لگایا۔

"اگاستنو نے ہم سب کو گرجا کے عقب میں چھوڑا اور خود ان کی جانب چلا۔" لوکا نے پھر داستان شروع کی۔ "یہ طے پا چکا تھا کہ اگاستنو کو تب اپنا ریوالور نکالنا چاہئے جبکہ جا کسی ہتھیار کے استعمال میں پہل نہ کرے۔ اگاستنو نے یوں ظاہر کیا کہ گویا وہ اتفاقاً اس راستے سے گزر رہا ہے۔ اندھیرے کی وجہ اس نے سگریٹ سلگانے کے بہانے ماچس جلائی اور اس کی روشنی میں جاسوس کو پہچان کر چلایا۔ اوہ یہ تو دیکھی بھالی صورت معلوم ہوتی ہے۔ ہوں: تم تو اطالوی جاسوس ہو۔" اگاستنو نے سگریٹ پھینک دیا۔ اور دست

دست لڑائی شروع ہو گئی۔ ہم بھی کمین گاہ سے نکل آئے۔ اور کنشرنیا بھاگ گئی۔

"کیا تم بھی لڑائی میں شامل ہوئیں؟"

"اس کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ ہم صرف یہ دیکھتے رہے کہ کوئی آ تو نہیں رہا۔ بہت جلد گاستنو نے اسے پچھاڑ لیا اور اس کے سر کو اس زور سے پٹخا کہ اگر پتھر بھی ہوتا تو ٹوٹ جاتا گاستنو کی جسمانی طاقت سے تو ہم واقف تھے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ اس میں اس قدر نفرت بھی ہے۔"

"جانتی ہو کہ فاشی اس کے بھائی کو قتل کر چکے ہیں۔" ڈینیل نے کہا۔ "اس نے اپنا ہاتھ کیسے زخمی کر لیا؟"

"جاسوس نے کاٹ کھایا۔ نہ جانے کس طرح اگاستنو کی بائیں کلائی تک اس کے دانت پہنچ گئے پہلے اگاستنو نے اس کے جبڑوں کو دبایا۔ لیکن اس نے کلائی نہ چھوڑی آخر جب اس کا گلا گھونٹ ڈالا۔ تب کہیں خلاصی پائی۔"

"تو کیا اس نے جاسوس کو جان سے مار ڈالا ہے۔" ڈینیل نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

"تو اگاستنو کو فوراً روپوش ہو جانا چاہیے۔ بہتر تو یہ ہے کہ فرانس چلا جائے۔"

صورت حال کے پیش نظر ڈینیل نے رات نوکارنو ہی میں گزاری۔ مگر علی الصباح بلزونا چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس خیال سے کہ کہیں گھر والے پریشان نہ ہوں۔ اس نے ایک قریبی قہوہ خانے سے اپنے مکان پر ٹیلیفون کیا۔

"ابا میں گھنٹہ بھر سے تمہیں ہر جگہ فون کر رہی تھی۔" سلویا کی آواز سنائی دی۔

"کیا بات ہے؟" ڈینیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہمارے ہاں تو خیریت ہے۔ گورڈووالا والی سڑک پر دو موٹروں کا تصادم ہو گیا۔ اور ک آدمی بری طرح زخمی ہوا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اس کی حالت اتنی خطرناک ہے کہ اسے کہیں دور لے جانا مکن ہے۔ سب ینڈ سیبل نے بتائی دی کہ صرف ہمارا ہی مکان ہے جہاں زخمی کو عارضی طور

پر رکھا جا سکتا ہے۔ اماں کہتی تھیں کہ تمہاری غیر موجودگی میں ہمیں کسی اجنبی کو اپنے مکان میں داخل نہیں دینا چاہیئے۔ لیکن میں نہ مانی۔ میں نے کہا، ابا کبھی ایسے موقعہ پر انکار نہ کریں گے۔"

"بے شک ...... لیکن تم نے اسے کہاں رکھا ہے؟"

"میرے کمرے میں۔ میں لوئزا کے پاس سو رہوں گی"

"کیا اس کی حالت واقعی خطرناک ہے؟"

"کہہ نہیں سکتی۔ ڈاکٹر نے ایک نرس کو بھیجا ہے۔ اگرچہ اس کی دیکھ بھال کے لیے میں نے اپنی خدمت پیش کی تھی۔"

"وہ رہنے والا کہاں کا ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟"

"وہ اب تک بے ہوش پڑا ہے۔ غالباً امیر گھرانے سے ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر اماں کو پیشگی ہی روپیہ دے دیا تھا۔"

"اچھا سنو!" ڈینیل نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آج رات میں نہیں آسکتا۔ رات کو تو میں لوکارنو ہی میں رہونگا صبح ایک ضروری کام سے بلزونا جاؤں گا۔ تم جانتی ہو، کہ میں تم پر کتنا اعتماد کرتا ہوں۔ جو ڈاکٹر کہے وہی کرو، اور خوشی سے کرو۔"

دوسری صبح پھر ڈینیل نے گھر پر ٹیلیفون کرکے دریافت کیا کہ زخمی زندہ ہے یا نہیں؟ سلویا اس وقت سودا سلف خریدنے بازار گئی ہوئی تھی۔ اس کی بجائے لوئزا نے جواب دیا: "بیچارہ پہلے کی نسبت کچھ اچھا ہے کل رات ایک نرس آگئی تھی لیکن سلویا بھی رات بھر جاگتی رہی —— ڈاکٹر بھی تھوڑی دیر ہوئی آگیا ہے۔"

ڈاکٹر نے ٹیلیفون کا رسیور لوئزا سے لے لیا۔

ڈینیل بولا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ میرے مکان کو جس طرح چاہیں استعمال میں لا سکتے ہیں۔ مجھے ایسے موقعہ پر گھر سے اپنی عدم موجودگی کا بہت افسوس ہے۔"

"مجھے امید ہے کہ مریض اچھا ہو جائیگا۔ اس کے سر میں شدید چوٹیں آئی تھیں مگر لیف بڑھ جانے کا اندیشہ نہیں۔ جو بھی خرچ ہوگا آپ کو ادا کر دیا جائیگا۔"

"آپ جانتے ہیں۔ یہ شخص کون ہے۔ کہاں کا رہنے والا ہے؟"

"بولزنو کا رہنے والا ایک اطالوی انجینئر ہے۔ امبرٹو سٹیلا نام ہے۔ شاید آپ نے ہی سنا ہو، وہ یہاں برفیات کے مطالعہ کی غرض سے آیا ہوا تھا۔"

"بہر حال وہ کوئی بھی ہو آپ بیرگھر سے ہر قسم کی مدد لے سکتے ہیں۔"

بیلونیزونا پہنچتے ہی ڈینیل نے یہ پتہ لگانے کی کوشش کی کہ گزشتہ شب کے اقدام ل کے متعلق پولیس نے کہاں تک تحقیقات کی ہے، وہ اتنا ہوشیار تھا کہ خود بات نہ چھیڑتی ہتا تھا۔ بلکہ اس انتظار میں تھا کہ کوئی بات کرے چنانچہ وہ اپنے قانونی مشیر کے پاس پہنچا اور متعدد اہم معاملات کے تصفیہ کی خاطر اس کے ہمراہ عدالت تک چلا گیا۔ راستے میں جو واقف لوگ ان کے ساتھ اچھی طرح باتیں کیں دو روزنامے خریدے۔ لیکن کسی میں بھی اس حادثے کے تعلق ایک لفظ نہ تھا۔ ظاہر تھا کہ بیلزونا میں سبھی اس سے بے خبر تھے۔

آخر ہمت کر کے اس نے اپنے وکیل سے کہا "میں نے سنا ہے کہ رات لوکارنو کے یب اطالویوں میں سیاسی اختلاف کی بنا پر کچھ جھگڑا ہو گیا ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔ یہاں تو کوئی ایسی خبر نہیں ملی۔ کوئی خاص بات نہ ہوگی۔ کیونکہ معاملہ اہم ہوتا تو یہاں ضرور اطلاع ہو جاتی۔ یہاں فاشی اور ان کے مخالفین کے تعلقات نہایت کشیدہ ہیں۔"

ڈینیل سخت پریشان تھا۔ مگر وکیل کے اس جواب سے مطمئن ہو گیا، اور اسے ین ہو گیا کہ لوکا نے بات کا بتنگڑ بنایا ہے۔ جب وہ واپس ہوا تو گاڑی میں چند کسان کے متعلق باتیں کر رہے تھے جس نے میگڈونیو کے مقام پر مرغی پر حملہ کیا تھا۔

"لومڑ بہت عیار ہوتے ہیں ــــ انسان اور اس کے پھندے سے کہیں زیادہ۔"

ایک کسان بولا۔

"بھئی ایک نئی قسم کا پھندا دیکھنے میں آیا ہے ——— ایک اطالوی ایجاد ہے۔"

دوسرے نے کہا۔

"یہ پھندا بہت شور مچاتا ہے ——— کسی کام کا نہیں۔" پہلے نے جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک کہتے ہو۔" ڈینیل بھی گفتگو میں شامل ہو گیا۔ "ہاں شور تو بہت کرتا ہے اور کام کا بھی نہیں۔"

گھر میں داخل ہوتے ہی ڈینیل مجروح کی مزاج پرسی کے لئے اس کمرے کی طرف چلا۔ دروازے پر سلویا راستہ روکے کھڑی تھی۔ اس نے انگلی لب پر رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا

"اسے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔" لڑکی نے دبی آواز میں کہا۔ "ڈاکٹر کہتا ہے کہ اس کے پاس کوئی نہ جائے۔"

"گویا میں اس وقت اس کی تیمارداری نہیں کر سکتا۔" ڈینیل نے مایوس ہو کے کہا۔

"نیچے جانے سے پہلے جوتے اتار لو تاکہ تمہاری آہٹ اسے پریشان نہ کرے" سلویا نے سرگوشی میں کہا۔

ڈینیل نے جوتے اتار لئے۔ اور خاموشی سے باغ میں چلا گیا اور کلہاڑے سے کھیت کی باڑھ کے لئے لکڑی پھاڑنے لگا۔ اس نے کام شروع کیا ہی تھا کہ سلویا دوڑی آئی۔

"ابا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ گھر میں مریض پڑا ہے اور تم اتنا غل کر رہے ہو۔"

ڈینیل نے کلہاڑا ایک طرف رکھ دیا۔

"اچھا میں کھدائی تو کر سکتا ہوں۔" اس نے کہا

سلویا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور گھبرائی ہوئی واپس چلی گئی۔

ڈینیل اپنا بیلچہ اٹھا کر باغیچے میں روشیں ہموار کیں، کیاریاں درست کرنے لگا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس نے سلویا کو ٹوکری ہاتھ میں لئے گھر سے نکلتے دیکھا۔ وہ اکیلی

باغیچے سے نکل کر چپکے سے زینے پر چڑھ گیا۔ دروازے پر پہنچتے ہی نرس نظر آئی اس سے چند منٹ کی اجازت لیکر وہ کمرے میں گیا۔ اسے سلویا کے بستر میں ایک بہت بڑا سر پٹیوں سے بندھا ہوا نظر آیا۔ اس کا ذہن اس وقت کسی برفانی انسان کا تصور کئے بغیر نہ رہ سکا — ایک بڑا سفید سا گولا جس میں ایک سوراخ آنکھ کے لئے اور دو اور چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔

"معاف کیجئے۔ کافی وقت ہو چکا ہے۔" نرس نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ڈینیل ہاتھ میں جوتے اٹھائے نیچے آ رہا تھا کہ اسے سلویا ملی: "آپ کہاں گئے تھے؟" اس نے کسی قدر تیز ہو کر کہا۔

"باپ سے بات کرنے کا یہی سلیقہ ہے؟" ڈینیل نے جواب دیا، اور فوراً باغیچے میں جا کر دوبارہ زمین کھودنے لگا۔ اتنے میں اس کی بیوی آ پہنچی اور بولی: "سلویا تو شاید ہوش کھو بیٹھی ہے۔ کل سے تو اس نے نہ کچھ کھایا ہے۔ اور نہ ایک لمحہ سوئی ہے۔"

"وہ دل کی بڑی اچھی ہے۔"

"مگر کچھ ضرورت سے زیادہ۔" ماں نے جواب دیا۔

"ضرورت سے زیادہ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

ڈینیل اپنی بیٹی سے بڑا خوش تھا۔ اور اسے فخر اور خوف کی نظروں سے دیکھتا۔ دیوار کے ساتھ باغیچے سے اس طرف نئے نئے گلاب کھل رہے تھے۔ سلویا آئی۔ اور گلاب کے کچھ پھول توڑ کر مریض کے کمرے کی جانب جانے لگی۔ "لیکن وہ انہیں دیکھ تو سکتا ہی نہیں۔" اس کی ماں نے دھیمی آواز سے کہا۔

"اماں پھولوں کو آنکھیں بند کر کے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔" سلویا نے جواب دیا۔

ڈینیل نے اپنا زیادہ وقت انگور کے باغ میں صرف کیا۔ شام کے وقت واپس آ کر اس نے پہلا سوال مریض کی کیفیت کے متعلق کیا۔ سلویا نے اسے بتایا کہ وہ رو بصحت ہو رہا ہے

نرس کو موقوف کر دیا گیا تھا۔ اور اب خود سلویا اس کا کام کر رہی تھی۔ ڈینیئل ایک دو دفعہ تھوڑی دیر کے لئے مریض کے کمرے میں گیا۔ وہ خاصہ جسیم آدمی معلوم ہوتا تھا اگرچہ ڈینیئل عموماً سارا دن مصروف رہتا تھا۔ تاہم سلویا کی طبیعت میں تبدیلی کا غور سے مطالعہ کر رہا تھا۔

"دوسرے کام تو ہوتے رہیں گے۔ ذرا اپنی بیٹی کی خبر لو۔" ایک شام فلومنا نے غصے سے اپنے شوہر سے کہا۔

"سلویا اب بچی نہیں رہی۔ خاصی سمجھدار ہو گئی ہے۔"

"سمجھدار ہے۔ مگر ناتجربہ کار بھی۔"

ڈینیئل کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ "کیا تمہاری رائے ہے کہ اس سے کچھ کہوں۔"

"ہاں! ضرور اور فوراً۔"

دوسرے روز ڈینیئل کو کچھ مٹر لیکر گاما میں ایک دوست کے گھر جانا تھا وہ سلویا کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ میزبان کے اصرار کے باوجود وہ زیادہ دیر ٹھہر نہ سکا۔

دونوں باپ بیٹی چپ چاپ واپس لوٹے۔ سڑک ندی سے اوپر بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی اور اس کا پانی اچھل اچھل کر نیچے وادی میں گر رہا تھا۔

"ندی کے ساتھ ساتھ کیوں نہ چلیں۔" سلویا بولی۔

"کیا ضرورت ہے۔" ڈینیئل نے جواب دیا۔

وہ ایک سیڑھی ایسی پگڈنڈی سے نیچے اترنے لگے۔ اور ادھر ادھر گھوم کر ایسے مقام پر پہنچ گئے۔ جہاں ندی چٹان کی دیوار سے ٹکرا رہی تھی۔ پانی اس قدر شفاف تھا کہ تہ میں پڑے ہوئے سنگریزے بھی صاف نظر آ رہے تھے۔

"کیسے خوبصورت سنگریزے ہیں۔" سلویا نے کہا۔

"یہ سنگریزے نہیں مچھلی کے انڈے دینے کی جگہ ہے۔" باپ نے وضاحت کی۔ "ستمبر کی آخر میں مچھلیاں دریا کے منبع کی طرف چلی جاتی ہیں۔ وہ مچھلیاں انڈے دینے کے لئے کسی

یتلی محفوظ جگہ کی تلاش کرتی ہیں۔ وہ اپنی دم کی مدد سے سنگریزوں کو ریت سے کال پھینکتی ہیں۔ اور ان کی جگہ انڈے دے دیتی ہیں۔"

"اچھا! مچھلیوں کی پیدائش کا یہ طریقہ ہے۔"

"پھر مچھلیاں انڈوں پر ریت کی ایک موٹی دودھیا تہہ جما دیتی ہیں۔ چند روز کے بعد انڈوں میں سے بچے نکلنے لگتے ہیں۔"

سلویا حیرانی سے اس ریت کے بچھے ہوئے ٹکڑے کو دیکھنے لگی۔ جہاں یہ حیرت نگیز عمل ہوتا ہے۔

راستے بھر میں ان کے درمیان بس یہی گفتگو ہوئی۔

"تم نے اس سے کچھ کہا تھا؟" ڈینیل کی بیوی نے اس سے دریافت کیا۔

"ہاں۔"

"تو پھر؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

ایک دن انجینئر پہلی بار اپنے کمرے سے نکلا۔ اور باغیچہ میں کرسی پر جا بیٹھا۔ کیٹرینا اور ڈینیل بھی ادھر آ نکلے۔ انجینئر نے سلویا کو پکارا۔ "محترمہ سلویا۔"

کیٹرینا کے کان میں یہ آواز پہنچی تو اس کے پاؤں وہیں جم گئے۔ اس نے ان جھاڑیوں میں سے جھانک کر دیکھا جو باغ اور سڑک کے درمیان حائل تھیں۔ "مسٹر ڈینیل" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "یہ آدمی تو وہی جاسوس ہے جس کے متعلق میں نے تم سے کہا تھا۔"

"دیوانی تو نہیں ہو رہی۔" ڈینیل نے جواب دیا۔ اس نے اسے بتایا کہ کس طرح اس کی غیر موجودگی میں وہ شخص زخمی ہو کر مکان میں لایا گیا۔ کیٹرینا نے دوبارہ بغور انجینئر کا جائزہ لیا جو ہنس ہنس کر سلویا سے باتیں کر رہا تھا۔

"ہاں۔ ہاں وہی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے دیکھ لے میں جا رہی ہوں۔"

ڈینیل کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ "اچھی بات ہے۔ تم ذرا اگاستو سے کہنا کہ وہ کل اسی وقت یہاں آ سکے اور میں بھی اس بات کا دھیان رکھونگا کہ یہ آدمی اسے دیکھ نہ پائے۔"

تھوڑی دیر بعد سدیا آ گئی۔ اور باپ کو مخاطب کر کے بولی "مریض کی حالت بہت کچھ سنبھل گئی ہے۔ بہت اچھا ہو۔ اگر تم کسی وقت اس سے باتیں کرو تم اسے ضرور پسند کرو گے۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔"

ڈینیل نے اپنے دلی جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "ضرور دوپہر کو ہم سب کھانے پر اکٹھے بیٹھیں گے۔"

کھانے پر ڈینیل کی بری حالت تھی۔ جاسوس کو اپنے دونوں لڑکیوں کے درمیان دیکھنا اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ سر کے درد کا بہانہ کر کے وہ باہر چلا آیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر باغیچہ میں ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

"اخبار کیا کہتے ہیں؟" سول انجینئر نے کہا "میں نے تو ہفتوں سے اخبار نہیں پڑھا۔"

"ہر روز کوئی نہ کوئی حادثہ ہو جاتا ہے۔" ڈینیل نے جواب دیا۔ "ابھی کل فرانس میں ایک گاڑی الٹ گئی، اور سینکڑوں ہلاک ہو گئے۔"

"ہر روز کوئی نہ کوئی حادثہ ہو جاتا ہے۔" انجینئر نے ڈینیل کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا "لیکن زیادہ افسوسناک وہ طریقہ ہے۔ جس سے لوگ اپنے اپنے انجام سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ انہی سینکڑوں لوگوں کا خیال کرو جو کل کے حادثے میں مارے گئے۔ ان میں طالب علم تھے، کسان تھے، تاجر تھے، افسر تھے۔ ڈاکٹر تھے۔ وکیل تھے۔ وکیلوں کو خطاب حاصل کرنے کی دھن سوار تھی۔ افسر امیر لڑکیوں سے شادی کرنے کی سوچ میں ہونگے، ڈاکٹر خیال کی دنیا میں اپنے قصبہ کے صدر سے جھگڑ رہے ہونگے۔ اور طالب علم اپنی خریدی ہوئی ٹائیوں کے متعلق خواب دیکھ رہے ہونگے۔ اسی طرح سب اپنی اپنی علیحدہ گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ زندگی میں ہر شخص اپنی علیحدہ گاڑی میں سفر کرتا ہے، اور پھر ایک ہی جھٹکے

ساتھ وہ سب ایک ٹرین — موت کی ٹرین میں — سوار کر دئے جاتے ہیں۔ طالب علم کی تنگنائی کسان کے جوتے میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ کلاہ ساز کے نئے ماڈل دودِ آتش میں گم ہو جاتے ہیں۔ وہ سب ایک ٹرین میں بیٹھے تھے۔ اور انہیں ان سب پاؤں کا علم تک نہیں تھا۔"

"مگر ریلوے کے منتظمین موت کے پیدا کردہ اس اتحاد کو جلدی تباہ کر دیتے ہیں۔ قیمتی لباس والے لاشوں کو دوسری لاشوں سے الگ رکھ دیتے ہیں"۔ ڈینیل نے کہا۔

"مرنے کے بعد بھی انسانوں میں بیگانگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے؟" سلویا نے پوچھا

"انسان کی فطرت اور تقدیر اس کے ماحول کے درمیان ہمیشہ ایک خلیج ہے"۔ انجینئر کہنے لگا "جب میں موت اور زندگی کی کش مکش میں تھا تو مجھے ہر وقت یہی خیال رہتا ہم میں ہر شخص اپنی الگ گاڑی میں سفر کرتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم سب ایک ہی گاڑی میں سوار ہوتے ہیں"

"موجودہ سماج کی عمارت قطعی طور پر انسانوں کے باہمی اختلافات اور دشمنی کی بنیادوں پر کھڑی ہے"۔ ڈینیل نے کہا "یہ انسانوں کو اپنی محنت کے ثمر سے محروم کر دیتی ہے۔ ان کی محنت کی پیداوار ان کے دشمنوں کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ اور اس لحاظ سے پیداوار گویا خود پیدا کرنے والے کی دشمن ہے۔ بے جان اور بے روح چیزوں نے اتنی اہمیت اختیار کر لی ہے، کہ انسان کو ان کے سامنے سجدہ تک کرنا پڑتا ہے"۔

"کیا یہ سلسلہ ہمیشہ یونہی رہیگا"۔ سلویا نے پوچھا

"جب میں نوعمر تھا" مریض بولا "تو میں بھی ایسے سماج کا خواہاں تھا جو اس سماج سے مختلف ہو جس میں ہم آج کل زندگی بسر کر رہے ہیں"۔

ڈینیل اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا باغیچہ درست کرنے میں مصروف ہو گیا۔ موسم بہار نزدیک آ رہا تھا۔ اور اسے بہت کام کرنا تھا۔ اس نے برہمی کے عالم میں اپنی درانتی زمین میں پیوست کر دی اور پھر دائیں پاؤں کے بوجھ سے اس کا دستہ دبا دیا اور مٹی کا تودہ ایک طرف کھد

اور اس کے بعد فلومنا نے زمین کو ہموار کر دیا۔ باغیچے سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھنے لگی۔ اور ڈینیل کے مضطرب اور آزردہ چہرے پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے نمودار ہو گئے۔ مریض شام تک باغیچے میں ہی پڑا رہا۔ حتیٰ کہ بستی کے پُر امن آسمان پر تارے جھلملانے لگے۔

”برسوں سے میں نے آسمان کی طرف نہیں دیکھا“ مریض نے اپنے میزبانوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”چاند کی بھی ہماری طرح ہی ناک اور آنکھیں ہیں“۔ لوئزا بولی۔

”یہ دریا اور پہاڑ ہیں“۔ سلویا نے کہا۔ پھر انجینئر بولا۔ ”اگر چاند میں رہنے والے زمین کو دیکھیں تو انہیں بھی بالکل ایسا ہی دکھائی دیگا۔ ہمارے بڑے بڑے شہر بھلا کیا دکھائی دیتے ہونگے۔ اٹلی کی شکل تو ضرور ایسی ہوگی۔ اور سوئٹزرلینڈ بالکل نقطہ معلوم ہوتا ہوگا“۔

”مسولینی وہاں کیا دکھائی دیگا؟“ لوئزا نے پوچھا۔ اور سب ہنس پڑے۔

اگلے دن ڈینیل نے اگاستنو کو آتے دیکھا تو آگے بڑھ کر اسے ایک دوسرے راستے سے گھر میں لے آیا۔ دونوں اوپر لوئزا کے کمرے میں چلے گئے۔ اگاستنو نے پردے کے پیچھے چھپ کر جاسوس کو اچھی طرح دیکھا۔ اور کہا ”یہ وہی شخص ہے ...... اب ہمارے ہاتھ سے بچ نکلے تو جانیں“۔

”مذاق کر رہے ہو نا؟“ ڈینیل نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ اگاستنو کے کان کھڑے ہو گئے۔

”لومڑ پھندے میں آگیا ہے۔ کیا تم اسے بچ نکلنے کا موقع دو گے۔ اب ان لوگوں میں سے ایک ہمارے پنجے میں ہے۔ جنہوں نے ہمارے ساتھی کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہم کیا اسے بھاگنے دیں گے؟“ اگاستنو کی آواز غصے سے بھرا گئی۔

”وہ میرے مکان میں ہے۔ میرا مہمان ہے“۔ ڈینیل نے متانت سے کہا۔

”وہ ایک جاسوس ہے“۔

”وہ جاسوس تھا۔ مگر اب وہ میرا مہمان ہے۔ وہ مر رہا تھا جب اس نے میرے گھر میں

ہیں وہ اچھا ہوا۔" ڈینیل مطمئن تھا۔ اگاستنو کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا
ین تمہیں عذر کیا ہے تم خوب جانتے ہو کہ فاشی ہمارے خلاف کیسے اوچھے ذریعے
کرتے ہیں اور انہیں ذرا بھر اخلاقیات کا پاس نہیں۔"

ں جانتا ہوں۔" ڈینیل نے جواب دیا۔ "اور اسی لئے میں فاشی نہیں ہوں۔"

مارا اخلاق ہی ہماری شکست کا موجب ہے"

ور اخلاق ہی میں ہماری جیت ہے۔"

ن عقلی دلیل کے آگے اگاستنو صرف سر ہی ہلا سکا۔ "یہ یہاں کتنے روز اور ٹھہرے گا؟"
نے پوچھا۔

اب ایک ہفتہ اور۔ وہ ابھی کمزور ہے۔"

پھر اس کے بھاگ نکلنے سے پیشتر کچھ سوچنے کا موقع ہے۔" اگاستنو نے کہا۔

نیل نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے گھر والوں کو اس سے بالکل آگاہ نہ کرے۔ وہ انہیں
ہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس بات کی خاص احتیاط کی کہ اس کا مہمان کچھ جانے
، اس کی ساس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تھا۔ ڈینیل بیوی اور سلویا کو وہاں لے گیا
ڑا مریض کی دیکھ بھال کے لئے چھوڑ دی گئی

آپ یہاں کئی ہفتوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی آپ نے ہمارا پورا
ی نہیں دیکھا؟" لڑکی نے انجینیر سے کہا

حض اس لئے کہ میں بستر ہی میں پڑا رہا۔"

ڈ نے اسے ہر چیز دکھائی گودام تک دکھایا۔ جس میں آلو، پیاز، پھل اور ترکاری
کے جاتے تھے۔ اپنا کمرہ بھی دکھایا۔ جس میں آجکل وہ اور سلویا سویا کرتی تھیں
ریم والی ایک تصویر نے انجینیر کی توجہ اپنی طرف جذب کر لی۔ "یہ کس کی تصویر ہے؟"
نے پوچھا۔

"سینی اوٹی کی"

انجینئر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "سینی اوٹی کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

"غریبوں کا حامی جسے مسولینی نے مروا ڈالا تھا"

"کیا تم فاشیوں کی مخالف ہو؟"

"ضرور"

"سلویا بھی"

"وہ مجھ سے بھی زیادہ مخالف ہے"

"اور تمہارے ابا"

"وہ ہم سب سے زیادہ مخالف ہیں مگر وہ باتیں نہیں بنایا کرتے، کام کیا کرتے ہیں"

پھر لونزا اسے دوسری چھت پر لے گئی۔

"یہ میرے والدین کا کمرہ ہے"

"اور وہ کمرہ کس کا ہے؟"

"وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں، ابا نے منع کر رکھا ہے۔ اس کمرے میں کاغذات دھرے رہتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ وہ بکھر نہ رہیں"

اس کے بعد وہ دونوں نیچے باغ میں آگئے۔ آدھ گھنٹہ تک انجینئر باغ کی روشوں پر ٹہلتا رہا۔ پھر وہ لونزا کے پاس گیا اور کہا "کیا تم تار گھر جا کر ایک تار دے آؤ گی؟" اس نے پیسے اور پیغام اسے دے دیا۔ اور کہنے لگا "میرے سر میں زیادہ درد ہے میں بستر پر لیٹتا ہوں"

دوسرے روز سلویا ناشتہ لیکر انجینئر کے کمرے پر پہنچی۔ لیکن کمرہ خالی پڑا تھا۔ اس نے شور مچا دیا اور گھر والے جمع ہو گئے۔ انجینئر معہ سامان کے غائب تھا۔

"وہ جا چکا ہے" سلویا بولی

"وہ جانے کی اطلاع بھی نہ دے سکا" وشنرا نے کہا۔

"وہ کل رات ہی بھاگ گیا ہو گا" ملوشنا نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جھپٹ سے ڈینیل بالائی منزل میں جا پہنچا۔ جہاں ایک لمحہ بعد عورتوں نے اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنیں "لٹیرا، فریبی!" وہ پاگلوں کی طرح شور مچا رہا تھا

"میرے سارے کاغذات اٹھا کر لے گیا"

عورتیں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئیں کمرے میں بے ترتیبی تھی۔ میز کی درازوں کو تالاں توڑ کر [illegible] گیا تھا۔ جبھی اسی وقت اگاستنو داخل ہوا۔ [illegible] ابھی تک کچھ [illegible]

"جاسوس گزشتہ رات [illegible] اپنے ساتھ میرے تمام ضروری کاغذات لے گیا ہے اور وہ [illegible] کے لیے ہدایات درج تھیں۔" ڈینیل نے اگاستنو سے کہا "[illegible] لوگوں کو فوراً [illegible] دینا چاہیے۔ انہیں خبر ہونی چاہیے۔"

"آج صبح [illegible] مزدور [illegible] لے گئے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو دن کو ادھر ادھر مزدوری کرتے رہتے اور رات کو [illegible] لوٹ جاتے تھے"

سلویا حیرت سے اپنے باپ اور اگاستنو کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گویا یہ بھی ایک ناٹک تھا۔

"نہیں" وہ سسکیاں لینے لگی "ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ درست نہیں، مذاق ہے اگاستنو خدا کے لئے کہدو کہ یہ مذاق ہے۔ واقعہ نہیں ہے"

"اسی وقت ہمیں کوئی ایسی تجویز سوچنی چاہیے۔ جس سے وہ لوگ جو ابھی گرفتار نہیں ہوئے بچ جائیں" ڈینیل نے کہا اور اگاستنو کے ساتھ باہر نکل گیا اور رات گئے تک واپس نہ آیا۔

فلومنا اور لومڑ انگیٹھی کے پاس بیٹھی رہیں۔ ملویا باورچی خانے کے عقب میں ایک صندوق پر بیٹھی تھی۔

"ہمارے اکثر ساتھی آج صبح مختلف اسٹیشنوں پر گرفتار کرلئے گئے" ڈینیل نے داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "دوپہر کے وقت ایک کتب فروش کی تلاشی لی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگسٹن بھی پکڑا جاچکا ہے۔ غالباً اسے موٹرزلینڈ سے بھی نکال دیا جائیگا۔ ادھر تو کوئی پولیس والا نہیں آیا؟"

"نہیں" فلومنا نے جواب دیا۔ ڈینیل دہلیز پر بیٹھ گیا۔

رات کی تاریکی چھانے لگی۔ ستارے نکل آئے۔ مرغوں نے پہلی اذان دی۔ مگر کسی نے بستر پر جانے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ کوئی بھی اس بیت پر جانا نہ چاہتا تھا جو کل انجینئر کی جائے رہائش تھی۔ پھر دوبارہ مرغوں کی آواز سنائی پڑی۔ فلومنا اور لومڑ انگیٹھی کے پاس بیٹھی رہیں۔ ملویا باورچی خانے کے عقب میں پیٹی پر بیٹھی رہی اور ڈینیل بھی وہیں دہلیز پر بیٹھا رہا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا گویا کوئی مر گیا ہو۔

دفعتہً کسی جانور کی چیخ نے خاموشی کو توڑ دیا۔ جیسے چوٹ کھا کر کتا بلبلا رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی مرغیوں اور چوزوں کی چوں چوں بھی سنائی دی۔

ڈینیل کھڑا ہو گیا اور مرغی خانے کی جانب لپکا۔ لومڑ کا پنجہ پھندے میں پھنس چکا تھا۔ وہ اپنے کو آزاد کرانے کی انتہائی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ڈینیل کو آتے دیکھا تو خوف اور غصے سے بے قابو ہو کر اچھلنے لگا۔

"آخرکار" ڈینیل نے کہا۔ اور اس نے جھپٹ کر قریب پڑے ہوئے ایک کلہاڑے کو اٹھا لیا۔ اور لومڑ کے سر پر اس زور سے دے مارا کہ اس کا بھیجا نکل گیا۔

مرغی خانے کے دروازے پر گوشت کے لوتھڑے خون میں لت پت پڑے نظر آتے تھے۔

مجروح سلطان پوری

بنگال

بھوک کی آگ میں جھلسے ہوئے، اجسام نزار، زندگی فتنۂ نمرود کی بیداد لیے
ناتواں ہاتھوں میں ٹوٹا ہوا اک ظرفِ حیات، خشک ہونٹوں پہ سسکتی ہوئی فریاد لیے

* * *

چند آنکھیں جو زمستی میں ترسنے دو انہیں   انکے اشکوں سے بھرے جائینگے مینا و ایاغ
روحِ آدم کو تڑپنے دو اندھیرے میں یونہی   کون کہتا ہے لہو سے نہیں جلتے ہیں چراغ

* * *

آہ وہ خلق کہ جو تشنگیٔ زیست کو بھی   لطفِ شبنم ہی تسکین دیا کرتی ہے
اور افلاک کے ہاتھوں سے مہ و مہر کا جام
وقت آئے یہ زمین چھین لیا کرتی ہے

* * *

آخری شعر میں گہن کی تھیوری سے ایک انقلابی کنایہ کیا ہے۔ مجروح

سلیمان اریب

اشارے

سوئے ایسے ہیں کہ کروٹ بھی نہیں لی ہم نے
کیا غلط ہے جو ہمیں مردہ و بے جاں سمجھیں؟
دور ساحل سے بہت دور کھڑے ہیں پھر بھی
ہے یہ اصرار کہ سب موج کو طوفاں سمجھیں
اف رے اک پل کے غلامانہ تعیش کا اثر
اس پہ نازاں ہیں کہ قفس ہی کو گلستاں سمجھیں
دامِ افرنگ سے آزادی نہیں ممکن ہے
جب تلک اپنے وطن ہی کو نہ زنداں سمجھیں
رنگ بھرنا ہے ہمیں قصۂ **ہیرو** میں اگر
خون کی بوند کو اب زینتِ عنواں سمجھیں
اب تو شمشیر جھکی ہے سرِ بیضا نہ !
کس لیے دار کو ہم حلقۂ زنداں سمجھیں
[illegible] کے اٹھا [illegible] شقاوت سے ہوا ہے
جنگ و طاؤس کو اب [illegible] سمجھیں

عطا محمد

اختر انصاری کی شاعری

اب سے دس بارہ سال پہلے اختر انصاری ہمارے شعر و ادب میں ایک نئی آواز تھے۔

کوئی آٹھ برس ادھر کی بات ہے، کم عمری اور ابتدائے سن شعور۔ یہ بالکل اتفاق تھا کہ میرے چند ساتھی اس وقت بھی ادب میں خاص دلچسپی رکھتے تھے اور مجھے بھی اس طرف لگاؤ تھا۔ غزل کی اور ہمارے بندھے ٹکے عاشقانہ مضامین کی بڑی سختی سے مخالفت شروع ہو گئی تھی۔ اور گو مجھ میں ابھی اتنا شعور پیدا نہ ہوا تھا کہ میں نئے ادبی زاویہ نظر کے معیار پر کسی چیز کو پرکھ سکتا۔ مگر پھر بھی مختلف رسائل نظر سے گزرتے تھے۔ غزل کے مخالفین کی منطق معقول ہوتی تھی۔ ہر چند کہ میرے اپنے معیار نقد کچھ نہ تھے۔ پھر بھی اپنے ایک سیاسی (کانگریسی) مزاج ساتھی کی وجہ سے کچھ سیاسی لٹریچر پڑھنے کو مل جاتا تھا۔ اور میں دیکھتا تھا کہ ہماری زندگی اور ماحول سے علیحدہ ادب بھی کوئی چیز ہے۔ جو ہمیں تھکے ہوئے لمحات میں تسکین کل میں لیجاتا ہے۔ اور زندگی سے فرار کا طریقہ سکھاتا ہے۔ چنانچہ سختی سے میں اور میرے چند ہم درس اس بات میں عقیدہ رکھتے تھے کہ ادب کا یہ دور جلد بدل جانے والا ہے اور اسی خیال میں سال دو سال گزر گئے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مضامین ساقی میں نکل رہے تھے جن میں انہوں نے چن چن کر ہمارے اساتذہ متغزلین کے عیوب اور نقائص گنوائے تھے۔ اسی زمانے میں ان کی ایک دھوم تھی۔ موجودہ ترقی پسند اشتراکی ادیبوں کی طرح ان کے پاس کوئی مضبوط بنیاد غزل سے انحراف کی نہ تھی۔ صرف انہیں ایک بات آتی تھی کہ غزل کے بندھے ٹکے مضامین اور

پرستی اور غیر فطری مبالغہ نیز جسم (Form) کو غزل میں بے طرح دخل حاصل ہو ہے۔ انہیں نکال کر کس چیز کو داخل کرنا چاہئے۔ اس کا جواب ان کے پاس نہ تھا پھر بھی بے چین تھا۔ ہر چیز اچھی معلوم ہوتی تھی۔ زندگی سے بھرپور۔ (زندگی کیا ہے؟ اس واضح طریقہ پر ہمیں کوئی احساس نہ تھا) تندرست عیب دیکھنا جانتے ہی نہ تھے۔ اب یہ مضامین نظر سے گزرے تو ذہن کو سخت صدمہ پہنچا اور وہی جگر، حسرت، فانی جیسے اساتذۂ متغزلین جن کے متعلق سن سنا کر اور درس میں استادوں کی زبانی ذہن میں مرعوبیت کا اتنا رسوخ ہو گیا تھا، پوچ نظر آنے لگے۔ اسی دوران میں ساقی کے شمارہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں عندلیب شادانی کا ایک مضمون نظر سے گزرا۔ "ایک تابناک ستارہ" حیران تھے کہ اتنا بڑا کلبی (Cynic) جو صرف عیوب اور نقائص ہی دیکھ سکتا ہے جس کے لہجہ میں بلا کی تلخی ہے۔ اور جو صرف جلی کٹی سنا سکتا ہے کیا اس کے ذہن کے کسی گوشے میں کسی کی بھلائیاں دیکھنے کی بھی سکت بچ گئی ہے؟ یہ مضمون اختر انصاری اس وقت تک کی شاعری پر ایک جیتی تنقید تھا۔ اختر اس وقت تقریباً تمام موقر جرائد میں چھپ رہے تھے اور اب میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کے کلام کو پڑھتا تھا۔ جتنا پڑھتا اور سوچتا ڈاکٹر شادانی کی رائے کو صحیح ہی پاتا۔ ان کے کلام کا ایک چھوٹا سا مجموعہ بھی آ چکا تھا "نغمۂ روح" مجھ میں بھی بھلا برا پہچاننے کی تمیز پیدا ہو چکی تھی۔ کھرے کھوٹے کو پرکھنے لگا تھا۔ اور اب میں صرف نقادوں کی رائے سے مطمئن نہ ہو جاتا تھا جب تک خود کسی کو پرکھ نہ لوں اور اس لئے اب میں غزل کا اس شدت سے مخالف نہ رہا تھا۔ اور نہ کٹر حامی بھی تھا۔ بلکہ میری اپنی رائے تھی کہ غزل بھی جاندار ہو سکتی ہے۔ البتہ اب ہمیں اس جسم میں نئی روح پھونکنا پڑے گی نئے رجحانات کو سمونا پڑے گا اور اسے زندگی سے قریب لانا پڑے گا لیکن یہ ایک علیحدہ بات ہے۔

اختر غزلیں بھی کہہ رہے تھے اور نظمیں بھی۔ لیکن رسائل میں زیادہ تر ان کے قطعات نکل رہے تھے۔ ان کے قطعات اور ان سے پہلے کی اردو شاعری میں [illegible] کے لحاظ سے کوئی چیز مشترک نہ تھی۔ انوکھا مغربی لہجہ اور مشرقی وضع [illegible] ہلکے پھلکے الفاظ، لہجے میں اتنی شدت کہ ذہن میں ایک بار ایک کپکپی [illegible] حرف حرف میں درد و کرب، اور دبی گھٹی نوجوانی کی چیخ، جیسے [illegible] گلا دبا دیا گیا ہو۔ حلق میں سے آواز کھنچ کر نکل رہی ہو۔ اور [illegible] لئے بالکل نیا تھا پرانے پٹے ہوئے طرز نگارش سے بالکل [illegible] انفرادیت، ایک نئی شخصیت ابھرتی محسوس ہو رہی تھی۔ نیا لہجہ [illegible] غزل کے نکھار اور بانکپن سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ نہ مزاج کے لحاظ سے [illegible] اختیار ہے۔

انہیں زبان لکھنے کا ایک خاص ڈھنگ آتا ہے، شستہ و رفتہ۔ وہ [illegible] طرز انشا بھی رکھتے ہیں جملوں کی تراش خراش، لفظوں کے دروبست اور موقع [illegible] پہچانتے ہیں۔ اور ایک فن کار کی حیثیت سے وہ حسن کلام کا اہتمام پہلے کرتے ہیں [illegible] چیز کا بعد میں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ اردو شعرا میں ان کا ایک بلند مقام ہے۔ سب سے عمدہ۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ الفاظ میں روح پھونکنے کے علاوہ الفاظ میں ایمائیت (یا تصور آفرینی) (Suggestiveness) پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے الفاظ و معانی سے قطع نظر صرف الفاظ و ارکان کا صوتی آہنگ ہمارے ذہنی افق پر فن کار کے ذہن و روح کے نقوش اجاگر کر دیتا ہے۔ اور مرتسم بھی۔ اور ٹوٹتے تارے کی طرح اپنے پیچھے ایک ضوفشاں لکیر چھوڑ جاتا ہے۔ ان کا ایک مصرعہ ہے

"یاد آتی ہیں جوانی کی چھلکتی راتیں" یا
"[illegible] کچھ نہیں [illegible]" یا

"جوان ہونے سے پہلے ہی مر تو سکتا تھا" یا پھر
"پکا ہے یہ [illegible] دکھ بھری جوانی کی"

پہلے اور دوسرے مصرعوں میں "پھلنی" اور "بھری" کی آواز سے جو حسن تناسب [illegible] حد تک [illegible] اور گداز کی آمیزش اور ایک حسین و جوان انسانی مجسمہ جھانک رہا ہے قاری کے دماغ میں ایک ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے کہ اس ذہنی منظر کی موجودگی میں [illegible] [illegible] کرب اور محرومی [illegible] نظر آتی ہے اور ہم اپنے دلوں میں [illegible] ہمدردی کرتے ہیں اور اس کی حسرتوں پر آہ کرنے کو جی چاہتا ہے اسی نقطۂ [illegible] آپ [illegible] میں ملاحظہ فرمایئے۔ پوری جوانی کسی پکے پھوڑے کی طرح نظر آتی ہے جس میں نیلا پیلا مواد گجر گجر کر رہا ہو ادھر [illegible] گیا اور ادھر غلاظت کا ڈھیر [illegible] ہے شاعر کی صنعت گری [illegible] مر سکتا تھا" کا محل کچھ ایسا ہے کہ ہمیں ایک [illegible] نوجوانی [illegible] کی بات اور دنیا سے بیزار [illegible] نظر آتی ہے [illegible] کے لئے تیار نہ ہو جیسے شاعر کو اپنی نوجوانی سے کچھ کام لینا ہو جیسے وہ ان تمام مجبوریوں کو [illegible] ایک مٹ [illegible] پھینکنا چاہتے مگر ایسا [illegible] سکے۔ اور جیسے زندگی اور غم روزگار کی چکی نے اسے اپنے پاٹوں میں لے کر پیس ڈالا ہے مگر سرکشی [illegible] تھکاتی [illegible] میں بے پناہ توانائی (Vitality) کام اور آ[illegible] بڑھنے کی خواہش ہے [illegible] ترقی پسندوں کی نگاہ ان پر پڑی۔ اور [illegible] اسی گروہ کے ہمدرد ہو گئے۔ تلاش کرنے پر ان کے یہ [illegible] جو عصر [illegible] کے کسی اردو شاعر کے یہاں نظر آتی [illegible] پہنچا مگر [illegible] بڑھا اور کوٹ میں پھینکو! مگر [illegible] (Social Con[illegible]) [illegible]

ور ہم بالآخر ان کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے

س گروہ بندی اور جانبدارانہ پروپگنڈے کے زمانے میں ہم نے بہتوں کے نقارے پیٹے ستوں کو سر چڑھایا۔ مگر ہم ایک مستقل مزاج لیکن گروہ بندی سے دور رہنے والے شاعر و نہ بھلا سکے۔

یہ سچ ہے کہ ان کے یہاں یگانہ کا سا کس بل نہیں ہے نہ فراق کی سی نئے رجحانات کو سمونے کی شعوری کوشش۔ نہ کوئی آئندہ نظام کے خواب نہ [illegible] کا سا تند لہجہ، نہ اقبال کی سی عظمت۔ لیکن پھر بھی وہ ایک خود دار دل کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں میر کا سا سوز۔ فانی کی تہذیب نفس اور دھیما پن۔ آتش کا تمرد اور غم کا اپنا انداز نظر ہے ان کے یہاں بے انتہا خلوص ہے۔ جو فن کاری کی لازمی خصوصیت ہے اور جنسی جذبہ اس قدر ارتفاع Sublimity پا گیا ہے کہ ان کی نظر جوش کی طرح تناسب جسم اور اعضا کے سڈول پن ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ مطرب کی تصویر میں بھی دھڑکتا دل دیکھتے ہیں۔ اور جمالی حسن سے گزر کر آواز کا لوچ ترنم۔ اور انسانی شرافت و تہذیب نفس تک ان کی نظر جا پہنچتی ہے اب چاہے آپ اسے جنسی مرض کہیں یا کچھ میں تو جسمانی حسن پر اتنا زور دینے کو بھی کہ نظر اعصاب اور [illegible] کے نشیب و فراز ہی میں پھنس کر رہ جائے جنسی مرض سمجھتا ہوں۔ جسم کے اندر [illegible] انسان کا اپنا رویہ (Attitude) اور سماجی ذمہ داری [illegible] (Responsibility) بھی ہے اور سماجی اخلاقی قدریں بھی۔ خواہ اشتراکی سماجی اقدار کے تحت ہم اخلاقی قدروں کا ڈھانچہ ترتیب دیں بہر حال اشتراکی نظام بھی اخلاق سے معرا ہو کر زندہ نہ رہ سکے گا۔ اور کسی اخلاقی اور سماجی قدر [illegible] جنسی مزاج (Anarchy) اور لذتیت کو عام کرنے سے سوسائٹی کی تعمیر نہیں تخریب کا ڈر ہے۔

اب تو خیر جنگ عظیم چھڑی ہوئی ہے اور ساری دنیا ہی مصائب و ابتلا کی زد میں [illegible] ہے لیکن جنگ عظیم [illegible] سے پہلے سے ہندوستان ایک [illegible] کے لئے آمادہ ہیں۔ مگر ان سے [illegible] کا غلبہ اور غیر ملکی استحصال [illegible] سے ہمارے ملک کی [illegible] طرح کھایا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل اور نئی نسل کے پیش رو [illegible] جیسے لکھے ہیں بات کہیں [illegible] زہر میں بجھی ہوئی ہے اس لحاظ سے [illegible] اختر [illegible] میں ساری [illegible] اور جنگ عظیم کے بعد کے شعرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر [illegible] گئے ہیں۔ جہاں [illegible] ان کا دم گھٹ رہا ہے۔ یا وہ [illegible] گئے ہیں [illegible] ان میں جذبہ [illegible] رہا ہے۔ لیکن پھر بھی اختر کی [illegible] جاتی ہے ان کا [illegible] شاعری کے قدیم و جدید شعرا سے علیحدہ ہے [illegible] ان کی [illegible] ہی صاف واضح [illegible] ہے [illegible] نہیں۔ شروع شروع میں فانی کا اثر ان پر پڑا اور [illegible] کہ وہ کہہ اٹھے ؎

وہ معتقد ہوں میں اختر کلام فانی کا
کہ عیش خلد نہ لوں باقیات [illegible] کے واسطے (اختر انصاری)

مگر [illegible] بھی [illegible] غم نہیں زندگی سے بدگمان اور مایوس نہیں کرتا۔ اس [illegible] نتیجہ [illegible] سے متاثر ہو کر وہ قہقہے نہیں [illegible] جوش کے یہاں یہی نقص ہے [illegible] پیتے ہیں [illegible] اختر کے یہاں [illegible] کا ساختہ معصوم ہے [illegible] غم کے انجام [illegible] ایک بات اور [illegible] اختر [illegible] ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے حلق میں [illegible] جو کچھ وہ [illegible] ہیں بہت ہی واضح

اور صاف طریقے پر سکتے ہیں۔ یعنی وہ گورکھ دھندا بنا کر ہمارے سامنے پیش نہیں کرتے اور نہ ابہام پسند ہیں۔ شاید اسی لئے دیر میں مقبول ہو سکے۔ یوں تو سننے والے تو پہیلیاں بجھانا پسند کرتے ہیں۔ داستان سننا نہیں!!

اختر ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی پرورش ناز و نعم میں ہوئی۔ ذہین تھے ہی۔ جی بھر کر اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کرنا چاہے، مگر پھر جلد ہی کچھ ایسی ناگفتہ بہ اقتصادی تبدیلیاں ہوئیں کہ انہیں وقت سے پہلے تلاش معاش کی فکر لاحق ہوئی اور علی گڑھ کے ایک ہائی سکول میں استاد مقرر ہو گئے۔ کون جانے کتنا [illegible] نفسیاتی صدمہ ان کے دماغ کو پہنچا ہوگا۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

شاید اسی پس منظر میں ان کی شاعری ابھری اور اس میں [illegible] پیدا ہو گیا۔ جو اردو کے شعری ادب میں نایاب تھا ——————

فن اس شعور کی بیل ہے جو فن کار کا خون پی پی کر ہی پلتی بڑھتی ہے۔

اختر کے قطعات پچھلے دنوں بہت بکے۔ اب تک قطعہ ایک اہم [illegible] تھی کہ کسی نے اس کو فن کے نقطۂ نظر سے نہ [illegible] دیکھا تھا [illegible] دو شعر کہتا ہوئے تو رباعی کہہ لی اور غزل یا نظم نہ چل سکی [illegible] بلکہ قطعہ کی شکل ذرا واضح تھی۔ جہاں کہیں غزل میں مضمون [illegible] دوسرے شعر کے ساتھ مل کر مفہوم مکمل ہوتا تھا ایسے متفرق [illegible] نے اپنی ذہانت سے کام لیکر قطعہ کو بحیثیت فن اور صنف سخن فروغ دیا۔ یہ چیز اس [illegible] ہوئی کہ ملک میں قطعہ کہنے کی دبا چل پڑی۔ مگر ان اشعار میں انسانی [illegible] روح کے تمام درد و کرب اور فن کارانہ نزاکتوں سے کام [illegible] بنانا صرف اختر ہی کے بس کی بات [illegible] مجھے [illegible]

کو نہ پایا۔ بعد کو احمد ندیم قاسمی نے کوشش کرنے اچھے نمونے پیش کیے۔ مگر اختر انصاری پر کوئی اضافہ نہ کر سکے۔ ان کے یہاں رنگوں کا وہ حسن کارانہ انتخاب و امتزاج، خلوص اور تڑپ نہیں جو اختر کے یہاں ہے۔ کس قدر ظلم ہے کہ ڈاکٹر تاثیر "دھڑکنیں" کے دیباچے میں اس قسم کے قطعات کے بانی ہونے کا اور انہیں مقبول کرانے کا سہرا قاسمی کے سر باندھتے ہیں۔ اور ساری ادبی دنیا کی آنکھوں میں دھول ڈالتے ہیں۔ یہ کھلی ہوئی جانبداری ہے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے عدم مطالعہ کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن اس بات کے ماننے [illegible] نہیں تیار ہوتا

ان کے اشعار پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت ذہین اور حساس ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی دھیما پن اور شائستگی لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ تلملا کر رہ جاتے ہیں۔ اور بس۔ اندرونی کرب کی وجہ سے ان کے چہرے پر ایک رنگ آرہا ہے اور ایک جا رہا ہے۔ مگر اف نہیں کر پاتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا [illegible] ان پر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت درجہ ارتفاع پا گیا ہے۔ اور وہ ایسا متوازن مزاج رکھتے ہیں، جو سوچتا زیادہ ہے، بھڑکتا کم ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے ان کی نظموں اور غزلوں میں وہ دہشت انگیزی اور ابال پیدا نہیں ہوتا۔ جو آج کل اکثر ترقی پسندوں کے یہاں عام ہے اور نہ وہ کبھی اس دنیا سے اس درجہ بیزار ہوئے کہ زندگی کو وبال دوش سمجھیں اس میں شک نہیں کہ "نغمۂ روح" میں چند اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے زندگی سے متنفر اور دنیا سے بیزاری ٹپکتی ہے جو شاید فانی کا اثر ہے مگر آہستہ آہستہ وہ اس پر قابو پا گئے۔ ترقی پسندی کا لفظ بیچ میں آجانے سے شاید کسی کو کچھ غلط فہمی ہو۔ اختر خود بڑے اچھے ناقد ہیں۔ اور ترقی پسند ادیب ان کے اپنے معیار نقد ہیں۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ادب کی تخلیق کسی واقع اور مخصوص سماجی عمل کے تحت وجود میں آنی چاہیے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ خواہ مخواہ مزدور اور کسان کے متعلق کچھ کہا جائے۔ خواہ تعلق

نہ کبھی کسان اور مزدور کے متعلق کچھ سوچا ہو۔ اور ان کی تکالیف کا صحیح اندازہ و مشاہدہ اور تجربہ نہ کیا ہو۔ ان کے نزدیک ادب زندگی کی تخلیقی تنقید اور تفسیر ہے۔ جو زندگی کا اثر ہے اور زندگی پر اثر بھی کرتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ زندگی کسان اور مزدور تک محدود نہیں۔ اس لحاظ سے شاید اختر ہی کے یہاں ہمارے موجودہ ہندوستان کے متوسط طبقے کے نوجوانوں کی غنائی اور سیاسی بے بسی اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ یہ واقعات محسوس کردہ جاتے ہیں۔ لیکن ان کا ہر شعر اپنے معنی سے علیحدہ ایک تصوراتی (Suggestiveness) کا بھی حامل ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت شاید ہی کے اشعار کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر اور اس بے بسی کو ان آئینوں میں دیکھ کر ہم کھٹک کر بیٹھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بلکہ بجلی کے کوندے کی طرح موجودہ نظام کی بے بسی ہمارے دماغ میں گھوم جاتی ہے۔ اور ہم سوچتے ہیں کہ اس طرح کب تک؟ . . . . کبھی نہ کبھی تو اس بے بسی اور ناچاری کو ہمیں ختم کرنا ہی ہوگا۔ جس نے ہماری ذہانت کو معطل کر دیا ہے۔ یا یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ فراق کی طرح ادھ کچرے خیالات کو نظم کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان کے یہاں اگر کوئی نئی چیز ملتی ہے۔ نیا خیال پیدا ہوتا ہے تو وہ اس قدر رچ بس گیا ہے اور روح کا جزو بن گیا ہے کہ ہمیں قطعاً اجنبی نہیں معلوم ہوتا۔ مگر نہیں کون بتائے کہ یہ اجنبیت ہی آج کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اور قاری کے لئے سب سے زیادہ جاذب نظر۔

اردو تنقید نگاروں کو شعراء و ادباء کا موازنہ انگریزی شعراء و ادباء سے کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ اس ذیل میں کیٹس (Keats) کی بڑی مٹی پلید ہوئی ہے۔ نہ جانے کتنے شعراء کو اردو کا کیٹس (Keats) بتایا گیا ہے۔ مگر بیچارے رعب علم کے آگے کسی کا پول ہی کھولنا رہا۔ لیکن اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو

[illegible] ی اور عروض میں صرف اختر انصاری کا کیٹس (Keats) سے کچھ مماثلت رکھتے ہیں۔ اختر انصاری اور کیٹس کی آواز اور لب و لہجہ میں فرق کرنا ذرا مشکل ہی ہوتا۔ اختر کے اشعار میں جس طرح [illegible] ماں چھایا رہتا ہے وہ کبھی ہمیں اُس نوجوان انگریزی شاعر کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ وہی نفاست، وہی لطیف رنگینی، وہی نوجوانی کی ہوس ترنگ، وہی ماورائیت۔ لیکن ماورائیت کے باوجود اک ارضیت (Worldliness) بھی بالکل اسی جیسی۔ ملائمت، حسن اور تڑپ۔ اور وہی درد اور کسک وہی درد کی لذت جو (Keats) کیٹس کو نظم [illegible] ی، اختر کے یہاں بھی ہمہ وقت موجود ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلیقہ سے بات کہنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی لئے وہ ان کے اشعار میں سے باتیں کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ اور لوگوں کی طرح انہیں خواہ مخواہ تشبیہات و استعارات استعمال کرنے کا شوق نہیں۔ جوش نے اس رجحان کو فروغ دیا۔ مگر وہ اپنے انتہا شعری قوتوں کا منبع ہے تھا گیا۔ لیکن دوسرے مارے گئے۔ اس راستے میں ان کی پونجی لٹ گئی۔ برخلاف اس کے وہ (اختر) تو دھلی منجھی نکھری ستھری زبان میں بڑی پرکاری سے ایک دکھ بھری لمبی کہتے ہیں۔ خواہ مخواہ بات کو طویل بنانے کی بجائے وہ اسے کم سے کم وقت میں نفاست کے ساتھ کہہ دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں شاعرانہ صنائع بدائع کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہے۔ ان کی ساری فن کاری اور شاعرانہ حسن کاری [illegible] ان کے مخصوص دلپذیر اسلوب میں ہے۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ ہماری [illegible] پر نشتر لگاتے ہیں۔ اور ان کا یہ وار ہمیشہ بھرپور ہی ہوتا ہے اور [illegible] ہی نہیں کہ یہ دل کے پار ہو چکا ہوتا ہے۔ ہاں جہاں کہیں وہ صنعتِ شعری لاتے بھی ہیں تو دیکھئے کیسے حسن اور کتنے انوکھے پن سے ——

بجھے دل میں امید کا عالم   جیسے صحرا میں جل رہا ہو دیا

(شعلہ نوائی)

کسی کی انگلیوں کی جنبش پہ — ستاروں سے نکل رہے ہیں راگ
میرے سینے کی کیفیت تو یہ — جیسے جنگل میں لگ رہی ہو آگ

(جوہر رائگاں)

رائگاں میرے فکر کی نزہت — جیسے خوشبو [illegible]
میرے دل کی تجلیاں برباد — چاندنی آہ جیسے [illegible] کی

کون ہے جو اس نشتر کی کسک محسوس نہ کرے؟ کیا کوئی پتھر دل بھی ہے جو ہندوستان کے اس نوجوان شاعر کے آئینے میں ہندوستان کا چہرہ دیکھے۔ گزشتہ دور کی چند مجبوریوں نے کھل کر بات نہ کہنے دی۔ لیکن اس دباؤ سے تو انداز میں چٹکی لینے کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیے۔

(مسکراہٹ اور ہنسی)

مسکرائی وہ جب تو میں سمجھا — کسی رباب سے نغمہ پھوٹ پڑا
ہنس پڑی وہ تو یہ ہوا معلوم — دامن ساز سے ترنم پھوٹ پڑا

دیکھ رہے ہیں آپ تشبیہوں کی اچھوتی نوعیت اور ان کا بے ساختہ پن۔

اختر کو قطعہ کے دو اشعار میں فضا کی پوری تصویر کھینچ دینے میں کمال حاصل ہے۔ وہ ایسے رنگ کسی منظر کے چن لیتے ہیں جن سے پورا منظر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ان میں رنگوں کا "انتخاب و امتزاج" ملتا ہے۔ ذیل کے دو قطعے دیکھیے [illegible]

پھوار، ہوا، پرندوں کے گیت، مست ہوا — بھرے گھروں کی صورت چھلک رہی ہے فضا
بہار کان میں کچھ مجھ سے کہہ رہی ہے مگر — وہ بیخودی ہے کہ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا

پھر حسین رات کو دیکھیے اور اس کے حسن میں کھو جائیے۔

(حسین رات)

شبِ مہجوری کی روشن [illegible] [illegible] ضیا رُخ کے [illegible]
صبحِ جبین [illegible] [illegible] [illegible]

صاحب کا اختصار اور [illegible] Nietzsche [illegible] اجمال ، انتخاب [illegible] اور [illegible] Abruptness کا حال یہی ہوا ہے۔

—— [illegible] مجھے [illegible] ہے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ساتھ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نہیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اپنے [illegible] [illegible] [illegible] اور شاید [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور ان پر [illegible] —— [illegible] [illegible] —— لیکن [illegible] [illegible] آپ [illegible] کے اشعار [illegible] اور ان [illegible] [illegible] میں [illegible]

غزلوں (خوناب) کا انتخاب

حسین یادوں کی شمعیں مجھے جلا لینے دو   مزار ہیں مرے سینے میں آرزوؤں کے

کیا یاد کر کے عشرتِ رفتہ کو روئیے — اک لہر تھی کہ ناچتی گاتی نکل گئی
یادش بخیر عہدِ محبت کی شاعری   اک آہ تھی کہ گیت کے سانچے میں ڈھل گئی

آنکھیں برس رہی ہیں، دل بن گیا ہے بجلی   کہدو یہ کوئی شب سے زلفیں یوں سنوارے

ہاں اے غمِ فراق اٹھا میرے ناز تو   برسوں کسی کی آنکھ کا تارا رہا ہوں میں
یہ شاعری نہیں ہے تمنا کی قبر پر   تعمیر ایک تاج محل کر رہا ہوں میں

امید بن کے [illegible] پاس ہی   [illegible] جا بیٹھے

وہ غنچۂ جوانی ہے اشگفتہ ابھی   شامل ہے شرم حیا میں کچھ شرم کچھ جھجک بھی
[illegible] ہے مضطرب   اک نغمۂ جواں تھی جو بے تابی کی جھلک بھی

زندگی ہجر کی اک رات ہے جینا یارب — ایک دن کی مصیبت ہو تو کوئی سہہ لے!

ناز فرما ہے تمنائے جواں یوں دل میں   جیسے دوشیزہ کوئی صحنِ چمن میں بیٹھے

اس سے پوچھے کوئی چاہت کے مزے — جس نے چاہا اور جو چاہا گیا
غنچۂ دل ہائے کیسا غنچہ تھا — جو کھلا اور کھلتے ہی مرجھا گیا

ضیا تبسم سے پھوٹی لبوں تک آ پہنچی   لبوں سے چہرے پہ پھیلی ضیا تبسم کی

میں کبھی اپنے دل کی بات کر سکتا نہ تھا — اب سخن کی آڑ میں کیا کچھ نہ کہنا آ گیا

رونے بغیر چارہ، نہ رونے کی تاب ہے   کیا چیز اف یہ کیفیتِ اضطراب ہے؟
اے سوزِ جاں گداز ابھی میں جوان ہوں   اے دردِ لا علاج یہ عمرِ شباب ہے

نظر تو پھر بھی نظر ہے غمِ محبت میں   فضا میں جب تو ہنسی سے لہو ٹپکتا تھا

مری بلا غمِ ہستی اٹھائے تیرے ناز — مجھے نظر نہیں آتا ابھی جواں ہوں میں

دل کو میں حسن سے تو بہلاؤں   اور اگر جان سے چلا جاؤں؟
ہو گیا عیش سے بھی جی بیزار   ہائے اب کیا کروں کہاں جاؤں

خواب ہیں یوں مرے شباب کے دن   جیسے جاڑوں کی چاندنی راتیں

اف یہ شگفتگیٔ حسن کی بہار   گویا چمن میں پھول کھلا ہے گلاب کا

ہاں کبھی خواب عشق دیکھا تھا ۔ اب تک آنکھوں سے خوں ٹپکتا ہے

سننے والے فسانہ تیرا ہے ۔ صرف طرزِ بیاں میرا ہے
اس میں کوئی میرا شریک نہیں   میرا غم آہ صرف میرا ہے
چاندنی چاندنی نہیں اختر   رات کی گود میں سویرا ہے

چمن میں گا رہی ہیں پھول والیاں مل کر   ٹپک رہا ہے رسیلی جوانیوں کا رس

میں رنگ کار ہوں الفاظ رنگ ہیں میرے   دل و دماغ کی تصویر کھینچتا ہوں میں

ہوا بھی سرد ہے بھیگی ہے رات بھی لیکن   سُلگ رہی ہے کسی آگ سے مری چھاتی

نظر نرگس، عارض لالہ گوں، زلفیں شمیم آگیں   خدا آباد رکھے اس جوانی کے گلستاں کو

سب کہیں گے کون کرتا ہے ہمارے راز فاش ۔ جب ترے لب پر محبت کی کہانی آئے گی۔

میں بہت ہی برا ہوں اہلِ بزم!   تم کہو تو یہاں سے اٹھ جاؤں

کیا بتاؤں میں کیا ہے من کی آگ   تم نے دیکھی تو ہوگی بن کی آگ
دھیمی دھیمی دبی ہوئی خاموش   اف گُل و غنچہ و چمن کی آگ
آبِ قلزم جسے بجھا نہ سکے   وہ ہے آزادیٔ وطن کی آگ

شانِ انسانیت کے شایاں ہوں　　مختصر یہ کہ شانِ انساں ہوں

اسے کس نام سے پکارے کوئی　　جو خلش تلخ بھی ہو، شیریں بھی؟

جس کو دیکھو وہ ہے نظارہ سوز　　ہائے کاشی کا حسن حال افروز

مجھے اک اک سے حال کہنے دو　　آہ اس میں بھی اک راحت ہے

وہ فریبِ آرزو ہی کیوں نہ ہو　　ہم کو جینے کا سہارا چاہیے

یہ بھی ممکن نہیں کہ مر جائیں　　زندگی آہ کتنی ظالم ہے

سن رہے ہیں آپ مرحوم نوجوانی کا مرثیہ؟ کیا واقعی یہ آرزوؤں کی قبر پر تاج محل نہیں ہے؟ اور کیا اب بھی آپ غزل کی نشتریت کے منکر ہوں گے؟

قطعات (آبگینے) کا انتخاب

(آبگینے)

یہ روداد نہیں لطفِ زندگانی کی　　یہ داستان نہیں عیش و کامرانی کی
مری تڑپتی ہوئی روح کی فغاں ہے یہ　　پکار ہے یہ مری دکھ بھری جوانی کی

(بہارِ غم)

اجڑے دل کو بسایا ہے ذرا دیکھو تو! غم نے غمگیں کو سجایا ہے ذرا دیکھو تو!
چشمِ گریاں، دلِ پرخوں، جگرِ زخم آلود تین سے اک باغ لگایا ہے ذرا دیکھو تو!

(تاثیرِ اولیں)

کسی خیال میں مدہوش جا رہا تھا میں اندھیری رات تھی، تاریکیوں کی بارش تھی
نکل گئی کوئی دوشیزہ سی تڑپتی ہوئی یہ میرے سازِ جوانی کی پہلی لرزش تھی

(حسن کی آواز)

گر رہی ہو جو مرے دست سے گنہ شکر پڑ رہی ہے یہ گلستاں میں پھوار
یہ تمہارے ہنسنے کی آواز ہے بج رہا ہے یا کہیں کوئی ستار؟

(تلخیٔ حیات)

وہ دل نہیں رہا، وہ طبیعت نہیں رہی وہ شب کو خوں رونے کی عادت نہیں رہی
محسوس کر رہا ہوں میں جینے کی تلخیاں شاید مجھے کسی سے محبت نہیں رہی

(رقاصہ)

کر دیا خانے میں حشر بپا اور ماضی میں زندگی بھر دی
انگلیوں کو دستار میں دے کر تو نے اک داستاں رقم کر دی

(محبت کی بہاریں)

مرے دل میں تصورات حسن جیسے پھواریں لطیف اور ہلکی
میرا رونا غم جدائی میں بھری برسات جیسے جنگل کی

(ضبطِ اشک)

ان آنسوؤں کو بہنے دیا نہ تھا میں نے کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے
میں ان کو ضبط نہ کرتا، اگر خبر ہوتی پہنچ کے قلب میں بن جائیں گے انگارے

(رفتارِ ناز)

کوئی خوابوں سے بھری سوئی ہوئی شب ہے گویا — جام سرشار سے چھلکی ہوئی مئے ہے
[illegible] برسات کی راتوں میں جیسے گاتے ہیں — تیری رفتار اسی گیت کی لے ہے

(گزشتہ شب)

ہوا تھی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی تھی دور دریا تھا — کہیں نزدیک ہی جنگل میں کوئی گیت گاتا تھا
فضا میں [illegible] جیسے نغموں کی [illegible] تھی — مرے دامن میں چھم چھم آنسوؤں کا مینہ برستا تھا

(مطربہ کی تصویر دیکھ کر)

لبوں میں شراب، آنکھوں میں [illegible] عارض میں شعاعِ مہر
تبسم میں سرودِ جاں فزا کا راز ملتا ہے
تری تصویر یکسر فتنۂ انداز ہے لیکن
تمہیں کس طرح دیکھیں کہ دل سینے میں ہلتا ہے

(رات کے وقت)

کوئی جنگل میں گا رہا ہے گیت — دھیمی آواز، دکھ بھرا لہجہ
دل کو گویا یہ سن کیا ہے غم — اشکِ خوں بن کے آنکھ سے بہا

(بھری جوانی)

یہ آرزوئیں یہ جوشِ الم یہ سیلِ تمنا — یہ دل کہ ہے تپش حسن و عشق کا سوتا
ستم ہے مٹ جاتے بھری جوانی کے — میں ابتدائے جوانی میں مر گیا ہوتا

(محبت)

تیری کشش محفل سے کیوں رہتا ہے دور — لطف آتا ہے خود آرائی میں کیوں
کوئی بتلائے خدا کے واسطے — مسکراتا ہوں میں تنہائی میں کیوں

([illegible] دل)

میرے دل کے شکستہ بربط میں
ابھی باقی ہیں چند سالم تار
اب بھی مضراب حسن گر مل جائے
میں بنا دوں جہاں کو نغمہ زار

(فنون لطیفہ)

کوئی رنگوں میں، کوئی شعر میں، کوئی سر میں
درد اپنا کوئی نالوں میں کہا کرتا ہے
ایک ناسور ہے فی الاصل غم ہستی بھی
اور ناسور بہر نوع بہا کرتا ہے

(جنت ارضی)

یہ سبزہ، یہ ترا نغمہ، یہ مہتاب
یہ کلیوں کی چٹک، یہ رونق گل
اگر ایسے میں جنت بھی عطا ہو
تو ٹھکرا دوں اسے میں بے تامل

(اظہار محبت)

میں نے حسرت سے کہا تم سے محبت ہے مجھے
تم نے شرماتے ہوئے مجھ کو جواب اس کا دیا
آہ! لیکن دل ناشاد (یہ غارت ہو جائے
اس قدر زور سے دھڑکا کہ میں کچھ سن نہ سکا

اختر کی نظموں کا مجموعہ بھی "خندۂ سحر" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اسے دیکھ کر اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ اقبال و جوش کے عروج و مقبولیت کے دور میں تربیت پایا ہوا ذہن ان دونوں سے علحدہ ہو کر اپنی لے کو کیسے قائم رکھ سکا؟ ابتدائی نظموں میں سے ایک آدھ نظم میں اقبال کا ہلکا سا اثر پایا جاتا ہے۔ جو نہ ہونے کی برابر ہے۔ اور وہ بھی بانگ درا" کی شروع کی نظموں کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ جو منظری شاعری سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں۔

دراصل یہ بات ذرا تفصیل چاہتی ہے۔ اور غور طلب بھی ہے۔ غور طلب یوں کہ اختر کی نظموں میں "نئے ادب" کا بیج پہلی دفعہ بویا گیا جس میں سے بعد کو کونپلیں پھوٹیں۔ یہ بات بعض لوگوں کو ذرا کھٹکے گی مگر بقول فراق۔ "اختر انصاری کے قطعات لگ بھگ

بارہ برس پہلے کی چیز ہیں۔ وہ پہلے اشارے ہیں جو وقت کی انگلیاں دورِ حاضر کی طرف کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ آج نئے ادب کے معنی ہیئت و مضمون میں ایک میکانی mechanic انقلاب کے ساتھ مختص ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور اس لئے بعض ذہنوں میں یہ چیز ذرا مشکل سے جگہ پا سکی کہ ہم ایمان داری سے خود اپنے اس [illegible] کا تجزیہ و تحلیل کریں۔ اگرچہ ہیئت میں انقلاب کی طرف پہلا قدم تو نہیں تھا۔ مگر نمایاں کام اختر نے بھی کافی کیا ہے۔ انہوں نے اردو شاعری میں قطعہ کو بحیثیت ہیئت [illegible] وقت شروع یہ خطرہ مول لے ہی لیا تھا۔ مگر ان کی ذہانت نے انہیں وہاں بھی دوسروں کا پیش رو ہی رکھا۔ میں اسی مضمون میں کہیں کہہ چکا ہوں کہ لہجے میں بلا کی تیزی اور چبھن جو آج قدیم و جدید ادب کے درمیان امتیازی خط کا کام دے رہی ہے۔ پہلی دفعہ ایسے پن سے اختر ہی کے یہاں جھلکی۔ اور پھر یہ لہر عام ہو کر سارے نئے ادیبوں کی میراث قرار پائی لیکن اس بات کی طرف کم لوگوں کا دھیان گیا ہوگا۔ سہل پسندی اور سستی شہرت نے نوجوان ادیبوں کو سوچنے کی مہلت کم دی ہے۔ اصل چیز جو نئی ہو سکتی ہے وہ لفظ و معنی و خیال میں سے کوئی شے نہیں ہے بلکہ روح عصر Geits der Zeit کا اظہار اور طریق اظہار ہے۔ مگر آج شاعر روح عصر کے اظہار کی جگہ جسم عصر کے اظہار کو فن کاری کی انتہا سمجھے ہوئے ہیں۔ چند معلوم اور رائج الوقت اصطلاحوں کا ذکر ہنگامی سیاسیات۔ ابہام جنسیات اور جدید علمی تحقیقات کو وزن و قافیہ کے زیور سے آراستہ کرنا شعر میں روح عصر کے اظہار کے مترادف نہیں ہے بلکہ اسے میں جسم عصر کہتا ہوں۔ اصل چیز ماحول کے زیر اثر کسی خاص زمانے کے جمالیاتی تجربات (Aesthetic experiments) اور رویہ Attitude کا تجزیہ ہے۔ جیسے ہم سب قومی مزاج کہتے ہیں۔ اس قومی مزاج کے ساتھ ساتھ ہم انسانی بنیادی جذبوں کے متعلق کسی خاص زمانے میں کسی خاص قسم کا انداز نظر رکھتے ہیں۔ یہی چیز نئی کہلاتی ہے۔ اور یہی نیا پن ہے۔ اور مجھے یہ کہنے میں

کوئی باک نہیں۔ کہ یہ ظاہر دنیا بھر سے بے خبر مگر دنیا بھر کی باتوں کو داخلی رنگ دیکر شعر بھی کہنا کسی غزل گو ہی کا کام تھا۔ مگر اختر نے اپنی نظموں سے یہی کر دکھایا ہے۔ اور اسی لئے اقبال و جوش کے ناظمین کے باوجود اختر زندہ رہا۔ دونوں سے بچ کر نظم کی نئی وسعتوں کی خبر لایا۔ نظم نگاروں میں نئے رجحانات کی تخم ریزی کرتا رہا۔

ابتدائی نظمیں کچھ طوالت کی طرف مائل ہیں۔ مگر ناگوار حد تک نہیں۔ رفتہ رفتہ نظمیں کم طویل ہوتی گئیں۔ بحریں بھی چھوٹی ہوتی گئیں۔ اور الفاظ میں موسیقی اور معنویت زیادہ آتی گئی۔ اسی مجموعہ کی آخری نظم "قطب مینار" میں چند اشعار فارسی کے بھی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کا مطالعہ کافی ہے اور شاید اسی لئے ان کی زبان میں چاشنی اور نکھار زیادہ پایا جاتا ہے۔ قطب مینار کو وہ کسی طرح قومی عظمت و وقار اور کردار کی علامت (Symbol) مانتے ہیں اور اس کے متعلق ان کا (Vision) کتنا مکمل ہے۔ وہ ذیل کے شعر میں دیکھئے۔

آہ تجھ پر سربلندی کا ہے کتنا سخت بار اور اس پر یہ متانت یہ خموشی، یہ وقار

یوں تو سارا مجموعہ ہی حسین ہے۔ مگر "شباب"۔ "بت تراش" "ڈھولک کا گیت" "مونالزا" اور "اودے شنکر" پانچ نظمیں اردو ادب میں ایک ناقابل فراموش اضافہ ہیں اور بالخصوص "ڈھولک کا گیت" "مونالزا" اور "اودے شنکر" کو ہم دنیا کے حسین ادبی شہ پاروں میں جگہ دے سکتے ہیں۔ "مونالزا" کی شعری تصویر میں انہوں نے وہی رنگ بھرے ہیں جو لیونارڈو نے بھرے تھے۔ اس کی تخلیق میں بھی انہوں نے وہی خون جگر کھپایا ہے اور اس کے عارض سے وہی مسکراہٹ کا نور پھوٹ رہا ہے۔ "اودے شنکر" میں انہوں نے رقاص کی غیر ارضی حرکتوں کو شعر میں قید کر لیا ہے اور "ڈھولک کا گیت" اپنی لطافت اور موسیقیت کے اعتبار سے عجیب ہی شئے ہے۔ لاہور ریڈیو اسٹیشن سے اکثر "ڈھولک کا گیت" سنا جاتا ہے۔ اور یہ اسی "ڈھولک کے گیت" کی تعریف ہے۔ لطف

یہ ہے کہ یہ اپنی ہی بحر میں بھی ہے۔ اس کے دو بند دیکھئے

یہ گیت وہ دل کش ساون ہے
جو جس سے عبارت دل کی بہار
تخئیل کے طائر کی جھنکار
نازک سے حسیں پھولوں کی پھوار
یہ گیت وہ دل کش ساون ہے

یہ گیت وہ بجتا جھانجھن ہے
جو جس میں نہاں اک نغمہ زار
اٹھلاتی جوانی کی رفتار
بدمست اداؤں کی جھنکار
یہ گیت وہ بجتا جھانجھن ہے

"بت تراش" میں میکائیل انجیلو کا مشہور عالم خیال نظم کیا گیا ہے کہ "نگاہ حق شناس ہو اور حجابات اٹھ جائیں۔ تو ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب ہے"

ان کی نظمیں۔ قطعے اور غزلیں زیادہ تر فنون لطیفہ سے متعلق ہیں۔ اور اس پردے میں روح کا کرب۔ بیزاری۔ مگر جینے کی تمنا اور اپنی زندگی سے محبت کا جس طور سے اظہار ہوتا ہے۔ وہ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے۔ جو آگے بڑھ کر پھل پھول لائی افسوس کہ ملک کے نقاد اس طرف سے آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں۔ "ہم تم"۔ "شاعر کی دنیا"۔ "برشگال"۔ "مصنف"۔ "گائے جا"۔ "ایک پارہ" اور "جواں مرگ شاعر" بھی ان کی اول درجے کی نظمیں ہیں، جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

اختر کے اشعار دیکھنے کے بعد ان کا درجہ ادب میں متعین کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ ہمارے ذہن میں خود ہی ان کا مقام قائم ہو جاتا ہے۔ ہر چند کہ وہ غالب و اقبال نہیں ہیں۔ مگر یہ کہ ان کے قدر اوّل کے شاعر ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا غالب و اقبال قدر اوّل سے بھی آگے تھے۔ وہ مستثنیات میں سے تھے۔ جس طرح ادب کے دو مختلف ادوار کی درمیانی کڑی انگلستان میں شیلی (Shelley) بائرن (Byron) اور کیٹس (Keats) ہیں۔ اور اگرچہ وہ اپنی عظمت میں اپنے ہی زمانے کے (Wordsworth) ورڈس ورتھ سے نہیں بڑھتے۔ مگر پھر بھی کسی ادبی تاریخ و تذکرہ میں انہیں نہیں بھولا جا سکتا۔ (Wordsworth) کے باوجود ان لوگوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں جوش سے شاعری کا اک نیا دور طلوع ہوتا ہے۔ لیکن جوش کی عظمت مان لینے کے بعد بھی فراق اور اختر انصاری کے بغیر ہم اردو ادب کے دو مختلف ادوار میں ربط پیدا نہیں کر سکتے۔ جیسے ایک تار کو اس کی قوت برداشت سے زیادہ کھینچنے سے وہ درمیان میں کہیں سے پتلا پڑ جاتا ہے۔ اور ٹوٹنے کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ اس کی یکساں موٹائی قائم نہیں رہتی۔ اور ایک خاص حصہ تناسب سے زیادہ لمبا ہو جاتا ہے اور موٹا کم۔ مگر تار کی لمبائی ناپتے وقت اور اس کے جسم کو دیکھتے وقت ہم اس حصہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کہ یہی پتلا حصہ دو مختلف موٹے ٹکڑوں کو جوڑتا ہے۔ یہی حالت جنگ عظیم کے بعد ہمارے ادب کی ہو گئی تھی۔ ایسے وقت میں ادب کے دو مختلف نازوں میں اختر انصاری کی ہلکی سی لرزش نے اردو شاعری کو ملا دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں ٹوٹتے تار کی سی جھناہٹ ہے۔ جو آہستہ آہستہ پھیل رہی ہو۔ اور زیادہ سے زیادہ وسعت کا احاطہ کرتی جاتی ہو۔ ان کے غم میں ایک شادابی اور آنسوؤں میں ایک ترنم ہے۔ ان کے قہقہوں میں کراہ اور نشاط میں بے بسی ہے۔ مزاج میں نرمی اور سکون ہے۔ لیکن یہی تو آج ہندوستانی شاعری کا مزاج ہے۔

اختر انصاری

ایک آرزو

عمر بھر ناکامیوں نے خوں پیالے کا تو اب
دل کی ناکامی پہ خوں رونے کی فرصت بھی ملے
یہ کہ تو روز جھکتی ہی رہی ہے کام میں
فکر ہیں سر کو جھکانے کی مسرت بھی ملے
رات دن ٹھکرائے جانے کی ملی ذلت بہت
چاہئے اور پیار سے جانے کی سعادت بھی ملے
ہو چکی [illegible] سے جینا تو بہت
اب کسی کے عشق میں مرنے کی [illegible] بھی ملے
عمر بھر [illegible] نے پسینہ ہی بہایا ہے خود
اب [illegible] سے آنسو بہانے کی [illegible] بھی ملے

قطعات

چاندنی رات

سرِ جامِ مستی سے خالی ہے آج
ہے نغمہ و نالہ نیم رنگ
زمینِ چمن خوں سے ہے سرخ پوش
ابھی تک ہے کیوں چاندنی نیم رنگ

پرواز

زمیں سے [illegible] آزاد اگر [illegible] بھی
زمیں [illegible] تھے ہم بہت بلند
بلند اتنے کہ [illegible] جاتا [illegible] پیش
[illegible] ہاتھ ستاروں [illegible]

فراق گورکھپوری

رباعیاں

(۱)

جب کرنیں ہمالیہ کی چوٹی گوندھیں
سوتے ہوئے آبشار آنکھیں کھولیں
جب کیچن تیرسی جھلکتی ہو فضا
ایسے میں مکاشف تیری آہٹ پائیں

۲

نرمی کی کہانی رس کا ساگر ہے بدن
پیتم آکاش کا سا چھایا سا ہے بدن
انگڑائی میں راتیں سنکتے ہیں پر
امرت سے بھرا پیالہ تر و تر ہے بدن

۳

پائل کی صدا ہے یا چھنکتے ہیں ایاغ
ملتا ہی نہیں ہے آج دھرتی کا دماغ
جگ جوتی لو مارتی ہے ابر کے بیچ
جل اٹھتے ہیں لالہ زار جنت کے چراغ

سلہ، آواز یا

۴

رنگت ہے کہ گھنگروؤں کی مدھم جھنکار
جوبن ہے کہ پچھلی رات کو بجتا ہے ستار
سرشار فضاؤں کی رگیں ٹوٹتی ہیں
چٹکاتا ہے انگلیاں جوانی کا خمار

۵

پیکر سے نیا درس سبو لیتا ہوں
چھلکے ہوئے صد جام و سبو پیتا ہوں
اے جانِ بہار تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ
سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

۶

ہونٹوں پہ وہ رس کہ جن پہ بھنورا منڈلائے
سانسوں کی وہ سیج جس پہ خوشبو سو جائے
چہرے کا عرق گلاب کو بھی شرمائے
مد آنکھوں کی کامدیو کو بھی جو جھٹکا سے

۷

کومل پد گامنی کی آہٹ تو سنو — گاتے قدموں کی گنگناہٹ تو سنو
رس میں ڈوبا ہوا ہے [illegible] رہنا — رس کی بوندوں کی جھمجھاہٹ تو سنو

مدھوسودن

گلابی شیڈ

کلب سے باہر آکر اسے ایک دھندلا سا احساس ہوا کہ اس کے جسم کا توازن ٹھیک نہیں ہے۔ غالباً اسکی چال میں لغزش ہے، یا یہ لغزش کی ابتدا ہے۔ شراب اس کے اعصاب پر اثر کر گئی تھی۔ ابھی تک اسکے ذہن میں نغموں کی آواز گونج رہی تھی، جیسے ذہن کی موہوم روشنی سے محروم محرابوں میں راستہ بھول گئی ہو۔ اور ایک نرم گداز بوجھ جو اسکے ذہن سے آنکھوں کے پپوٹوں پر اتر آیا تھا۔ وہ آنکھوں کو پورا کھولنا چاہتا تھا۔ لیکن پپوٹے گرے جاتے تھے۔ اور نغموں کی آواز اس کے ذہن کی محرابوں میں راستہ بھول گئی تھی، اور سیما کے جسم کی خوشبو، اسکے بالوں کی خوشبو، اس کے سینے کی حرارت نیند کا بوجھل دھند بن کر چھا گئی تھی۔ اسے سلا رہی تھی۔ اور وہ جاگ رہا تھا۔ اور آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔

وہ سڑک پر آ گیا تھا۔ بلیک آوٹ میں سڑک کا سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ تارکول کی سڑک ٹھنڈک کی چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ اس نے ایک تیز جھرجھری سی لی اور آنکھوں کو پورا کھول دیا۔ سڑک پر اندھیرا تھا۔ دور دور پہ روشنی کے دھبے تھے۔ آس پاس کسی ٹیکسی کا نشان نہ تھا۔ وہ پیدل چلیگا۔ اس نے سوچا۔ گھر بہت دور نہیں ہے۔ حقیقت میں وہ پیدل چلنا چاہتا تھا۔ دل میں ایک خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ اس سنسان ٹھنڈی سڑک پر چلتا ہوا چلا جائے۔ گھر شعور کے آخری افق پہ تھا۔ وہ اس سڑک پہ چلنا چاہتا تھا۔ وہ چلنے لگا۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آ رہی تھی۔ کہیں کوئی وکٹوریہ آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ وہ پیدل چلیگا۔ وکٹوریہ دور چلی گئی۔ اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز اس کے شعور سے غائب ہوتی گئی۔ اور پپوٹوں پر بوجھ

پھر بڑھنے لگا، بڑھنے لگا، اور اچانک وہ چونک گیا۔ نشہ بڑھ رہا ہے، اس نے سوچا اور اس کا جی چاہا کہ ہنس پڑے، لیکن اس نے خود کو ہنسنے سے باز رکھا۔ اُسے خود کو قابو میں رکھنا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ رم کے چار پیگوں نے اس پر نشہ طاری کر دیا ہے۔ اس نے سوچا شاید اس لئے کہ اب اسے پینے کی عادت نہیں رہی، ایک عرصہ سے اس نے پینی چھوڑ رکھی ہے۔ شادی کے بعد سے آج تک اس نے شراب نہیں پی تھی۔ چندرا سے وعدہ کیا تھا، کہ شراب پینی چھوڑ دیگا۔ اس نے وہ وعدہ توڑ دیا ہے! ایک لمحہ کے لیے وہ اس احساس سے محظوظ ہوا اور پھر فوراً ہی اس نے ایک ندامت سی محسوس کی کہ کیا کیا جائے۔ اس نے سوچا، چند دوست ساتھ پی رہے ہوں تو ایک حد آتی ہے جب انکار کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور پینی پڑتی ہے۔ اگر سیما کے گھر اس گلابی شیڈ کی دھیمی روشنی میں بیٹھ کر شراب پی جائے تو کتنا لطف ہو، اس گلابی شیڈ کی دھیمی روشنی، جیسے شفق شام اپنے آخری لمحوں سے پہلے، اور شراب —— شراب پینے کی آرزو پھر لوٹ رہی ہے،" اس نے تلخ خیال کیا، یہ اچھی بات نہیں، جو عادت اتنی مشکل سے چھوٹی ہے۔ اس کا لوٹ آنا بُرا ہوگا۔ چندرا کو اس کا شراب پینا بالکل پسند نہیں، ناحق جھگڑا ہوگا، فضول، لیکن اپنے احساس کے عقب میں اس نے ایک تلخی سی محسوس کی، چھوٹی ہوگی یہ عادت، اس نے سوچا، لیکن اب اسے پینے کی عادت تو نہیں، یونہی چند دوستوں کے ساتھ کبھی —— پینے سے پرہیز قائم رکھنے کے لئے اُسے کلب چھوڑنی پڑے گی، کلب —— کبھی چھوڑنی پڑے گی۔ اسے گویا جھنجھلاہٹ سی ہوئی۔ کلب چھوڑنے کی نوبت نہ آئے گی، وہ ارادہ کا اتنا کمزور نہیں ہے، اتنے عرصے بھی تو نہیں پی تھی، آخر۔ آخر ہفتے کی رات تھی۔ بال روم میں بجتا ہوا آرکسٹرا لوگوں کے بشاش چہرے، جوان عورتیں۔ رنگین لباس، پوڈر کی خوشبو، مسکراہٹیں

ہونٹوں کی سرخ لپسٹک، میرز کی کمان۔ کتنے سرخ تھے۔ اس کے ہونٹ اوہ کرن تھی۔ اخیر تک اس سے تعارف نہ ہو سکا۔ اس کے ہونٹوں پر لپسٹک نامعلوم تھی لیکن ہونٹ سرخ تھے۔ ان کبوتروں کے پنجوں کی طرح جو منڈروں کے کلسوں پر بیٹھے رہتے ہیں۔ آخیر تک اس سے تعارف نہ ہو سکا۔ کئی بار اس کے قریب سے گزرا تھا۔ صرف ایکبار اس نے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ جذبات سے خالی تھا، ورنہ تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔ جیسے وہ مسکراہٹ کو دبا رہی ہو۔ فیروز کے ساتھ آئی تھی۔ اسکی بیوی کی دوست ہو گئی۔ سیما بھی پہلے پہلی بار فیروز کے ساتھ آئی تھی۔ آپ کچھ سوچ رہے ہیں۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سیما تھی، سندر سیما، ننھی سیما، منی سیما، گھنی سیما، — وہ ہنس پڑا، وہ سیما کو گھنی کہہ رہا ہے، نشے میں ہے۔ اسنے سوچا، سیما بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت وہ میز پر اکیلا تھا۔ اس کا سینہ سفید تھا۔ بلاؤز کا گلا بڑا تھا۔ اس کے سینے کا فراز، جہاں اس فراز کی آخری حد تھی یا ابتدار — آپ اکیلے ہیں؟ جی ہاں۔ کیوں؟ یونہی۔ اس نے ملامت سے دیکھا تھا۔ اسکی آنکھوں میں ملامت کا وہ جذبہ کتنا حسین تھا، خوبصورت، خوبصورت چندرا کو کو اب ڈانس وغیرہ میں شامل ہونے کا وقت نہیں ملتا، اس نے جواب دیا تھا۔ وہ ایک لمحہ تک دیکھتی رہی تھی۔ عجیب عجیب نظریں! ٹھیک ہے پھر اس نے کہا تھا۔ بچے کی دیکھ بھال سے فرصت ہی کم ملتی ہوگی اور پھر رات کا معاملہ۔ آخر ہفتے کی رات تھی، ہال روم سے آرکسٹرا کے نغمے سنائی دے رہے تھے، دھیمے ہوتے ہوئے، اونچے ہوتے ہوئے چیختے ہوئے، سرگوشیاں کرتے ہوئے۔ کلب میں آکر میں تنہائی کو بھول جاتی ہوں سیما نے کہا تھا۔ گھر پر وہ اکیلی رہتی ہے، اس وقت تک اکیلی رہیگی، جبتک میجر ماتھر جنگ سے واپس نہ آجائیں۔ اور اگر جنگ سے واپس نہ آئیں۔ وہیں مر جائیں چچ چچ چچ چچ چچ، چچ چچ — وہ رک گیا اور پشیمان ہو گیا۔ یہ کیا بیہودگی ہے۔ اس نے

سوچا۔ نشے میں وہ پیچ پیچ کئے جا رہا ہے۔ وہ اپنے آواز سے محظوظ ہو رہا تھا۔ جیسے میجر ماتھر کا مر جانا اسکی خوشی کا باعث ہو۔ ماتھر کافی خوبصورت آدمی ہے اس نے سوچا، کلب میں اور بھی خوبصورت آدمی ہیں، سیما کسی اور سے شادی کریگی۔ اس کی وہ نگاہیں، جب اس نے ملامت سے اس کی طرف دیکھا تھا، کیسی عجیب تھیں، اور جب اس نے ناچ کے لئے پوچھا تھا۔ آپ ناچ میں شامل نہیں ہونگے؟ وہ خود کو پیش کر رہی تھی۔ لوگ بال روم کی طرف جا رہے تھے۔ لوگ بال روم میں چلے گئے تھے۔ موسیقی دھیمی ہوگئی تھی۔ مدھم مدھم سُر جیسے نغمے پانی کی تہ سے سنائی دے رہے ہوں، وہ بال روم میں چلے گئے تھے۔

آرکسٹرا کا نغمہ اس کے ذہن میں ابھر آیا اور اس کا جی چاہا کہ سڑک پر رقص کرتا ہوا چلے، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور خواہش کو مغلوب کرکے اپنے حواس میں چلتا رہا۔ اس کا دماغ رقص کے نغمے سے مسحور ہو گیا تھا، دھیما، دھیما، دھیما جیسے نغمہ سازوں میں جذب ہوتا جا رہا ہو۔ پاؤں آہستہ آہستہ اُٹھ رہے ہیں، روم سے، جیسے زمین اپنے وسیع آغوش میں شانت سمندر کی لہروں کو ڈانواڈول کر رہی ہو۔ حرکات میں ایک ضبط ہے۔ جس سے ملائمت پیدا ہوتی ہے۔ نرمی، ملائمت، کومل، شانت سمندر کی لہریں، پاؤں آہستہ آہستہ اٹھ رہے ہیں۔ دل ایک نرم گداز دھند میں ملبوس ہوتا جاتا ہے۔ جسم قریب آتے ہیں۔ جسم قریب آتے ہیں، جسم دور جاتے ہیں۔ ہاتھ کمر کے گرد ہے، ہاتھ ہاتھ میں ہے، جسم حرکت کر رہے ہیں ساتھ ساتھ۔ ساتھ ساتھ، ایک نغمے کی لے پر۔ ایک نغمے میں گرفتار۔ جو دماغ روح اور جسم پر چھا گیا ہے۔ نغمہ ابھر رہا ہے۔ ملائم دھند سے شدت پھوٹ رہی ہے، تیزی، شدت، ہیجان۔ یہ جسم قریب آئے، یہ جسم قریب آتا ہے۔ اس جسم میں حرارت ہے۔ اس جسم میں شدت ہے، یہ ملبس حرکت کر رہا ہے، سرشار کے

ہوتی ہیں۔ یہ گردن کا خم ہے۔ یہ جسم میرا ہے، یہ جسم میرا ہے، سمندر کے سینے میں تیزی ہے۔ ایک آگ کی ملائم خنکی سے سینہ معمور ہے، نغمے کی لے ڈانواڈول ہے سازوں کے سُر خرابے میں مخمور ہیں۔ پریشان، منظم سلسلے ہیں، جوش سرد پڑ رہا ہے آندھی آکر گزر گئی ہے۔ چراغ کی لو ساکن ہو رہی ہے۔ دل کی ایک طرف فرشی روشنیاں مدھم ہو رہی ہیں۔ ایک طرف اندھیرا ہے۔ ایک طرف روشنی ہے۔ روشنی کے آگے سلہوٹ حرکت کر رہے ہیں۔ تمہارے جسم پر اندھیرا ہے، مگر یہ تم ہو، یہ تم ہو۔ یہ ہاتھ کا دباؤ، یہ کمر کا خم، یہ خوشبو، ہلکی ہلکی، پیاری پیاری، یہ نغمہ ڈوب جائیگا۔ سازوں میں جذب ہو جائیگا، لے رک جائیگی، جسم ساکت ہو جائیں گے۔

جسم ساکت ہو گئے تھے۔ وہ چلتے چلتے رک گیا، جیسے رکنا فرض ہو۔ رکنا ضروری ہو۔ وہ کھڑا ہو گیا، اسے، وہ رک کیوں گیا۔ اس نے سوچا، اور خیال آگے بڑھ گیا۔ اور وہ چلنے لگا۔ ناچ کے بعد سیما گھر چلی گئی تھی۔ اس نے ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ کہ وہ راستے میں اسے کار سے اتار دے گی۔ لیکن وہ جا نہیں سکا تھا۔ محسن نے روک لیا تھا۔ اسے۔ وہ آج ریس میں جیتا ہے۔ ورنہ تو ہمیشہ ہارتا ہی رہتا ہے جیا کتنی بنک میں جمع کرا دیا ہے، روپیہ وہ ہار کر آتا ہے ہارنے کے بعد وہ کبھی اداس نہیں ہوتا۔ جیتنے کے بعد بہت خوش ہوتا ہے۔ کہنے لگا کبھی کبھی پی لینے میں کیا حرج ہے۔ اس نے انکار بھی کیا لیکن محسن مصر تھا۔ کہنے لگا تم تو صوفی ہو گئے ہو۔ محسن کے ساتھ یکے بعد دیگرے وہ رہ کے چار پیگ پی گیا تھا۔ اپنے شعور کے عقب میں اسے پھر احساس ہوا کہ وہ نشے میں ہے۔ در اصل یہ نشہ نہیں ہے۔ اس نے سوچا، یونہی ایک غنودگی سی ہے یہ نشے کی ابتدائی حالت ہے۔ لیکن نشہ بڑھتا نہیں۔ چار پیگوں سے کیا ہوتا ہے۔ اسنے سات سات پیگ پیئے ہیں۔ اور اسے کچھ نہیں ہوا۔ خوب تھے وہ دن بھی۔ ہائے، کتنی عیاشی کی ہے۔

اس نے ان پچھلے چند سالوں میں، شراب۔ طوائفیں؟ بعض طوائفیں بھی شراب نہیں پیتیں۔ عجیب بات ہے۔ نجمہ بھی نہیں پیتی، دو سال ہو گئے ہوں گے، اسے نجمہ کے گھر گئے ہوئے، اس کے گھر جاؤ تو وہ پلا دیتی ہے۔ لیکن خود نہیں پیتی اور وہ لڑکی جو سینما کی گیلری میں ملی تھی ـــــ ان میٹرو کی گیلری میں ملی تھی، کہتی تھی میں نہیں پیتی، ہا ہا ہا، سے ہنسی آنے لگی کتنی چالاکی سے پلائی تھی۔ اسے شراب، وہ تصور کرنے لگا۔ وہ اسے اپنے ساتھ ہوٹل میں لے آیا تھا۔ کیسی نوآموز سی لڑکی تھی۔ اتنی بڑی بھی تو نہیں تھی۔ زیادہ سے زیادہ انیس برس کی ہو گی یا بیس کی، اس کے ساتھ ہوٹل میں چلی آئی تھی جان بیگ، دو گلاسوں میں لاؤ۔ اس نے بیرے کو کمرے میں بلا کر کہا تھا۔ میں شراب نہیں پیتی، وہ جلدی سے بولی تھی۔ بالکل نہیں؟ جی نہیں، تو پھر آج شروع کر دیجیے۔ مگر وہ مانی نہیں۔ اچھا ایک گلاس لاؤ۔ اس نے بیرے سے کہا۔ اور آپ کیا پئیں گی۔ لیمونیڈ پیجیے۔ ایک گلاس لیمونیڈ بھی لاؤ۔ بیرہ آرڈر لیکر چلا گیا اور وہ خود بھی بیرے کو آواز دیتا ہوا باہر آ گیا۔ اور اس سے کہہ دیا کہ لیمونیڈ میں سفید جن ملا دینا۔ جن ملا دی گئی تھی۔ اس نے جن ملی ہوئی لیمونیڈ کے دو گلاس پیے۔ اس ہلکے سے نشے میں وہ کتنی پیاری ہو گئی تھی۔ وہ کتنی لذیذ ہو گئی تھی۔ کتنی عیش سے گزری تھی وہ رات، شراب نے اسکے جذبات کو شدید کر دیا تھا، شراب نے اسکے جذبات کو بھڑکا دیا تھا۔ اس صحبت شب میں کتنا ہیجان، کتنی شدت۔ کتنا لطف تھا، عیش عیش، پھر صبح ہونے سے کچھ دیر پہلے وہ ایک دوسرے کے بازوؤں میں سو گئے تھے، صبح جب اسے بتایا تھا تو وہ کتنی جھلائی تھی۔ ہا ہا ہا۔

اچانک اسے ٹھوکر لگی اور وہ گرتے گرتے سنبھل گیا، اس کا جی چاہا کہ جس چیز سے اسے ٹھوکر لگی ہے اُسے دوبارہ ٹھوکر مارے، انتقاماً، لیکن اس خواہش

کو اپنے نشے پر محمول کر کے وہ مسکرانے لگا۔ کوئی اجنبی آدمی دلچسپی سے اسے دیکھتا ہوا گزر گیا۔ یہ اسے نشے میں سمجھ رہا ہے۔ اس نے سوچا اور پلٹ کر دیکھا۔ اجنبی آگے چلا گیا تھا، نیم اندھیرے میں آگے جا رہا تھا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ لیکن اجنبی کے قدموں کی آواز اس کے شعور میں آتی رہی اور جوں جوں اجنبی کے قدموں کی آواز دور جاتی گئی، وہ اپنے قدموں کی آواز پر متوجہ ہوتا گیا۔ اور کوئی آواز نہ تھی دکانیں سنسان بند پڑی تھیں۔ کتے تک خاموش تھے۔ بازار کے نیم تاریک سناٹے میں اپنے قدموں کی آواز کو سنتا ہوا چلنے لگا۔ لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ، وہ اپنے دل میں دہرانے لگا۔ وہ تیز چل رہا تھا، بالکل سیدھا، اسے محسوس ہوا، جیسے راستہ دونوں طرف سمٹا ہوا اس کے پاؤں کے نیچے سے نکلا جا رہا ہے۔ جسم میں اعصاب سمٹتے ہوئے سے محسوس ہوتے تھے، ایک تناؤ سا تھا، گردن کے قریب شانوں اور گردن کے سنگم پر یہ تناؤ زیادہ تھا اور کان کے پیچھے کی ہڈی کے ساتھ شدید ہوتا گیا تھا۔ کنپٹیوں پر زور تھا، جیسے کوئی باہر سے اندر کی طرف دبا رہا ہو، اور دماغ سمٹا جا رہا تھا۔ گلابی رنگ کا شیڈ۔ کی دھیمی روشنی — میں اس آرام کرسی پر سو جاتا۔ آپ تو آتے ہی نہیں کبھی، سیما نے کہا تھا۔ لیکن اس دن کے بعد وہ دوبارہ اس کے گھر نہیں گیا تھا۔ اکیلے وہ اکثر اس کا جی گھبرانے لگتا ہے۔ وہ کہتی تھی۔ سیما چاہتی ہے کہ وہ اس کے گھر جایا کرے۔ اسی لئے وہ اسکے گھر دوبارہ نہیں گیا تھا۔ وہ معاملہ کو بڑھانا نہیں چاہتا، کیا فائدہ، ہاں کیا فائدہ کب تک یونہی ہوتا رہے گا۔ ایک عورت کے بعد دوسری عورت — پھر زندگی میں ایک عورت آتی ہے جس سے ملنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ روح سیراب ہو گئی ہے جسے چھوڑا [illegible] سکتا۔ جس سے ملنے کے بعد انسان کو بلوغت سے [illegible]

کو وہ آخر تک نہیں چھوڑ سکا۔ پھر زندگی میں ایک عورت آتی ہے۔ جس سے ملنے کے بعد محسوس ہوتا ہے۔ کہ روح سیراب ہو گئی ہے۔ تمام زندگی آدمی ایسی عورت کو تلاش کرتا رہتا ہوگا، رہتا ہے۔ ایک کے بعد دوسری عورت، وہ دوبارہ سیما کے گھر نہیں گیا۔ اور اس روز، کتنا سفید اور خوش شکل تھا۔ اس کا ہاتھ، اور لمبی مخروطی سفید سی انگلی پر سرخ نگ کی انگوٹھی۔ سیما نے اس کا خیال جاننے کے لئے اسے اپنی انگوٹھی دکھائی تھی۔ وہ سیما کا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے دیکھتا رہا تھا۔ کتنے دلکش طور پر ترتیب ریشو تھا۔ اس کا ہاتھ، پھر اس نے نظریں اٹھائیں۔ سیما پہلے سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، پھر وہ ہنس پڑی۔ عجیب تجربہ سی ہنسی۔ وہ پھر وہاں نہیں گیا تھا۔ لیکن سیما کا مکان کتنا خوبصورت تھا۔ اور دیوار پر قائم وہ گلابی رنگ کا شیڈ اس شیڈ کی دھیمی روشنی ——— میں بیٹھنے کی خواہش پھر اس کے دل میں عود کر آئی۔ اس دن کے بعد سے اکثر اس خواہش نے اسے ستایا تھا۔ دل میں اس آرزو نے گھر کر لیا تھا۔ وہاں جا کر اس گلابی شیڈ کی دھیمی روشنی میں اس پرسکون کمرے میں بیٹھ کر رفتہ رفتہ سو جانے کی۔ سو .. جانے ... کی ــ

وہ سنبھل گیا اور چوکنا ہو گیا۔ نیند میں وہ آگے کو جھکتا ہوا گرنے لگا تھا۔ یہ نیند نہیں ہے، اس نے سوچا۔ نشہ ہے۔ زندگی ہے۔ جلد گھر پہنچ کر وہ بستر پر سو جانا چاہتا تھا۔ کہ گھر پہنچ کر سیدھا بستر پر دھم سے گر کر سو جائے۔ چندرا جاگ رہی ہوگی۔ تو کہے گی، شراب آج پھر پی ہے۔ پچھلی رات کو اس نے چندرا سے کیا ہوا وعدہ توڑ دیا ہے۔ وعدے توڑے جانے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ اس نے سیما سے پھر آنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن وہ دوبارہ اس کے گھر نہیں گیا۔ اس رات گلابی شیڈ کی دھیمی روشنی میں بیٹھے ہوئے ٹک ٹک، ٹک ٹک، آتشدان کے اوپر رکھی ہوئی ٹائم پیس چل رہی تھی۔ آتشدان میں کوئلے دہک رہے تھے۔ انکی سرخی مائل روشنی سے

آتشدان کی دیواریں دھک رہی تھیں۔ آپ بہت چپ ہیں، سیما نے کہا تھا، وہ مسکرا دیا تھا۔ آپ کو شال کی ضرورت ہو تو لے آؤں، وہ بولی تھی۔ نہیں اب میں چلتا ہوں۔ وہ چلا آیا تھا۔ دیوار پر گلابی شیڈ کی دھیمی روشنی کتنی خوبصورت تھی۔ جی چاہتا تھا۔ اس آرام کرسی پر بیٹھا بیٹھا سو جائے اور گلابی رنگ کا شیڈ نیند میں بھی جلتا رہے۔ لیکن وہ وہاں سویا نہیں تھا، اسی لئے اٹھ آیا تھا کہ اسے نیند آ رہی تھی۔ سیما اسے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔ پھر کب آئیں گے آپ؟ امید ہے جلد ہی۔ اس نے جواب دیا تھا۔ لیکن وہ پھر نہیں گیا۔ ٹھیک ہی کیا کہ نہیں گیا۔ بات بڑھتی جاتی۔ چندرا کو معلوم ہو جاتا! چندرا کو معلوم نہ بھی ہوتا تو کیا تھا۔ کیا حق ہے اُسے کہ چندرا کی موجودگی میں سیما سے تعلقات پیدا کرے چندرا بھی چاہیے تو کسی کے ساتھ —— بکواس ہے! شراب دماغ کو چڑھ گئی ہے۔ بھائی صاحب، اس نے خود سے کہا۔ عجیب اول جلول سی باتیں دماغ میں آ رہی ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔ جب دو سال سے پہلے ہی عشق سرد پڑ جاتا ہے تو شادی کیوں کی تھی۔ بس عشق کئے جائیے شادی کی کیا ضرورت ہے۔ درست فرمایا قبلہ و کعبہ آپ کی ذرہ نوازی ہے، شادی بالکل بیکار ہے۔ اس نے سوچا۔ لیکن جو بے وقوفی اب ایک بار کر لی ہے۔ اس کا خمیازہ بھگتئے۔ وہ خود شادی کے لئے بیقرار تھا۔ چندرا نے اسے قبول کر لیا۔ گویا اس پر احسان کیا۔ چندرا کو ہر لحاظ سے وہ اپنے سے بہتر سمجھتا تھا۔ خود اپنے دل میں اس شادی کے لئے اس کا مشکور تھا۔ چندرا سے بہتر بیوی اسے مل ہی نہیں سکتی تھی۔ چندرا ذہین ہے۔ چندرا خوبصورت ہے سیما خوبصورت ہے، چندرا نے آ کر اس کی زندگی کا توازن ٹھیک کر دیا۔ اور کیا۔ اسی لئے تو شادی کی تھی کہ زندگی متوازن ہو جائے۔ زندگی میں بے اعتدالیاں ختم ہوں۔ اپنا ایک گھر ہو۔ بیوی ہو۔ آدمی

آرام کرسی پر دراز ہو کر سو جائے اور گلابی شیڈ کی روشنی نیند میں بھی جلتی رہے لیکن اس کے اپنے گھر میں اس گلابی شیڈ کا تصور کتنا بے ڈھنگا معلوم ہوتا تھا نہیں، اسکے گھر میں یہ ناممکن ہے۔ کتنا بے تکا لگتا ہے۔ اور سیما کے گھر اس کی روشنی سے کتنا دلکش سکون ملتا ہے۔ اس کیفیت کو محسوس کرنے وہ کسی دن پھر وہاں جائیگا۔ ہاں اس کیفیت کو محسوس کرنے۔ سیما سمجھے گی — نہیں، وہ نہیں جائے گا۔ خواہ مخواہ غلط فہمی ہوگی۔ اسے رقص کے دوران میں اسکے شانے پر سیما کے ہاتھ کا دباؤ کتنا ملائم تھا۔ کئی بار اس نے یہ دباؤ محسوس کیا تھا۔ اور کبھی کبھی اس کے جسم کا قریب آجانا۔ کپڑوں کے پیچھے اس کے جسم کا لمس۔ اس کی حرارت، اس کا گداز گداز سا احساس اس کے تصور میں گھس آیا۔ اور ہال کی ایک طرف روشنیاں گل ہوگئی تھیں، ہلکی روشنی کے آگے اس کے جسم کا خاکہ، متحرک، مخزن جذبات۔ اسکے بازو کے حلقے میں، رقص رک جاتا اور وہ سیما کو اپنے بازوؤں میں لے لیتا رقص رک جاتا اور وہ اس کے جسم کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں چرمر کر دیتا۔ اسکا چہرہ روشنی میں آگیا تھا۔ اس کا چہرہ خاموش تھا اور بوجھل اور اس خاموشی کے تل میں ہیجان کی شدت محسوس ہوتی تھی۔ اگر وہ ۔

اسے پھر ٹھوکر لگی اور اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ جیسے وہ اچانک کسی گھاٹی میں گرتا گرتا بچ گیا ہو، یعنی کنارے پر آکر رک گیا ہو۔ جسم میں تمام رگیں یکبارگی جھنجھنا کر رہ گئیں۔ وہ آگے بڑھ گیا اور اسے خیال آیا کہ یہ کیا چیز تھی جس سے ابھی اسے ٹھوکر لگی تھی۔ غالباً پٹری کا کنارہ تھا۔ ہاں پٹری کا کنارہ ہی تھا۔ اسے یقین ہوگیا، اگر یونہی اندھا دھند چلا تو گھر پہنچنے سے پہلے ہی ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائینگے۔ اس نے سوچا، اتنی دیر سے وہ بغیر سوچے سمجھے یونہی گردن اٹھائے چلا جا رہا ہے، اپنی ہی

[illegible]

سے کوئی طاقت سر کو جھکا رہی تھی۔ جیسے گردن پر بہت بھاری بوجھ رکھ دیا گیا ہو۔ اس نے کوشش کرکے گردن کے بوجھ کو جھٹک دیا۔ اور آگے چلتا رہا۔ یہاں سڑک سونی تھی۔ اس نے سوچا۔ کوئی موٹر وغیرہ تو نہیں آ رہی۔ اُس نے بائیں طرف دیکھا۔ دور ایک بس آ رہی تھی۔ اسکی تیز سی آنکھیں دور اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ بس ابھی دور تھی۔ آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ لیکن وہ کھڑا رہا۔ اور ایک نیم خواب کی سی حالت میں بس کے گزر جانے کا انتظار کرتا رہا۔ بس کی آواز آہستہ آہستہ چمکدار آنکھوں کو لئے قریب آئی اور پھر ایک ٹینک کی طرح شور کرتی ہوئی اسکے پاس سے گزر گئی۔ یہ میونسپلٹی کی گوشت لیجانیوالی لاری تھی۔ اسنے سڑک عبور کرتے ہوئے غیر اہم ڈھنگ سے سوچا۔ اور دوسری پٹری پر آکر سیدھی سڑک پر مڑ گیا۔ سڑک سنسان تھی۔ چلتے چلتے کوئی روشنی کا دھبہ آ جاتا تھا اور دونوں سے بچ کر چلا جاتا تھا۔ وہ روشنی سے بچ کر اندھیرے میں چل رہا تھا۔ اندھیرے میں چلنا اچھا لگتا تھا۔ نشہ پھر اس پر غالب آ رہا تھا۔ ذہن کی رگیں ایک گرد سا معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے اخروٹ کا مغز۔ لیکن ملائم اور کھنچتی جا رہی تھیں۔ ہولے جھک کر رستے ہی میں سو جانے کو جی چاہتا تھا۔ اس خواہش کے احساس کو لئے ہوئے وہ چلتا رہا۔ گھر جا کر بستر پر لیٹ جائے اور سو جائے اور گلابی شیشہ کی روشنی نیند میں بھی جلتی رہے۔ وہ چلتا رہا۔ آگے جا کر سڑک دو راستوں میں بٹ جاتی تھی۔ ایک راستے پر سیما کا گھر تھا۔ اسے خیال آیا۔ دو قدم پر اس کا گھر۔ پھر اسے یہ خیال نہیں رہا۔ وہ سیما کے گھر دوبارہ نہیں گیا۔ سیما کو اس کے آنے کی امید تو ہوگی۔ چند گھڑی اس کی انتظار کرتی ہوگی۔ یا شاید سو گئی ہوگی۔ جاتے ہی وہ بستر پر سو جائیگا۔ نیند، نیند، نیند کی بھرپوری دھند میں دھنس جائیگا۔ اور گلابی شیشہ کی روشنی جلتی رہے گی وہ یہ محسوس کرتا ہوا سوچتا ہوا چلتا رہا اور ایک خواب کے شعور میں ڈوبتا گیا۔ اور چلتا رہا۔ [illegible] ٹھیک ایک [illegible] آہستہ

سے اوپر رکھی ہوئی گھڑی چل رہی تھی۔ خاموشی، خاموشی، شال کو پاؤں پہ ڈال کر آتشدان کے سامنے آرام کرسی پہ سو جیئے اور پرسکون کمرے میں دھیمی سی گلابی روشنی جلتی رہے ....

اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ نوکر جاگ رہا ہوگا۔ اندر۔

نوکر نے دروازہ کھول دیا۔

اوہ، یہ تو سیما کا مکان تھا!

محمد حنیف کلیم

حسن و عشق

سر بسر تابندگی و زندگی
پیکر صد آرزو
کائناتِ رنگ و بو
سرخ رو، و تند خو
لالہ زار و نو بہار گو خارزار و کارزار

سر بسر دیوانگی و بندگی
بے نیاز مدعا
پیکر صدق و صفا
رہرو راہ وفا
مضطرب و بے قرار گو نالہ کش و اشکبار

نوشابہ قدوائی

معصیت

زندگی کے خطوط سادہ کو عشرت و غم سے رنگ دیتی ہوں
زیست کو ساغر و سبو دے کر مسکرانے کا ڈھنگ دیتی ہوں

میرے بدمست زمزموں کا فسوں رقص میں ہے تمام بزم جہاں
خون میرا رگوں میں ہستی کی ہیں جوانی جوانیوں کی [illegible]

اس فضائے خموش و ساکت میں میرے ہی ساز کا ترنم ہے
کیفیت ہے بہار میں جس کی میرا ہی پرفسوں تبسم ہے

نشۂ ہستی کا دھندلی آنکھوں میں میری چھائی ہوئی گھٹا ہی سے
دہر خانہ خراب مجھ سے حسیں حسن زندہ مری ادا ہی سے

میری ہنستی ہوئی حسین راتیں جب اشاروں میں مسکراتی ہیں
اٹھنے لگتے ہیں بیخودی میں قدم نیکیاں جھینپتی ہی رہتی ہیں

زندگی زندگی ہے مجھ سے ہی
آدمی آدمی ہے مجھ سے ہی

نیا دور

صدیقہ بیگم سیوہاروی

پلکوں میں آنسو

نازو کی پریشانی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ کتنی دیر ہو گئی۔ شمیم بھائی ابھی تک نہیں آئے نہ جانے کہاں ہوں کس حال میں ہوں۔ بڑی آفت ہے یہ صحافت اور ایسا کوئی نام بھی تو نہیں کہ چلو شہرت ہو گئی اخباروں میں آ گئے۔ تو بھی خیر تسلی مگر یہاں تو جا رہے ہیں مزدوروں میں کسانوں میں ۔۔۔ صبح سے شام تک یہی دھندا ہے نہیں کہ تھوڑی دیر جی بہلا لیتیں۔ مگر نہیں انہیں یہ فکر ہی نہیں۔ جب بھی گئے یہی کہہ گئے کہ کل شام کو ضرور آؤں گا۔ ادھر صبر بند ہوئی۔ اور میں جانتی تھی بھلا پھر بھلا ان کو کیا کام۔ لیکن کتنی شامیں یونہی انتظار انتظار کرتے کرتے گزر چکی ہیں۔ نازو ہر وقت ہی تو انتظار کرتی ہے۔ بعد میں اسکو اپنی اس حماقت پر غصہ آتا یہ بھی کوئی وقت تھا ان کے آنے کا۔ وہ بھی کتنی بیوقوف ہے —— بعض ہوتی یہ سیاست ۔ اب نازو اپنے آپ کو تسلی بھی نہ دے سکتی تھی کہ شمیم بھی اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے۔ شمیم کا وجود ہی تو اس کی زندگی کا سہارا بنا ہوا ہے۔ وہ شمیم کے نازو کہکر مسکرانے پر اپنی زندگی تک قربان کر سکتی تھی۔ لیکن انہیں اپنی نازو سے محبت نہیں —— "اپنی نازو" وہ گھبرا گئی۔ وہ تو نہیں سمجھتے پھر اتنی کیسے ہو سکتی ہے۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا جیسے کسی نے آگ پر پانی ڈال دیا ہو۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں چھلّے کے چھلّے بنتے جا رہے ہیں جو بھٹکتے ہوتے ہوتے ختم ہو جائیں گے۔ اور آکاس تک پہنچ بھی نہ سکیں گے۔ کیا آکاس کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ لیکن یہ رنگینی کیسی رادھا کے [illegible] گونج ۔ وہ پھر کسی نے ٹھوکر دی —— یکایک نازو چونک پڑی۔ دروازہ

میں آہٹ ہوئی جیسے کوئی داخل ہوا۔ کون ہوگا شمیم نہیں آ سکتا، وہ نہیں آئیں گے۔ بے حس پتھر —— لیکن پانی کی بوند بوند بھی اگر ٹپکتی رہی تو وہ ایک دن اس میں گھر کر سکتی ہے۔ وہ اس کو حاصل کر سکتی ہے۔ تو کیا وہ شمیم کے دل میں بھی گھر کر سکتی ہے۔ اسے شمیم سے کتنی محبت ہے۔ نازو نے جب شمیم کو پہلی بار دیکھا تھا تو وہ نہ جانتی تھی کہ وہ کون ہے —— وہ گھر میں ایک اجنبی کی طرح داخل ہوا —— اور اب اپنا —— اس کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ کسی ڈرامہ کی ہیروئن ہے، آج سے پہلے کے تمام سین اس کے دماغ میں گھومنے لگے۔ شمیم جب پہلی بار گھر میں آیا تھا تو اس سے پردہ کرایا گیا تھا۔

"نازو کمرہ میں ہو جا بیٹھی شمیم آ رہا ہے۔" امی کے اس جملے سے اس وقت وہ جھنجھلا گئی تھی۔ ان پابندیوں کی کوئی حد بھی ہے جو آئے دن بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اور پھر اس کو سب سے زیادہ غصہ تو اس "نازو" سے آتا تھا۔ کوئی نام میں نام ہے۔ اچھا بھلا سا نام "نازنین" بگاڑ کر رکھ دیا۔ وہ کمرے میں ایسا جھپٹ کے گھسی کہ گرتے گرتے بچی، اور اس نے اس زور سے دروازہ بند کیا کہ وہ دوبارہ کھل گیا اور پھر بند کرنے سے پہلے امی کی طرف خوب گھور کر دیکھا۔ جیسے کوئی نوکر اپنے آقا کے جبر و سختی سے تنگ آ کر کچھ سخت و سست سنانا چاہتا ہے، لیکن پھر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مانا کہ وہ اس کی ماں ہے، اس کا اتنا خیال کرتی ہے۔ لیکن یہ بھی کوئی بات ہے کہ آدمی کو جانور سمجھنے لگے، ان پر کوئی اتنی پابندیاں لگائے تو معلوم ہو لیکن اس کے بعد بھی تو چین نہیں جب دیکھو جب چلاتی رہتی ہیں "یہ آج کل کی لڑکیاں —— نہ شرم نہ لحاظ بیاہیوں کی طرح رہتی ہیں۔ ٹیڑھی مانگ نکالے دوپٹہ گلے میں پڑا"۔ اور پھر بھی بس نہیں بلکہ اپنی مثال پیش کرتی ہیں "ایک ہم بھی تو تھے ماں کے اشاروں پر پھرکی سے ناچتے تھے۔ مجال کیا کہ ذرا پٹری سے سرک

جائے۔ ہر جگہ اپنی مثال ہم سے تو ایسے نہیں رہا جاتا ہم سے تو اشاروں پر ناچنا نہیں آتا۔ اس پردہ کی کوئی حد بھی ہے۔ خود تو سامنے ڈٹ کر بیٹھ گئی ہوں گی۔ اور یہاں ہمیں کمرہ میں لے کر ٹھونس دیا —— لیکن اب آہستہ آہستہ اس کا غصہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ دیکھنا چاہئے چھپ کر —— اس کے ذہن میں یہ خیال خود بخود پیدا ہوا۔ کوئی کیا دیکھے گا کمرہ تو چاروں طرف سے بند ہے اور پھر امی تو اپنی بات کرنے میں مشغول ہیں —— دیکھیں کیا بات کر رہی ہیں امی —— ناز دروازہ کے قریب بڑھی۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو یقین دلا رہی تھی کہ وہ باتیں سننے جا رہی ہے۔ باتیں سننے میں حرج ہی کیا ہے۔ کونسی بری بات ہے۔ اور اس نے دروازہ میں سے جھانکنا شروع کر دیا۔ امّی ان کے قریب بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔

"کیوں شمیم تو آخر یہاں کیا کام کرتا ہے"

"کہیں نہیں چچی یونہی ذرا سا سیاسی کام ہے وہ کرتا ہوں"

"کتنا مل جاتا ہوگا اس میں"

شمیم کے چہرے پر مسکراہٹ سی کھیل گئی۔ لیکن ناز نے جو سنا کہ اماں پوچھتی ہیں کہ کتنا مل جاتا ہوگا۔ اس سیاسی کام میں۔ تو اس نے ضبط کرنے کی کوشش کی مگر کھل سے ہنسی آ ہی گئی۔ یہ بھی کوئی گورنمنٹ کی نوکری ہوئی۔ ناز جو اندر سے ہنسی تو وہ سنجیدہ ہوگیا۔ بلکہ اپنے مسکرانے پر کچھ جھینپ سا گیا۔ اس نے اس سوال کو ٹالتے ہوئے پانی مانگا۔

"اچھا تو پھر تو مزے سے ہیں؟"

"نہیں چچی ذرا طبیعت خراب تھی"

"پھر تو پہلے کی طرح ملازمت بھی ڈھونڈھ رہے [illegible]"

[redacted]

باورچی خانہ میں چلی جا بیٹیا کے لئے کچھ ناشتہ پکا دے پردہ کا ہے کا اپنا ہی تو بھائی ہے۔“

پھر تو نازو خوش ہو گئی۔ اس وقت امی کا نازو کہنا بھی اس کو ناگوار نہ لگا اس نے فوراً دوپٹہ سنبھالا اور دوسری جانب سے باورچی خانہ میں چلی گئی۔ نسیم نے شرما کر سر جھکا لیا۔ امی نے پھر کہنا شروع کر دیا۔

”یہ لڑکی ایسی شرمیلی ہے کہ اپنوں تک سے تو پردہ کرتی ہے۔ کوئی اپنوں سے بھی چھپتا ہے“! اس کو ہنسی آئی ”یہ امی بھی بس خوب ہی آدمی ہیں، خود ہی تو پردہ کراتی ہیں اور الزام میرے اوپر رکھتی ہیں، میں نے ہی تو خود کالج چھوڑا تھا جیسے —— اس کے غصے کا پارہ پھر بڑھنا شروع ہوا۔ اچھی بھلی پڑھ رہی تھی لیکن چھڑوا دیا۔ ”سیانی لڑکیوں کا کالج جانا ٹھیک نہیں، بے بس بہت پڑھ چکی“۔ ان کے لئے تو اس سے زیادہ بس اور کوئی پڑھائی نہیں۔ سیانی کی بھی بس ایک ہی رہی، نہ پڑھانے کے سو بہانے ہیں۔ آخر اتنی لڑکیاں پڑھتی ہیں کوئی سیانی ہی نہیں۔ لے دے کر وہی ایک سیانی رہ گئی ہے جس کا پڑھنا ٹھیک نہیں۔ وہ آلو چھیلتی جا رہی تھی اور دل ہی دل میں امی پر ناراض ہو رہی تھی، اس کے ساتھ کی لڑکیاں سب ہی تو پڑھتی ہیں، عالیہ، ریحانہ، مارگریٹ، نگہت، پریما۔ جوں جوں انکا نام اس کے ذہن میں آتا جاتا تھا انکی شکل نازو کی نظروں میں پھرتی جاتی تھی، وہ للچائی نظروں سے دیکھ رہی تھی، وہ اس درجہ اپنے خیالات میں کھو گئی کہ اگر آلو ختم نہ ہو جاتے تو وہ نہ جانے کبتک یونہی کاٹتی رہتی، آلو کے چھلکے کتنے موٹے کٹے ہیں ویسے ہی تھوڑے سے تھے، اب اور کم ہو گئے۔ اس کو اپنے اوپر غصہ آیا۔ وہ بھی پھینکے آخر اتنی تکلیف کیوں کی پھر اس نے سوچا کہ چلو تھوڑا سا انڈے کا حلوہ بھی بنا دیگی بس دو چیزیں کافی ہوں گی،

چائے بھی تو ہوگی کیونکہ بغیر چائے کے کہیں ناشتہ ہوتا ہے۔ اب اس نے آلو کے باریک قتلے کر ڈالے اور تلنا شروع کر دیا اور جلدی سے چولہے کے دوسری طرف چائے کے لئے پانی رکھ دیا۔ وہ سننا چاہتی تھی کہ امی کیا باتیں کر رہی ہیں مگر گھی چھن چھن کر رہا تھا اس میں ٹھیک سے سنائی نہیں دیتا، کوئی کوئی لفظ اس کی سمجھ میں آجاتا تھا۔ کوئی سیدھی سی بات کر رہے ہیں امی سے — اُسے ہنسی آئی۔ ہندو مسلم اتحاد، گاندھی، جناح ملاقات کے سلسلے میں کچھ سمجھا رہے تھے اس نے غور سے سننا شروع کر دیا۔ امی کہہ رہی تھیں۔

"بیٹا سچ مچ تم لوگوں نے جب سے آنکھ کھولی ہے یہی لڑائی جھگڑا دیکھا نہیں تو پہلا زمانہ ایسا تھا کہ ہندو مسلمان سب ہی مل کر رہتے تھے۔ رام لیلا میں مسلمان ہندوؤں کا ساتھ دیتے تھے اور ہندو مسلمانوں کے ساتھ محرم میں علم اور تعزیئے اُٹھاتے تھے ایک دن وہ بھی تھا کہ بیٹا! اور ایک آج ہے کہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔"

"جی ہاں آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن اب پھر ایک ہو جائیں گے، بہت کچھ اُمیدیں ہیں۔ بغیر ایک ہوئے کام بھی تو نہیں چلتا۔"

اس کے بعد پھر وہ کچھ نہ سن سکی اس کے آلو جلنے لگے تھے اس نے جھٹ سے آلو اتارے اور اس کے بعد جلدی جلدی انڈے کا حلوہ تیار کرنے لگی۔

ذرا سی دیر میں تمام ناشتہ تیار ہو گیا۔ اس نے ٹرے میں باقاعدہ لگایا اور امی کو آواز دی "امی ناشتہ تیار ہو گیا لیجائے"۔

امی باورچی خانے میں آگئیں۔ "بیٹی تو خود ہی لے آئی ہوتی" انھوں نے آہستہ سے کہا —

[redacted]

"ارے میں نے تھوڑا ہی کہا تھا کہ تو ایسا پردہ کرنے لگ۔ ذرا منہ ڈھک کے سامنے آجا اپنے گھر کے کام کاج میں بھی حرج نہ ہو۔ پھر یہ تو بھیا نسیم کا لڑکا ہے اتنے دن بعد یہاں آیا ہے، تو اسے نہیں جانتی۔ تو اپنے گھر کا لڑکا ہے۔" امی ٹرے لیکر چل دیں اور وہاں پہنچ کر بولیں "نازو بیٹا تو بھی کچھ کھالے، تو نے نہیں کھایا صبح سے، آجا یہاں بھیا کے پاس۔"

اور پھر شمیم سے بولیں "اس کا جی اچھا نہیں تھا، میں نے آج روزہ نہیں رکھنے دیا اسے۔"

اس وقت نازو کتنی لجاتی ہوئی آکر دوسری چارپائی پر ماں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ سر جھکائے ہوئے تھی مگر اس کا چہرہ کیسا لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ کہاں تو وہ غور سے بات سن رہی تھی اور اب یہ تک بھول گئی کہ کہاں بیٹھی ہے۔ وہ چارپائی کے دو ٹوٹے بانوں کو انجانے جوڑنے لگی۔ اس کو کتنی شرم آتی جب اس کے سر کے بال آپ ہی آپ لٹک گئے۔ اس کو غصہ تو بہت آیا۔ منحوس وقت بھی تو نہیں دیکھتے جب نہیں تب بکھر پڑتے ہیں، اور لانبے بھی۔ تو بلا کے ہیں مگر اس نے بھی انہیں یہ سزا دی کہ دیر تک ایسے ہی لٹکنے دیا۔ اس نے کنکھیوں سے دیکھا شمیم شاید اسی کی طرف دیکھ رہا تھا تو پھر اس نے گھبرا کر انہیں اوپر ڈال لیا۔ لیکن وہ تو رکنے کا نام نہ لیتے تھے، بمشکل تمام کئی جھٹکے کھا کر ٹھہرے۔

تھوڑی دیر تک تو وہاں بالکل خاموشی رہی لیکن پھر شمیم نے خود اس سکوت کو توڑا

"یہ کیا کرتی ہیں"

"نازو" امی چونک پڑیں "ہاں بیٹے یہ اسکول میں پڑھتی تھی، اس

کالج جانا ٹھیک نہیں زمانہ بڑا خراب ہے پھر اتنا پڑھ لیا اب کیا ضرورت ہے۔ شمیم تو خاموش ہو گیا لیکن نازو کی جھنجھلاہٹ بڑھ چکی تھی اور اب اس کو پھر امی پر غصہ آنے لگا۔ اچھا فیصلہ کر بیٹھ گئیں ——

نازو چونک پڑی یہ تھی اس دردناک ڈرامہ کی ابتدا! اس وقت اس میں ایک جھنجھلاہٹ تھی، ایک شرم تھی جو آہستہ آہستہ پرسکون تمناؤں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ کیا یہ آرزوئیں پروان نہ چڑھ سکیں گی۔ لیکن وہ یاس کے اس اتھاہ سمندر میں امید کی اس ناؤ کے کھینے سے باز نہیں آئے گی کاش کوئی اس کا رازدار بھی ہوتا جس کے شانوں پر وہ سر رکھ کر روتی اور گھنٹوں روتی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے شاید شمیم کو معلوم ہے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ اسی وجہ سے نہ آتے ہوں، لیکن نہیں ان کو کیا معلوم، میں نے ان کو محسوس بھی تو نہ ہونے دیا۔ لیکن اگر وہ اس راز کو سینے سے باہر لے آئے تو اس کا کتنا بڑا بوجھ کم ہو جائیگا۔ وہ مطمئن ہو جائے گی۔ اس نے اپنی راتوں کی نیندوں کو حرام کر رکھا ہے کتنی راتیں اسے جاگتے گزر گئیں وہ رات کی تاریکی میں دیوانوں کی طرح دوڑتی ہے، گرتی ہے —— اس اندھیارے میں اس کا سانس گھٹ رہا ہے —— روشنی کی تلاش۔

وہ آئینہ کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے صبح سے اپنے بال تک نہیں بنائے تھے۔ الجھے ہوئے اس نے کنگھا کرنا شروع کر دیا۔ اس کا دماغ بیکار ہو گیا تھا۔ وہ کنگھا کئے جا رہی تھی جو آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں رینگ رہا تھا وہ سلجھ بھی گئے تھے مگر نازو کا ہاتھ برابر چل رہا تھا اس کی آنکھیں ہر چند کھلی ہوئی تھیں مگر اسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ شمیم کا وجود اسکی زندگی کو بنا سکتا تھا، اس میں لطافت پیدا کر سکتا تھا۔ کاش وہ اس کے پاس ہوتا —— وہ یکایک آنکھیں پھاڑ پھاڑ

کر دیکھنے لگی کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ شمیم آئینہ میں اس کے پاس کھڑا ہے۔ اس کی زلفوں سے کھیل رہا ہے۔ جتنا بھی وہ غور سے دیکھتی شمیم کی شکل اتنی ہی صاف نظر آتی، یہ آئینہ کتنا صاف ہے کہیں دھبا تک نہیں اس نے دیکھا کہ جیسے شمیم نے اس کا سر اپنی طرف جھکایا ہو، نوجوان فطرت کے ابدی اور نہ معدوم ہونے والے نقوش ثبت کرنے کے لئے۔ اس کا سر ایک طرف کو جھک گیا۔ نازو چونک پڑی وہاں کوئی بھی تو نہ تھا اس نے غور سے دیکھا ایک میلا آئینہ اس کے سامنے تھا جس میں اس کا عکس دھندلا دھندلا نظر آرہا تھا۔ وہ تنہا تھی، ابھی اس میں اُس نے شمیم کو دیکھا کتنے صاف اور واضح نقوش تھے۔ لیکن یہ آئینہ کتنا گندا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس کی گرد کو کسی نے جھاڑا تک نہیں، شمیم کو اس نے ابھی دیکھا تھا۔ اس آئینہ میں اپنی داہنی طرف "شمیم" اس نے آہستہ سے کہا۔ "لو یہ میری پیشانی ہے، اس پر اپنی محبت کے نقوش ثبت کردو" وہ چونک پڑی آخر کس سے بات کر رہی ہے۔ شمیم یہاں کہاں۔ پھر وہ رومانوی شمیم ہرگز نہیں۔ وہ تو رومان کے نازک شیشہ کو اپنے ایک سیاسی گرز سے چکنا چور کر سکتا ہے۔ رومانی اور قلبی تکلیف اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیا دنیا کے مزدور اس سے زیادہ پریشان ہیں جن کے لئے وہ اپنی زندگی خراب کر رہا ہے۔ اس کے ذہن میں شمیم کی وہ باتیں گونجنے لگیں ——

"نازو ہم کو سرمایہ داری ختم کرنی ہے اس لئے کہ کثیر التعداد طبقہ، جس کو مزدور کہتے ہیں بھوکا مر رہا ہے۔ جس کے پاس اتنا نہیں کہ وہ زندگی گذار سکے۔ ہم کو شہنشاہیت ختم کرنی ہے کیونکہ اس کے جبڑوں میں انسانیت کا خون لگا ہوا ہے۔ آج ہماری تہذیب کتنی پرانی ہو چکی ہے لیکن اب بھی ایک انسان دوسرے پر ظلم کرتا ہے۔ اب بھی وہ کمزوروں کے جسم سے ایک ایک قطرہ خون چوس لینا چاہتا

ہے کمزور کو دنیا میں رہنے کا حق نہیں اسلئے کہ وہ کمزور ہے، اس لئے کہ وہ تم پر ظلم نہیں کرتا، اس لئے کہ وہ راتوں کو بھوکا سوتا ہے۔ وہ تمہاری زندہ اور بیکار لاشیں کندھوں پر اٹھاتا ہے۔"

جو باتیں شمیم کرتا ہے وہ کس قدر جذباتی ہوتی ہیں، وہ غصہ سے کانپ اٹھتا ہے، کتنا رحم دل ہے، لیکن نآزو کا دل جل رہا ہے۔ دھواں اُٹھ رہا ہے، اس کا دم گھٹ رہا ہے —— مگر شمیم کو اسکی ذرا بھی پرواہ نہیں —— اس کو ہر وقت سیاست —— سیاست —— نآزو کو نفرت ہونے لگی مزدوروں سے ان لوگوں سے جن کا وہ ذکر کرتا ہے، انھوں نے شمیم کو اس سے چھین لیا ہے قومی خدمت —— اس کا دماغ الجھنے لگا۔ دنیا میں کہیں کوئی برابر بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے کہنے سے کیا ہوتا ہے ہر وقت تو لال لال کتابیں لئے پھرتے ہیں۔ خونی رنگ کی کتابیں، بھلا یہ بھی کوئی رنگ ہے اُسے اس رنگ سے الجھن ہونے لگی اسے نفرت ہو گئی ہے اس سرخی سے —— اس لالی سے۔

وہ انھیں خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ یکایک شمیم نے دروازہ کھولا۔

"تم کمرہ میں کیوں اتنی دیر سے بند پڑی ہو، کچھ معلوم بھی ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح اور مہاتما گاندھی ادھر باہم سمجھوتہ کرنے کے سلسلے میں ایک دوسرے سے مل رہے ہیں اور ادھر برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چرچل سے امریکہ کے صدر مسٹر روزولٹ کیوبک میں ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں مل رہے ہیں اور تیسری طرف جرمنی میں فاشزم کا خاتمہ ہو رہا ہے —— دیکھا تم نے ——

لو سرخ سویرا آتا ہے، آزادی کا، آزادی کا۔
گلنار ترانہ گاتا ہے، آزادی کا، آزادی کا۔
دیکھو پرچم لہراتا ہے، آزادی کا، آزادی کا۔

لو سرخ سویرا آتا ہے، آزادی کا، آزادی کا۔
لو سرخ سویرا آتا ہے۔ آزادی کا، آزادی کا۔
لو سرخ سویرا آتا ہے۔ آزادی کا، آزادی کا۔

شمیم اس مصرع کو جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے واقعی سرخ سویرا آ رہا ہے۔ جیسے اس کی محنتوں کا پھل بہت جلد ملنے والا ہے۔ صبح آزادی کی شفق اس کی نظروں میں ناچ رہی تھی۔ اس نے تھیلے سے ایک کتاب نکالی جس پر "سرخ سویرا" لکھا ہوا تھا ——

"لو نازو! یہ کتاب میں تم کو بطور تحفہ پیش کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ تم اس کو شوق سے پڑھوگی ——"

"کیوں نہیں" —— نازو نے اس کو اپنے ہاتھ میں بے دلی سے لے لیا۔ اس کی پژمردگی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے شمیم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے کوئی پاگل کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر اس نے کتاب کی طرف دیکھا —— سرخ رنگ —— شفقی رنگ —— ایک مزدور اپنے قوی ہاتھوں سے مشین کا پہیہ چلا رہا تھا۔ وہ جھنجھلا گئی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ شمیم متحیر تھا کہ نازو اس قدر پریشان کیوں ہے۔ —— "نازو تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"کچھ نہیں —— اچھی تو ہوں" اس کے گالوں کی حمرت پہلے سے زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ شمیم نے ہنستے ہوئے اس کو آئینہ کے سامنے کر دیا۔

اس کے رخسار لال انگارا ہو رہے تھے، جیسے ساری کائنات لال ہو جائے گی۔ گالوں کا گلنار رنگ دیکھ کر اس نے چاہا کہ ان کو نوچ کر پھینک دے۔ منحوس کہیں کے ——

"کیوں تمہیں یہ کتاب پسند ہے"۔ شمیم نے خاموشی کو توڑا

"جی ہاں بہت اچھی ہے"

"بہت اچھی، یہ بھی ایک ہی رہی۔ تم نے بغیر پڑھے ہی رائے قائم کرلی"

نازو جھینپ گئی، وہ بھی کتنی بے وقوف ہے۔ بغیر سوچے سمجھے جو کچھ جی میں آتا ہے بک جاتی ہے۔

"نہیں میرا مطلب اس کی ظاہری شکل و صورت سے ہے" اس نے بات کو نباہ دیا "اچھا آئیے ناشتہ تو کر لیجئے"۔

"واہ میں ناشتہ تو کب کا کر چکا، جب تم کمرہ میں عبادت کر رہی تھیں"۔ شمیم کی زبان سے بے ساختہ "عبادت" کا لفظ یونہی نکل گیا لیکن نازو جھینپ سی گئی۔ یہ بھی ایک قسم کی عبادت ہی ہے۔

"اچھا تو آپ دیر کے آئے ہوئے ہیں"!

"مجھے تو کافی دیر ہوگئی تمہارے متعلق امی سے کئی مرتبہ پوچھا مگر کچھ پتہ نہیں ملا، پھر میں نے کہا کہ کہیں کچھ طبیعت تو خراب نہیں۔ انھوں نے کہا کہ تو خود جا کر دیکھ لے شاید پچھلے کمرہ میں ہے"۔

"ہاں یونہی ذرا طبیعت گھبرائی تھی تو یہاں چلی آئی ویسے تو میری طبیعت ٹھیک ہے"۔

نازو کی آنکھوں میں مسرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی، اس نے گھنی پلکوں میں سے اس طرح دیکھا کہ کوئی چیز ان میں سے جھانک رہی ہے۔ کیا واقعی شمیم اس سے محبت کرتا ہے۔ کیا سچ مچ اسے نازو کا اتنا خیال ہے۔ وہ شائد اس سے بھی زیادہ سوچتی لیکن شمیم کی موجودگی حائل ہوگئی۔ اس وقت اس کا دماغ کوئی کام نہیں کر رہا تھا۔ کتنی دیر سے وہ یہاں کھڑی تھی اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس کے بال کھلے ہوئے ہیں، یونہی اس نے محسوس کیا، وہ جھینپ سی گئی۔ لیکن کیا یہ

بال اسکی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ واقعی وہ بہت خوبصورت معلوم ہو رہی ہوگی۔ اس نے غیر شعوری طور پر بالوں کی ایک لٹ کو اپنی انگلیوں میں لپیٹنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ اپنے ماحول کو بھول گئی تھی۔ لیکن شمیم نے اس احساس کو ختم کرنے کے لئے پھر گفتگو شروع کرنی چاہی۔

"نازو اگر تمھیں یہاں کوئی کام نہ ہو تو آؤ باہر بیٹھیں"! نازو نے بغیر جواب دیئے قدم آگے کو بڑھائے اور وہ دونوں آہستہ آہستہ نکل کر برآمدے میں آگئے۔ امی باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی کھانا پکا رہی تھیں۔

"نازو میں ایک چیز تو دینا بھول ہی گیا" شمیم نے تیزی سے پھر تھیلے میں ہاتھ ڈالا "لو یہ ہماری پارٹی کا ہفتہ وار اخبار ہے ــــ "قومی جنگ"۔

نازو کا ذہن پہلے ہی سے ایک عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

"یہ سفید کاغذ پر چھپا ہے" ــــ اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا وہ گھبرا گئی۔ نہ جانے شمیم کیا سوچے۔

"اور کیا رنگین کاغذ پر چھپتا۔ تمھارا مطلب لال رنگ سے ہے؟"

"نہیں، میں نے یونہی پوچھا تھا"

"نازو، یہ رنگ بذات خود ایک اشاریت رکھتا ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ لال رنگ سے ہماری مراد مزدوروں کی انقلابی تحریک ہے۔ یہی ہمارے بین الاقوامی جھنڈے کا رنگ ہے۔ تم نے جذبی کا وہ شعر سنا ــــ

وہ بلندی پہ ہے مزدوروں کا پرچم آگ سا
اس کی جانب دیکھ جب تھکنے لگیں تیرے قویٰ

ہم اس رنگ کو دیکھکر اپنے تھکے ہوئے بازوؤں میں قوت محسوس کرتے ہیں۔ اور دگنی قوت سے انسانی آزادی کے لئے کوشش کرتے ہیں" شمیم [illegible]

ن جوش آتا جا رہا تھا، اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہو گئی تھیں۔ نازو نے تی پوچھی "آپ کو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی، دن بھر دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے تی بڑی مصیبت کا کام ہے۔"

"نازو تم سمجھتی ہو کہ میں یونہی بیکار مارا مارا پھرتا ہوں، کاش اپنے ملک کی ابتر حالت پر بھی نظر ڈالیں۔ اپنے غلام ملک پر — ہمیں اس کی آزادی کی راہیں تلاش کرنی ہیں، ہم تلاش کرتے ہیں، کوشش کرتے ہیں۔ اور اس وقت تک جب تک کہ ہم کو راستہ نہیں مل جاتا۔ چنانچہ ہندوستان کی آزادی ہم اپنی قوت بازو سے حاصل کر سکتے ہیں لیکن متحد ہو کر — ہندو مسلم اتحاد اس کے لئے ناگزیر ہے۔ ہمیں چاہئے کہ متحد ہو کر اس کے لئے کوشش ریں۔ ہندو مسلم اتحاد ہمارے تمام قومی مسائل کو حل کر سکتا ہے یہ غذائی بحران جو آج ہر طرف دکھائی دے رہا ہے دور ہو سکتا ہے لیکن صرف قومی حکومت کے قوت بازو پر" شمیم بولتا جا رہا تھا اس کو اس کا مطلق احساس نہ تھا کہ نازو اس کی باتوں میں دلچسپی لے رہی ہے یا نہیں — نازو کی افسردگی اب غصہ کے حدود میں پہنچ چکی تھی۔ اس کے لئے یہ سیاست ایک مصیبت ہو گئی تھی۔ ہر وقت یہ خشک باتیں — ہندوستان کی آزادی، ہندو مسلم اتحاد، قومی حکومت — ہر وقت اسی کا وظیفہ ہو گیا ہے۔ عجیب آدمی ہیں یہ بھی۔ کبھی یہ نہیں کہ ہنس بول کر باتیں کریں۔ آخر ہماری بھی طبیعت چاہتی ہے کہ اور طرح کی باتیں کریں۔ جب بھی آتے ہیں ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اور جب یہ ختم نہ ہونے والی باتیں ختم کرتے ہیں تو چل دیتے ہیں۔ میں صبح سے شام تک انتظار کرتی ہوں — میں بھی بیوقوف ہوں جو انتظار کروں۔ لیکن نہیں ج کا وقت کس طرح کٹے گا۔ یہ پہاڑ سا دن کبھی ختم نہ ہوگا —

اتنے میں امی باورچی خانے سے نکلیں، شاید وہ بھی شمیم کی باتیں سن رہی تھیں۔

" بیٹا یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہیگا، ہندو مسلمان کبھی ٹھیک نہ ہونگے تو یہ تو بتا کہ کبھی نماز بھی پڑھتا ہے"!

" نماز ! —— چچی آپنے نہیں سنا کسی شاعر نے کہا ہے

ع غلام قوم کا سجدہ حرام ہوتا ہے

بس کیا فائدہ اپنی نمازوں کو حرام کرنے سے۔ اسی لئے میں نہیں ——"

" یہ کس مسئلہ میں ہے۔ اپنے نئے نئے مسئلے مسائل تم لوگ نکالتے ہو، یہ اسکول کالجوں نے تو اور بھی خراب کر رکھا ہے"!

" اچھا چچی اجازت دیجئے۔ کل شام کو پھر آؤں گا"

" کل شام کو آئیں گے ! —— کہیں آئے نہ ہوں" نازو نے دل ہی دل میں کہا۔ ہمیشہ یہی وعدہ کرتے ہیں، جانے ہوں گے قومی خدمت کیلئے۔ شمیم گھر سے باہر جا چکا تھا۔ نازو کا دماغ خراب ہو رہا تھا کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے اس کی نظر کتاب پر پڑی" سرخ سویرا" پھر اس نے اخبار کو ہاتھ میں اٹھا لیا " قومی جنگ" اور " سرخ سویرا" دونوں چیزیں اس کے ہاتھوں میں تھیں۔ وہ اندر کمرہ میں چلی گئی وہاں اس نے چارپائی پر دونوں کو پٹک دیا۔ —سرخ سویرا کہیں کا۔ کوئی کتاب میں کتاب ہے۔ وہ چارپائی پر گر پڑی۔ اور گھنٹوں روئی —— وہ شائد اسی طرح لیٹی رہتی اگر امی نہ آجاتیں۔

" نازو لے میں تجھے ساری دینا بھول گئی تھی۔ تیرے ابا لائے تھے" نازو نے اپنے آنسو پونچھے اور دوسری طرف غسل خانے میں چلی گئی۔ منہ دھو کر باہر آئی۔

"کہاں ہے وہ ساری؟"

"لے یہ رکھی ہے" امی نے ایک سرخ ساری اس کے ہاتھ میں دیدی۔

"یہ ساری" وہ جھنجھلا گئی "میں تو نہیں پہنتی یہ بھی کوئی رنگ ہے لال خونی —— مجھے نہیں چاہئے" یہ کہکر اس نے اس کو چارپائی پر پٹک دیا۔ جہاں دیکھو یہی رنگ ہے جیسے ساری دنیا لال رنگ کی ہو جائے گی —— شام ہو چکی تھی اس نے اوپر کی طرف جو نظر اٹھائی تو آسمان کی لالی سامنے آگئی، وہ تیزی سے کمرے میں گھس گئی —— کاش وہ اپنی آنکھیں پھوڑ لیتی، یہ لال لال رنگ تو نظر نہ آتا۔ جدھر دیکھو یہی رنگ ہے —— اس کا دماغ الجھنے لگا اس نے یہ بھی نہ سنا کہ امی کیا بڑبڑا رہی ہیں۔ اس نے زندگی میں شاید پہلی بار امی کے غصہ کی پروا نہیں کی۔ لیکن امی کی بھی کیا غلطی انہیں کیا معلوم کہ نازو کو لال رنگ سے کتنی نفرت ہے۔ نازو نے بکس میں سے ایک سیاہ کرتا نکالا، اور پہن کر باہر آئی۔ اب وہ ہمیشہ اسی رنگ کے کپڑے پہنے گی۔ اسکی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں تاریکی بڑھتی جا رہی تھی نازو کی گھبراہٹ بھی اب کچھ کم ہو گئی تھی سرخی اس کی نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس کی جگہ سیاہی نے لے لی تھی۔ وہ کچھ مطمئن سی ہو گئی تھی۔

* * *

عرصہ تک اس ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ شمیم کی سیاسی گرمجوشی اپنی جگہ پر قائم تھی تو نازو کی گھٹن، سیاست سے نفرت، ایک خاموش بغاوت کی حیثیت رکھتی تھی۔ جوں جوں حسرت کا عنصر بڑھتا جاتا تھا محبت میں بھی زیادتی ہوتی جاتی تھی۔ لیکن نازو کو یقین ہو چکا تھا کہ شمیم اس سے محبت نہیں کرتا۔ وہ یہاں صرف اپنے سیاسی مقاصد کے لئے آتا ہے کیونکہ وہ اکثر کہا بھی کرتا تھا [illegible] تم کو اپنا پیغام زیادہ سے زیادہ آدمیوں میں پہنچانا ہے، اور ان کو

اپنا ہم خیال بناتا ہے۔ وہ نازو پھر سوچتی کہ کیا وہ اتنی خوبصورت نہیں کہ شمیم اس سے محبت کرے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور سے محبت کرتا ہو۔ کوئی پری پیکر اس کے دل پر حکومت کرتی ہو اور وہ اس کا دم بھرتا ہو لیکن نہیں شمیم کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ سیاست کی پتھریلی زمین میں محبت کا حسین اور نرم پودا کبھی سرسبز نہیں ہو سکتا۔ وہ تو محبت کی آگ کو سیاست سے بجھا دینا چاہتا ہے لیکن نازو اس کو بجھنے نہیں دے گی وہ آگ ہمیشہ اس کے سینے میں بھڑکتی رہے گی لیکن کیا مردوں میں جذبات نہیں ہوتے کیا ان کی دنیا میں محبت ایک بے معنی فقرہ ہے لیکن نہیں شمیم کا کردار یقیناً اور مردوں سے مختلف ہے۔ نازو جب بھی شمیم کو غور سے دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں اُس کا دل تو کبھی نظر نہیں آیا بلکہ وہ ان پلکوں میں ایک دماغ دیکھتی —— وہ بیسویں صدی کا' وہ نمائندہ نوجوان ہے جس کے دماغ نے اس کے دل پر قبضہ کر رکھا ہے لیکن کیا نازو کے دل میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ اس کے دماغ کو ہرا سکتی۔ یقیناً وہ کمزور ہے اس میں طاقت نہیں ——

* * *

دن اس ہی عسرت سے گذرتے رہے حتیٰ کہ ایک دن نازو کی شادی بھی ہو گئی اور ایسے اجنبی سے جس کو وہ جانتی بھی نہ تھی۔ اس نے مخالفت تو کی لیکن مشرقیت کی حدود میں جس کا کوئی اثر نہ ہو سکا۔ وہ اس جدوجہد میں ہار گئی اور ایسا ہاری کہ تھک کر بیٹھ گئی۔

نازو کی شادی میں شمیم بھی مدعو تھا۔ لیکن اس نے سیاسی سرگرمیوں کی آڑ لے کر شادی میں شرکت نہ کی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس روز وہ تمام دن پارٹی کے دفتر میں پڑا رہا۔ شام کو جب کام [illegible] دفتر سے [illegible] آئے تو انہوں

بے تکلفی سے کہا "کیوں کامریڈ شمیم کیا معاملہ ہے۔ کیسی طبیعت ہے؟"

"کامریڈ یونہی سر میں درد ہے" اس نے گلوگیر آواز میں جواب دیا اور جب کامریڈ رمیش نے غور سے دیکھا تو وہ رو رہا تھا۔ اس کا تکیہ قریب قریب پورا تر ہو چکا تھا۔ صرف ایک وہی حصہ باقی تھا جس پر سرخ گلاب کا پھول کڑھا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کو عمداً بھیگنے سے بچایا گیا ہے۔ کامریڈ رمیش نے بہت معلوم کرنا چاہا کہ کیا بات ہے مگر شمیم نے وہ راز کسی کو نہ بتایا، پارٹی آفس میں ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ اب شمیم میں وہ بات نہیں ـــ وہ گرم جوشی نہیں جو پہلے تھی، وہاں سب سے زیادہ شور کرنے والا شمیم ایک خاموش تماشائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب بھی کوئی سیاست کے کسی موضوع پر گفتگو کرتا تو اس کی طبیعت الجھتی ـــ "ہر وقت سیاست ہی سیاست ـــ کوئی بات بھی ہے۔ گاندھی جناح سمجھوتہ ہو ہی جائے گا۔ اس کے متعلق بکا۔ باتیں کرنے سے کیا فائدہ ـــ"

* * *

نازو اپنی سسرال پہنچ چکی تھی اس کو ایک محبت کرنے والا شوہر ملا تھا آج وہ اپنا گھر سجا کر بیٹھی تھی۔ سامنے الماری میں وہ تمام "سرخ کتابیں" سجی ہوئی تھیں جو شمیم نے وقتاً فوقتاً لا کر دی تھیں۔ اس نے "سرخ سویرا" وہاں سے نکالا اور ورق گردانی کرنے لگی۔ اُس کی زندگی میں ایک انقلاب ہو چکا تھا آج اس کے کمرہ میں زیادہ چیزیں سرخ نظر آ رہی تھیں اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس کے شوہر نے چند روز میں یہ محسوس کر لیا کہ اس کی بیوی فلسفہ کی ایک کتا
تھی۔

پڑھ رہی ہو؟

"فضول سی! — آپ نے اس کو بغیر پڑھے ہی کس طرح فضول کہہ دیا۔ مخدوم کی انقلاب آفریں نظموں کا مجموعہ ہے"!

"یونہی — میں نے اس کی ظاہری شکل دیکھکر یہ رائے قایم کی تھی۔ خیر چھوڑو۔ اس قصہ کو — میں شادی کے موقع پر تم کو کوئی چیز نہ دے سکا۔ چلو ساریاں دیکھیں میں بہت سی لایا ہوں۔ جو پسند کرو رکھ لو"!

"ہاں آج کا اخبار نہیں لائے"!

"یہ رکھا تو ہے"

"یہ تو میں نے منگوایا ہے' یہ ہفتہ وار قومی جنگ ہے"!

"خیر تو پہلے ساری پسند کر لیجیے بعد میں دیکھا جائے گا"!

نازو کمرہ سے نکل کر صحن میں جو آئی تو وہاں ساریوں کا ایک انبار تھا۔ اتنی بہت سی مختلف رنگوں کی لیکن اس میں اس کا مرغوب رنگ کہاں تھا' یکایک اس کی نظر سرخ رنگ والی ساری پر پڑی۔ نازو نے اسکو اٹھا لیا۔ اور کمرہ میں لے کر گھس گئی۔ فرید متحیر تھا — وہ کچھ نہ سمجھ سکا اگر یہی حال رہا تو کہیں ایسا نہ ہو اس کا سارا گھر لال ہو جائے۔ اس نے گملے سے ایک گلاب کا سرخ پھول توڑا اور مسل کر زمین پر پھینک دیا —

روس کے زندہ جاوید مصنف آندریف کا
شاہکار
پھانسی
میں ملاحظہ فرمایئے
مترجمہ شاہد احمد دہلوی
ایڈیٹر "ساقی" دہلی
قیمت ،، دو روپیہ
[illegible]

مسعود پرویز

پہچان

ایک لمحے کے لئے تو نے مجھے دیکھا تھا
بس یونہی ایک اچٹتی سی نگاہ

اور چہرے پہ ترے
ایک بے معنی نظر میں نے بھی دوڑائی تھی
دیکھنا جرم نہیں ہے آخر
سینکڑوں آنکھیں مگر اٹھیں ہماری جانب
اور آپس میں اشارے بھی ہوئے
لوگ پہچان گئے جان گئے تھے سب کچھ
کاش ان لوگوں نے دیکھی ہوتیں
وہ نگاہیں بھی جو آنسو بن کر
میری آنکھوں سے کبھی ڈھلکی تھیں

تجھ سے اک بات کہی تھی سرِ راہ
لے اڑے لوگ بنا ڈالا فسانہ اس کا
گر یہ سن پاتے وہ روداد طویل
جو پلٹ جاتی تھی آ آکے مرے ہونٹوں تک
اور جسے ایک حسین لمحے میں
جب کوئی شوخ نظر مستِ شباب
حال دل پوچھ رہی تھی مجھ سے

کہہ دیا تھا مری خاموشی نے —
گر یہ روداد اڑا لیتے لوگ
ایک افسانہ نہ بن جاتی یہ ساری دنیا !

ہونٹ سے ہونٹ ملے ۔
لوگ یہی کہتے ہیں
وہ تو پہچان گئے، جان گئے ہیں سب کچھ
ہونٹ سے ہونٹ ملے —

ہونٹوں کا مصرف ہے یہی
پھر یہ حیرانی ہے کیوں لوگوں میں ؟
دیکھ پاتے جو کبھی
میرے کھوئے ہوئے ماضی کی جھلک
جب میرے ساز پہ تھرایا تھا ابدی نغمہ
روح سے روح ہم آغوش نظر آتی تھی
اور تھم جانے کو تھی نبضِ حیات —
دیکھ پاتے جو کبھی یہ منظر
فرطِ حیرت سے نہ مرجاتے لوگ !

دفن ہیں سینۂ ماضی میں فسانے دل کے
بربطِ روح پہ تھراتے ہیں سینکڑوں راگ
سسکیاں، آہیں، تبسم، آنسو

حسنِ معصوم کے دھندلے سے نقوش
اور ناکام محبت کے مزار
جن پہ لوگوں نے جلایا نہ کبھی ایک دیا
اور نہ مرجھائے ہوئے پھول کی پتّی ہی چڑھائی
ہاں مگر تو اور میں
زندہ درگور کئے جائیں گے رسوائی سے
اور پھر قہقہے پھولوں کی طرح برسیں گے
لوگ پہچان گئے جان گئے ہیں سب کچھ

چاندی کے تار
مشہور افسانہ نویس مہندر ناتھ کے افسانوں کا مجموعہ
پرانی تہذیب اور فرسودہ روایات سے برسر پیکار نظر آتے ہیں آپ نے زندگی کے ناقص اور مضحکہ خیز پہلوؤں کی اس لطافت سے پردہ داری کی ہے کہ پڑھنے والا اس کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔
قیمت دو روپے بارہ آنے
مکتبہ اردو، لاہور

محمد حسن عسکری
جزیرے
محمد حسن عسکری کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ
عسکری صاحب نے اردو افسانہ نگاری میں ایک جدید و لذیذ طرز بیان کا اضافہ کیا ہے۔ ان کا تخیل بے باک ہے اور ان کا طریقۂ اظہار بے لاگ۔
قیمت دو روپے
ساقی بک ڈپو، دہلی

تمنائی

چینی کہانی

چینیوں کو بہت پرانے زمانے سے قصہ کہانی سے دلچسپی رہی ہے۔ قدیم ترین فلسفیوں (مثلاً چوانگ تزو) کی تحریروں میں بھی خالص تخیلی قصص کی عبارتیں ملتی ہیں۔ سونگ خاندان کے شہنشاہ جن تسونگ (۱۰۲۳ء سے ۱۰۵۶ء) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا حکم تھا کہ "اسے خوش کرنے اور ساتھ ساتھ رعایا کے رسم و رواج اور اخلاقیات سے واقف کرانے کے لئے" اسے ہر روز ایک نئی کہانی سنائی جائے۔ لیکن الف لیلہ کے برخلاف یہ کہانیاں مختصر ہوتی تھیں اور اس لئے انھیں شیاؤشئو یا "مختصر گفتگو" کہا جاتا تھا، اور یہی نام ہر طرح کی چینی کہانی کے لئے رہ گیا، چاہے وہ مختصر ہو یا طویل۔ اکثر قدیم چینی ناول طویل ہوتے۔ یہ ناول اس عہد کی بولی میں لکھے جاتے اور گرچہ ان میں سے بعضوں کے پڑھنے والوں کی تعداد لاکھوں تھی تاہم انھیں ادب میں نہیں شمار کیا جاتا تھا۔ پرانے اسکول کے خود دار ادیب اور عالم اگر انھیں دھیان میں لاتے بھی تھے تو خوش گوار دل بہلاوا کی حیثیت سے۔ ان کا خیال تھا کہ فرصت کے لمحات کے علاوہ ایسی ادنیٰ چیزوں کی طرف توجہ دینا محض تضیع اوقات و صلاحیت ہے۔ مثلاً چینی ناولوں میں "تین سلطنتوں کا رومان" گرچہ نہایت ادبی قسم کا ہے تاہم اگر کوئی عالم اپنی تحریروں میں اس کے کسی واقعہ کا حوالہ دیتا تو اپنے ساتھیوں کے مذاق کا ہدف بن جاتا۔ اگر وہ قصہ لکھنے کی نوازش بھی کرتا تو کسی خاص، ذاتی مقصد کی بنا پر ——— یا تو کسی دشمن پر حملہ کرنے کو یا کسی شکایت کا اظہار کرنے کو ——— کوئی جمالیاتی یا ماہرانہ مقصد نہ ہوتا۔ اور اپنے کو کسی قسم کے اشتہار سے بچنے بچانے

ہوتے، خالص نفع کے خیال سے، مانچو خاندان کی ابتدا میں جا کے کہیں لکھے جا سکے قصہ کہانیوں کے لئے عوام کی مانگ مستقل رہی اور ادیبوں کی نظر سے گر کے یہ پیشہ ور قصہ گویوں کی جاگیر بن گئی۔ یہ قصہ گو زیادہ تر کم تعلیم یافتہ ہوتے تھے لیکن رنگین بیانی کا ملکہ اور موزونیت اور تناسب کیلئے فطری مہارت ہمیشہ سے چینیوں کی خصوصیت رہی ہوگی کیونکہ انکی کہانیاں عام طور سے واضح ہیں۔ انکی خاص کمزوری یہ تھی کہ ان میں تھوڑی بہت بھی جو علمی صلاحیت تھی اس کا وہ اظہار کر دینا چاہتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انکی داستان ناموزوں اقتباسات، تلمیحوں، طویل بیانیوں اور بھدے اشعار سے بوجھل ہو جاتی۔ اس کا احساس ہونے کے باوجود، بہت سے آج کل کے مصنفوں میں بھی یہی صفتیں اور نقائص ملتے ہیں ان کے ناول بھی تھوڑے سے ایجاز کے بعد اور بہتر ہو سکتے ہیں۔

قدیم داستان گو عام چائے خانوں اور بازاروں میں اب بھی موجود ہے اور آج کل کا ادیب اس سے مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک تخلیقی فن کار کیلئے یہ مسئلہ کوئی بہت آسان نہیں۔

چینی ادب میں نئی تحریک مغرب سے اتصال کا نتیجہ ہے۔ اس کے رہنماؤں نے جدید مغربی تعلیم پائی ہے۔ اسلئے وہ جو مغربی ادب سے آشنا ہیں چینی ادب عالیہ، (کلاسک) کی نسبت جدید ادب تک زیادہ آسانی سے پہنچ سکتے ہیں اور جدید چینی افسانہ کو اپنے معیار تنقید سے صحیح طور سے جانچ سکتے ہیں۔ لیکن جب تک چینی زبان سے تھوڑی سی بھی واقفیت نہ ہو، اس کی دقتوں کا اندازہ نہیں ہوسکیگا۔

گرچہ کلاسیکل چینی زبان بالکل ہی مختلف بولی والے علاقوں کے درمیان تحریری رابطہ کا ممتاز ذریعہ تھی لیکن یہ نہ تو بولی جا سکتی تھی نہ زبانی سمجھی جا سکتی تھی۔ کلاسیکل ناول کے مسودات کو اس لائق بنانے کیلئے کہ سمجھ میں آسکیں مقامی بولیوں میں ان کا ترجمہ

اور توضیح کی ضرورت ہوتی تھی، ۱۹۱۱ء میں مانچو خاندان کے خاتمہ کے بعد معلمین عام
تعلیم کے ذریعہ کیلئے سادہ اور زیادہ موزوں زبان کی تلاش کرنے لگے پہلا نظریہ
پائی ھوا ، لوگوں کی عام بولی، سے زیادہ مناسب اور کیا چیز معلوم ہوتی، جو
کلاسیکی محاوروں سے تقریباً بالکل معرا ہے؟ لیکن 'پائی ہوا' کی بے شمار شکلیں ہیں اور
اسلئے آخرکار یہ فیصلہ کیا گیا کہ سب سے زیادہ وسیع طور پر بولی جانے والی شکل کوان ھوا'
کو اختیار کیا جائے۔ غیر ملکی اس بولی کو "ماندرین" کہتے ہیں۔ اصل میں ماندرین،
چین کے عمال کے نو طبقوں میں سے کسی طبقہ کے عامل کو کہتے ہیں لیکن چونکہ مقامی بولیوں
کے برخلاف یہ کوان ھوا بہت دنوں تک چینی عمال کی زبان رہی ہے اس لئے اس
زبان کا بھی نام ماندرین پڑ گیا۔ لیکن معلمین نے جس بات کی تبلیغ کی اس پر عمل کرنے
کیلئے جس ہمت کی ضرورت تھی وہ ان میں نہ تھی اور جس زبان سے وہ نفرت کرتے
تھے اسی میں لکھ کے وہ اپنے آپ کو ذلیل نہیں کر سکتے تھے۔

اس زبان میں سنجیدگی سے تجربہ کرنا بعد والی نئی نسل کے لئے تھا۔ پیکنگ
قومی یونیورسٹی کے پروفیسروں کی ایک جماعت اس تحریک کی ہراول بنی۔ ماہنامہ
شباب نو ان کے خیالات کا خاص ترجمان بنا۔ اس کی ادارت مسٹر چین تو شیو
کر رہے تھے۔ جو اس وقت شعبۂ ادبیات کے صدر تھے۔ اور اسی رسالہ میں اپنے اشتعال
انگیز مقالوں کی بنا پر ڈاکٹر ہو شہ نے شہرت حاصل کی۔ مسٹر چین نے ۱۹۱۷ء
میں لکھا

> ادبی انقلاب کیلئے لڑنے والوں کے تین بڑے اصول یہ ہیں۔
>
> ۱۔ چند امرا اور خواص کے ہر تصنع، رنگ و روغن چڑھے ہوئے
> خوشامدانہ ادب کو مٹانا اور سادہ صاف اور پرمعنی عوام کے
> ادب کی تخلیق کرنا

۳۔ کلاسیت کے رسمی اور بے تنوع ادب کو مٹانا اور حقیقت پسندی کے تازہ اور سچے ادب کی تخلیق کرنا۔

۴۔ راہبوں اور گوشہ نشینوں کے متعلق، ناقابل فہم، گنجلک اور غیر واضح ادب کو مٹانا اور زندہ سماج کے مقبول اور صاف گو ادب کی تخلیق کرنا۔

جیسا کہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے شباب نو نے علما کے حلقہ میں شدید ہنگامہ پیدا کر دیا اور پرجوش مباحثے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مختصر افسانہ لکھنے کا ایک عام جوش سا ابل پڑا جس کی مثال انگلستان میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں کے اوائل کے دور میں ملتی ہے۔ چین کیلئے یہ ایک نئی بات تھی۔ کیونکہ یہاں، سوا چند ایک استثنا کے، مختصر سے مختصر کہانی بھی اوسط فرانسیسی ناول جتنی ہوتی تھی، طویل، اور ساخت کے لحاظ سے بے ترتیب اور ڈھیلی۔ کہانیاں لکھنے کا جوش کچھ تو ردعمل کے طور پر شروع ہوا ہوگا۔ لیکن اس کا خاص سبب یہ جبلی احساس تھا کہ یہ انداز بیان چینی ذہنی صلاحیت کے عین مطابق تھا۔ اسلوب بیان کا ارتکاز اور تاثرات کی تنظیم صاحب شعور چینی فن کاروں کا ہمیشہ سے مقصد رہا ہے۔

اس پرجوش دور کا (جو نوجیون سے زیادہ دیکھ بھال کا دور تھا) پہلا پختہ پھل لوہسون کی چند کہانیاں تھیں۔ چینیوں کو اس کے موضوع اور تکنیک بہت ہی عجیب اور غیر معمولی معلوم ہوئے لیکن ہمیں یہ فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ لوہسون کی تحریروں پر روسی اثر ہے۔ اس کے مختصر مقالے جو تساکان (خیالات پریشاں) کہلائے، گورکی کی "میری ڈائری کے اوراق" کی یاد دلاتے ہیں اور اس کی کہانیاں چیخوف کی۔ ان دونوں مصنفوں سے بالکل بجا طور پر اسے تشبیہ دی جاتی ہے۔ لیکن وہ نقال نہیں۔ اس کا سا مطمح نظر، اس کے طرز تحریر کی متانت، اس کا طنز، اس کا لطیف انداز بیان اور دبی دبی ہجو بلکہ المناک موضوعات کو اس کا ظریفانہ غیر جذباتی طریقہ سے برتنے کا انداز مخصوص طور پر چینی ہے۔ اس کے علاوہ فطرت کی طرف چینیوں کا رویہ صوفیانہ اور شاعرانہ ہے اور اد

اندر روسیوں سے ایسی ملی جلی تلخی آمیز شیریں ظرافت ہے کہ چینیوں پر روسی اثر مبالغہ آمیز حد تک معلوم ہوتا ہے اگر لوہسون نے چیخوف کے یہاں سے چند پھول چنے تو جو ہار اس نے تیار کیا وہ خالص چینی ہے۔ اس کی بہت صاف مثال اس کی شروع کی دو کہانیوں ”کنگ آئی چی“[1] اور ”دوا“[2] میں ملتی ہے۔ یہ کہانیاں سب سے پہلے شباب نو میں شائع ہوئیں ”دوا“ میں دیہاتی توہم پرستی پر حملہ ہے۔ اس کہانی میں جس کراہیت انگیز اور چیختی ہوئی بات کا ذکر ہے۔ وہ جنوبی چین کا یہ عام توہم ہے کہ انسانی خون دق کی دوا ہے۔ اپنے شکاروں کا گرم خون معقول نفع پر بیچنے کے رواج سے جلاد مستفید ہوا کرتے تھے اور ”دوا“ میں ایک غریب میاں بیوی کا قصہ ہے جو اپنے قریب المرگ بیٹے کو یہی ”اکسیر اعظم“ اس کی تاثیر میں حسرتناک اندھے اعتقاد کے ساتھ دیتے ہیں۔ کہانی کا خاتمہ کنگالوں کی قبروں کے درمیان ہوتا ہے جو ”ان گنت تعداد میں پاس پاس اس طرح بنی ہوئی ہیں کہ انھیں دیکھ کے کسی دولتمند کے گھر میں جشن سالگرہ کے موقع پر قطار میں لگا کے رکھے ہوئے میٹھے کلچے یاد آجاتے ہیں۔“ مدقوق لڑکے کی ماں ایک دوسری عورت کے غم سے اتنی متاثر ہوتی ہے کہ قریب قریب اپنا غم بھول جاتی ہے اور اسے تسلی دینے چلی جاتی ہے۔ یہ دوسری عورت اپنے بیٹے کی روح سے منت کرتی ہے کہ وہ کسی علامت سے اسے بتائے کہ وہ اس کی باتیں سن رہا ہے۔ پاس کے درخت پر ایک کوا بیٹھا ہے۔ عورت چلا اٹھتی ہے۔ ”کوا کوا اڑ کر اپنی قبر پر بٹھالو!“۔۔۔ اور دونوں بوڑھی عورتیں سوکھی گھاس پر کھڑی کوے کو ٹکٹکی لگائے دیکھتی ہیں لیکن کوا اس طرح بیٹھا رہتا ہے جیسے لوہے کا ڈھلا ہوا ہو۔ بہت دیر کے بعد وہ روانہ ہوتی ہیں اور اسی وقت یکایک اپنی کرخت کائیں کائیں

---

[1] اردو میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور میرے مرتب کئے ہوئے مجموعہ ”زندہ چین“ میں شامل ہے۔ تمنائی

[2] اس کا ترجمہ عنقریب ”نیا دور“ میں شائع ہوگا۔ تمنائی

ہے کہ انھیں چونکا دیتا ہے اور ذہنا پیچھے ہٹاتا دور اُفق کی طرف اٹھاتا ہے۔ ہمارا مقصد چند نہایت ہی واضح کھینچی ہوئی تصویروں میں نچوڑ کے رکھ دیا ہے۔ مکالمہ بہت چبھتا اور بے حد مناسب موقع ہے۔ "ہوا" قریب قریب شاعری ہے۔ ترجمہ میں پڑھنے کے باوجود اس کا اثر بہت شدید ہوتا ہے۔

لوسون کو چیخوف سے سچ مچ اتنی مشابہت نہیں جتنی معلوم ہوتی ہے۔ افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ گوگول سے زیادہ نزدیک ہے۔ گوگول کی مردہ روحیں (Dead souls) کا ترجمہ اس نے مرنے سے کچھ ہی پہلے ختم کیا تھا۔ فطرت قوت مشاہدہ کے ساتھ ساتھ اس کے اندر اپنے بچپن کے ماحول اور مناظر کی طرف کمال بے ساختگی سے پلٹ جانے کی وہ صلاحیت ہے جو لفکاڈیو ہرن کو خالص مشرقی معلوم ہوتی۔ اس کے لطیف ترین تاثرات، مختصر لفظی تصویروں کی یک دست اور واضح جھلکیاں —— مفلوک نوا، کتاب پرست، بوڑھا کلاسیکی عالم کُنگ آئی چی جس کی ٹانگیں کتاب چرانے کے جرم میں توڑ ڈالی گئیں —— اندازِ تحریر جس سے وہ قوم کی انفرادی روحانیت کو ابھار سکتا ہے، یہ سب ایک ہلکے ظریفانہ ذکر کرنے والے انداز اور تاکید لفظی کے فقدان کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ جن کی وجہ سے ترجمہ کی کوشش میں بے حد دشواری ہوتی ہے۔ اس کا نشتر چینیوں کی بے حسی کی جڑ کو کاٹتا ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں بھولتا کہ وہ سماجی پیغام پہنچانے والا ادیب ہے۔ اپنے ایک دیباچے میں وہ بیان کرتا ہے کہ جاپان میں طب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ چین کا روگ جسمانی نہیں، ذہنی ہے۔ اس نے چین واپس آ کے تعلیم کا پیشہ اختیار کیا۔ پہلے اپنے صوبہ چیکیانگ میں پڑھاتا رہا پھر پیکنگ میں۔ لیکن اس کے انداز میں فن اتنا لطیف ہے کہ وہ صرف بے لطف پیغام ہی پیغام ہو کے نہیں رہ جا سکتا۔ تمسخر آمیز، ہلکا، منافقت اور ناانصافی کے خلاف غصہ سے بھرا ہوا وہ دیہاتوں کے غریب کی زندگی کی تصویر پیش کرتا ہے۔ مثال کے لئے "آہ کیو کی کہانی" [illegible]

کی بہترین طویل کہانیوں میں سے ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس میں انقلاب کے آغاز کے وقت چینی دیہاتوں کی اکثریت کی ذہنیت کی تصویر ہے اور بہت سے شہریوں کی نفسیات کی بھی جو قادر مطلق خدا کے بیٹے ہونے کے خواب سے جھنجھوڑ کے جگائے گئے تھے۔ ویچوانگ اگر چھوٹے پیمانہ پر سارے چین کا نمونہ نہیں (جیسا کہ بعضوں کا خیال ہے) تو خالص چینی گاؤں ضرور ہے ابھی حال تک آ ہ ق کی سی ہستیاں بہت تھیں۔ وہ گمنامی کی زندگی بسر کرتے اور گمنامی کی موت مر جاتے۔ لیکن آ ہ ق کا وجود ایک جھلملاتی ہوئی شعاع سے روشن ہو جاتا ہے۔ "دیکھا گنہگاروں کو سارے گاؤں نے بری طرح ستایا ہے اور اسلئے باغیانہ کیفیت کے تحت وہ انقلابیوں کی صف میں شامل ہو جانے کا ارادہ کر لیتے ہیں!" ادھر کچھ دنوں سے آ ہ ق کو بھی کچھ جھٹکے لگے تھے اس پر طرہ یہ کہ سہ پہر میں خالی پیٹ میں اس نے دو پیالے شراب کے چڑھا لئے تھے اور نشہ میں ہو گیا تھا۔ اسلئے چلتے چلتے وہ اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ وہ پھر ہوا کے گھوڑے پر سوار اپنے کو بلندیوں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا اور بغیر جانے بوجھے کہ یہ کیسے ہوا اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ خود انقلابی جماعت ہے اور سارا ویچوانگ اس کا قیدی ہے۔ انتہائے انبساط میں وہ "انقلاب! انقلاب!" چیخے بغیر نہ رہ سکا۔

لیکن جب انقلاب ویچوانگ میں پہنچا تو سب سے پہلے بیچارہ آ ہ ق ختم کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کے قتل ہونے کا بیان تیز چبھتی ہوئی طنز کا بہترین ٹکڑا ہے۔ لوسون کی تمام تصنیفوں میں سوز و گداز بھرا ہوا ہے لیکن ایسا سوز و گداز جو یخ بستہ ہے اور جس میں برف کی سی چبھن اور جلن ہے۔ پھانسی کا تماشہ دیکھنے کو مجمع اکٹھا ہے۔ اور ایک [illegible] ہوئی آواز میں اپنا گرما گرم صدا پھینکتے چیخ رہا ہے! اس بیان کو جس نے پڑھا ہے وہ بھول سکتا ہے! ..... خود غرضی اور بے دردی پر اس کے بعد کبھی بھی کاٹ دار طنز [illegible]

دقت نظر کی گہرائی ہوتی ہے۔

[illegible] وارسائی صلح کانفرنس میں شانتنگ میں جرمنی کے پچھلے مقبوضات کو جاپان کے حوالے کر دینے کے فیصلے اور بگڑتی ہوئی رجعت پسند حکومت کی جاپان دوست پالیسی کے خلاف احتجاج کرنے کو ۴ مئی ۱۹۱۹ء کو پیکنگ یونیورسٹی کے طلبا کا جو عام جلسہ ہوا اس سے دیسی زبان کی تحریک کو بڑا زور ملا۔ اور عام جذبہ بالکل طلبا کی موافقت میں تھا۔ حکومت کو جھکنا پڑا۔ گرفتار شدہ طلبا رہا ہوئے اور تین بدنام جاپان دوست وزیروں کو برطرف کیا گیا۔ اس جیت نے پیکنگ یونیورسٹی کی وسعت بڑھا دی۔ پائی ھوا کے رسالوں [illegible] سیاسی [illegible] پڑا اور ۱۹۲۰ء میں وزارت تعلیم نے احکام جاری کئے کہ ابتدائی اسکولوں کے درجوں کے نصاب دیسی زبان میں لکھے جائیں ——— دیسی زبان کو اب چین کی قومی زبان کی حیثیت دی گئی۔

[illegible] دو جیوں کا گروہ بندی میں پڑ جانا فطری تھا لیکن ان کے شائع شدہ عقائد اور منشور سے [illegible] دلچسپ تعلیم بہت لوچ دار تھیں "حقیقت پسندوں" نے "ادبی تحقیق کی سوسائٹی" کے ساتھ ایک گروہ بنایا جس کی طرف سے ماہنامہ افسانہ (Short story monthly) اور "ادب" (Literature) شائع ہوتا۔ دونوں کا ایڈیٹر جنگ چین تو تھا اور اس کے مضمون نگار شیلوتن اور اس کے "اشاک و فون" اسکول والے ساتھی تھے، ماؤتن کی طویل کہانی "بہار کے ریشم کے کیڑے" (Spring silkworms) اور اس کا سہ نثر "سعی، اضطراب، دریافت" [illegible] چین کی دیہی معاشیات کے دیوالہ کا بیان ہے۔ اس اسکول کے ممتاز شاہکار ہیں۔ یہ حقیقت پسندی کے اولوالعزم، ٹھوس، ہشیاری سے تعمیر کئے ہوئے ذخیرے ہیں ——— اکثر چینی ادیبوں کے اطلاقی کرداروں کا خاکوں اور افسانہ پرستانہ منظرکشی کے بالکل ضد۔ ماؤتن کا بڑا زبردست [illegible] نفسیات کے طالبعلموں کیلئے اس کی کافی اہمیت ہونی چاہئے۔ لیکن اس کی [illegible] سے قطع نظر، وہ اتنا مشکل پسند ہے کہ اکثر وہ پڑھنے والوں کو

[redacted]

متاثر نہ کر سکا۔ چینی نقاد اسے آپٹن سنکلیئر سے مشابہت دیتے ہیں اور یہ بالکل درست ہے۔

"رومانیوں" کی سرکردگی بلا ارادہ، ہیجانی اور بے انتہا کثرت سے لکھنے والا ناول نویس، شاعر، ڈرامہ نگار اور ماہر اثریات دان کومو جو کے ہاتھ میں تھی۔ کئی سال تک وہ "تخلیق" (Creation) کا روح رواں اور ایڈیٹر تھا ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۸ء تک کسی اور چینی ادبی مجلہ کا اتنا اثر اتنی کثیر اشاعت نہ تھی جتنی اس ماہانہ رسالہ کی۔ اور آگے یوتا فو۔ اور چینگ ترو پنگ جیسے مشہور لکھنے والوں کی حمایت حاصل تھی۔ موخر الذکر کی ادنیٰ درجہ کی سنسنی خیز عشقیہ کہانیاں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں لیکن یہ ادبی خوبیوں سے معرا ہوتیں۔ لیکن یوتا فو اس پر اضطراب دور کے چینی نوجوانوں کی نفسیات کے مفید رہنما کا کام دیتا ہے۔ اسے مغلق اور بلند پرواز کیا گیا ہے لیکن اس کی سنسنی خیزی کی تلاش کبھی بھی بے جان نہ تھی۔ جاپان میں طالب علمی کے زمانہ میں، معاشیات سے زیادہ وہ طوائفوں کے خیال میں مصروف رہتا تھا قوت کی کمی ہونے اور نسوانی دلکشیوں کا بے انتہا اثر قبول کرنے والا ہونے کی وجہ سے اس کے اندر اشتعال اور اپنے اوپر جبر میں مستقل آویزش رہتی۔ جنسی اذیت کے علاوہ چین کی تیرہ و تار حالت نے اس کے وجود کو اور بھی تکلیف دہ بنا دیا۔ اگر وہ وطن میں رہا ہوتا تو اتنا نہ ہوتا۔ اس کی تخئیل روگی ہو گئی۔ اس کا مطمح نظر ایک ہے خودکشی۔ اس کی تحریروں میں آپ بیتی کو کہانی سے جدا کرنا مشکل ہے۔ اس کی بہت سی کہانیاں اس قدر اس لئے دلچسپ ہیں کہ "عنفوان شباب کا کرب" ہم تک پہنچاتی ہیں۔ سارا منظر، ساری فضا اس سے دکھ رہی ہے۔ اگر ہم اس سے قطع نظر، محض افسانہ کی حیثیت سے ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ اکثر مہمل معلوم ہوتی ہیں۔ "تیعیں موت" ([illegible]) میں نوجوان طالب علم کی بیوی چونکہ گھر پر دق سے مر گئی اس لئے وہ شراب پینے لگتا ہے۔ آخر کار یہ پتہ لگنے پر کہ اسے تسلی دینے والی واحد لڑکی، ہوٹل کی جاپانی ملازمہ، کی منگنی ہو چکی، انتقام اور خود رحمی کے ملے جلے جذبات کے تحت وہ اتنا پی لیتا ہے کہ بالکل مدہوش ہو جاتا ہے اور کالج آف میڈیسن کے سامنے کے چوراہے پر اختناق الدماغ

ٹھہر جاتا ہے۔ اس کی جیب میں ارنسٹ ڈوسن کی نظموں کی ایک جلد ہے۔

چین واپس آکے اس کا جو نظریہ زندگی ہو گیا اس کی وضاحت خود اسکے لفظوں میں سنئے!

"اس دنیا میں اندھے بہت سے ہیں، تیز نظر چند۔ لوگوں کے کان ہیں، آنکھیں نہیں۔ وہ صاف اور گندہ میں تمیز نہیں کر سکتے، انہیں صرف شہرت پر اعتبار ہے"۔

لیکن وہ نوجوان تھا اور اس پر جو مردہ دلی طاری ہوئی وہ کچھ تو اختیاری تھی، نہیں تو وہ اسے اتنی شدت سے ظاہر کرنے کی تکلیف نہ کرتا۔ مشاہدہ نفس اگرچہ چینی معاشرت کا رنگ نہیں تو یو کے حق میں یہ ایک برکت ثابت ہوا۔

"میرا ماضی ——— میری اندھی زندگی ——— مصیبت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب میں یاد کرتا ہوں تو سوا آنسوؤں اور آہوں کے کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ کچھ پہلے تک میں اس مصیبت سے مزا لیتا تھا۔ اپنے کو تسلی اور دھوکہ دینے کو سیکڑوں سپنے تھے۔ آج نہ صرف یہ کہ میں نے اس شیریں تلخی کو چکھنا چھوڑ دیا ہے بلکہ بے رحم قسمت نے مجھ سے احمقوں کا آخری بچاؤ ——— کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنا ——— بھی چھین لیا ہے . . . ."

اور، جیسے کہ چینی زبان کافی نہیں، وہ انگریزی میں کہہ اٹھتا ہے،

"میں سچ مچ ایک فضول انسان ہوں! اس لئے سماج اور دنیا کے لئے بیکار ہوں۔ فضول آدمی! بیکار آدمی!"

یو کی تحریریں اس طرح کی عبارتوں سے بھری پڑی ہیں۔ اور اس طرح کی مثالیں اس نسل کے باغی ہوا کے شاعروں میں کثرت سے ملیں گی۔ ان کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں اس ماحول کا لحاظ رکھنا چاہئے جس میں یہ تھے۔ عجیب تری تھی

انتشار اور ہنگامہ تھا۔ اس کے باوجود رجائی اور جوشیلے نظریہ پرست تھے جن پر لیوشن نے ایک کہانی "خون آنسو" ([illegible]) میں طنز کیا ہے کیونکہ اس وقت اس کا میلان تاؤئی خیالات کی طرف نمایاں طور سے تھا۔

ارزو کی ناکامی کے جوش سے تملا کے یوتافو خوب لکھتا، لیکن جیسے جیسے بائیں سیاست کے لئے اس نے مشاہدۂ نفس ترک کیا اس کی بے لاگ پن اور بھولا پن کی خوبیاں جاتی رہیں۔ ۱۹۲۰ء سے ۳۰ء تک اس کی تحریروں کا کافی اثر ہوا۔ خاص کر ان تحریروں کا جن میں طے کی ہوئی شادیوں کے سانتی رواج، جنسی ممانعتوں اور فرزندانہ سعادتمندی کے قدیم تصورات پر حملہ کیا گیا ہے۔ لیکن آج کی تعمیری نسل کے لئے اس کی قنوطیت میں کوئی دلچسپی نہیں۔

حقیقت پسندوں اور رومانیوں کے درمیان فرق کوئی بہت گہرا نہیں۔ "ادبی تحقیق کی سوسائٹی" اور "تخلیق" دونوں ہی جماعتیں ساکن جاگیرداری کا پرزور اختلاف کرنے میں ساتھ اور چین کی دقیانوسی اخلاقی تعلیمات سے باغی تھیں۔ اور سب سے بڑھ کے وہ چین کی آزادی چاہتی تھیں۔ ماؤتون اور کشوموجو دونوں پرولیتاری (عوامی) ادب کے پرجوش حامی بن گئے ۱۹۲۵ء میں کشوموجو نے لکھا۔

> "ہمارے ادب میں پرولیتاری انقلاب کی روح رچ جانی چاہئے۔ چین کے ہم ادیبوں کو عوام، بارکوں، کارخانوں اور انقلابی فوج کے عام سپاہی تک پہنچنا چاہئے۔ ہمیں ایسے ادب کی تخلیق کرنی چاہئے جو حقیقت پسند ہو، اور چینی عوام کی تمنا پوری کر سکے۔"

انقلابی ادیبوں کا زیادہ زبردست کارنامہ ترجمہ کے میدان میں رہا۔ ڈاکٹر ہوشیہ اور چنگ چن تو نے نوجوان ادیبوں کو ماہانہ وظیفے دئے کہ وہ ترجمہ پر زیادہ [illegible] اوقات کا [illegible] ترجمہ کے کام کے علاوہ [illegible]

نیا دور

چیزیں بھی لکھ سکتے تھے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء کا دور، ترجمے سے قطع نظر، شدید ادبی جھگڑے کا دور تھا۔ کمیونزم کو کچلنے کے سلسلے میں المناک ظلم ہوئے اور پاٹینگ اور ہنگامی میں بائیں ادبی رسالے حشرات الارض کی طرح نکل آئے۔ لوہسون بائیں مصنفوں کی لیگ کا صدر چنا گیا۔ اسی زمانہ میں "ماہ نو" (Crescent Moon) میں بہترین پائی ہوا شاعری کے نمونے چھپے۔ اس ماہنامہ کا روحِ رواں شو جیہ مو تھا۔ شو کیمبرج کے دوران قیام میں انگریزی ادب کا قاف اور وہیں لوئیس ڈکنسن نے اس کی قوتوں کا احساس اور شعور اسے دلایا۔ چین واپس پہنچ کے وہ پیکنگ قومی یونیورسٹی میں پروفیسر ہوا اور طلبا کو دم بھر میں مسحور کر لیا۔ اس سے زیادہ کسی اور شاعر نے چینی شاعری میں "مغربی رجزیہ انداز نہیں داخل کیا" اور ۱۹۳۲ء میں ہوائی جہاز کے ایک حادثہ میں اس کا مر جانا چینی ادب کیلئے بڑا نقصان دہ ہوا۔ گرچہ "ماہ نو" پر زندگی سے بے تعلقی کا اعتراض ہے تاہم اس کے ذریعہ بہت سے ذہین اور طباع شاعر اور مقالہ نگار ادبی میدان میں آئے۔ مثلاً وین آئی تو اور چین منگ چیا۔ یہ ایسے شعوری فن کار تھے جن کا اعتقاد تھا کہ شاعری کو "پابہ زنجیر رقص کرنا" اور بحر اور وزن کے چند قوانین کی پابندی کرنا چاہئے۔ اسی کے صفحات پر ایک کہانی لکھنے والا بھی نمودار ہوا، ہمہ گیر شین تسونگ دن، جو تیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے چالیس سے زیادہ کتابوں کا مصنف ہو چکا تھا۔ ابتدائی عمر میں وہ اپنے صوبہ ہونان میں فوجی محرر تھا اور چین کے "مغربی صوا" میں میاؤ تزو اور دوسرے عجیب قبیلوں کے درمیان مارے مارے پھرنے کے سلسلے میں اس نے وہ تجربات حاصل کئے جن سے اس کی تحریریں مالا مال ہیں۔ اس کی بعض کہانیوں کا ترجمہ ہوا ہے لیکن اس کے تر و تازہ دلکش محاوروں اور شوخ مقامی رنگ کی ترجمانی اور ادائیگی بہت مشکل ہے۔

آخر کار جاپان کی مخالفت کے متحدہ مقصد کے سامنے ادیبوں کے کئی گروہ نے اپنے ستا

چین کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ وہ اپنی قومی زندگی کو کیسے بچائے رکھے۔ ہمارے لوگوں کے سامنے ایک ہی راستہ ہے، وہ متحد ہو کے حملہ آوروں کو نکال بھگائیں۔" ۱۹۳۶ء میں واقعہ سیان کے پرامن خاتمہ پر سیاسی اتحاد عمل میں آیا اور ادیبوں نے فوراً قومی محاذ میں شرکت کی۔

ماؤ تون انکی نمائندگی اور پیغمبری کر رہا تھا۔ جب اس نے ماہنامہ "ادب" ([illegible]) میں لکھا کہ "ہمارا نیا ادب اصل میں قومی بچاؤ کا ادب ہے۔ یہ اپنی آزادی کیلئے چینی عوام کی جدوجہد کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن یہ ادب جنگجویانہ نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں اس دشمن کے لئے نفرت ہے جو ہمارے ملک پر چڑھا چلا آ رہا ہے پھر بھی اس میں دشمن کے سپاہیوں کیلئے ہمدردی ہے ——— ان معصوم بیچارے نوجوانوں کیلئے جو توپ کا چارہ بننے کیلئے محاذ پر بھیجے جا رہے ہیں۔ لیکن ان کے لئے صرف ہمدردی ہی نہیں۔ ہمیں اپنے برادرانہ خلوص اور جوش سے انھیں مشتعل کر دینا چاہئے تاکہ وہ ہمارے ساتھ کھڑے ہو سکیں اور ہم ایک ساتھ مل کے اپنے مشترکہ دشمن سے لڑ سکیں۔ ہم ان غداروں پر بے رحمی سے حملہ کریں گے جو دشمن کی خدمت کرنے میں اور ہم لوگوں کو آمادہ کریں گے کہ ایسی ناپاک ہستیوں کو نیست و نابود کر دیں۔"

۲۷ر اپریل ۱۹۳۷ء کو ہنکاؤ میں مصنفوں کا ایک جلسۂ عام ہوا اور ایک تجویز منظور ہوئی کہ "فوراً کل لکھنے والوں کی ایک یونین قائم کی جائے تاکہ مشترکہ مقصد کیلئے سب زیادہ باضابطگی اور موثر طریقہ سے کام کر سکیں"۔ ایک کمیٹی بنائی گئی اور اس طرح چینی ادیبوں کا فیڈریشن قائم ہوا۔ فیڈریشن کا صدر مقام چنکنگ میں ہے۔ شاخیں تمام شہروں میں قائم ہیں اور سارے چین میں اس کے سینکڑوں ممبر ہیں۔

جنگ چھڑی تو بہت سے ناشروں نے کاروبار بند کر دیا لیکن فوراً ہی ادیبوں نے مل کے اپنی تصنیفیں شائع کرنے کا انتظام کیا۔ ماؤ تون اور باجن نے ایک نیا ہفتہ وار "پکار" ([illegible]) نکالا۔ ہو فنگ نے ایک ماہنامہ "جولائی" جاری کیا اور ڈرامہ نگاروں، شنگ چی یو اور ھنگ یشنگ نے ایک رسالہ "روشنی" نکالا

بہتیرے اخبار ادبی ضمیمے چھاپنے لگے۔ ان میں پہلا اور سب سے بااثر تاکنگ پاؤ کا ضمیمہ تھا جس کا ایڈیٹر باصلاحیت افسانہ نویس شیا چئن تھا۔ ادیب مردانِ کار بن گئے۔ وہ محاذ پر جو ٹولیاں لے کے گئے۔ انھوں نے ہسپتال پر پڑے زخمیوں کے لئے خط لکھے۔ خیموں میں پناہ گزینوں کو تعلیم دی۔ پن چیلن اور ہو چی فنگ ایٹتھ روٹ آرمی (چینی سرخ فوج) میں شامل ہو گئے۔ جو شخص پن سے ذاتی طور سے واقف ہے اس کے لئے یہ تصور کرنا سخت مشکل ہے کہ یہ نازک، زرد، متریلا۔ عینک پہننے والا بادیئر۔ فادیم۔ ژید، ورجینیا وولف اور جرن اور اسٹریچی کی "ملکہ وکٹوریہ" کا مترجم جاپانیوں کے خلاف مہم کی سختیاں کیسے برداشت کر رہا ہے۔ جنگ نے انکی توجہ اور تمام چیزوں کی طرف سے ہٹا نہیں لی ہے۔ اس کے برخلاف انکا تخلیقی جوش اور تیز ہو گیا ہے۔ وہ اپنے تجربوں سے اور زیادہ تازہ اور جاندار ہو کے لکھ رہے ہیں۔ شو ہہ لن کے قلمی نام سے پن نے چند کہانیاں لکھی ہیں جو نئے رجحان کی آئینہ دار ہیں۔ پیغام کی حامل ہونے کے ساتھ یہ طرزِ ادا اور اسلوب بیان کیلئے اس کی فطری توجہ سے خالی نہیں ہیں۔ ایک کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے: "یکا یک آن چو بستی میں گھبراہٹ پھیل گئی۔ عورتوں نے فوراً اپنے سرخ پاجامے ترک کر دئے"۔ یہ لال پاجامے بنیادی خیال ہیں۔ پن چیلن کی باریک بین انفرادیت قائم رہی ہے۔ لیکن جنگ چین و جاپان کے طوفان میں اس کا رنگ اور چوکھا ہو گیا ہے۔

جنگ نے ادیبوں کو چین میں چاروں طرف پھیلا دیا اور انھیں عوام سے نزدیک سے ملنے کا موقع ملا۔ شنگھائی کی کسی اونچی عمارت میں ادبی محل کے اندر مجرد دبیر کی طرح ان کا مطالعہ کرنے کی بجائے انھوں نے اصلی جھونپڑیوں اور کھلے میدانوں میں دیکھا اور انکی ذہنی ضرورتوں کو براہ راست محسوس کیا اور سمجھا۔ بعض نے اپنے عمل ٹھیک جاپانی مورچوں کے عقب میں جاری رکھے۔ بعض صوبوں کے دور دراز شہروں

میں پیدل مارے مارے پھر کے کام کرنے لگے۔ پیکنگ اور تشنگین کی خاص یونیورسٹیاں چینگشا گئیں، اور وہاں سے کُنمنگ اور انھوں نے ان ادبی طلبا کی اہمیت عام طور سے تسلیم کی جو پروپیگنڈا کا کام کر سکتے تھے۔ ان طالبعلموں میں سے اکثر اسکول کے کام کے ساتھ چھاپہ ماری کا کام بھی کرتے۔ عام طور سے پچاس سے دو سو آدمیوں کی جماعت کے ساتھ ایک تجربہ کار سارجنٹ ہوتا ہے لیکن انھیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جو پیغام پڑھ سکے اور سیاسی تقریریں کرے۔ اس کا درجہ سارجنٹ کے برابر تصور کیا جاتا ہے اور یہ عام طور سے یونیورسٹی یا فیل شدہ نوجوانوں میں سے لئے جاتے ہیں۔ اسی درمیان میں ہینکاؤ۔ کنیٹن۔ کویلن۔ سیان۔ چُینگتا۔ چنگتو۔ یُنّان اور کُنمنگ میں نئے ادبی رسالے نکل آئے۔ جاپانی دہشت پسندوں اور چینی غداروں کے اڈے شنگھائی میں بھی ادبی احیا ہوا۔ چنگ چو تو ابھی تک ہیں اپنی ضخیم تحقیقوں میں لگا ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ چینی نشاۃ الثانیہ جنگ چین و جاپان کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ پائی ھوا تحریک کے رہنما صاحب شعور زندگی تھے جن کا حلقہ نفوذ پہلے سے طلبا اور ذی فہموں تک محدود تھا۔ لیکن جنگ کے بعد سے جدید ادب کی اشاعت بہت بڑھ گئی اور نئے تجربوں میں دلچسپی لینے والا بالکل ہی مختلف طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔ جس میں سرکاری کلرک، ڈاکخانہ کے ملازم، مرکزی فوج کے سپاہی (جس میں اکثریت مڈل سکول کے فارغ شدہ طالب علموں کی ہے) اور پولس کے آدمی شامل ہیں —— ان میں بہتوں کو تو ادبی حوصلے ہیں۔ مختصر افسانہ کا رواج پھیلتا جا رہا ہے اور لکھنے والے اپنے لوگوں سے زیادہ نزدیک ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر "تیسرے درجہ کا بندوقچی" (The Third rate gunman) کو لیجئے جو رسالہ "جولائی" میں شائع ہوا۔ اس کا مصنف ایک سپاہی ہے جس نے اس نام کے قلمی نام سے لکھا ہے۔ محبوب طو۔ لیکن افسانہ کا طور یہ ہے: ٹھنگ کسان —— جو اپنے ساتھیوں کے قتل پر چڑھانے سے مشتعل ہو کے اپنی نشانہ بازی ثابت کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

سے اس مختصر مطالعہ کو بڑی ہنگامہ خیز کامیابی ہوئی۔ اس مصنف یاؤ شیہ چن کی کہانی "آدھا گاڑی پیال کم" (Half a cart load of straw short) ہے جس کا موضوع بھی اسی طرح کا ہے۔ اس کہانی کو گورکی کی بہترین تحریروں سے بہت مماثلت ہے۔ ایک نہایت ہی ہونہار نوجوان مصنف ہاؤ ینگ چیہ ٹیان کے ایک قدیم قبیلہ میاؤ کا فرد ہے۔ اس کی کہانی "ٹیان برما روڈ پر"[1] میں اس سڑک کے بنانے والوں —— 'عقب کے مزدور جو جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں' —— کے جذبات کو نعرہ وار اور بااثر طور سے ابھارا گیا ہے۔ روسی کہانیوں کا اثر ابھی تک زبردست ہے۔ بعض کہانیوں میں تو اتنا زیادہ ہے کہ وہ جابکدست چربہ معلوم ہونے لگتی ہیں۔

جو مصنف ۱۹۰۷ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے انھیں اب تو بوڑھوں میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ ان میں سے ایک 'چینگ تئن یی' آگے ہی بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی کہانی ([illegible])[2] بہترین چینی کہانیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اپنا نہایت دلچسپ خود نوشت خاکہ پیش کرتے ہوئے چینگ لکھتا ہے:

> "میری کہانیوں کے کردار دوستوں رشتہ داروں اور ان لوگوں میں سے لیے گئے ہیں جن سے میں برابر ملتا ہوں۔ پہلے مجھ میں یہ کمزوری تھی کہ میں اپنے کرداروں سے اسی قسم کی حرکات کراتا تھا جو صرف میری کہانی کے موضوع کو ابھارنے کے لئے ضروری ہوتے۔ ان کی پیچیدہ انسانی فطرت کو میں نظر انداز کر دیتا تھا۔ ادھر میں نے اس غلطی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے "تخلیقی قیموں" کی ضرورت اور اہمیت کو میں یاد رکھوں گا اور انھیں وجود میں لانا سیکھوں گا۔"

---

[1] اس کا ترجمہ "ادب لطیف" میں شائع ہو چکا ہے۔

[2] میں نے اس کا ترجمہ کر لیا ہے۔ "نیا دور" کی اگلی اشاعت میں شائع ہوگا۔

بہتیرے نام نہاد نقلی محب وطن کی ابن الوقتی، ریاکاری اور ظاہرداری کی بھدی سی چینگ تمن یی نے "مسٹر ہُوا وی" میں کی ہے۔ اس میں ایک قسم کا کردار ایسے خالص چینی اختصار و ذہانت کے ساتھ پیش کیا ہے جو ترجمہ میں ضائع نہیں ہوتا۔ انگریزی مصنفوں میں صرف ڈکنس کا اثر اس پر ہوا ہے۔ اس کا مکالمہ بہت ہی پر مذاق اور حقیقت نگارانہ ہے، لیکن اس کی بہترین کہانی "نفرت"[1] میں ایک درشت اور بے لطف خوشی سے خالی شاعری ہے، ایک شدید خوف اور اندوہ جو جدید چینی ادب کیلئے بالکل نیا ہے۔ اس کہانی میں ایک عجیب مجتمع اور مرتکز زور ہے۔ انسانی رویہ اور زبان کی تفتیش کے سلسلے میں اپنی دریافتوں پر چینگ تمن یو کو ایسا تصرف ہے اور وہ انھیں اس طرح استعمال کر لیتا ہے کہ اور بہت کم ادیب ایسا کر سکے ہیں۔

ادیبوں پر جنگ کا یہ برا اثر پڑنے کا خدشہ ہے کہ وہ چٹپٹے اور زود اثر رپورتاژ سے بہت آسانی سے مطمئن نہ ہو جائیں۔ آج کل کے چینی ادیبوں کی تحریروں میں ایک رجحان دکھائی دے رہا ہے کہ وہ صرف محاضرات اور جھلکیوں کو، جو بذات خود دلچسپ ہیں، مکمل اور مستقل کہانی سمجھ لے رہے ہیں۔ آج کل باریک تفریق و امتیاز کا مطالبہ کرنا ظلم ہے لیکن مواد شاندار ہے اور کیچڑ اور خون کے ڈھیر میں بہتیرے جواہر ریزے پڑے ہیں۔ جنھیں صرف چُن کے نکالنے اور صاف کرنے کی ضرورت ہے۔

بدلتے ہوئے ادبی منظر پر لوہسون کا تسلط اور اقتدار ابھی تک قائم ہے!

(نیوز رائٹنگ میں ہیرولڈ ایکٹن کے مضمون سے) تمنائی

---

[1] 'نیا دور' کے اس نمبر میں شامل ہے۔

چینگ تیئن یہ

مترجمہ تمنائی

نفرت

خستہ حال چھوٹی جماعت بالو پر پیر گھسیٹتی جا رہی تھی، مرد آگے اور عورتیں اور بچے پیچھے۔ ان کی آنکھیں سامنے سڑک پر لگی ہوئی تھیں۔ یہ کبھی ختم نہ ہونے والی معلوم ہو رہی تھی۔ تین دن اور دو رات سے وہ اس سڑک پر چل رہے تھے۔ جب وہ سورج پر نظر ڈالتے تو انھیں یقین سو جاتا کہ ٹھیک سمت کو جا رہے ہیں۔ لیکن سڑک کبھی ختم ہوتی نظر نہ آتی۔ جب کبھی وہ اس کے سرے پر پہنچ جاتے سڑک آگے ہی کو جاتی نظر آتی۔

"ہم لوگ شہر لیو کب پہونچیں گے؟"

"شاید کل"

زرد جھاگ کی طرح سڑک کے کنارے گرد کے ڈھیر نے لہر بنا دیا تھا۔ سورج کی تیز کرنیں ان لوگوں کو شعلے کی طرح جھلسا رہی تھیں۔ وہ بھی زمین سے اٹھتی ہوئی زرد گرد کے بادل میں لپٹے ہوئے تھے لیکن پھر بھی وہ چل رہے تھے راہگیروں کے بدن اس طرح جھلس کے گہرے بادامی ہو گئے تھے کہ ہر شخص ان کی پرانی بو سونگھ سکتا تھا۔

"ہمیں لیو میں کچھ کھانے کو مل جائیگا؟"

"کھانا ہمیں کون دیگا؟"

"کاش میں جلد مر جاتا ——— ابھی! زندگی دکھ کے سوا کچھ نہیں!" کرخت اور شاکی آواز میں کسی نے کہا

"باپ ہائی پھر چیخ رہا ہے" عورتوں نے ایک دوسرے سے سرگوشی کی۔

"قسم ہے ..... کی، میں اکیلا زندگی گذار رہا ہوں، ایک دم اکیلا!" باپ ہائی کی کرخت آواز نے شکایت کی۔

اپنی بیٹی تانیل کے مرنے کے بعد سے وہ ہر دم اسی طرح چلاتا اور قسم کھاتا ہے ”اگر میں پکڑ پاؤں، ایک — ایک — لعنت ہے اس پر۔ اگر کوئی سپاہی میرے پنجوں میں آ جائے تانیل، میری تانیل! تم — تم۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !“

بچے اس کو اس طرح بڑبڑاتے دیکھ کر ہنسنا چاہتے تھے لیکن انکی ہنسی ان کے گلے میں گھٹ کے رہ گئی۔ مرد چپ رہے۔ کچھ دن پہلے یہی لوگ باپ ہائی کے سامنے اس کی لڑکی تانیل کی ننگی، سوجی ہوئی نیلی لاش لائے تھے۔ اسکی جانگھیں خون سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ وہ سخت کرب میں تڑپتی ہوئی مری تھی۔

اِن مردوں کو اُن کی بیویاں یاد آ گئیں، جو ہمیشہ کیلئے ان سے چھِن گئی تھیں۔ اور ان کے چہرے زرد ہو گئے۔ کیا یہ گرمی کا اثر تھا کہ ان کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے، اور ان کے گھٹنے تھرتھرا رہے تھے؟ وہ نہیں جانتے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے دانت کس کے جکڑ لیے۔

بارود یا سڑی لاش کی جیسی ایک عجیب طرح کی بُو زمین سے اٹھتی معلوم ہوئی۔ لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ آسمان سورج کی گرمی سے کھول کے آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا۔ تپش کی وجہ سے یہ کسی عظیم الشان پوری کے کنارہ کی طرح جو تیز آگ پر پک رہی ہو مڑتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

ہر شخص چپ ہو گیا۔ صرف بالو پر ان لوگوں کے پیر گھسیٹنے کی آواز ہو رہی تھی۔ بالو دریا کے کنارے پڑے ہوئے کیچڑ کی طرح نرم تھا۔ ہر قدم پر ان کے پیر دھس جاتے تھے جنھیں وہ کوشش کر کے نکالتے تھے۔

”کسی کے رونے کی آواز آ رہی ہے“ یکایک ایک بچے نے ایک طرف یوں ہی اشارہ کر کے کہا۔

”چل“ اس کی ماں نے جھنجھلا کے کہا۔ لیکن اس کی آواز سے فکر ظاہر ہو رہی تھی۔

عورتیں بھوتوں کے مل جانے سے ڈر رہی تھیں۔ ان کی جماعت اس دنیا میں اکیلی تھی گرد نے زمین اور آسمان کو ڈھانک دیا تھا۔ وہاں گرد اور دہکتے ہوئے سورج کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس قافلہ کے سوا کہیں کسی جاندار کا پتہ نہ تھا۔ "کون رو رہا ہوگا؟ بھلا اس ماحول میں کون جی سکتا ہے۔"

لیکن لڑکا ماننے کو تیار نہ تھا۔ کچھ دیر چپ رہ کے وہ پھر بڑبڑانے لگا۔

"جو کچھ میں نے کہا تھا وہ سچ ہے۔"

ہاں، وہ سچ کہہ رہا تھا۔ کوئی کہیں کراہ رہا تھا۔

"بھوت ضرور دن دہاڑے آنکلیں گے۔"

عورتوں کے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔

"بیرے...... بیرے.......... میں التجا کرتا ہوں......"

"کون ہے؟"

مردوں نے ہر طرف دیکھنا شروع کیا۔

"یہ رہا!"

وہ بستی کے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر چڑھ گئے۔ ایک چھوٹے درخت کے نیچے ایک شخص پڑا ہوا تھا۔ وہ اوپر کے دھڑ سے ننگا تھا اس کا پائجامہ پھٹا ہوا اور سارا بدن ایک دم کالا تھا۔ "مجھ کو مار ڈالو میں برداشت نہیں کر سکتا ——" اتنا بھی وہ بڑی مشکل سے کہہ سکا۔

"کون تمہاری جان لینا چاہتا ہے؟"

"مجھ کو مار ڈالو، میں تم سے التجا کرتا ہوں.... میں برداشت نہیں کر سکتا —— ...."

کانپ گیا۔ اس کی پیٹھ اور سینے پر تمام تلوار کے گھاؤ تھے۔ لاکھوں کی تعداد میں چیونٹیاں ان زخموں سے لپٹی ہوئی ان کے پاس کے گوشت کو نوچ رہی تھیں۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ زخموں کی گہرائی کا اندازہ لگانا ناممکن تھا۔ ان گنت چیونٹیاں اس کے بدن پر ادھر ادھر تیزی سے دوڑ رہی تھیں۔ درخت کی جڑ کے ایک سوراخ سے نکل کے ایک لمبی قطار بنائے کھلے ہوئے زخموں پر پہنچتیں اور جگہ پانے کے لئے ایک دوسرے کو دھکا دیتیں یا ایک زخم سے دوسرے زخم کو جاتیں۔ لیکن کہیں بھی، چیونٹی کے سرکنے کو تل بھر جگہ خالی نہ تھی۔ ان کالی چیونٹیوں نے اس آدمی کو حبشی کی طرح سیاہ فام بنا دیا تھا۔

وہ آدمی ابھی تک مرا نہ تھا لیکن چیونٹیاں اس کو جیتے ہی کھا رہی تھیں۔

"مجھ پر رحم کرو۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا ـــــــ برداشت کرنا ناممکن ہے...... میں.....“ وہ کمزور سسکیاں بھرتا رہا۔

لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کیا جائے۔ ان کے بدن کی ہر رگ پھڑک رہی تھی، گویا چیونٹیوں کی فوج ان کے دل و دماغ میں تیزی سے دوڑ رہی تھی۔

"تم کون ہو؟“ ان میں سے ایک نے جھجکتے ہوئے پوچھا لیکن فوراً ہی اس کو یہ سوال بیجا معلوم ہوا۔

"میں زبردستی بھرتی کیا ہوا ایک مزدور ہوں۔ ان لوگوں نے مجھ کو اپنا کام کرنے کے لئے مجبور کیا۔“ اس شخص نے آہ بھر کر آہستہ سے کہا، اتنا آہستہ سے جیسے مچھر کے پروں کی بھنبھناہٹ۔

ان میں سے ایک مضبوط دیو جیسے آدمی نے اپنے پھیپھڑوں کو پوری طاقت سے پھلا کر مزدور کے بدن پر پھونک ماری۔ دوسروں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ چیونٹیاں

صاف پانی بہتی چلی جاتی ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں چیونٹیاں گرتی پڑتی بھاگ گئیں۔ کچھ زخموں کی گہرائی میں اور اندر گھس گئیں اور بہت سی خون کے ساتھ چپک کے رہ گئیں۔

سانس لینے کے لئے رُک رُک کے اُس آدمی نے اپنی دکھ بھری کہانی سنائی کہ کیسے وہ زبردستی مزدوروں کی جماعت میں بھرتی کیا گیا تھا۔ ایک دن تھکن سے چُور ہو کے وہ باقی کام پورا کرنے کے قابل نہ رہا تھا جس کی وجہ سے لوگوں نے اس کو کوڑوں سے بُری طرح پیٹا' اور جب اُس نے اپنے کو بچانا چاہا تو انھوں نے اس کے سینہ اور پیٹھ پر تلوار کے سات یا آٹھ وار کئے۔ اور وہاں تین یا شاید چار دن سے پڑا ہوا تھا۔ اس کو اچھی طرح یاد نہ تھا۔ اپنی داستان ختم کر کے اس نے ان لوگوں سے پھر التجا کی کہ اس پر ترس کھا کر اس کی دکھ بھری زندگی جلد سے جلد ختم کر دیں۔

وہ ان لوگوں کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس کی پلکیں نہ اُٹھ سکیں۔

بچے اور عورتیں بھی وہاں پر پہنچ گئیں۔ بچوں نے تیزی سے بھاگتی ہوئی چیونٹیوں کو کچلنا شروع کر دیا۔ عورتیں بھی اس کے چاروں طرف ایک لمحہ کے لئے جمع ہو گئیں لیکن اسے دیکھ کے دیوانوں کی طرح چیخ اٹھیں اور ایک ہاتھ سے آنکھیں بند کئے دوسرے ہاتھ سے بچوں کو گھسیٹ کے دور ہٹا دیا۔

مردوں نے جلدی جلدی اس مرتے ہوئے آدمی کے زخموں کو پانی سے دھویا خون سے رنگین پانی پیلی زمین پر چشمہ کی طرح بہہ نکلا

"ہم لوگ اسے نیچے لے چلیں۔"

اس سے زیادہ وہ کر ہی کیا سکتے تھے کہ اس کو اپنے ساتھ اس نہ ختم ہونے والے سفر میں لے چلیں۔ ان لوگوں نے سامنے دیکھا وہی کبھی نہ ختم ہونے والی سڑک، زرد آسمان، دہکتے ہوئے سورج کے نیچے جھلسی ہوئی زمین اور وہی اُبلتا ہوا افق۔ اس [illegible]

وہی جاندار تھے۔ ان کے سوا کہیں ایک کتا یا ایک چڑیا تک نہ تھی۔ کیا اس بچارے کو ساتھ لے کے وہ پھر آگے کو روانہ ہو جائیں؟

زخمی آدمی برابر ان سے التجا کرتا رہا کہ اس کی تکلیفوں کا خاتمہ کر دیں۔

"مجھ پر دیا کرو۔۔۔۔ میرے ہم وطنو!۔۔۔۔۔۔ میری زندگی کا خاتمہ۔۔۔۔۔"

لیکن وہ لوگ اس کو چھوٹے ٹیلے سے نیچے لے جا چکے تھے۔

"اس کی تکلیف اتنی ہی زیادہ ہے جتنی ہم لوگوں کی مصیبت۔ وہ ہم لوگوں کا ہم وطن ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ بھائی ہم لوگوں کو ساتھ جینا اور ساتھ مرنا چاہیئے۔

پھر ان میں سے ایک نے اپنا کرتہ اس کے اوپر ڈال دیا۔ مگر پسینے سے بھیگے ہوئے کپڑے نے اس کے زخم کی تکلیف اور بڑھا دی۔ اس نے اسے اوڑھنے سے انکار کر دیا۔

کچھ عورتوں کو ان کے شوہر یاد آ گئے جو اسی طرح زبردستی مزدوروں کی جماعت میں بھرتی کئے گئے تھے اور جن کی کوئی خیر اب تک ان کو نہ ملی تھی۔ وہ رو پڑیں اور کو لگیں۔ مرد خاموش پیچ و تاب کی حالت میں کس کے مٹھیاں بھینچے تھے۔ اگر اس وقت کوئی سپاہی بندوق اور تلوار لیکر بھی ادھر ان کے راستہ پر آ جاتا تو سب کے سب اس پر پل پڑتے، اس کی گردن مروڑ دیتے۔ انتہائی طیش میں اس کو دانتوں سے کاٹ کھاتے۔

جب وہ ایک دوراہے پر جس کے کنارے پر ایک نیم شکستہ مندر کھڑا تھا پہونچے تو سورج ڈوب رہا تھا۔ ان لوگوں نے وہاں ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا۔ زخمی مزدور قریب المرگ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سانس رک چکی ہے۔

ایک اداس خاموشی چھا گئی۔ مرد مرتے ہوئے مزدور کو گھیرے ہوئے چپ چاپ دیکھ رہے تھے۔ وہ سسکیاں بھی نہ بھر سکتا تھا۔ عورتوں پر سکتہ کا عالم تھا۔ بچوں نے کوئی غیر معمولی واقعہ سمجھ کے اپنے پاؤں کی انگلیوں کے بل کھڑے ہو کر جھانکنا [illegible] دیکھ سکیں۔

اس آدمی کے ہونٹ آہستہ آہستہ پیلے ہوتے گئے۔

یکایک ہاپ بائی کے چہرے پر دہشت کے آثار نمایاں ہو گئے اور وہ اپنی کرخت آواز میں چیخ اٹھا: "اس کی طرف دیکھو!..... وہ کتے ذلیل کتے...... اس کو دیکھو .. بہشت کی قسم ..... اگر کوئی سپاہی ہم لوگوں کی گرفت میں آ جائے...... میری نائیل...."

کوئی اسکی طرف متوجہ نہ ہوا لیکن اپنے دل میں سب کہہ رہے تھے، "صرف یہ مزدور ہی نہیں، صرف اسکی بیٹی نائیل ہی نہیں بلکہ جو کچھ ہم لوگوں کا ہے۔ ہمارے لڑکے ہمارے چوپائے، ہماری لڑکیاں، ہمارے گھر، ہماری چند گز زمین —— سب اسی طرح تباہ کی جا رہی ہیں۔ اس کی نائیل کی طرح، اس مزدور کی طرح۔"

ہر شخص یہ خیال کر رہا تھا، "اگر کوئی سپاہی ہماری گرفت میں آ جائے....."

اس وقت اگر انکی آنکھیں گرد سے نہ بھری ہوتیں تو یقینی وہ اپنی طرف آتے ہوئے کچھ دیکھتے جو تین کالے چیونٹوں کی طرح تھا۔ سامنے سڑک نیچی ہو گئی تھی۔ وہ تین کالی چیونٹیں مشکل سے چڑھتی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ تین سپاہی تھے پھٹی وردی پہنے!

ہر طرف گرد ہی گرد تھی۔ پانی کے جھکولوں کی طرح گرد لٹو کی مانند چکراتی ان تینوں سپاہیوں کے سامنے سے گذر رہی تھی۔ کبھی گرد ان کو چھپا دیتی تھی اور کبھی وہ کھل جاتے، لیکن وہ نزدیک ہی ہوتے جا رہے تھے۔

سپاہی جو بیچ میں تھا وہ دوسرے دونوں کے سہارے چل رہا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ گھائل تھی۔ ایک دبلا تھا اور اس کے چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، تیسرے کا سانولا چہرہ اور ہونٹ سوجا ہوا تھا۔ سوجے ہوئے چہرہ والے سپاہی نے آدمی سے آگے دیکھا اور ایکبارگی رک گیا۔

دوسرے دونوں پر گویا بجلی گر گئی۔

"اب ہم لوگوں کا خاتمہ ہے!"

کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ کسان کس قسم کا استقبال کرینگے۔ لیکن بھاگتے کہاں؟ واپسی ناممکن تھی۔ ایک دن اور دو رات سے وہ اس راستہ پر۔ اس زرد زمین پر اپنے کو گھسیٹ رہے تھے۔ روٹی کی ایک کھیل بھی اڑکر ان کے منہ میں نہ گئی تھی۔ پانی کی بوند بھی انکے حلق سے نہ اتری تھی۔ پیاس کم کرنے کیلئے ہونٹوں پر جمے ہوئے پسینہ کو چاٹ لیتے تھے۔

"برا ہوا ہم لوگوں کے پاس اب تک ہماری بندوق ہوتی تو بتا دیتے کہ ہم ایسے ذلیلوں کو کیا سمجھتے ہیں!"

وہ شکست کھائے ہوئے تھے۔ انکا دستہ ٹوٹ چکا تھا۔ اور انکی عزیز بندوق دشمنوں نے چھین لی تھی۔

"ہائے بدقسمتی! کسی پہلو چین نہیں۔ دشمن بھی ہم سے نفرت کرتے ہیں اور ہمارے اپنے لوگ بھی" دبلے سپاہی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ جس خستہ حال جماعت کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے ان میں سے ایک نے آخرکار انھیں دیکھ لیا۔

"وہ دیکھو! سپاہی!"

سب لوگوں نے ایک ساتھ اپنی گردن اس طرف پھیر دی جیسے ایک فوج کا دستہ افسر کے حکم پر۔ اور پھر پلک جھپکاتے سب کے سب اپنی پوری قوت سے پاگلوں کی طرح سپاہیوں کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک نوجوان آدمی نے سب سے پہلے ان کو جا لیا۔ پہونچتے ہی وہ پھسلا اور گرا لیکن گرتے گرتے اس نے دبلے سپاہی کی ٹانگ پکڑلی

بگاڑ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بوٹی نوچ لے گا۔ اس کے دانت تقریباً ہڈیوں تک گھس گئے۔ سپاہی نے اپنے کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس کا بدن لوہے جیسے ہاتھوں کی گرفت میں تھا۔ اس کے لئے یہ بھی ناممکن تھا کہ گردن گھما کر دانت سے کاٹ کر بدلہ لے۔ سوجے چہرہ والا اور زخمی ٹانگ والا بھی۔ دونوں اسی طرح گرد پر چت پڑے تھے اور اوپر سے گھونسے اولوں کی طرح پڑ رہے تھے۔

"چمڑا ادھیڑ دو!"

"مارتے مارتے تختہ کر دو!"

"مار مار کے ادھ موا کر دو!"

ایک شخص نے ہاتھ روک کے کہا: "کیوں ان کو مار مار کے پریشان ہو رہے ہو ——— آؤ انھیں جیتے جی گاڑ دیں!"

سب اس کی طرف دیکھنے کو مڑے اور گھونسوں کی بارش ایک ذرا کیلئے تھم گئی۔

کچھ دور پر باپ ہائی فریادی لہجہ میں چیخ اٹھا:

"ان ناپاک کتوں کو مار ڈالو ...... ان کا گوشت کھا جاؤ .... لعنت ہے ان پر ... .. مار ڈالو ....."

"ٹھیک ہے! ٹھیک ہے! بڑا اچھا اور سستا گوشت ہوگا!" سبھوں نے چلا کے اس خیال سے پرجوش موافقت دکھلائی۔

ان لوگوں کی آواز میں خوشی کی کوئی جھلک نہ پائی جاتی تھی صرف انتہائی غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔

زخمی ٹانگ والے سپاہی نے اپنا سر زمین پر ڈال دیا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا، اور جبڑے ہل رہے تھے۔ پیلے دانتوں کی دو دھاریاں باہر نکلی ہوئی تھیں، جیسے کھینچ کے نکال دی گئی ہوں تازہ بجھے ہوئے بونٹ کی طرح گرم بالوں کے

میں ٹھونس دیا گیا۔

"بھائی!" اس نے دھیمی اور مدھم آواز میں التجا کی۔ "پہلے مجھے مار ڈالو۔"

"ہم کو کیا پڑی ہے کہ تم کو جلدی مار ڈالیں؟" ایک حبشیوں کے سے چہرہ والے نے کہا۔

زخمی آدمی کا ہر عضو لرز رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا: "میں مر رہا ہوں ...... میں ......"

"ہم لوگ تم کو آسانی سے قتل نہیں کرینگے۔ بلکہ خوب اذیت دے دے کر مارینگے۔"

"ہم لوگ تم کو تکلیف دینگے ..... جان لو! بدبخت، مردود! تمہاری سفاکیوں کا بدلہ ...."

"ان لوگوں نے بے گناہوں کو لوٹا ہے!"

"ان کی جامہ تلاشی لو۔"

ان تین بدقسمتوں کے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ صرف سوجے ہوئے چہرہ والے کی جیب میں جوا کھیلنے کے پانسے پڑے تھے۔

"ان لوگوں کا موزہ دیکھو .... موزہ کی تلاشی لو۔"

کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب کوئی سپاہی شکست کھا کے بھاگتا ہے تو وہ جیتے ہوئے بینکوں کے نوٹ موزہ میں چھپا لیتا ہے۔

موزے ٹانگوں سے چپک گئے تھے۔ ان لوگوں نے اس بے پروائی سے کھینچا کہ کھال بھی ادھڑ کے ساتھ آ گئی۔

"اب تم لوگوں کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم لوگوں کے پاس کچھ نہیں۔" — سب سوجے چہرہ والے نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

بچوں نے سپاہیوں کے منہ پر تھوکا۔ انھوں نے بچنے کے لئے گردن پھیر لی [illegible] ہنس رہے تھے لیکن ان کی ہنسی ترش اور تلخ تھی۔ سپاہیوں کے کان، ناک اور

[redacted]

منہ سب بالو سے بھر گئے۔ مرد بھی ہنسنے لگے۔

"ذلیل کتو! کہاں گئی اب تمہاری شیخی؟"

"دیکھو خیال رہے، کہیں بھاگ نہ جائیں!"

"اس کی فکر نہ کرو"

"اب تک یہ ذلیل کتے خوب مزے اڑا رہے تھے"

"عورتوں کو بھی اپنا بدلہ نکالنے دو۔ عورتوں کو بھول نہ جاؤ!"

"ہاں ٹھیک ہے۔ انکو بھی لاؤ۔ عورتوں کو بھی موقع دو کہ وہ اپنی نفرت کا اظہار کریں"

"ان سپاہیوں کو ادھر لے چلو"

"ذرا میری مدد کرو"

سپاہیوں کو گھسیٹتے ہوئے وہ ٹوٹے مندر کی طرف لے گئے۔ جھوٹانگوں نے بالو پہ چھوٹے چھوٹے ہل کی طرح کیاریاں بنا دیں۔ زخمی آدمی بے ہوش ہو رہا تھا اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھیں آدھی بند تھیں۔ اس نے اپنے تئیں انکے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ موجے چہرے والے کی شکل سے افسوس اور ڈر ظاہر ہو رہا تھا۔ بغیر افسوس کے وہ کیسے مر جاتے؟ کیا وہ بغیر ایک قطرہ پانی پئے اور سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا چکھے مر جائیں گے؟ ان لوگوں نے اتنی مصیبتیں جھیلی تھیں صرف اس لئے لڑائی کے میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے اور کبھی نہ ختم ہونے والی سڑک کو تھاما، بھوک پیاس اور جلا دینے والے سورج کا سامنا کیا کہ زندہ رہ سکیں! ...... اور اب ———— ؟

"ہائے! ہم لوگ تباہ ہو گئے!"

وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کسان اور شہری ان کے بارے میں کیا خیال رکھتے ہیں۔ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کا سامنا ہو جانا موت ہے لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اس وحشیانہ نفرت کا سبب کیا ہے کیونکہ ان لوگوں نے خود

اتنے دکھ سہے تھے کہ اپنی سفاکیوں کو بھول گئے تھے۔ انہوں نے بھی اکثر فاقے کئے تھے سال دو سال تک اپنی بیویوں سے نہ ملے تھے۔ بندوق کی باڑھ اور سنگین کی نوکوں کا سامنا کیا تھا محاذ پر، جہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کرتے اور پکڑے جاتے تو گولیوں سے اڑا دئے جاتے۔ وہاں ہر طرح کی تکلیف اٹھائی تھی۔ ان کو بھی گھربار، بال بچوں اور ماں باپ کی یاد ستاتی تھی۔ پھر بھی لوگ ان کے خون کے پیاسے تھے

سوجے ہوئے چہرہ والے نے اپنے ساتھیوں کو ایک ایک کر کے دیکھا۔ پہلے زخمی کو پھر دھنستے ہوئے گال والے کو۔ دھنسے ہوئے گال والے کا چہرہ چوٹ کے صدموں سے نیلا اور بینگنی ہو رہا تھا۔ خون اس کی پیشانی سے بہہ کر ٹھوڑی پر ٹپک رہا تھا اور اس کی آنکھیں ڈر سے پھٹی ہوئی تھیں۔ کتنے تعجب کی بات تھی! وہ محاذ پر کبھی ڈرتا نہ تھا۔ ہاں محاذ پر ان کے پاس بندوق ہوتی تھی!

”ہزار افسوس کہ اب ہم لوگوں کے پاس بندوق نہیں۔ اگر اب بھی ہوتی تو دیکھتے کہ کون ہمیں چھونے کی بھی ہمت کرتا ہے۔ یہ سب ہم لوگوں کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک جاتے اور اپنا کل مال و اسباب ہمارے حوالہ کر دیتے اور یہ عورتیں... چیختا ہوا

”ناپاک سور! کھیل بگڑ چکا۔ اب اس طرح بکنے سے کیا فائدہ؟“

زمین تپ رہی تھی۔ زرد بالو پر ان لوگوں کو جوتوں اور ٹانگوں کے بل گھسیٹا جا رہا تھا چمڑا چھل گیا جس کی وجہ سے خاکی پتلون خون کے دھبوں سے داغدار ہو گئی۔

”زندہ دفن کر دو! ان لوگوں نے بہت شرارتیں کی ہیں —— بہت زیادہ ......“ ایک عورت نے چیخ کے کہا۔

ان عورتوں کو اپنے شوہروں اور بچوں کی مصیبتیں یاد تھیں وہ چاہتی تھیں کہ ان تین سپاہیوں کا اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دیں۔ ان کی ہڈیاں اور پسلیاں توڑ کر رکھ دیں۔ دانت سے کاٹ کاٹ کھائیں۔ لیکن جب وہ ان کے

[redacted]

سامنے لائے گئے تو چپ چاپ سکتہ کی حالت میں کھڑی صرف پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھیں ۔

"زندہ دفن ......"

ن تین قیدیوں نے تپتی زمین کو دیکھا۔ اتنے بھوکے پیاسے ہونے پر بھی و گاڑے جائیں گے۔ انھوں نے اپنے ہونٹوں پر سے پسینہ چاٹا۔ پسینہ سمندر کے پانی ی طرح نمکین تھا۔

"تھوڑا پانی دو۔ پہلے مجھ کو تھوڑا پانی پلا دو پھر زندہ دفن کر ڈالنا" دبلے سپاہی نے منت سے کہا۔ جیسے کوئی دیوتا سے منت مانگتا ہو

"پانی! ناپاک کتے! تم کو پانی دوں؟" پاگل کی طرح گھوم کر ایک بوڑھا

"میں تمہارا قیمہ بناؤں گا، میں تمھیں مار ڈالوں گا۔"

"تم پر پھٹکار! ہماری تامل ...... وہ ......"

یہ کہہ کے وہ ان پر پل پڑا۔ زکٹ جیسا پتلا لٹھ، اُٹھا کے اس نے سوجے ہوئے چہرے والے سپاہی کے گال پر گھونسہ مارا۔ گہرا نیلا نشان اُس کے گال پر پڑ گیا بوڑھے نے حقارت سے اس پر تھوک دیا۔ تھوک کیڑے کی طرح اس نیلے نشان پر سے رینگتا ہوا نیچے ٹپک پڑا۔

سپاہیوں نے اپنے کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن مرد انھیں مضبوطی سے پکڑے تھے "تمام سپاہی کمینہ ہوتے ہیں" ایک عورت نے ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے کہا۔ ا کے منہ میں جھاگ بھر آیا تھا۔ "تمام سپاہی ......"

دبلے سپاہی نے سر گھما کے اس عورت کو دیکھنا چاہا۔ جو بولی تھی لیکن اس کا گھوم نہ سکا۔

زخمی آدمی نے آنکھیں آدھی بند کر لیں۔ اس کا چہرہ پھڑک رہا تھا۔ اس

کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

"میرے ہم وطنو... ... اس سے اچھا ہے کہ مجھ کو مار ڈالو.... مار ڈالو"
کسی نے سننے کی تکلیف گوارا نہ کی۔

"میرے ہم وطنو، میرے ہم وطنو" اس نے کمزور آواز میں دہراتے ہوئے کہا:
"مجھے ابھی قتل کر دو..... جلد....."

"تم اتنا جلد چھٹکارا نہیں پا سکتے ہو" باپ ہائی نے غصے میں منہ کے کونے سے جھاگ نکالتے ہوئے کہا۔

زخمی نے کوشش کر کے اپنی آنکھیں کھولیں۔ وہ اس جماعت میں کسی ایسے کو ڈھونڈ رہا تھا جس کے سامنے وہ رحم کی درخواست کر سکے۔ لیکن اس کو تمام صورتیں وحشیوں جیسی نظر آئیں۔ کچھ دیر چُپ رہ کے اس نے آنکھیں بند کر لیں پھر اپنے پورے زور سے چلّایا۔
"میرے ہموطنوں، اس وقت ہم لوگ کہاں ہیں؟... ... ایک سال کے بعد آج کے روز مجھ کو مرے ہوئے ٹھیک ایک سال ہو جائے گا...... میری ماں، میری بوڑھی کی تسلی کر دینا..... اسے ابھی تک خبر نہ ہوگی اس کو کہہ دینا کہ مجھے بھول جائے...

ایک کالا ہاتھ جو اسے دبائے تھا صاف لرز رہا تھا!

"لیکن یہ ممکن ہے کہ ان ظالموں کی بھی ماں ہوتی ہے۔ یہ بھی تکلیف سے گھبراتے ہیں۔ یہ لوگ جو......"

"جتنا جلد تم سے ہو سکے... جلد... میرے ہم وطنو!........ دوسری زندگی میں....."

ان میں سے ایک نے اس کے منہ پہ تھوک دیا۔

"دوسری زندگی! تم ہاتھوں میں بندوق لے کے لوٹ مار کرتے ہو۔ زندگی قتل و خون میں گزارتے ہو! کتے کمینے! تم لڑائیوں سے دولت پیدا کرتے ہو!"

[redacted]

دُبلے آدمی نے مشکل سے گردن موڑ کر باپ ہائی کی طرف دیکھا جس کے گال کی ہڈیاں اونٹ کے کوہان کی طرح اُبھری ہوئی تھیں۔ اس کے نتھنے، ہونٹ اور چہرہ کی جھریاں بالوں سے بھری تھیں۔ اس کی نیلی مٹیالی آنکھیں مری ہوئی مچھلی کی آنکھوں کی طرح پھٹی ہوئی تھیں۔ ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جیسے پھاڑ کر ان دشمنوں کو کچا کھا جائیگا۔

"وہ کیا بک رہا ہے؟ کس نے دولت پیدا کی ہے؟"...... ان لوگوں کو بھی اسی طرح ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان کے دکھ بھی اتنے ہی بڑے تھے۔ ان کے لئے بھی بھوک اور پیاس اسی طرح تکلیف دہ تھی۔ آخر یہ لوگ اپنا دبا ہوا غصہ ان پر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے؟ دبلا سپاہی چپ نہ رہ سکا۔

"خدا غارت کرے! کیا یہ ہم لوگوں کا قصور ہے جو لڑائی ہوتی ہے؟ کیا ہم لوگ یہ چاہتے ہیں؟ بھلا ہم لوگوں کو لڑائی سے کیا مل جاتا ہے؟"

"کیا خوب تم تو بالکل معصوم ہو۔ بلا شبہ، کیا کہنے ہیں!"

"یہ تو افسر ہیں جو سب کچھ کرتے ہیں۔۔ جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے ...... ہم لوگ........"

"اس کی مت سنو۔ ان لوگوں نے خونریزی، قتل و غارت سے ہر طرف تہلکہ مچا دیا ہے۔" عورتوں نے چلا کر کہا، "سب سپاہی کمینہ ہوتے ہیں۔"

"ہم لوگ بے بس ہوتے ہیں۔ جنرل قتل و غارت کا حکم دیتا ہے اور ہم لوگ .... ہم لوگ......."

"اس کی مت سنو"

"ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں؟ ہم لوگ صرف......"

یہ بھی کسان تھے کبھی یہ بھی سپاہیوں سے نفرت کرتے تھے۔ اپنے گھر کی زمین انھوں نے صرف اسلئے چھوڑ دی تھی کہ دائمی فاقہ کشی ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ ان کے

ماں باپ بھی اس خستہ حال جماعت کی طرح زمین و آسمان کے درمیان کہیں مارے پھر رہے ہونگے۔ ان کے ماں باپ بھی اسی طرح سپاہیوں سے نفرت کرتے ہونگے۔ اسی طرح ملاقات ہو جانے پر سپاہیوں کو زندہ گاڑ دینا اور کچا نگل جانا چاہتے ہوں گے۔ یہ سپاہی اپنی دنیا سے نکالے ہوئے تھے ان کے ماں باپ ان کو اپنا بیٹا بنانے کو تیار نہ ہوں گے۔ ان کے بھائی بہن ان کو اپنا بھائی نہ کہیں گے۔ انکی بیویاں ان کو اپنا شوہر سمجھنا ذلت خیال کرینگی ان کے دوست بچھڑ گئے۔ اس تپتی جلتی ہوئی دنیا میں صرف وہ تین باقی رہ گئے تھے۔

"ہم لوگ کچھ نہ کر سکتے تھے . . . . . ہم لوگ . . . . ."

آنسو لمبے آدمی کے چہرے پر ڈھلک آئے۔

ارے یہ تو رو رہا ہے !"

[illegible] حیران ہو گئے۔ کیا یہ لوہے اور خون کے آدمی رو رہے تھے !

اس لانبے آدمی کی گرفت، جو دبلے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھا۔ دھیرے دھیرے ڈھیلی ہوتی گئی۔ پسینہ کے قطرے اس کی پیشانی پر سے ٹپک کر اس کے قیدی کے کاندھوں پر گرے۔

گرد جس نے آسمان کو ڈھانک لیا تھا گہری ہوتی گئی۔ پیلا سورج بیگنی ہوا جارہا تھا بالو سے لدی گرم ہوا ان لوگوں کے چاروں طرف چکر کھاتی گھوم رہی تھی۔ ان لوگوں کا دم گھٹ رہا تھا۔

"لڑائی کون چاہتا ہے ؟" سوجے چہرہ والے نے آہستہ سے کہا: "آخر سپاہی بھی انسان ہوتے ہیں۔ ان کے بھی ماں باپ ہوتے ہیں...... اپنے گاؤں میں...."

"تم کہاں سے آرہے ہو ؟"

"شہر پیرس سے"

"اچھا تم لوگ ؟"

"یہ دونوں چیوکے گاؤں سے" سوچتے ہوئے چہرہ والے نے انکی طرف سے جواب دیا۔

"سپاہی بننے سے پہلے تم کیا کرتے تھے؟"

"ہم کھیت میں کام کرتے تھے، ہمارے گاؤں کے کل لوگ" اس نے معمولی لہجہ میں کہا۔

خاموشی!

"کھیت میں کام کرتے تھے! پھر تم نے سپاہی کا ذلیل پیشہ کیوں اختیار کیا؟ تم کو کس نے بھرتی کیا؟"

"کیا تمہارا خیال ہے کہ ہم لوگوں نے خوشی سے سپاہی گری اختیار کی ہے .... گھر پر کھانے کو کچھ نہ تھا۔ اگر تم ہماری جگہ پر ہوتے تو کیا کرتے؟"

سب لوگ چپ تھے۔ ہوا بالو پہ سے سیٹی بجاتی گذر رہی تھی آسمان کا کنارہ دھندلا ہوگیا تھا۔ زمین اور آسمان میں فرق کرنا مشکل تھا۔ ہر چیز پگھل کر سورج میں ملتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

اب تک بالکل چپ چاپ، عورت مرد بچے سبھی ان تینوں سپاہیوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سپاہی کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوتا ہے۔ کیا یہ لوگ بھی کسان تھے؟ کیا یہ لوگ بھی کھیت جوتتے تھے؟ یہ سپاہی! کیا یہ ممکن ہے کہ ان کمینہ سپاہیوں کا خمیر بھی کسانوں اور مزدوروں کے خمیر سے بنا ہے؟ یہ نیا خیال عجیب طرح سے انکے دماغ کو روشن کر رہا تھا۔

"جب تمہارے پاس کھانے کو نہ رہا تو خون بہانا اور لوٹ مار شروع کر دیا" عورتوں نے کہا۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ دوسروں پر تم نے کیسے کیسے دکھ ڈالے ہیں؟"

"چونکہ تم نے بھی کھیتوں میں کام کیا ہے، ہم لوگ کیوں......"

"چپ! سپاہی پھر بول رہا ہے"

ان کے گاؤں میں لوگ بھوکے مر رہے تھے۔ وہ جینا چاہتے تھے۔ لیکن کھانے کو کہاں سے لاتے؟

"دنیا میں کھانے کو کافی ہے۔ لیکن اس پر [illegible] کا قبضہ

وہ بھوکے کیوں مرتے؟ ان لوگوں نے فوج میں بھرتی ہو جانے کا ارادہ کرلیا تاکہ ایک دو سال فوج میں روپیہ جمع کرلیں اور پھر چین سے زندگی گذار دیں۔ ان کے افسروں نے دشمنوں کو، جن کے بارے میں وہ کچھ نہ جانتے تھے، قتل کرنے کا حکم دیدیا۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ لوگ بھی ان ہی کی طرح ہڈی اور چمڑے کے بنے ہوئے آدمی ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ آخر انھیں اپنی ہی طرح کے آدمیوں سے کیوں لڑنا پڑتا ہے۔ شاید ان کے افسر کا دوسرے افسر سے جھگڑا ہو گیا ہوگا۔ عوام، جنتا، لوگ ان سے نفرت کرتے تھے لیکن وہ کسی سے بھی نفرت نہیں کرتے تھے انھیں ہار ہو گئی اور وہ تینوں اپنی جانیں بچانے کو بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور بس ...... اور اب ......

اب ہم لوگوں کا آخر وقت آگیا ہے چاہے ہم کو زندہ گاڑ دو یا مار ڈالو جو چاہو ....."

وہ پھر چپ ہو گیا۔ پیلے دانت اس کے کھلے منہ میں سے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے تھکن ظاہر ہو رہی تھی

اس کے گرفتار کرنے والے ایک دوسرے کو گھبراہٹ اور حیرت سے تک رہے تھے اس وقت ان تین دکھیوں کی زندگی ان کے رحم پر تھی۔ انھیں اس موقع سے فائدہ اٹھا کے اپنا بدلہ نکالنا چاہئے تھا لیکن کیا وہ اپنے دل کا بخار ان تینوں پر نکالیں؟ وہ جو کبھی کسان تھے، جو ان ہی کی طرح سیدھے سادے آدمی تھے؟

وہ دیر تک ایک دوسرے کو تکتے رہے لیکن کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ ان کے مرجھائے ہوئے زرد چہروں پر چند منٹ پہلے جو خوفناک ارادے اور سنگدلی کے آثار جھلک رہے تھے اب غائب ہو چکے تھے۔ اس کے بدلے بے چینی دکھائی دے رہی تھی۔ اب کیا کیا جائے؟ ان کی زندگی بھوک اور دکھ سے بھری ہوئی تھی ـــ لیکن ان تینوں سپاہیوں کی زندگی بھی تو ایسی ہی تھی! وہ مرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہی حال اُن تین سپاہیوں کا بھی تھا۔ کیا ان بدقسمتوں کو زندہ رکھ کے دکھ دینا انصاف ہے؟

تینوں نوجوانوں نے، جو ان تین سپاہیوں کو پکڑے تھے اپنی گرفت چھوڑ دی۔

"خدایا! خدایا!" باپ ماتی چیخ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چشمہ کی طرح بہہ رہا تھا۔ اس نے ان سے بدلہ لینا چاہا تھا۔ لیکن اب اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کرے۔

زخمی ٹانگ والا سپاہی کراہ رہا تھا۔ اس کے چہرہ کی رگیں زور زور سے کھنچ اور پھڑک رہی تھیں۔

"کیسے ہو تانی؟"

مردوں کا بے اختیار ہنس دینے کو جی چاہا۔ تانی! کیسا بے ڈھنگا نام!

"بہت تکلیف ہے" تانی نے بہت آہستہ سے کہا گویا وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی سُن نہ لے! اس کی ٹانگ کے زخم کی وجہ سے اس کا بدن بے حس و حرکت ہو گیا تھا، اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی چیز رینگ رہی ہے۔

"تکلیف ہو رہی ہے۔ افسوس اس بیچارے کی ٹانگ میں آتشک کا زخم ہے"

سبھوں نے تانی کی ٹانگ پر نظر جما دی۔ اس نے اپنی پتلون اوپر چڑھائی۔ زخم پر خاکی رنگ کی پٹی سیاہی مائل سرخ خون اور ہلکے پیلے رنگ کی ریم سے بھیگی ہوئی بندھی تھی۔ تانی اپنے تھرتھراتے ہاتھوں سے کپڑا الگ کرنا چاہتا تھا لیکن یہ ناممکن تھا کیونکہ کپڑا اچڑے پہلو سے چپک گیا تھا۔

"آہ! کیسی مصیبت ہے! بچائیو کیا ...."

سوچتے ہوئے چہرہ والے نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ وہ پانی مانگنا چاہتا تھا لیکن اس کی ہمت نہ پڑی۔

"زخم کو ایسے ہی چھوڑ دو۔" اس نے کہا۔

"لیکن یہ بہت تکلیف دے رہا ہے" دوسرے نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

"اگر ہم لوگوں کے پاس تھوڑا، بہت تھوڑا سا...... ہوتا" سوچتے چہرہ

والے کو "پانی" کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ تانی نے پٹی پر تھوک ڈال دیا۔ تھوک نمکین تھا۔ بالوں سے بھرا ہوا۔ تکلیف بڑھ گئی۔ اس نے پٹی نوچ دی۔ پٹی کے ساتھ گوشت کھنچ گیا۔ خون ٹانگ سے بہہ نکلا اور زمین پر جمع ہو کر چھوٹے سیاہ گڈھے بنا دیئے۔

"کیڑے!"

گہرا زخم ٹانگ کی پوری گولائی میں پھیلا ہوا تھا۔ کچھ کیڑے اس سُرخ سوراخ میں رینگ رہے تھے۔ موٹے موٹے کیڑے ریم اور خون میں لتھڑے ہوئے۔ جیسے ہی پٹی اُدھڑی وہ تیزی سے بھاگنے لگے۔ چند زخم سے نکل کر تانی کے ہاتھوں پر چڑھ گئے۔ اور وہاں لال رنگ کی پتلی لکیریں بن گئیں۔ بہت سے گرم زمین پر گر کے تڑپنے لگے۔

دیکھنے والوں نے اپنے دانت بھینچ لئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے کیا وہ اس کی مدد کریں؟ لیکن کیسے؟

تانی تکلیف کے مارے اپنے پیلے دانتوں سے نچلا ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس پر تشنج کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کے انگلیوں کے جوڑ اینٹھ رہے تھے۔ جب دَورہ ذرا کم ہوا تو اس نے سانس روک کے اپنی کانپتی ہوئی انگلیاں زخم میں ڈالیں۔

"اس کا ناس ہو!" اس نے بھرائی ہوئی بھاری آواز میں کہا جیسے کوئی رضائی کے نیچے سے چیخ رہا ہو۔

اس نے چٹکی سے پکڑ کے کیڑے کو زمین پر پھینک دیا۔ مگر نمکین پسینے سے بھیگی انگلیاں زخم سے چھو گئیں۔ تکلیف اتنی زیادہ ہوئی کہ وہ سر سے پیر تک کانپنے لگا...

لیکن پھر بھی اس نے انگلی دوسری بار ڈال دی..... اور پھر اور پھر۔

کیڑے تپی زمین پر رینگ رہے تھے۔ چند اس کی انگلیوں سے لپٹ کے ناخون تک پہونچ گئے تھے۔ انھیں پھینکنا مشکل ہو گیا تھا۔

وہ انھیں چٹکیوں سے پکڑتا گیا لیکن ہر بار تکلیف سے تڑپ جاتا۔ سوجے ہوئے

چہرہ والے نے اپنے دل میں سوچا، "کیا میں پانی مانگوں؟ لیکن وہ تو ہم لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ ہمیں اذیت پہونچانا چاہتے ہیں۔" اس نے سر اٹھا کے تانی کی طرف دیکھا۔ تانی کے گال اب تک تکلیف سے پھڑک رہے تھے۔ وہ کانپ گیا۔ اگر اس کے پاس بندوق ہوتی تو وہ اب تک تانی کو اکی ان مصیبتوں سے چھٹکارا دلا دیئے ہوتا۔

صرف چند کیڑے اب زخم کے منہ پر باقی رہ گئے تھے۔ اس کا دبلا ساتھی ان کے نکالنے میں مدد کر رہا تھا اور ہر بار: "تم کو تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے" کہتا جاتا تھا۔

اداس چہروں کے ساتھ لوگ چاروں طرف کھڑے چپ چاپ دیکھ رہے تھے انکی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ ان لوگوں کو اس مزدور کا چیونٹیوں سے لپٹا ہوا زخمی بدن یاد تھا۔

"جتنی کم تکلیف ہو اور جتنا جلد وہ مر جائے اچھا ہے۔ لیکن یہ سپاہی ......"

دبلا آدمی اب تک احتیاط سے کیڑے چن رہا تھا۔ خون اور ریم اب تک زخم سے رس رہا تھا۔ تانی نے اس پر تھوک ڈال دیا اور سفا کی پٹی پھر باندھنے کو اٹھائی۔

"بغیر پانی کے پٹی نہیں باندھ سکتے ہو" لانبے آدمی نے کہا۔

"پانی!" ...... تینوں سپاہیوں نے اس لانبے آدمی کو تعجب سے دیکھا۔ یہاں بھلا پانی کہاں مل سکتا ہے؟ وہ لوگ دو رات اور ایک دن سے پیاسے اس ریگستان میں چل رہے تھے جب پینے کو ایک قطرہ پانی نہ ملے تو زخم دھونے کا سوال ہی بیکار ہے۔ ان لوگوں کو تو ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ دس سال سے سوا اپنے نمکین پسینہ کے پانی کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے۔ اس پیلے آسمان، پیلی زمین، دہکتے سورج اور جھلسانے والی ہوا کی دنیا میں پانی بھی ہو سکتا ہے؟

سپاہیوں نے ہونٹ کے پسینہ کو چاٹ لیا۔

باپ ہاٹی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "آخر تم اس تکلیف میں کیوں ہو؟"۔

"ہم لوگوں کی مصیبت اب تک ختم نہیں ہوئی ......"

ایک ہی دنیا میں رہتے ہوئے ایک ہی طرح کے دکھ سہتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے! آخر یہ کیوں؟...... اور اب کہ وہ ایک دوسرے سے ملے تھے وہ پھر ایک ایسی دنیا میں تھے جو ان سبھوں کے لئے ایک ہی جیسی تھی ایسی دنیا جہاں صرف پیلا آسمان تھا۔ پیلی زمین، جھلسانے والا سورج اور کچھ کھانے کو نہیں!

"تم کتنے دنوں سے بغیر پانی کے ہو؟" لانبے آدمی نے پوچھا۔

چھ آنکھیں اس کو حیرانی سے تک رہی تھیں لیکن زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ ان کی زبانیں ایسی سوکھ گئی تھیں کہ کوئی آواز نکالنا بھی مشکل تھا۔ وہ پیٹ میں درد محسوس کر رہے تھے لیکن یہ نہ جانتے تھے کہ یہ بھوک سے ہے یا کسی بیماری سے۔

لانبے آدمی کا چہرہ سورج کی وجہ سے کالا ہو گیا تھا وہ چلا گیا۔ سب اس کو چپ چاپ دیکھ رہے تھے اور جب وہ چلنے لگا تو اس کو راستہ دے دیا۔

اس گہرے سناٹے میں لوگوں نے کسی چیز کے چٹخنے کی آواز سنی۔ انھوں نے خیال کیا کہ زمین سورج کی تیز گرمی سے پھٹ رہی تھی۔

پانچ منٹ بعد لانبا آدمی مٹی کی صراحی لئے آ گیا۔

"کتے کے بچے پیو"

کیا یہ سچ ہو سکتا تھا؟ ان کی آنکھیں تو خطا نہیں کر رہی تھیں؟ سپاہیوں کی آنکھیں حیرانی سے پھٹی ہوئی تھیں۔ یکایک ان میں سے ایک نے اس لانبے آدمی کو اپنے سینہ سے چمٹا لیا۔ انکی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے!

سپاہیوں نے جی بھر کے پانی پیا۔ تانی نے اپنے زخم پر بھی چھڑکا۔

دشمنی اور نفرت کی رکاوٹ دور ہو گئی۔ ہر شخص یہ سوچ رہا تھا "مجھے ان بیکسوں کی ضرور مدد کرنی چاہئے" لیکن کوئی کچھ کہہ نہ رہا تھا۔ وہ سب جانتے تھے کہ یہ تینوں بھی آخر ان ہی کی طرح انسان ہیں اور انسان ہی سا ان سے سلوک کرنا چاہئے اب بدلہ لینے

کا خیال ان کو نہ تھا۔ "وہ بھی اسی مصیبت میں ہیں جس میں ہم" لیکن کسی نے اس ترس کو فعل سے ظاہر نہ کیا تھا۔ نفرت کو ہمدردی سے بدلنے میں انہیں شرم معلوم ہو رہی تھی۔

"کیا تم اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے ان بےکسوں کو دیکھتے رہو گے؟ یہ تین بھی تمہارے ہی بھائی ہیں!"

سبھوں نے لانبے آدمی کو دیکھا جس نے پہل کی تھی۔ اس نے ان کی الجھن اور رکاوٹ دور کر دی اب ہر کوئی بڑی خوشی سے ان تینوں کو آرام پہنچانے میں مشغول ہو گیا

"شکریہ، تم لوگوں کی مہربانی، سپاہی بھائیو! میں تم کو کبھی نہ بھولوں گا... ... میں پانی پی چکا میری پیاس بجھ گئی، اب تم زندہ دفن کر دو یا زندہ کھال کھینچ لو، جو تمہارا جی چاہے.... میں ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالوں گا.... تم کو کبھی نہ بھولوں گا......" سوجے ہوئے چہرہ والے نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیا مہمل بک رہے ہو" لانبے آدمی نے بےچین ہو کے کہا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی چھوٹی بات کے یاد دلائے جانے سے شرما رہا ہے۔ "آخر...."

سپاہیوں کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہے ہیں۔

"آخر تم اور ہم... ہم سب... ایک ہی کشتی میں ہیں"

جوں ہی اس نے جملہ ختم کیا یکایک تانی گر پڑا۔ اس کا سر ایک پندرہ سولہ برس کے لڑکے سے ٹکرا گیا۔ لڑکے نے تانی کا سر اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور گھبرا کے ہر طرف دیکھنے لگا۔ وہ یہ طے نہ کر سکا کہ اس کو ہاتھ میں لئے رہے یا زمین پر ڈال دے۔ گویا اس کے ہاتھ میں کوئی قیمتی چیز ہے جس کے ٹوٹ جانے کا ڈر ہے۔

"تانی! تانی!"

تانی کا سر اس لڑکے کے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر آ گیا۔ لڑکا یہ خیال کر کے کانپ گیا کہ "اسے چوٹ گیا!" اس نے چاروں طرف ایسی نظر سے دیکھا گویا معافی مانگ رہا ہو

ایک گرد بھرے لانبے ہاتھ نے تانی کا ماتھا چھوا ۔

"بخار !"

"او ۔ و ۔ ہ ۔۔۔۔۔ او ۔ و ۔ ہ ۔۔۔۔" تانی زمین پر مچھلی کی طرح تڑپ کے سسک رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ گرم بالو میں گاڑ رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا، اور وہ رمین پر دانت مار رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں آدھی بند کر لیں، رنگا رنگ کی تصویریں س کی آنکھوں کے سامنے جھلملا رہی تھیں اور ان میں وہ اپنا مکان، اپنی بہو کی روتی ما کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر کراہ کے گرد میں دانت پیسا ۔

"تانی، تھوڑا پانی پی لو !"

ہوا غبار کے طوفان کو تیزی سے چکراتی اور ان کے چہرہ اور گردن کو جلاتی گزر ہی تھی۔ ان لوگوں کو ایسا معلوم ہوا کہ چراندھ آرہی ہے۔ گرمی ایسی تھی کہ چھوتی جاتی ھی۔ آسمان سے بوند کی طرح برستی زمین سے بھاپ کی طرح اٹھتی اور افق سے بادل کی رح بڑھتی تھی۔ بیگنی سورج دھول کے بادل میں سے دھندلا ہو کے صرف آدھا دکھائی ے رہا تھا۔

بچوں نے دیکھا کہ اس مزدور کا چہرہ عجیب طرح کا ہو گیا۔ سب ایک دوسرے سے سرگوشی کرنے لگے ۔

"ارے مزدور کو دیکھو !۔۔۔۔۔ وہ ۔۔۔"

وہ ابھی مرا تھا !

عورتیں گردن جھکائے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ [illegible] ہی تھیں۔ ہر طرف ہر چیز پر سناٹا سا چھا گیا۔ سڑک کے کنارے مرد [illegible] چپ چاپ چلے گئے۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بولے گویا وہ ڈر رہے تھے [illegible] آخر کار آہستہ سے ان لوگوں نے اس کو قبر میں لٹا دیا اور [illegible]

تنگ پیچی مٹی سے چھپا دیا۔

"سکون اور آرام سے رہو۔ ہم تمہارے مرنے کے دن کو نہ بھولیں گے" سبھوں نے زیرِ لب کہا "اگلے سال ......"

اگلے سال؟ وہ خود اگلے سال کہاں ہوں گے؟ بہرکیف وہ زندہ تو ضرور رہیں گے۔ کھانے کو اناج اور پینے کو پانی تو ڈھونڈ ہی لیں گے۔

نزدیک کے درخت سے ان لوگوں نے سوکھی ٹہنیاں توڑیں، اور قبر پر نشان یادگار کے طور پر گاڑ دیا۔

"اب تم لوگ کہاں جاؤ گے؟" انھوں نے موٹے چہرے والے اور دبلے سپاہی سے پوچھا۔

"کون جانتا ہے؟ ...... ہم لوگ بے یار و مددگار ہیں ...... ہم لوگوں کو کچھ کھانے کا سامان کرنا ہے۔"

"پھر ہم لوگ ساتھ چلیں، شاید شہر پہنچ کر کچھ کھانے کو مل جائے۔"

عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور تین سپاہیوں کا پریشان حال چھوٹا قافلہ پھر کبھی نہ ختم ہونے والی سڑک پر چل پڑا۔ لانبا آدمی اور ایک چیچک رو آدمی تانی کو اٹھائے ہوئے باری باری بدل رہے تھے۔ ان کے پاؤں گرم بالو میں دھنس جاتے تھے جس کی وجہ سے ان کی چال دھیمی ہو جاتی۔ عورتیں اور بچے زرد مٹی پر بڑی مشکل سے اپنے کو گھسیٹے لئے چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے گرد کا بادل اٹھ رہا تھا۔

تانی کا چہرہ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ وہ سنبھل نہ سکا۔ اس کے ہاتھ ان کے کاندھوں پر سے پھسل گئے۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں اور وہ زمین پر سر کے بل گر گیا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ سانس لینے کی وجہ سے بالو نتھنوں کے پاس ناچ رہا تھا۔

"تمہاری کیا حالت ہے؟ تانی؟ تانی؟

"مجھ کو مار ڈالو" تانی نے رو کے کہا اس کے کالے ہونٹوں پر جھاگ تھی۔ "بھائی
... مجھ کو مار ڈالو! بھائی......"

سب لوگ رک گئے۔

"میرے ہم وطنو، میرے ہم وطنو! میرے پیارے بھائیو، اب برداشت سے ہر ہو گیا...... او-و-ہ! او-و-ہ! میرے بھائیو......" تکلیف سے بے چین کے تانی رو رہا تھا۔

سورج پچھم کی طرف ڈھلتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان لوگوں نے ندی کنارے دوسری قبر کھود کر تانی کو دفن کیا۔ سوجے ہوئے چہرے والے نے جیب سے پانسے نکال کے لاش کے پاس رکھا اور زور زور سے رونا شروع کیا اور گھٹی گھٹی آواز کہا:

"کل تم نے مجھ سے انھیں مانگا تھا۔ لیکن میں نے نہیں دیئے۔ اب لے لو... تمہاری بوڑھی ماں سے باتیں کروں گا۔ اسے سب کچھ کہہ دوں گا...... اس کو ی دوں گا!"

اس نے پھر پانسوں کو دیکھا گویا وہ محفوظ نہ تھے اور انھیں اٹھا کے تانی کی ب میں رکھ دیا۔

لانبا آدمی اور چیچک رو یہ سوچ کے کہ اب ان کے کاندھوں پر اس کا بو ہوگا۔ ان کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ ان لوگوں نے آسمان کی طرف دیکھا کہ آنسو ں پھر نہ گرے۔

باپ ماتھی نے دردناک آواز میں کہا: "لعنت ہو! ہم لوگ سب کے سب

"تم لوگ بھی کتنے بیوقوف ہیں" دبلے آدمی نے کرخت آواز میں کہا:

کسی نے کچھ نہ کہا۔ لیکن ہر شخص اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔

"بندوق چھن گئی: لعنت ہو ان پر! اگر ہم لوگوں کے پاس ہوتی تو بتا دیتے!"

اپنے چاروں طرف وہ لہکتا ہوا سورج زرد ریگستان اور کھولتا ہوا افق دیکھ رہے تھے گو یہ نظارہ ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا! سب نے ایک ساتھ آبلوں سے چھلنی پاؤں اٹھائے اور آگے بڑھے۔ وہ اب نہ تو کھانے کے بارے میں کچھ بول رہے تھے، وہ نہ یہ کہ اگلے گاؤں میں وہ کیا پائیں گے۔ وہ تپتے ہوئے بالو پر چلے جا رہے تھے۔

"زندہ چین"

نیا دور کی چند ایجنسیاں

پٹنہ: نیا سنسار، بانکی پور

(۲) لاہور: مکتبہ جدید، انارکلی چوک

(۳) دہلی، ریجنٹ نیوز ایجنسی نئی سڑک

(۴) گوجرانوالہ۔ الطاف یزدانی،
ادبی کتب خانہ چوک نیائیں، گوجرانوالہ

(۵) بمبئی: احمد بخش، بک سیلر، ادبیہ
بک ڈپو، جے جے ہسپتال کا ناکہ بمبئی ۳

(۶) حیدرآباد: دکن بک ڈپو،
عابد روڈ، حیدرآباد۔ دکن

(۷) ہوشیار پور: میم چراغ الدین
مسلم نیوز ایجنسی، گوردین گیٹ،

(۸) آرہ: ذوالفقار حیدر،
نیوز پیپر ایجنٹ، محلہ مہادیو۔

(۹) پونہ: شیخ چاند یوسف۔
نیوز پیپر ایجنٹ، 55 ویتال پیٹھ،
پونہ سٹی، پونہ ۲

(۱۰) پشاور: صادق کیشن ایجنسی
بازار قصہ خوانی، پشاور۔

نیا دور

(دو ماہی رسالہ)

4

اڈیٹر:۔ صمد شاہین

سالانہ چندہ چھے روپئے　　　　فی پرچہ ../6/1

AN BOO
ROAD, HYD

نیا دور۔ ٦٢ خلاصی پالیم۔ بنگلور سٹی

ترتیب

نظمیں

صفحہ
بنگال کا نغارہ ۔ قاضی نذر الاسلام ۹
تیز چلو ۔ جاوید منظر ۱۰
جنگ ۔ منیب الرحمٰن ۱۱
ہیرو ۔ ضیاء الاسلام ۱۹
آغاز و انجام ۔ سلیمان اریب ۲۰
سلسلے ٹوٹ گئے ۔ اختر الایمان ۲۱
آج سے ہم بھی اپنے نہیں ۔ اختر انصاری ۲۲
ہمزاد ۔ یوسف ظفر ۲۳
صفحہ
دو نظمیں ۔ عطا محمد ۲۵
دو نظمیں ۔ اختر ہوشیارپوری ۲۶
مجبوریاں ۔ باقر رضوی ۲۸
پابہ زنجیر ۔ عبادت بریلوی ۲۹
جاگ اے دل ۔ شفیع منصور ۳۱
میں نے کہا ۔ سلام مچھلی شہری ۳۳
غزل ۔ الطاف مشہدی ۴۰

کہانیاں

صفحہ
قرضہ ۔ قاضی عبدالغفار ۴۱
یہاں کا انصاف ۔ ماتی گیگشیش آنگار ۴۸
ایک لاکھ ستانوے ہزار آٹھ اٹھاسی ۔ رادھا کرشن ۶۲
موت کا استقبال ۔ پرل ایس بک ۷۸
بھولے بھٹکے ۔ صمد شاہین ۸۹

مضامین

صفحہ
اقبال کی شاعری میں علائم کا استعمال ۔ ضیاء الاسلام ۱۱۰
۱۹۴۴ ۔ افسانوی ادب کا ایک اہم سال ۔ ممتاز شیریں ۱۱۶

نوٹ: سارے مضامین نظم و نثر خاص "نیا دور" کیلئے موصول ہوئے ہیں اور ترجمے بھی خاص نیا دور کیلئے کرائے گئے ہیں اور اردو میں پہلی دفعہ آرہے ہیں۔ سب مضامین غیر مطبوعہ ہیں۔

صمد شاہین، ایڈیٹر اور پبلشر نے ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس بنگلور سٹی میں چھپوا کر دفتر "نیا دور" ۶۲ خلاصی پالیم بنگلور سٹی سے شائع کیا۔

دھندلی سی ایک تصویر

' نیا دور ' کا چوتھا نمبر حاضر ہے۔ اس کے نکلنے میں دیر ہوئی " باعث تاخیر کے سلسلے میں کیا عرض کیا جائے ؛ صرف اتنا کہنا ہے کہ بنگلور میں کتابت اور طباعت مشکلیں اتنی آن پڑیں کہ . . . . . لیکن ہمارے لئے تو اب بھی یہ آسان ہوتی نظر نہیں آ اور سپر کاغذ کی کمیابی اور گرانی ——— ان سب کو جنگ کا لازمی اثر ہی سمجھنا چاہئے۔

شکر ہے کہ جنگ اب ختم ہو رہی ہے مغرب میں شعلے فرو ہو چکے ہیں اور مش میں بھی سرد ہوتے آ رہے ہیں۔ کوئی لمحہ اور "جمہوریت" کی فتح کے نقارے بجنے لگیں ا میں شک نہیں کہ فتح کے بعد ایک نئی دنیا کی تخلیق ہوگی۔ وہ حالت نہیں رہے گی جو جنگ پہلے تھی For whom The Ball Tolls کے ہیرو' راب جورڈن نے مرتے ہوئے کہا تھا :

he world is a fine place and worth
he fighting for ——

یہ وہ دنیا ہے جہاں مساوات ہو، جہاں محبت ہو۔ کرشن چندر کے موبی کے الفاظ میں " ایسی محبت جو آدمیت سے پیدا ہوتی ہے، جس کا کوئی رنگ نہیں ہوتا، کوئی مسلک نہیں ہوتا، کوئی مذہب نہیں ہوتا، وہ زندگی کا آخری اور ابدی آدرش ہے . . . . . اس مسلک کی خاطر رالف فاکس، کرسٹو فر کاڈول، جان کارن فورڈ، جولین بل، اور امریکن انٹرنیشنل برگیڈ نے سپین میں اپنا خون بہایا تھا۔ اب یہ رنگ لاتا نظر آ رہا ہے۔

برطانیہ میں لیبر حکومت قائم ہو گئی ہے اور یورپ کے دوسرے ملکوں بھی دست چپ کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔ سوویٹ روس کا اثر ساری دنیا پر پھیل اور اس حد تک سامراجی گرفت ڈھیلی پڑتی نظر آ رہی ہے، شاید ہندوستان کی قسمت

[redacted]

جاگ جائے! لیکن "کیا جانے کب سورج نکلے، بستی جاگے، غم مٹ جائیں۔" فی الحال تو ہمارے لئے رات ہی ہے اور رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم —— خورشید درخشاں کے نکلنے تک، ہمیں یقین نہیں آتا کہ ع یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر۔ اس لئے "امن" کے دنوں میں بھی ہمارے ادیبوں پر یاسیت چھائی رہے اور وہ کوئی رجائی پیغام نہ پہنچا سکیں تو کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے!

زیرِ نظر شمارہ میں نظموں کا حصہ زیادہ تر جنگ ہی سے متعلق ہے۔ اور دورانِ جنگ میں ہمارے لکھنے والوں کی قلبی وارداتوں اور ذہنی کیفیتوں کا آئینہ دار ہے۔ ان نظموں میں ایک خاص قسم کا ربط اور ہم آہنگی ہے۔ اور ترتیب سے ہم نے ان میں ایسا تسلسل پیدا کیا ہے کہ "جنگ کا افسانہ" بن جائے۔ یہاں ایک بات کا ذکر ضروری ہے —— منیب الرحمٰن کی طویل نظم جنگ کے شروع زمانے میں لکھی گئی تھی، مگر گوناگوں مصلحتوں کی بنا پر شائع نہ ہو سکی تھی۔ اب انہوں نے وہ حصے جو "قابلِ گرفت" سمجھے جا سکتے تھے خارج کر دئے ہیں۔ اس سے نظم کے تاثر میں، ممکن ہے، فرق آیا ہو لیکن موجودہ صورت میں بھی یہ نظم ایک مکمل چیز ہے۔

افسانوں کا حصہ خاص طور پہ جاذبِ توجہ ہے۔ 'نیا دور' کے لئے باعثِ فخر ہے کہ جناب قاضی عبدالغفار نے اب کے ہماری بزم میں شرکت فرمائی ہے۔ ان کا افسانہ "قرضہ" پڑھئے۔ کیسا چست، پختہ اور رچا ہوا اندازِ نگارش ہے ——
ماستی وینکٹیش آئینگار کنڑی کے بہترین افسانہ نگار ہیں۔ ہمارے پہلے نمبر میں انکا افسانہ "دہی والی" شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔ اب ماستی کو ایک اور ہی روپ میں دیکھئے۔ اس طرز میں بھی وہ کتنے کامیاب ہیں، سادگی میں کیسی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ کیسے انجان طور پر چھپ چھپ کے وار کیا ہے۔ تلخ طنز کا وار اتنا اوچھا کیا پڑیگا
'موت کا استقبال' شہرۂ آفاق مصنف پرل بک کے ایک اچھے افسانہ کا ترجمہ ہے

"بھولے بھٹکے" اس زمانہ میں لکھا گیا تھا۔ جب جنگ کتنے ہی بے روزگاروں کے لئے ایک سہارا تھی۔ ان کے ساتھ اس شمارہ میں آپ کو ایک اور معرکہ کا افسانہ ملے گا۔ ——— رادھا کرشن کا "ایک لاکھ ستانوے ہزار آٹھ سو اٹھاسی"۔ بنگال کا ہولناک قحط ابھی پورے طور پر ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ صوبۂ بہار میں وبا پھیلی اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ مرے۔ رادھا کرشن کی کہانی کا motif یہ مختصر سی خبر ہے جو اخباروں میں شائع ہوئی تھی:-

Mr. Y. A. Godbole, Adviser to The Governor of Behar, stated that The total deaths from cholera and malaria are 1,97,888. (The Indian Nation, Patna, November 19, 1944)

کرشن چندر کا "ان داتا" اگر بنگال کے قحط کا نقش ابدی ہے تو رادھا کرشن کی یہ کہانی بہار کی ٹریجیڈی کی ناقابل فراموش داستان ——— اسے ایک بچے کی زبانی سنئے۔ دیکھئے اس کے معصوم انداز بیان نے ہمارے لئے ٹریجیڈی کو کتنا المناک کر دیا ہے

"اقبال میں علائم کا استعمال" ایک مختصر مضمون ہے اور کسی حد تشنہ بھی، لیکن اس موضوع پر پہلی پیش کش ہونے کی حیثیت سے اسکی افادیت مسلم ہے۔ ممتاز شیریں نے ہمارے گذشتہ سال کے افسانوی ادب کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے اور جو کچھ کہا ہے بہت سوچ سمجھ کر کہا ہے۔ مضمون طویل ہے لیکن یہ طوالت اس کی دلچسپی کو کھو نہیں دیتی۔

صمد شاہین

لکھنے والے

قاضی نذرالاسلام ۔ بنگال کا مغنیٔ آتش نوا۔ ہندوستان کا ایک بہت بڑا شاعر۔

جاوید منظر :۔ پیدائش ۱۹۲۱ء صوبۂ بہار کے ہیں اور بہاری شعرا کی منتخب نظموں کے مجموعہ "اشارہ" مرتبہ تمنائی میں شرکت فرمائی ہے۔

منیب الرحمٰن :۔ ۱۸ر جولائی ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ کے ڈبل ایم۔ اے ہیں۔ دو تین سال سے ان کی نظمیں معیاری رسائل میں شائع ہو رہی ہیں۔

ضیاء الاسلام :۔ پیدائش ۱۹۱۱ء۔ بی، ایس، سی ۱۹۳۰ء، پھر پی، سی، ایس میں کامیاب ہو کر یوپی میں ۳۵ء میں تعینات ہوئے۔ جرنلزم سے بھی لگاؤ ہے۔ پائنیر، اسٹیٹسمین، ایسٹرن ٹائمس وغیرہ کے نامہ نگار رہے ہیں۔

سلیمان اریب :۔ ۵ر اپریل ۱۹۲۱ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوا۔ میٹرک سے آگے نہ بڑھ سکا اور ۱۹۳۹ء میں تعلیم ترک کر دی۔ ۴۱ء کے اختتام تک حیدرآباد کے ایک بہت بڑے علمی اور ادبی ادارے میں کام کیا جہاں مجھے دس روپیہ ماہوار ملتے تھے لیکن یہ رقم مجھے الاؤنس کے نام سے دی جاتی تھی۔ اب کوآپریٹیو بینک میں کلرک ہوں۔

اختر الایمان :۔ ۲۷ر ڈسمبر ۱۹۱۸ء کو سہارنپور میں پیدا ہوا۔ ۳۰ء کو گھر چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔ ۳۰ء سے ۳۲ء کا زمانہ دہلی کے ایک یتیم خانہ میں گذارا۔ عربک کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد ایک سال تک آوارہ پھرتا رہا۔ اس کے بعد ایم۔ اے (اردو) کے لئے علی گڈھ چلا گیا" جولائی ۴۴ء میں اردو کانگریس کیلئے حیدرآباد آئے تھے واپسی میں شالیمار پکچرز پونہ میں ملازمت قبول کر لی اور ایم۔ اے چھوڑ دینا پڑا۔ نظموں کا مجموعہ "گرداب" شائع ہو چکا ہے۔

اختر انصاری :۔ پیدائش۔ بدایوں، یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء۔ لیکن ساری عمر دلّی میں گذری۔ ۱۹۳۰ء میں بی۔ اے آنرز، ہسٹری (دہلی) ۳۱ء میں انگلستان گئے۔ لیکن کوئی

تعلیم حاصل کئے بغیر جلد ہی واپس آنا پڑا۔ ہندوستان پہنچ کر قانون پڑھنا شروع کیا مگر ایک سال بعد چھوڑ دیا۔ ۳۳ء بی ٹی، علیگڈھ۔ پھر مسلم یونیورسٹی ہائی سکول میں انگلش ٹیچر رہے اب ٹریننگ کالج علیگڈھ میں لکچرار ہیں۔ تصانیف۔ اندھی دنیا، 'نازو' اور 'خونی' (افسانے) 'آبگینے' 'خوناب' 'روح عصر (نظمیں)' افادی ادب' 'ایک ادبی ڈائری'۔

یوسف ظفر:۔ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۱۴ء بمقام کوہ مری۔ بی۔ اے ۱۹۳۶ء، ماہنامہ 'کلیم' دہلی اور 'ادب لطیف' لاہور کے اداروں میں کام کر چکا ہوں۔ اور اب ہمایوں لاہور میں کر رہا ہوں۔ پانچ سال سرکاری دفتر میں کلرک بھی رہ چکا ہوں۔ نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں 'زہر خند' اور 'زنداں'۔ ریڈیائی ڈراموں کا ایک مجموعہ 'شہسوار' شائع ہو رہا ہے، بقول راشد۔ "زندگی میرے لئے کاوش بیداری ہے"۔

عطا محمد:۔ "پیدائش ۱۲ اگست ۱۹۲۳ء بمقام ایچانہ، ضلع بلند شہر تعلیم علی گڈھ۔ بی۔ ایس، سی میں ناکام رہا محض اپنی آوارگیٔ مزاج کی وجہ سے"۔ پچھلے دو تین سال سے پرائیوٹ ڈائرکٹریٹ میں ہیں۔ تنقید سے بہت دلچسپی ہے۔

اختر ہوشیارپوری:۔ عمر اٹھائیس برس، ایل ایل بی کرنے کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم ہوا۔ اور آج کل دہلی میں ہوں۔

باقر رضوی:۔ پیدائش ۱۹۱۹ء بی۔ اے۔ لکھنؤ ۱۹۴۰ء۔

عبادت بریلوی:۔ پیدائش بریلی ۱۴ اگست ۱۹۲۰ء لیکن پرورش پائی لکھنؤ میں۔ ایم۔ اے لکھنؤ ۴۲ء اینگلو عربک کالج، دہلی میں اردو کے لکچرار ہیں۔ تنقید سے دلچسپی ہے۔

شفیع منصور:۔ عمر تیس سال۔ تعلیم ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل، ایچ پی، بی ٹی بشکم بری کا وسیلہ گورنمنٹ آف انڈیا میں مترجمی۔ سینکڑوں اشعار کہے۔ مگر "چھپنے" کا شوق کبھی دامنگیر نہیں ہوا۔ اب یہ احساس ہوا کہ "نہ چھپنے" سے ادبی تخلیق کا جذبہ رفتہ رفتہ دھیما پڑ جاتا ہے۔

سلام مچھلی شہری :۔ پیدائش۔ مچھلی شہر ضلع جون پور، پہلی جولائی ۱۹۲۱ء۔ تعلیم انٹرنس سے آگے نہ جا سکا۔ پانچ چھ سال بیشتر فیض آباد سے ایک ماہنامہ "نغمہ" نکالا پہلا مجموعہ "میرے نغمے" لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا "وسعتیں" مکتبۂ اردو لاہور نے اسی سال نکالا ہے۔ پہلے الٰہ آباد یونیورسٹی لائبریری میں ملازم تھے۔ آج کل آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ہیں۔

الطاف مشہدی :۔ ۱۰ر فروری ۱۹۱۴ء کو چک نمبر ۱۱ جنوبی ضلع سرگودھا پنجاب میں پیدا ہوا۔ اور یہیں مرنے کا ارادہ ہے۔ ایک معمولی زمینداری ذریعہ معاش ہے۔ اب تک نظموں کے پانچ مجموعے چھپ چکے ہیں اور ایک کہانیوں کا۔ دل کی آواز کو انقلابی شاعری کی شکل میں پیش کیا۔ اور یہی میرا حقیقی آرٹ ہے۔ غزل میں بھی کچھ اس قسم کے شعر کہنے پر مجبور رہوں — غم زندگی اف غم زندگی تو محبت کا غم بھول جانا پڑا۔

قاضی عبدالغفار :۔ اردو ادب کی عہد آفریں تصانیف "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" کے مصنف۔

ماستی وینکٹیش آئنگار :۔ کنڑی زبان کے بہترین افسانہ نگار۔ حکومت میسور میں یکسائز کمشنر کے عہدے پر فائز تھے۔ ریٹائرڈ ہوئے تین سال ہوئے ہیں۔

پرل بک :۔ شہرۂ آفاق امریکی مصنفہ جن کا ذہنی اور روحانی تعلق چین سے ہے۔ ان کے ناول The Good Earth کے لئے ۱۹۳۸ء میں انہیں نوبل پرائز ملا۔ اس سلسلہ کے دو اور ناول "Sons" اور House Divided ہیں۔ حال ہی میں چینی جاپانی جنگ کی بیک گراؤنڈ میں ایک شاہکار ناول Dragon Seed لکھا۔ دو تین مختصر افسانوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ زیر نظر کہانی "موت کا استقبال" کا ترجمہ خاص "نیا دور" کے لئے نذیر احمد بی۔ اے نے کیا ہے۔

رادھا کرشن :۔ ہندی کے صف اول کے افسانہ نگار ان افسانہ نگاروں میں

سے ہیں۔ جنہیں پریم چند نے ڈھونڈ نکالا۔ طرزِ نگارش پر پریم چند کا اثر ہے۔ عمر کوئی تئیس سال۔ اب تک کوئی دو سو کے قریب کہانیاں لکھی ہیں۔ انہیں مزاحیہ افسانوں پر بھی اتنا ہی عبور ہے جتنا Grim افسانوں پر۔ انکی پہلی کہانیوں کا مجموعہ "مجلا" اور ایک ناول "فٹ پاتھ" شائع ہو چکے ہیں۔ کہانیوں کا ایک اور مجموعہ "کچھ کہانیاں" شائع ہو رہا ہے۔

ممتاز شیریں:۔ پیدائش ۱۲ ستمبر ۱۹۲۴ء۔ ۱۹۴۲ء میں مہارانی کالج بنگلور سے بی۔ اے کیا، ان کا مضمون "۱۹۴۳ء کے افسانے" (نیا دور نمبر 1) ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس دفعہ ۱۹۴۴ء کے افسانوی ادب پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مضمون میں انہوں نے افسانہ نگاروں کے ایک نئے سٹ کا ذکر کیا ہے۔ اس میں یہ بھی شامل ہیں۔ سال گذشتہ ان کے تین افسانے شائع ہوئے۔ "انگڑائی" (ساقی مئی) "رانی" (ساقی نومبر) اور "آئینہ" (نیا دور ۲) ان میں دو تو سال کے بہترین افسانوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔

صمد شاہین:۔ پیدائش ۱۶ جون ۱۹۱۶ء بی۔ اے۔ ایل ایل بی، اڈوکیٹ۔

'نیا دور' (نمبر ۱، ۲، ۳) کے بارے میں چند اور رائیں

پروفیسر احمد علی: "آپکی کوشش قابل تحسین ہے۔ امید ہے آپ 'نیا دور' کو برابر نکالتے رہیں گے۔۔۔۔ بدقسمتی سے میں اتنا کم لکھتا ہوں کہ فی الحال کوئی غیر مطبوعہ افسانہ نہیں ہے لکھونگا تو ضرور بھیجونگا۔"

حیات اللہ انصاری:۔ "نیا دور" نظر سے گذرا بہت اچھی چیز ہے میں تو اتنا کم لکھتا ہوں کہ اپنے کو لکھنے والوں میں شمار ہی نہیں کرتا ہوں۔ بہرحال آپکے اعلیٰ جریدے میں کچھ حصہ لے سکا تو لوں گا"

اوپندر ناتھ اشک:۔ "آپنے بہت اچھی چیز مرتب کی ہے۔ یہ ادبی کوشش ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ میں آپکے ساتھ اس کوشش میں تعاون بھی کر سکتا ہوں۔۔۔۔"

مہندر ناتھ: "۔۔ آپنے تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کے مشہور ادبا کی معاونت حاصل

کرلی ہے۔ "نیا دور" یقیناً ترقی پسند ادب کا ترجمان ہوگا۔ اور مجھے امید ہے کہ "نیا دور" پرانی زنجیروں کو توڑتا ہوا ایک ایسے ادب کی بنیاد رکھے گا جس میں صرف مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش ہی نہ ہوگی بلکہ ایک ایسی انسانیت کی بنیاد رکھی جائے گی جہاں مزدور اور سرمایہ دار انسان بن کر رہ سکیں گے۔

کرشن چندر۔ منٹو۔ اشک اور ممتاز شیریں کے مضامین مجھے بہت پسند آئے۔ مضمون ۱۹۴۳ء کے افسانے پڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ ممتاز شیریں نے تقریباً ہر اچھے ادیب کو بہت غور سے پڑھا ہے مقالہ بلند پایہ ہے۔

پروفیسر احتشام حسین:- آپ کو ایسا رسالہ نکالنے کا سلیقہ ہے۔ تمام چیزیں اچھی ہیں۔ میں اب بھی عرض کروں گا کہ نظم کا پلّہ ہلکا ہے۔ افسانے نہایت اچھے ہیں۔ محترمہ ممتاز شیریں کا افسانہ "آئینہ" جزیات نگاری اور فن کاری کی ایسی حسین تصویر پیش کرتا ہے کہ داد نہیں دے سکتا۔

اختر اورینوی:- "نیا دور" کامیاب، مناسب اور خوبصورت کوشش ہے۔ اس کی افادیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ اس نمبر (۲) کے افسانے اور تنقیدی مضامین نہایت اچھے ہیں۔"

احمد ندیم قاسمی:- "تعجب ہوتا ہے کہ اردو کے مرکزوں سے اتنے دور افتادہ مقام پر بیٹھ کر آپ نے ایسے نمبر مرتب کئے جو صوری اور معنوی لحاظ سے بہترین ہیں اور جن کی مندرجات میں جدت اور بیداری کی ایک ایسی رو دوڑتی نظر آتی ہے کہ لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ آپ کے انتخاب اور آپ کے انداز ترتیب کی داد دینی پڑتی ہے۔ مجھے "نیا دور" کا ایسا معاون سمجھئے جو اس کے لئے لکھنے میں مسرت محسوس کریگا۔"

راماننداساگر:- "نیا دور" کی صورت میں مجھے ایک روشن مشعل دکھائی دیتی ہے۔ جو جنوبی ہند کے کسی جیالے نے جلا رکھی ہو خواہ اسے شعلہ باہر سے بھی لانا پڑے۔ "نیا دور" نہ صرف تاریخی خدمت انجام دے رہا ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ہزاروں لاکھوں محبانِ ادب کے لاشعور میں چھپی ہوئی ان کہی خواہش کو تسکین پہنچائی ہے۔ ..... علے میں ممتاز شیریں کا مضمون مجھے پسند آیا۔ انہوں نے اس پر محنت بہت کی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں جو حکم وہ لگاتی ہیں، اس میں تھوڑی سی پختگی کی اور ضرورت ہے۔ بایں ہمہ اسکی وسعت افق کے باعث ہی اس کا شمار دور جدید کے چند ایک بہترین تنقیدی مضامین میں کیا جا سکتا ہے۔"

سہیل عظیم آبادی:- "نیا دور کا دوسرا نمبر بلا شک و شبہ پہلے سے بہت زیادہ اچھا ہے۔ اس میں ممتاز شیریں کا افسانہ "آئینہ" بہت خوب ہے بعض نفسیاتی مسئلے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں"

مدھوسودن: "نیا دور" کی دوسری جلد ہر لحاظ سے پہلی سے بہتر ہے۔ مضامین کا انتخاب اچھا ہے"

تمنائی: "نیا دور" نمبر ۴ کو پچھلے پرچوں پر ترجیح دیتا ہوں اس لئے کہ اس میں غیر مطبوعہ مضامین ہیں۔"

اختر انصاری

یوسف ظفر

احمد ندیم قاسمی

[illegible]

قاضی نذرالاسلام

جنگ کا نقّارہ

مترجمہ
محمد حسین خطیب

چلو آگے بڑھو
اوپر جنگ کا نقارہ بج رہا ہے   نیچے دھرتی مچل رہی ہے
نوجوانو! آگے بڑھو
رات کا گریبان چیر کر ہم رنگین پُربہار صبح نمودار کریں گے
ہم رات کے اندھیرے کو رخصت کریں گے اور رکاوٹ کا ہمالیہ راستہ سے ہٹا دینگے
نئے جوشیلے گیت گا کر ہم مرگھٹ میں روح پھونک دیں گے۔
ہم مفلوج بازوؤں کو نئی طاقت بخشینگے
نوجوانو! بڑھو اور کان کھولکر سنو
موت کے دوارے سے زندگی کی پکار سنائی دے رہی ہے
نوجوانو! بڑھو
رنج اور مصائب کی بجلیاں گرج گرج کر سوتوں کو جگا رہی ہیں
اردگرد، بیداری کی لہر دوڑ رہی ہے
نوجوانو! تم بھی چونکو
چھنی ہوئی سلطنت کا غم بیکار۔ کھوئی دولت پر آنسو بہانا بے معنی
تختِ طاؤس کے لٹنے کا رنج بے سود
آخر روم، ایران، روس اور ٹرکی بھی تو ڈوبکر ابھرے
نوجوانو! جاگو اور آگے بڑھو! تم بھی ابھرو گے۔
ہم لوگ خاک اور دھول پر بیٹھ کر تاج محل تعمیر کریں گے
نوجوانو! بڑھو۔

جاوید منظر

تیز چلو

”پیچھے پھر رہ گئے یعقوب ذرا تیز چلو“
دیکھو یہ بات تو اچھی نہیں میں کہتا ہوں   میں بھی ہوں گھر سے بہت دور مگر سہتا ہوں
ہر گھڑی بیت ہی جائیگی مگر عزم بھی ہو

دھوپ اور چھاؤں کی تعمیر گرانبار کا خواب
اپنے اس خواب کی تعبیر بتانا ہے تمہیں   اور تعبیر کو پروان چڑھانا ہے تمہیں،
میں تو بوڑھا ہوں مگر تم ہو ابھی از شباب

”میرے رکنے کا سبب تم کو بتاؤں نہ سنو“
انہیں ٹیلوں کی ڈھلانوں پہ انہیں باغوں میں   ڈوبتے چاند کے بکھرائے ہوئے داغوں میں
کاش تم دیکھ سکو کاش انہیں تم سمجھو

پھیکی پھیکی سی سیاہی میں پڑا سوتا ہے
دور وہ گاؤں کہ تالاب میں ہیں جیسے کنول   جیسے سرسبز درختوں میں ہزاروں کونپل
اُف نہ پوچھو مرے سینے میں کوئی روتا ہے

بوڑھے ماں باپ کی صدمے سے زباں کھل نہ سکی
بانسری توڑ کے ظالم نے وہیں پھینک دیا۔   زندگی تھا مری جو آہ وہ نغمہ نہ رہا۔
شب کی پیشانی سے تحریرِ ستم دھل نہ سکی

ٹھیک کہتے ہو۔ چلو تیز بڑھو۔ تیز چلو
میرے بچہ کی بلکنے کی صدا آتی ہے۔   ”بانسری ٹوٹ کے اک درد بنی جاتی ہے“

منیب الرحمٰن

جنگ

اِنتساب

زندگی چیختی چلاتی گذر جاتی ہے
دشت سے، کوچہ و بازار سے میدانوں سے
کِس کو معلوم ہیں اسرار و رموزِ ہستی!
شمع کا نور ھے جلتے ہوئے پروانوں سے

تمتایا ہوا وہ لال بھبوکا چہرہ!
خشم آلودہ نگاہوں میں وہ کوندے کی لپک
غم کے سرمائے سے گنجینۂ احساس تہی
ہر بُن مو سے عیاں سوزشِ پنہاں کی جھلک

"آؤ ظلمت کدۂ دیر و حرم سے باہر
فرض ہے انکی حفاظت، تمہیں معلوم نہیں؟
دم گھٹا جاتا ہے اغیار کے طعنے سُنکر،
جن کو معصوم سمجھتے ہو وہ معصوم نہیں،

کھول دو اپنے سیہ خانے کے دروازوں کو!
مرد بنتے ہو مگر جوش و حمیّت ہے کہاں؟
کِس جگہ نیت سے رکھّی ہے وہ شمشیر و تبر؟
اپنے اجداد کی دیرینہ وراثت ہی کہاں؟

سر کو ڈھلکائے ہوئے رات کے سایوں کی طرح
کُنجِ تاریک سے کچھ بھوت نکل آتے ہیں۔
اپنے دامن میں لئے گرد و غبارِ ہستی۔
سنسناتے ہوئے طوفان اُبل آتے ہیں۔

صبح تک ملکِ عدو پر یہ جوانانِ وطن،
اپنے رایات و عَلم لیکے اتر جائیں گے
اور مجھکو یہ یقیں ہے کہ ہمارے بچّے
حرمتِ ملک پہ لڑتے ہوئے مر جائیں گے

پھر وہ ہنگامہ! زمانے کیلئے شورِ نشور
سسکیاں نوحہ کناں اور گھٹی سی آہیں
قلب مضطر میں تمناؤں کی وہ تشنہ لبی
عارضِ نم، دلِ صد چاک، حمائل باہیں

ہچکیاں نزع کے عالم میں خموش و غمگیں
شہرِ موت کی تاریک فضا میں لرزش،
خوابِ خرگوش میں سوئے ہوئے محراب و ستوں
نہ نگاہوں کا تبسم، نہ لبوں کی جنبش،

فکر و آلام کے چہرے پہ تجسس کی شکن؛
شب کسی طور گذر جائے گی کل کیا ہوگا؟
غرق دریائے تذبذب میں وہ آوارہ مزاج
امن یا جنگ؟ جو ایسا نہیں، ایسا ہوگا!

اور پھر ایک صدا ۔ ایک جگر دوز صدا
جنگ! قابیل کے بیٹوں کا ہے پیمانہ جنوں
آخری لرزشیں گرتے ہوئے ایوانوں میں،
اسلحہ جات کا، طاقت کا، حکومت کا فسوں

سر جھکا لیتی ہے تقدیر بہ صد حسرت و یاس
دستِ میخوار میں پیمانہ چھلک جاتا ہے
رہروِ راہ طلب منزلِ مقصود سے دور
دشت کی بھول بھلیوں میں بھٹک جاتا ہے

زرگری، مرگِ مفاجات، شہنشاہ کا حکم
خون اُمڈا ہوا آنکھوں میں وہ ہیں شعلہ فشاں
شہر کے کوچہ و بازار میں پیروں کی دھمک
سینہ تانے ہوئے کہسار کی مانند جواں

ہ کتنے مغرور ہیں، خودسر ہیں ہمارے اعدا
بات کرنے کا انہیں کوئی سلیقہ ہی نہیں
آپ دیکھیں گے بجز معرکہ آرائی کے
اُن کو سمجھانے کا کچھ اور طریقہ ہی نہیں

"اے وطن! اے مرے اجداد کی عظمت کے نشاں
یونہی تو حشر تلک زندہ و پائندہ رہے
پھر بہار آئے شہیدوں کے لہو سے تجھ میں
ذرّہ ذرّہ ترا انوار سے تابندہ رہے"

تیرگی شب کی فضاؤں میں گھلی جاتی ہے
دامنِ رہگذرِ عام پہ پھیلا کاجل
عارضِ حسن سے غازے کا فسوں ٹوٹ گیا
ہو گئے نیند کے جھونکوں سے پپوٹے بوجھل

سنسناتے ہوئے طیاروں نے شبخوں مارا
نالہ و آہ و بکا کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں!
زندگی بال بکھیرے ہوئے فریاد کناں
عشوہ و ناز و ادا کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں

رہگذاروں پہ، مکانوں پہ بموں کی بارش
اُف! دھماکہ، کہیں نزدیک ستارہ ٹوٹا
ایک دیوار گری، ڈھک گئی واماندہ سڑک
آتشِ سرد میں پھر ایک شرارہ پھوٹا

پھر سرِ راہ سمٹ آیا ہے انبوہِ کثیر
پھول ٹوٹی ہوئی تربت پہ چڑھانے کیلئے
چشمِ نظارہ ہمہ شوق بنی بیٹھی ہے
خاکِ پامال پہ دو اشک بہانے کے لئے

مرد و زن، پیر و جواں، ریل کے ڈبوں میں ہجوم
کشمکش! ہمہمہ! اوروں سے ہمیں کام نہیں
موت کہتے ہیں جسے ہے یہ تساہل یہ جمود
زندگانی میں کوئی صبح نہیں شام نہیں،

بیکراں بحر میں خونخوار نہنگوں کا خطرہ،
ہاں مگر جان کسی طور تو بچ جائے گی،
پھر خزاں دیدہ گلستاں میں نہ جانے کس دن
مسکراتی ہوئی دوشیزۂ بہار آئے گی،

شہر کی سڑکوں پہ پھرتے ہیں درندوں کے جتھے
جن کے قدموں میں زمیں خوف سے تھراتی ہے
گھن گرج! میرے خدا ہوتا ہے پتہ پانی
زندگی کیا ہے! وہاں موت لرز جاتی ہے

بام و در خاک ہوئے گر گئے محراب و ستوں
لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے دھواں اُٹھتا ہے،
جم گئیں آج تہیں خون کی شہراہوں پہ
اُس جہنم سے کوئی لوٹ کے کب آیا ہے!

کیا بتاؤں تجھے کیا حال ہوا ہے اپنا
دِل بھر آتا ہے، یہ روداد سناؤں کیسے!
چشم پُر آب، جگر خون، تمنّا پامال
میرے معبود! یہ آگ بجھاؤں کیسے

قبرِ عصمت پہ ہے دوشیزگی فریاد کناں
ہائے! اُن لوگوں نے ماؤں کے شکم چاک کیے
وہ شبستان و حرم ڈھیر ہیں اب اینٹوں کے
ایک بھونچال نے وہ قصر تہِ خاک کیے

قہر نازل ہو خداوند کا ان کے اُوپر!
اُن کے ہاتھوں سے کوئی چیز سلامت نہ رہی،
مٹ گیا پاسِ حیا حرفِ غلط کی صورت
اُن کی آنکھوں میں تو یکگونہ مروّت نہ رہی

چار دن ہو گئے بیٹھے ہوئے اس خندق میں
موت سے میرا جنوں برسرِ پیکار رہا،
اپنے ماحول کا مطلق مجھے احساس نہ تھا
ہاں مرا دل خرد و ہوش سے بیزار رہا

گولیاں کان کو چھو چھو کے نکل جاتی ہیں
ایک آندھی سی چلا کرتی ہے میدانوں میں
ناچنے لگتے ہیں راتوں کو یہ مردے اکثر،
جو پڑے سڑتے ہیں پر ہول بیابانوں میں

آہ! کل نذرِ اجل ہو گیا میرا ساتھی
جنگ کی بھینٹ چڑھا اسکا شبابِ رنگیں۔
آہ! پھر مجھکو بھی تنہائی کا احساس ہوا
جیسے دنیا میں مرا کوئی نہیں کوئی نہیں

ہر طرف آتی ہے توپوں کے گرجنے کی صدا
مجمرِ چرخ میں پھر آگ بھڑک اٹھی ہے
خاک ہو جائینگے کچھ دیر میں یہ کون و مکاں
خرمنِ زیست میں بجلی سی چمک اٹھی ہے

اے جوانانِ وطن! آگے بڑھو آگے بڑھو
سر پہ آ پہنچے ہیں دشمن کے سپاہی شاید
مورچہ ٹوٹ گیا، خیر نہیں ہے اپنی
دیکھو منہ پھاڑے کھڑی ہے [illegible] شاید

[illegible] نوجواں ہاتھ میں بندوق لئے
شاہزادہ دھرتی کے سینے پہ گرا
اپنی راحت بھری آغوش ذرا پھیلا دے
ماں! ترا لال بہت روز میں واپس آیا

اپنی جوتوں سے یہ لاش کچل ہی ڈالو۔
مرنے والے کا کوئی یار و مددگار نہیں
زندگی ختم ہوئی رشتۂ الفت [illegible]
پھر بجز خاک کوئی دوسرا غمخوار نہیں!

(غیر مطبوعہ)

ضیاء الاسلام

ہیرو

اس جنگ کے غیور جوانانِ سرفروش۔
کس نے دیکھا ہے انہیں؟
ہاں مگر اُن کا پتہ چلتا ہے۔
سوختہ شہروں کے پیراہن سے
جیسے اٹھتا ہے دھواں
پھر آسمانوں کی طرف جا کے پگھل جاتا ہے۔

کس کو انسان کے ناخن کا پتہ چلتا ہے؟
ہاں وہی عقدہ کشا ناخنِ عقل۔
اور افریقہ کے صحرائے عظیم۔
کونسی آنکھ سے ڈھونڈھوں اے دوست۔
ان جوانوں کے تخیل کا سراغ۔
جنکی چھاؤں میں پلے۔
رات ہو جیسے فروزاں وہ خواب۔

آہ وہ تیرا پرستار وہ تیرا عاشق
وہ تجھے بھول گیا، بھول گیا۔
وہ محبت سے سلگتی ہوی تنگ آغوشی۔
آہ اب تجھ کو نہیں ملنے کی۔

ہائے سورج کی شعاعوں کے تلے۔ ——
گھاس مشرق کی ہواؤں سے مڑی جاتی ہے ——
اور اک گوہر یکدانہ پڑا سڑتا ہے۔

[illegible]

آغاز و انجام

سلیمان اریب

خون کی سرخیٔ پائندہ سے تابندہ ہے
ابنِ آدم کا تو قصہ ہی عجب قصہ ہے
جو ہے آغاز وہ انجام نظر آتا ہے
قتل و غارت گری کیا اپنا فقط حصہ ہے

آجتک پا نہ سکے رازِ سکوں کی راہیں !
صدیوں سر جوڑ کے بیٹھے رہے عقل و فرماں
ہاتھ تھک تھک گئے چھد چھد گئے غمخواری کے
آج بھی دل کے مگر چاک ہیں جیب و داماں،

مفلسی، تیرگی، دریوزہ گری، ناداری!
پشتِ گیتی میں ابھی اور یہیں ناسور کئی
چھین لی کس نے وہ تاثیرِ دمِ عیسیٰ کی
رستے رہتے ہیں ابھی دیدۂ بے نور کئی۔

جس طرف بھی مرے اللہ نظر کرتا ہوں!
تیرگی ہے کہ امڈتی ہی چلی آتی ہے۔
جانے کیا بات ہے کیوں زلفِ چلیپا کی طرح
زندگی ہے کہ الجھتی ہی چلی جاتی ہے

اختر الایمان

سلسلے ٹوٹ گئے

اٹھ گیا رات کے چہرے سے ستاروں کا کفن!
سبزہ و گل پہ ابھی تک ہے وہی پہلا نکھار
صبح کی آنکھ میں انگڑائیاں لیتا ہے خمار

دن کے ہمراہ چلا قافلۂ رنگ و بہار!
سینۂ خاک پہ رقصاں ہے وہی روحِ حیات
وہی کلیوں کی خموشی، وہی غنچوں کا ثبات

نورِ خورشید سے ذروں کی جبیں روشن ہے
دشت و کہسار میں ہے پھر وہی کرنوں کا خرام
پھر وہی شور، وہی کشمکشِ دانہ و دام

پھر اس مرکزِ آلام پہ لوٹ آیا ہوں!
پھر وہی حسن سے حیوان کی چارہ جوئی
پھر وہ انسان سے انسان کی چارہ جوئی

سلسلے ٹوٹ گئے خواب کی زنجیروں کے!
میری پلکوں پہ ستارے سے لرز کر ٹوٹے
اس کے ہونٹوں پہ سہارے سے لرز کر ٹوٹے

آج سے ہم بھی اپنے نہیں

اختر انصاری

دل کے سہارے ٹوٹ گئے
درد کے ساتھی چھوٹ گئے
کوئی یہاں اپنا نہ ہوا
آج سے ہم بھی اپنے نہیں

موڑ لیا منہ راحت نے
پھیر لیں آنکھیں قسمت نے
دورِ زماں اپنا نہ ہوا
آج سے ہم بھی اپنے نہیں،

مکر و سیاست نے لوٹا
کیدِ معیشت نے لوٹا
نظمِ جہاں اپنا نہ ہوا
آج سے ہم بھی اپنے نہیں

یوسف ظفر

ہمزاد

رات کے ہونٹوں پہ نغموں کی فراوانی ہے
چاند کو دیکھ کہ ہے نغمۂ سیمابِ رواں
اور تارے کسی پازیب کے پارے، لرزاں

تو مگر سن نہ سکا فطرتِ فن کار کی لے
مجھے حیرت ہے، — مرے دوست مجھے بھی حیرت ہے

۲

دور کہسار کی پُر پیچ و خطر راہوں سے
آرزو سوئے ہوئے گیت چرا لائی ہے
اور اک شعلے کا ڈھالا ہوا رنگیں پیکر
میرے جذبات کو آسودہ بنانے کے لئے
اپنے ابھرے ہوئے شانوں پہ اٹھا لائی ہے
دیکھ وہ قصرِ محبت پہ چراغوں کی قطار
جوئے سیمیں کی ابھرتی ہوئی سی کروٹ
اور یہ دامن پہ [illegible] سلوٹ سلوٹ

دیکھ یہ لہر کے سینے پہ لرزتا سا ابھار
عکسِ قندیل ہے یہ، مانگ میں سیندور نہیں

اس طرف رقص میں ہیں پھول۔ کہ رنگیں شعلے
سرخ ابریشمی ملبوس سنبھالے اُٹھے
وہ صدا آئی چھنا چھن کی — ستارے کانپے
دیکھ — وہ پیکرِ تخئیل کے لب ہلنے لگے،

دیکھ یہ انجمنِ رقص، یہ نغمات، یہ مے
تو مگر سُن نہ سکا فطرتِ فن کار کی لَے
مجھے حیرت ہے، مرے دوست، مجھے حیرت ہے

۳

تیری خاموشی مرے راز کی محرم تو نہیں
تیری آنکھوں میں مری حسرتِ پیہم تو نہیں
تیری حیرت میں مرے ہوش کا ماتم تو نہیں

یہ تری زردیِ رخسار — یہ پژمردہ جبیں
تو مرا عکس ہے، افسوس! کہ تو دوست نہیں

عطا محمد

دو نظمیں

(۱) ٹرِی - او - لے

کانپتے ہونٹ، سلگتی پلکیں ، اور آنکھوں میں نمی کی تحریر
دیکھ کر کس کی نہ چھوٹیں نبضیں؟
کانپتے ہونٹ، سلگتی پلکیں !
لئے آنچل میں ہزاروں شرحیں
خونفشاں چشم کی ہر سرخ لکیر
کانپتے ہونٹ، سلگتی پلکیں ! اور آنکھوں میں نمی کی تحریر

(۲) یہ بیچارے ہندوستانی

اینٹھن ہے، پورے جسم میں اِک پیچ و تاب ہے
سر میں خمارِ آرزوئے بے حساب ہے۔
آنکھوں میں وہ شراب کہ دنیا میں لاجواب
نس نس میں بجلیاں ہیں، تو رگ رگ میں اضطراب
اور دل کو دیکھئے تو لئے عزمِ بے حساب
لیکن یہ کیا کہ پھر بھی ہیں بے مقصد و خراب!
شاید مسلّط ان پہ غلامی کا ہے عذاب!!
کیا ان کو بھی جہاں میں ذوقِ شباب ہے؟
سر میں خمارِ آرزوئے بے حساب ہے؟

اختر ہوشیارپوری

استقبال

آج تو آ تو رہی ہے مرے کاشانے میں
اک ذرا صبر کہ اشکوں سے چراغاں کر لوں
بخش دوں ہر در و دیوار کو اک صورت
اور دوشیزۂ امید کو رقصاں کر لو
یہ بھی اک باب سہی عشق کے افسانے میں

میں ابھی آتا ہوں اے دوست پئے استقبال
اپنی پلکوں سے غبارِ رہِ غم جھاڑ تو لوں
زندگی بھر مجھے ہر چند میسر نہ ہوا
تیری خاطر تو چرا لاؤں نظاروں سے سکو
چھین لاؤں مہ انجم کا درخشندہ جمال

کیا ہی اچھا ہو جو چند سے توقف کر لے

[redacted]

ابھی کہنے ہیں فسانے مجھے تنہائی کے
ابھی ایوانِ تصوّر میں جلانے ہیں چراغ
سوچنا ہے غمِ فردا کا مداوا بھی مجھے،
تو بھی دو چار تخیل میں بنالے خاکے،

کل کو اک اور ہی عالم کو بسانا ہوگا
جہاں ہر گام پہ دنیا کی نگاہیں ہونگی،
جب نہ پائیگی زمانے میں کہیں زیست سکوں
یہ سنا ہے تری زلفوں میں پناہیں ہونگی،
اور جو گزریگی باہم اسے سہنا ہوگا

ماحول

فضا میں گہرے دھندلکے ہوا غبار آلود
قلوب کیف سے خالی نظر اداس اُداس
لبوں پہ پپڑیاں، اذہان سوچ سے عاری
حیات سر گریباں نہ کوئی آس نہ یاس
اُمید ایک کہانی ہے ان کہی وہ بھی اُمنگ وقت کی اک لے ہے ان سنی وہ بھی

باقر رضوی

مجبوریاں

اک پھول کا دامن سی نہ سکے تنظیمِ گلستاں کیا کرتے
اک ذرّہ کو تسکیں نہ ہوئی سیرابِ بیاباں کیا کرتے
تصویرِ جہاں بے رنگ سی تھی ۔ تھے روز و شب رُوکھے پھیکے
جب دنیا کا یہ نقشہ تھا رنگِ رخِ تاباں کیا کرتے
جب شامِ غم میں انساں کی قسمت کا ستارہ ٹوٹ گیا
پھر ہم شبِ گیسوئے مشکیں صبحِ رخِ جاناں کیا کرتے
سب دوست اسیرِ دامِ محن تھے ۔ ہمدم سارے وقفِ غم
ہم اپنی تنہا خوش حالی پر شکرِ یزداں کیا کرتے
ماتھے پہ عرق، آنکھیں پرنم، تھی جان بہ لب نوعِ انساں
پھر نزع کے اس ماحول میں ہم عشرت کا ارماں کیا کرتے
کرنا تھے ہزاروں کام ہمیں اک رات میں عہدِ جوانی کی،
اے جلوہ جاناں نادم ہیں پھر صرفِ شبستاں کیا کرتے
اُف شامِ غم کی تاریکی تاروں کے دیوں میں تیل نہ تھا
اور گل تھا ہمارے دل کا کنول اشکوں سے چراغاں کرتے
آنکھوں میں گوہرِ اشک نہ تھے، پہلو میں متاعِ درد نہ تھی،
یہ سارے خزانے خالی تھے ہم نذرِ بہاراں کیا کرتے

عبّاد بریلوی

پا بہ زنجیر

مری نظر میں تو اب کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں
بس اک اندھیرا ہے جو پھیلتا ہے بڑھتا ہے
ہر ایک چیز چھپی جا رہی ہے نظروں سے!
وہ اک خیال کبھی اندھیاریوں میں ڈوب چلا
جو اس جہان میں سب سے عزیز تھا مجھ کو
وہ ایک چیز جسے زندگی سمجھ رہا تھا
بس اب تو ہو چکی وہ بھی نگاہ سے اوجھل
یہی خیال تو مجھ کو رلا رہا ہے
اسی پہ کڑھتا ہوں۔ اور سوچتا یہ رہتا ہوں
نجات مل بھی سکے گی کبھی شکنجے سے

(۲)

میں اپنے آپ کو آنسوں کا ایک خطرہ کہوں
ٹپک کے رہ گیا جو زندگی کی آنکھوں سے
ڈھلکا ہوا سا — اس اک زندگی سے اکتا کر
جسے سمجھتا ہوں اک بار اس زمیں کیلئے
ہر ایک شام یہیں آ کے بیٹھ جاتا ہوں
یہی اس اونچی عمارت کی تیسری منزل
کہ جس میں میرا بسیرا ہے آج بیس دن سے
یہیں پہ بیٹھ کے میں دیکھتا ہوں سڑکوں پہ
ہزاروں قہقہے الجھے ہوئے کراہوں سے،
ہزاروں روپ میں انساں کے رینگتے کیڑے
انہیں کو دیکھتا ہوں، اور سوچتا ہوں میں

یہ زندگی کے جو آنسو نہیں تو کچھ کیسے سا ہیں ؟
بھٹک رہے ہیں انہیں راستہ نہیں ملتا!

۳

تھکی ہوئی سی ہیں آنکھیں، تھکا ہوا سا دماغ
تھکن سے روح بھی شل ہے مری اور جسم بھی شل
نظر کے سامنے کچھ آہنی سلاخیں ہیں جو سامنے سے تصور میں بھی نہیں ہٹتیں
ازل سے پاؤں میں میرے پڑی ہوئی زنجیر تڑپتی رہتی ہے، اور تلملاتی رہتی ہے
کہ جیسے بار رہا اس پہ مرا فسردہ وجود کہ جیسے کڑھتی ہو میری حیات تڑپ بھی!
ہر ایک گام پہ اس کے جھنجھنا کے کی آواز مجھے دکھاتی ہے کچھ مضمحل سی تصویریں
جو مجھکو سوچ کے ساگر میں ڈال دیتی ہیں!

۴

نظر کے سامنے سے واقعے گزرتے ہیں
گزرنے لگتے ہیں — گزرے چلے ہی جاتے ہیں
سبزہ کار شباب ہوائے دوراں سے
جلو میں اپنے لئے آگ خون کے طوفاں
قدم قدم پہ نظامِ جہاں بدلتے ہوئے
بلند کرتے ہوئے آسمانوں میں پرچم
مرے شعور سے کہتے ہیں جو کہانی سی
جسے سمجھتا ہوں، لیکن سمجھ نہیں سکتا!

شفیع منصور

جاگ اے دل...!

جاگ اے دل کہ میں زندانیٔ تقدیر نہیں!
زندگی موت سے آمادۂ پیکار ہوئی
خوئے تسلیم و رضا برسرِ انکار ہوئی
ایک ہنگامۂ خونیں ہے زمانے میں بپا
تو بھی ناکامیٔ پیہم کی کوئی سوچ دوا
ہاں مگر اس کی دوا نالۂ شبگیر نہیں!
جاگ اے دل کہ میں زندانیٔ تقدیر نہیں!

سوچ اے دل کہ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے!
تیرا غمخانہ ہے موہوم امیدوں کا مزار
آہ بیمار جوانی کا یہ بے کیف خمار!
روح ترسی ہوئی، آلام سے گھبرائی ہوئی
ہر کلی باغِ تمنا کی ہے مرجھائی ہوئی
زندگی تیرے لئے خونِ جگر پینا ہے!

سوچ اے دل کہ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے،
تو نہ بدلے گا تو کیا بدلے گی دنیا تیری!
کب سے ہے رہگذرِ غیر میں تو سجدہ گذار
آہ بیکار عقیدت کا پرانا آزار!
اپنی عظمت سے یہاں تک ہے تری بیخبری
مقصدِ زیست ہے تیرے لئے دریوزہ گری
ہے وہی نقشِ کہن ہستیٔ رسوا تیری
تو نہ بدلے گا تو کیا بدلے گی دنیا تیری!

جاگ! ہاں جاگ کہ یہ وقت نہیں سونے کا!!
رنگ بدلا ہے زمانے نے تو انداز بدل
بے اثر ہے تری آواز تو آوازہ بدل،
تو وہ مجبور نشیمن بھی قفس ہے تجھکو
آہ جینے کی مگر پھر بھی ہوس ہے تجھکو،
جان پر کھیل کہ ہے آج یہی فرض ترا
جاگ! ہاں جاگ کہ یہ وقت نہیں سونے کا

سلام مچھلی شہری

میں نے کہا

I

اب اوورکوٹ کے کالر میں باندازِ جمیل۔
رکھ لیا کرتا ہوں یہ ہاتھ اکثر۔
اور یہ سوچ لیا کرتا ہوں۔
میں بھی اک بورژا شاعر ہوں۔

میں نے ہر قیمتی سگریٹ کے دھوئیں دیکھے ہیں۔
اور سگاروں کے گھنیرے بادل
اور پائپ کو بھی اِن ہونٹوں پہ ہر پوز کے ساتھ۔
میں نے رکھے ہیں، پیئے، لیے کش بھی۔
اور کش لیتے ہوئے پہروں یہی سوچا ہے۔
کیا غلط ہے کہ میں چھاتا ہی چلا جاتا ہوں
کافی ہاؤس کی فضاؤں پہ دھوئیں کی مانند۔
کیا غلط ہے کہ یہ سیمیں اجسام۔
میرے پائپ کے دھوئیں سے کہ جھلس اٹھیں گے۔
کیا غلط ہے کہ مرے ظالم۔
میری خودداری سے لیں گے نہ اثر۔
اب بھی جب نقرئی سکوں کو اڑا دیتا ہوں۔

نقرئی سکّے، یہ مدّھم تارے۔
ہاں انہیں سرمئی! رومانی۔ دھوئیں کے پیچھے۔
رابعہ جن کو ستارے ہی کہا کرتی ہیں۔
لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کا۔
ایک شاعر ہوں جواں سال ادیب۔
جو بھی ہو میں تو یہی سوچ لیا کرتا ہوں۔
لوگ جو چاہیں کہیں۔
ایک کلرک
اک شاعر نوکر
یا محض رحم کے سائے میں مچلنے والا۔
کم پڑھا۔
اور اک ابہام کا مارا شاعر۔
ہاں تو میں گیت لکھا کرتا ہوں۔
ماہ پاروں سے سہانے سپنے۔
ہند کی دیویوں کے، دیویوں کے۔
دور، جمنا کے کناروں پہ مچلتے نغمے
جھلملاتے ہوئے ہنستے ہوئے کومل دیپک۔
منڈیروں کی ہری زرد گلابی ساری۔
اور [illegible] کے حسین پھولوں میں سجی ناگن۔
ناگنیں —— جو مرے گیتوں میں جو پوشیدہ سی ہیں!

ایک دن آپ انہیں بالوں کو
ایک دن آپ انہیں آنکھوں کو۔
ایک دن آپ انہیں چہروں کو۔
ایک دن آپ انہیں باہوں کو
معاف فرمائیے میں بھول گیا۔
شاید ان گیتوں کے بارے میں مجھے کہنا تھا۔

ہاں تو میں پہلے سے کچھ اچھا ہوں
لائبریری کی کتابوں نے مجھے۔
سوچنے پڑھنے کو کچھ دے تو دیا تھا لیکن۔
زندگی میری بڑی تلخ تھی شاید اکثر۔
تیز جاڑوں کی شب ماہ نے بھی۔
چاہے کتنی ہی کوشش کروں جتنا تڑپوں۔
میری تخئیل پہ ہنسنے کے سوا کچھ نہ کہا۔
اور کچھ دیر کے بعد۔
میری کھڑکی سے نظر آتے ہوئے پیڑوں ہوکے
—— بھوتوں کے اکھاڑے سے گزر جاتی تھی۔
اب کہ جب دیکھ رہا ہوں یہ فسردہ تارے۔
میرا خففات سے آباد یہ تپتا کمرہ۔
ایک تاریک سا چھوٹا کمرہ۔

نمایش انجم و مہتاب سے بھی دوری ہے ۔
یہ ستارے نہیں کافی کہ سجا لوں میں بھی ۔
اس کو بلا لوں میں بھی ۔
جو بہت دور، کسی گاؤں میں تنہا ـــ اکثر ۔
شمع کے سائے میں لیٹی ہوئی ۔
کچھ کہتی ہوئی ۔
اپنے اِن خوابوں سے جو دیکھ لیا کرتی ہے ۔
میری آراستہ باتوں کے حسین محلوں کو ۔
آج کی رات بھی کچھ سوچ رہی ہے شاید ـــ ۔

اب بھی جب آئینہ نما نوا سے حسیں اک دفتر ۔
اپنے فن کار کے مغرور قدم چومتا ہے ۔
اب بھی جب تنہا مگر پختہ سا اونچا کمرہ ۔
اپنے شاعر کے تخیّل کے پروں پہ اُڑ کر ۔
آج کی رات بھی اُڑتا ہی چلا جاتا ہے ۔
ماہ و انجم سے بھی کچھ دور ـــ سبک وادی میں ۔
جو مری فکر کا ہلکا سا اشارہ ہے مگر ۔
میں نے آباد کیا ہے جس کو ۔
بزمِ جنت کے خداؤں سے بھی لڑنے کے لئے !!
اپنی تخلیق کے اجسام جواں تر لے کر ۔

حور و غلماں کے مقابل مری رنگیں فوجیں۔
بزم جنت کے خداؤں کو بھی للکاریں گی:۔
یہ ہے پیمانہ۔
یہ صہبا۔
یہ صراحی۔
یہ گیت۔
اور یہ رقص۔
یہ ساقی۔
ایسی اک محفل رنگیں ہے اُدھر بھی کوئی؟
یہ سمندر ہے۔
یہ جھیل۔
اور یہ پہاڑ۔
یہ گلستاں
یہ گلستاں کے حسیں پھول۔
یہ شاداب فضا۔
اور یہ ڈھلتے بادل۔
یہ نکھرتے ہوئے تارے۔
یہ چراغاں۔
یہ بہار
اور یہ عروسانِ بہار۔

ہے ادھر بھی تری فردوس میں ایسی شہکار ۔
میری تخلیق کی رنگیں شہکار ۔
میری نوجوانی کی یہ ۔
یہ دوشیزہ جیسے ۔
میری نظروں کی کنول سے بھی سبک ٹھنڈک نے ۔
میری دانش کی اُفق سے بھی خنک وسعت نے ۔
میرے احساس کی بربط سے بھی نازک لَے نے ۔
میری تخئیل نے ۔
میرے دل نے، سانپ کے زہر کی گرمی لے کر ۔
ارضِ خورشید کے شعلے لے کر ۔
زلزلے آندھیاں طوفاں لے کر ۔
بحرِ ذخار کی مانند ۔
چٹانوں کی طرح ۔
عزم پر نازاں ۔ بلندی پہ بھروسہ کر کے ۔
اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے ۔
سجایا ہے اُسے ۔
دیکھ لو دیکھ لو جنت کے خداؤ! ورنہ
اس کی ٹھنڈک سے سکڑ جاؤ گے ۔
جل جاؤ گے ـــــ
اس کی بازو کی شعاعوں کو نہ رحم آئے گا ـــــ !

اس کے ہونٹوں کی لپک ۔
اس کی نگاہوں کا خرام ۔
اس کے رخسار کی لو ۔
اس کے بازو کے تنے ناگ ۔

یہ سینہ ۔

یہ بھرے جام ۔
یہ خورشید کا رقص ۔
اس کے کولھوں کی لچک ——
چلتے ہیں دو مست چکور ۔
اپنے پر تان کے پھیلا کے بڑی مستی میں ۔
یا تو بارش کی پھواروں میں ندی میں کچھ دور ۔ ——
چاندنی رات کی ویرانیاں خوابیدہ ہیں ۔
اور ملاح کی آنکھوں کی شراب ۔
ان کو کچھ اور بھی مدہوش کئے دیتی ہے
کشتیاں بڑھتی تو ہیں، چلتی تو ہیں پھر بھی ہوا ۔
بادبانوں کو پریشان کئے دیتی ہے ۔
بادبانوں کو بھروسہ ہے یہ کیا کر لیگی ۔
ہم تو طوفانوں سے ٹکرائیں گے ——!!

غزل

الطاف مشہدی

یہ بھری بزم یہ احباب کہاں پھر ہوں گے
دل کے بہلانے کے اسباب کہاں پھر ہوں گے

نکہت و نور میں ڈوبی ہوئی راتو! افسوس
یہ فسوں کار و حسیں خواب کہاں پھر ہوں گے

تیرہ بختی مجھے آغوش میں لیگی بڑھ کر۔
جلوہ ہائے رخ مہتاب کہاں پھر ہوں گے

میں پڑا ہوں گا کہیں دور بیابانوں میں
میرے ساتھی میرے احباب کہاں پھر ہوں گے

ایک برباد جوانی پہ جو ٹوٹے برسوں
آہ وہ دیدۂ پرآب کہاں پھر ہوں گے

موت کے سرد دھندلکوں میں اتر جاؤں گا
زندگانی کے یہ اسباب کہاں پھر ہوں گے

اب مری یاد میں الطاف جو خوں روتے ہیں۔
مجھ سے ملنے کو وہ بیتاب کہاں پھر ہوں گے۔

قاضی عبدالغفار

قرضہ

کیسا مشہور و معروف، کیسا معزز، کتنا بڑا لکھ پتی، راجہ، شہر میں اس کی دھاک سرکاروں میں اس کا مرتبہ بلند، لکشمی اسکے گھر کی باندی، وہ تجوریوں کا راجہ، محل اس کا بلند، دروازے اس محل کے مضبوط، اتنے مضبوط کہ عیش کی ان محفلوں کے دروازہ پر غم اور فکر نے بارہا دستک دی۔ مگر اوسے واپس جانا پڑا۔ عیش اوس کا چاکر، خوشی اور راحت اسکی داشتہ ——— اپنی نظر میں اپنے سے ہر کمتر کا آقا اور کمترینوں کی نظر میں اونکا بندہ نواز ——— یہ میری اس کہانی کا راجہ تھا۔

ایک دن وہ آیا کہ راجہ کی جوانی کا آفتاب ڈھلنے لگا۔ اے کاش کہ دولت اور اقبال کی طرح اس بھاگتی ہوی جوانی کی باگ بھی میرے راجہ کے ہاتھ میں ہوتی!۔ مگر یہ گریزپا جوانی، یہ بے وفا جوانی ——— نہ وہ بادشاہوں سے وفا کرے اور نہ ان کے غلاموں سے!۔ اپنے وقت پر آتی ہے اور اپنے وقت پر گزر جاتی ہے۔ زر و جواہر کی تجوریاں اس کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ فولاد کی دیواریں اسے محبوس نہیں کرسکتیں، یہ بیوفا جوانی ——— سب کچھ تھا راجہ کے پاس، دولت کی دیوی اوسکے گھر میں اصیل اور ماما کی خدمت انجام دیتی تھی۔ لیکن ایک کم بخت جوانی تھی کہ اسکے حکم کی تابع نہ تھی!۔ یہ روکتا رہا۔ اور وہ بھاگتی رہی!۔ ——— پھر بھی وہ ابھی اتنا بوڑھا نہ تھا۔ کہ ہم اسے جوان نہ کہیں، لٹنے والے حسن کے بازار میں بکنے والا حسن اب بھی راجہ کی جوانی پر شہادت

دیتا تھا۔ خون کی حدت گو کچھ کم تھی تو ہوس کی بیتابی اور بے اختیاری اس کمی کو پورا کر دیتی تھی !۔ بستر کے پھولوں کی مہک اور شریک بستر کے لباس کی خوشبو رندی اور سیہ مستی کی، اون راتوں میں راجہ کی تھکی ہوئی اور جھوٹی جوانی کو سہارا دیتی تھی —— اس لئے تو میں کہتا ہوں کہ وہ اتنا بوڑھا نہ تھا کہ ہم اوسے جوان نہ کہہ سکیں !!

اس دن شام بازار میں ایک ہنگامہ برپا تھا —— راہ گیروں کے ہجوم سے راستہ بند ہو گیا تھا۔ بازار کے لوگ چلتے چلتے رک گئے تھے، اونکے گھیرے کے اندر خاک و خون میں نتھڑا ہوا ایک زخمی جسم پڑا ہوا تھا، یہ لوگ کچھ افسوس اور کچھ حیرت کے ساتھ اوس زمین پر گرے ہوئے زخمی کو دیکھ رہے تھے۔ کیا کوئی راجہ بھی اس طرح سر بازار مر سکتا ہے !۔ بازار کے کوٹھوں اور برآمدوں پر گھروں اور بازاروں کی عورتیں نکل آئی تھیں —— ایک کوٹھے کے برآمدہ میں کوئی رقاصہ ہاتھ مل رہی تھی —— شاید رو بھی رہی تھی !۔ رات ہی تو اوسنے راجہ کی خوابگاہ کو اپنے عارض تاباں سے روشن کیا تھا۔ کیسی میٹھی نظروں سے راجہ اسے دیکھا کرتے تھے۔ اور چلتے وقت انہوں نے کہا تھا۔ رادھا ! کل پھر آنا۔

ہسپتال کے بستر پر —— سانس بہت دھیمی ہے اوس سانس میں کچھ ہچکیاں بھی ملی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر کا ہاتھ نبض پر ہے۔ زندگی کی امیدیں نبض کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ عمل جراحی ناکام رہا۔ حالانکہ جراح اپنے فن کا بہت بڑا ماہر تھا۔ وہ کسی بڑے شہر سے ہوائی جہاز پر بٹھا کر لایا گیا تھا۔

مریض کا چہرہ زخموں کی تکلیف سے بگڑا ہوا تھا۔ لیکن اسکے ہونٹوں پر ایک لرزتا ہوا تبسم تھا۔ کیا عجب ہے کہ یہ تبسم اُن ڈاکٹروں اور عزیزوں سے مخاطب ہو جو ابھی تک اس امید سے کھیل رہے تھے کہ شاید موت کا فرشتہ اپنا کام کئے بغیر واپس چلا جائے۔ ——— آخری لمحوں کی اس "شاید" میں امید و بیم کی کتنی بڑی دنیا آباد ہوتی ہے ——— مرنے والا اپنی زندگی کے دھندلے فاصلہ میں کہیں بہت دور دیکھ رہا تھا۔ کل ہی کی بات تھی مگر بہت، دور کی بات تھی !! ——— وہ منظر اسکی آنکھوں میں تھا، جب اوس نے بازار میں ایک فقیرنی کو بچانے کے لیۓ دفعتاً گھوڑوں کی باگیں کھینچیں اور گھوڑے بگڑ گئے، جب وہ گرا تو یہ فقیرنی اسکے قریب ہی تھی اور اور اُسنے اوس پھٹے اور میلے کپڑوں والی فقیرنی کا فاقہ زدہ چہرا بھی دیکھا۔ جب ہی تو وہ مسکرا رہا تھا !۔ کیا وہ چہرا اس آخری لمحہ میں راجہ کی آنکھوں میں سماکر اوسے کوئی بھولی ہوئی کہانی یاد دلا رہا تھا ؟ کیا وہ اپنی جوانی کی گزری ہوئی فتوحات کو یاد کرکے مسکرایا تھا ؟۔ یا اس لئے کہ آج وہ اپنا ایک بہت پرانا قرضہ چکا رہا تھا۔ ———

ابھی کچھ سانس باقی ہے آنکھیں کھلی ہوئی ہیں ——— مگر دیکھ نہیں رہیں ——— یعنی وہ کیفیت جو زندگی اور موت کے درمیانی فاصلہ میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ زندہ ہیں لیکن زندہ نہیں ہیں ——— یا مر گئے لیکن مرے نہیں ہیں۔ زندگی کی صبح کاذب کا وہ دھندلا وقت جب نہ رات ہوتی ہے اور نہ صبح !۔

——— ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہم سے جو کچھ ہوا ہم نے کیا۔ ہمارے فن کا کوئی کمال باقی نہیں جو اس شخص کی جان بچانے کے لئے ہم

نے استعمال نہ کیا ہو۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ جب موت کا فرشتہ جائزہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو پھر سائنس اور علوم کے دیوتاؤں کو ہار ماننا ہی پڑتی ہے۔

شفا خانے اور پولیس کی کتابوں میں اس مریض کا حال آج تک لکھا ہوا ہے ——— گھوڑے بھڑکے، ایک فقیرنی کو اپنے سامنے بھاگتے دیکھ کر ——— راجہ گاڑی سے گرے ——— اور گرے گھوڑوں کے قدموں میں ——— فقیرنی بال بال بچ گئی لیکن راجہ ہی کے ایک گھوڑے نے اون کے سینے پر پاؤں رکھدیا اور سینے کی ہڈیاں اس طرح ٹوٹ گئیں جیسے کسی پنجرے کی تیلیاں — کل جب ملک کے اخباروں میں راجہ صاحب کی موت کی اطلاع کے ساتھ یہ تفصیلات شائع ہوئیں تو ہزارہا شہری کفِ افسوس ملنے لگے۔ کیسا اچھا آدمی تھا وہ، کیسا محب قوم، اور ہمدرد بنی نوع انسان!

——— اس وقت جب راجہ صاحب کی وفات پر اخباروں میں ادارے لکھے جا رہے تھے۔ اور جلسوں میں ماتمی قرار دادیں منظور کی جا رہی تھیں۔ ——— تو صرف ایک عورت تھی جو خاموش تھی ——— مگر اس کا دل دھڑک رہا تھا اور وہ اس سے کہتا ہو گا کہ "غم نصیب! آج تیرا قرضہ ادا ہو گیا" ——— کیا معلوم کہ اپنے بستر پر کوئی ایسی ہی بات سوچ کر راجہ بھی مسکرایا ہو۔ شاید اوسکی روح اس قرضہ سے سبکدوش ہو کر مسکرا رہی ہو۔

دس پندرہ سال کا یہ واقعہ ہے۔ جب راجہ صاحب کی دولت اور جوانی نے اس عورت سے جو اس زمانہ میں عورت نہ تھی صرف لڑکی تھی۔

زبردستی اپنا خراج وصول کیا تھا —— اور پھر جب وہ لڑکی رات کی آخری ساعتوں میں اس دیو کی طلب کو مطمئن کر کے اس کے دیئے ہوئے دس روپیہ کے نوٹ کو اس کے منہ پر مار کر بھاگی تھی تو اوسوقت اسکی روح ایک جذبۂ انتقام سے کانپ رہی تھی اور چلتے چلتے وہ اپنے ہنستے ہوئے شکاری سے کہکر آئی تھی کہ موذی! تجھے یہ قرضہ کسی دن ادا کرنا ہوگا! -

سالہا سال اس لڑکی نے صرف ایک رات کے لئے عورت بننے کے بعد شہر کی سڑکوں پر بھیک مانگی تھی، جوانی کی راتیں اس نے سڑکوں کے کنارے گذار دیں، بوڑھاپے کے دن اس نے بازار کی دکانوں پر ہاتھ پھیلا کر گزارے، بھوک اور احتیاج کی کڑی منزلیں اس نے طے کیں۔ مگر وہ نو راجہ کے خلوت خانہ کو بھولی نہ اوس رات کو جب اس نے گناہ کا قرضہ مردانہ جوانی کے اس سرمایہ دار کو دیا تھا۔ اس قرضہ کا حساب وہ ہر روز یاد رکھتی رہی۔ —— ہر روز اس قرضہ کی میزان میں وہ ایک صفر بڑھا دیا کرتی تھی! -

* * *

اس دن سر بازار یہ پرانا قرضہ مع سود کے ادا ہوگیا۔ وہ ہر روز راجہ کی شاندار سواری کو بازار سے گزرتے دیکھا کرتی تھی۔ ہر روز وہ اس منظر کو دیکھنے بازار میں آتی تھی، اس کا جذبہ انتقام ہر روز اس منظر سے قوت حاصل کرتا تھا۔ اس دن بھی وہ سر راہ کھڑی تھی، معلوم نہیں کس طرح وہ مشکی گھوڑوں کی جوڑی کے سامنے آگئی، گھوڑے بھڑکے، اور وہ بھاگی، اسکے بعد ایک لمحہ میں کیا ہوگیا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ مگر اس نے راجہ صاحب کے کچلے ہوئے جسم کو سڑک پر پڑا ہوا دیکھا۔ اور اسی نے سب سے پہلے دوڑ کر اس خون آلودہ چہرہ کا خون اپنی میلی ساری کے کونے سے صاف کیا —— گویا قرضہ

کی دستاویز پر رسید لکھدی۔

کیا مرنے والے کی نظر کے روبرو بھی یہی منظر تھا جب وہ مسکرایا؟ زندگی کے اس آخری لمحوں میں جب گزرا ہوا ماضی زندہ ہوجاتا ہے اور مستقبل پر ایک سیاہ چادر گرجاتی ہے زندگی کے تمام مدفون مردے اپنی قبروں سے باہر آتے ہیں۔ ان مردوں کو دیکھ کر اپنے آخری معاملہ داں میں کوئی تو ہنستا ہے اور کوئی روتا ہے۔ عیش پرست راجہ کے سیاہ دل میں شاید روشنی کا ایک نقطہ باقی تھا جو زندگی کے اس آخری لمحہ میں چمکا۔ اور شاید اپنے بے پروا عیش کی قیمت ادا کرکے اس مجرم روح کو تسکین حاصل ہوئی! پھر بجھتا ہوا چراغ آخری دفعہ بھڑکا اور ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگیا۔

زندگی کے بادبان میں اب ہوا باقی نہ تھی۔ نرس نے آہستہ سے چادر کھینچ کر نعش کے چہرہ کو ڈھک دیا ——— وہ چہرہ جو ابھی ایک لمحہ پہلے ایک سخی راجہ اور ایک محب وطن قومی رہنما کا چہرہ تھا۔ وہ چہرہ جو جنسی طلب کے وقت بے خبر ہرنیوں پر جست لگانے والے شیر کے چہرہ کی طرح خوفناک ہوجایا کرتا تھا۔ وہ چہرہ جو دولت کے غرور سے تمتما اٹھتا تھا آخری دفعہ اس بڑے راجہ کے معزز چہرہ کو نرس نے ہسپتال کی ایک ایسی چادر سے ڈھانک دیا جو اس سے پہلے بہت سے ایسے بیجان چہرے ڈھانپ چکی تھی! ——— یہ چادر گویا راجہ کی زندگی کے یہی کہانی کا آخری ورق تھا!

فقیرنی اب بھی شہر کی سڑکوں پر بھیک مانگتی پھرتی ہے۔ مگر اب اسکی کمر جھک گئی ہے۔ اور وہ بولتی نہیں ——— بھیک کے لئے اپنا ہاتھ

بڑھا دیتی ہے۔ لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتی ———— شہر کے بوڑھے لوگ اس کو دیکھ کر کہا کرتے ہیں۔ یہی تو ہے نا، وہ فقیرنی جس کی وجہ سے راجہ صاحب کے گھوڑے بھڑک گئے تھے! ———— بازار کے شریر لڑکوں نے اس کا نام "رانی" رکھ دیا ہے ۔

چرواہے

اوپندر ناتھ اشک

صحراؤں اور سبزہ زاروں کے ماحول نے گوالوں اور چرواہوں کو ایسی باتیں سجھائیں، جن کے اظہار سے وہ پیغمبر بن گئے۔ اوپندر ناتھ اشک نے اپنے ڈراموں کے تازہ مجموعے "چرواہے" میں انسانی ذہن کے صحراؤں اور سبزہ زاروں کے ماحول سے ان باتوں کو اجاگر کیا ہے جو تحت الشعور کے پاتال میں دبی رہتی ہیں اور جن کی صورت گری وہی جادوگر کر سکتا ہے جسے تحت الشعور کی بھول بھلیاں کے منتر یاد ہوں۔

چرواہے کہنے کو تو اشک کے کئی ایکانکی ناٹکوں کا ایک مجموعہ ہے لیکن حقیقت میں وہ ان خیالات اور جذبات کا مظہر ہے جن سے ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں سامنا کرتے ہوئے جھجکتے ہیں مگر ایک سچے فنکار کی ذہانت، انانیت اور سماج کسی بات سے خوف نہیں کھاتی وہ ایک عالم کی نظر سے ہر بات اور واقعہ کا تجزیہ کرتا چلا جاتا ہے "چرواہے" ایسے ہی بے خوف تجزیہ کا آئینہ دار ہے۔

جن پڑھنے والوں نے اشک کے ڈراموں کا مجموعہ "پاپی" دیکھا ہے، انہیں یہ کتاب مصنف کی ذہانت کے ایک نئے پہلو سے روشناس کرائیگی . . . . قیمت ۲/-

مکتبہ اردو، لاہور

ماستی ونکٹیش آئینگار

مترجمہ: ممتاز شیریں

یہاں کا انصاف

میرے دادا مسٹر کورٹنی کے جوڈیشل کلرک تھے۔ جوڈیشل کلرک یعنی وہی جوڑی شال سرشتہ دار جیسا کہ ہم کہتے ہیں۔ جوڈیشل سے جوڑی شال ذرا سا تصرف تو ہے۔ اور جوڑی شال کے معنی تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ خیر۔ پرسوں میں پرانے دفتروں کے انبار میں سے جلانے کیلئے بیکار کاغذات الگ کر رہا تھا کہ دادا کے زمانے کی چند دستاویزیں میرے ہاتھ لگیں۔ اس میں مجھے کورٹنی کی ڈائری کے چند اوراق بھی ملے۔ میں نے مسٹر کورٹنے کو دیکھا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ کبھی کبھی مجھے مٹھائیاں دیا کرتے تھے۔ بہت نیک اور رحمدل، آدمی تھے۔ میں نے ڈائری کو یونہی کہیں بیچ میں سے کھولا۔ اور چند اوراق پر سرسری نظر ڈالی۔ اسے بہت دلچسپ پایا۔ اور ایک پورا حصہ پڑھ ڈالا۔ چند ہی صفحات تھے۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ختم کر لئے۔ تمہاری دلچسپی کیلئے میں یہاں اس قصہ کو نقل کئے دیتا ہوں۔

(۲)

میں نے آج ایک مقدمہ کا فیصلہ سُنایا۔ اس کے مدعی مسٹر آرتھر ہنری ایک مشنری تھے۔ ملزم دو وڈّر قوم کے جوان تھے۔ تمابوئی اور رلمابوئی۔ مجھے کہنا پڑتا ہے مسٹر آرتھر ہنری بھی الزام سے بری نہیں ہیں۔ لیکن اس احساس کے باوجود میں صرف رلما اور تما کو سزا دے سکتا تھا۔ مسٹر ہنری کو نہیں۔ شاید اب یا چند دنوں بعد خود مسٹر ہنری کو احساس ہوگا کہ وہ ٹھیک راستہ پر نہیں تھے اس احساس سے ان کو کچھ ندامت ہوگی۔ یہی اُن کے لئے کافی سزا ہوگی

گرجا گھر میں انکی چند قیمتی اشیا بھی چرالی گئی ہیں۔ یہ گویا ان کے جرم کا جرمانہ ہوا اور کون جانے شاید خدا بھی جو ہمارے اچھے یا بُرے کاموں کو دیکھتا ہے۔ جیسا کہ مسٹر ہنری خود اپنے وعظوں میں کہتے ہیں۔ انہیں آئندہ سزا دے۔ لیکن بہر حال آج صرف تمابوئی اور رامابوئی مجرم ٹھہرائے گئے اور انہیں سزا دی گئی۔

یہ دونوں رامپور کے رہنے والے ہیں جو بوبیگی تعلق چندراپور میں ہے۔ رامپور، پچاس ساٹھ گھروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ان میں سے کوئی تیس گھر وکلِگر قوم کے ہیں، جو بڑی بڑی زمینوں کے مالک ہیں، دوسروں کے پاس بھی چھوٹی چھوٹی زمینیں ہیں۔ جن میں وہ ترکاری اُگاتے ہیں۔ وڈروں کے بھی چند گھر ہیں۔ یہ قریہ چھوٹا ہے لیکن لوگ کافی خوشحال ہیں۔ چونکہ گاؤں میں سے بڑی سڑک گذرتی ہے کافی چہل پہل رہتی ہے۔ گاؤں سے کچھ دور پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر راما کا مندر ہے جسے جاترا کا مرکز ہونے کی وجہ کچھ شہرت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے اس کی قلیل آبادی کے باوجود یہ گاؤں کافی بارونق ہے۔

وڈر لوگوں کی زندگی بھی قریب قریب ایسی ہی ہے۔ جیسے گاؤں کے دوسرے لوگوں کی۔ یا تو انکی اپنی چھوٹی چھوٹی زمینیں ہوتی ہیں یا دوسروں کی زمینوں کی کھیتی کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کی حیثیت اس گاؤں میں پردیسیوں کی سی ہے جیسے کسی دوسری جگہ سے آکر یہاں بس گئے ہوں۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو "باہر والے" خیال کرتے ہیں۔ یہ لوگ، اگر چڑے ہوئے نہ ہوں، تو ہمیشہ اخلاق کا برتاؤ کرتے ہیں۔ لوگ خواہ مخواہ ان کے کام میں دخل نہ دیں تو وہ بہت اچھے پڑوسی ثابت ہوتے ہیں۔ اگر مجبوری نہ ہو، تو وہ ہمیشہ اچھے کام ہی کرتے

ہیں۔ بارش اچھی برسے، اور فصلیں اچھی ہوں تو وہ چوری کے پاس نہیں پھٹکتے۔ اگرچہ اناج ان کے سامنے ہی کیوں نہ پڑا ہو اور اس کی نگرانی کرنے والا کوئی نہ ہو۔ پھر بھی وہ چوری نہیں کرتے۔ مذہب پر اعتقاد انہیں سیدھے راستہ پر رکھے رہتا ہے۔

ان کے مذہب میں، جیسا کہ ان وڈّر لوگوں کا عقیدہ ہے، مندر میں راما کی مورتی کی پوجا سب سے اہم ہے۔ یہ وڈر لوگ ہم سے اور آپ سے کئے ہوئے وعدے توڑنے سے ذرا بھی نہ چوکیں گے۔ لیکن جو نیاز وہ مندر کے دیوتا سے کرتے ہیں اسکو ہر حال میں پورا کرتے ہیں۔ آنکھ جھپکانے میں وہ ہمیں دھوکا دیکر ہم سے دس روپئے لے لیں گے۔ لیکن دیوتا سے دس پائی کبھی نہ لینگے۔ وہ نہ صرف دیوتا سے کئے ہوئے معاہدے میں پکے ہیں بلکہ ایکدوسرے سے معاملہ کرتے وقت بھی بہت ایماندار رہتے ہیں۔ وہ دوسرے مذہب یا دوسری برادری کے لوگوں کو دھوکا دینگے، تکلیف پہنچائینگے۔ ان سے وعدہ خلافی کریں گے۔ مگر ایک وڈر دوسرے وڈر سے ایسا کبھی نہیں کریگا۔ کبھی کبھی میں سوچنے لگتا ہوں کہ خدا سے بھی وہ اتنے ایماندار اسلئے ہوں گے کہ وہ خدا کو بھی شاید ایک وڈر ہی خیال کرتے ہوں۔ مجھے یہ خیال اسلئے ہوتا ہے کہ ہم بھی اسیطرح خیال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے ہموطنوں ہی کو لیجئے۔ وہ اپنے ہم قوم انگریزوں کے ساتھ کتنے اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ لیکن ایک ہندوستانی کے ساتھ وہ کتنا ظالمانہ سلوک کرسکتے ہیں!۔ اور جیسا وہ بوئی لوگ اپنے مندروں کی قدر کرتے ہیں ہم بھی اپنے گرجا گھروں کا احترام کرتے ہیں۔ تو یہ وڈر لوگ مذہب اور اخلاق کو عزیز رکھتے ہیں۔ اگر مصیبتیں انہیں مجبور نہ کریں تو سچائی اور دانشمندی سے کام کرتے ہیں اور نیک نفس اور باکار شہری بنے رہتے ہیں۔

ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ انکے مذہب اور اخلاق کی بنیاد کسی ٹھوس فلسفہ پر نہیں ہے اس لئے انسے انسان کو روحانی بلندی پر پہنچنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ ہم مہذب ہیں اس لئے صرف پیچیدہ چیزیں ہی ہم کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہیں۔ ایسی سیدھی سادی لیکن گہری عقیدت جیسی کہ ان وڈر لوگوں کی ہے ہمارے دلوں کو مسخر نہیں کر سکتی۔ یہی تو تہذیب و تمدن کی خمیر ہے، میں ابتک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ یہی سیدھا سادھا اعتقاد اچھا ہے یا ہمارا۔ سیدھے سادھے آدمی کوئل کی کوک سے محظوظ ہوتے ہیں۔ انہیں اسکی پروا نہیں کہ یہ کوک ایک ہی طرز کی ہے۔ ہمارے دل کو خوش کرنے کیلئے بی تھاون کی موسیقی بھی ناکافی ہے۔ ہم مہذب ہیں! متمدن ہیں!! ہم جب راما بوئی اور اسکے نظریوں کا معائنہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اسکا مذہب روحانی بلندی پر نہیں پہنچا سکتا۔ اسے ہمارے مذہب کی تعلیم دے کر، ہمارا ہم مذہب بنا لینا چاہیئے۔ یہی مسٹر ہنری کا نظریہ ہے۔ وہ انگلستان سے ہندوستان کو صرف۔ اسی غرض سے آئے ہیں کہ ہندوستانیوں کو اس تاریکی سے نکالیں۔ اور اپنی روشنی سے انہیں منور کریں۔ یہ ماننا چاہیئے کہ انہوں نے لوگوں کو کچھ فائدہ پہنچایا ہے لیکن کبھی کبھی فائدہ پہنچانے میں انہوں نے غلط راستہ اختیار کیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے یا اس لئے کہ نیک لوگوں پر مصیبت آنی ضروری ہے، مسٹر ہنری کو بھی تھوڑا نقصان پہنچا۔ اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہیں کی تبلیغ کا نتیجہ ہے کہ راما اور تما۔ آج میرے سامنے مجرموں کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔

راما کا مندر، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے۔ ایک پہاڑی پر گاؤں سے کچھ دور پر واقع ہے۔ میں نے کئی دفعہ یہ مندر دیکھا ہے۔ رامپور کے اطراف کی سرزمین انتہائی خوبصورت ہے۔ یہ دیہات بومیگی کے جنوب مغرب میں ہے۔

وہ سڑک جو بومیگی سے ہو کر اس قریہ کے پاس سے گذرتی ہے اچھی بنی ہے۔ ہمارے افسروں کی کوششوں اور یہاں کے لوگوں کے عقیدے کی بدولت، کہ سڑک پر سایہ دار درخت لگانا ثواب کا کام ہے، اس سڑک پر بھی خوبصورت دو رویہ درخت لگے ہوئے ہیں۔ رامپور کے قریب یہ سڑک تالاب کے بند پر سے ہو کر گذرتی ہے۔ قریہ کے سامنے بڑے بڑے قدآور درخت ہیں۔ ایسے ہی شاندار جیسے سڑک کے دونوں طرف ہیں۔ پیپل اور بڑ کے درخت، جھنڈیں کھڑے ہوئے ان درختوں میں ایک ایسی شان ہے کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ صبح سویرے ہم ان درختوں کا منظر دیکھیں تو ہمارا دل گویا انہیں میں کھو جاتا ہے۔ پھیلے ہوئے برگد کے درخت ایک سکون اور بے نیازی سے کھڑے ہوئے، اونچے اونچے پیپل کے درخت جن کی پتیاں نرم رو نسیم کے ذرا سا چھونے سے بھی کپکپا اٹھتی ہیں، کتنے شاندار معلوم ہوتے ہیں۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی چمکیلی شعاعوں میں نہائے ہوئے! جب ہم گاؤں کے اندر داخل ہوتے ہیں تو ہمیں گھر اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سڑک پر گھروں کی دو رویہ قطاریں نہیں ہیں۔ شہر کے لئے یہ ٹھیک ہے لیکن گاؤں میں ایسا ہو تو گاؤں بہت چھوٹا نظر آئے گا۔

ہر گھر کے سامنے زمین جھاڑ جھوڑ کر صاف کی ہوتی ہے اور ہر گھر کی دہلیز کے سامنے زمین پر کسی سفید آٹے سے بیل بوٹے کھنچے ہوتے ہیں۔ اگر تم صبح سویرے اس گاؤں میں جاؤ تو عورتیں اپنے اپنے گھروں کے سامنے یہ بیل بوٹے کھینچتی دکھائی دیں گی۔ اور مرد درانتیاں اور ہل لئے اپنے اپنے کھیتوں کو جاتے ہوں گے۔ گایوں بھینسوں کے گلے اپنی چراگاہوں کی طرف جاتے دکھائی دیں گے۔ گاؤں سے گذرنے پر ہر طرف ہری ہری کھیتیاں پھیلی

ہوئی نظر آئینگی۔ کھیتوں سے پرے کوئی آدھ میل پر ندی بہتی ہے۔ ندی گاؤں کے تینوں طرف بہتی ہے۔ گاؤں کے پچھلی طرف جانے پر یہ پتہ لگتا ہے کہ ندی کس طرف مڑتی ہے۔ ندی کے موڑ پر یہ مندر والی پہاڑی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے یہ پہاڑی کہیں سے بھٹک کر ادھر آگئی ہے۔ گاؤں سے پہاڑی تک جانے کیلئے یا تو بیل گاڑی کے راستے سے جانا پڑتا ہے یا کھیتوں میں سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے۔

میں کئی دفعہ اس پہاڑی پر گیا ہوں۔ گھوڑے کو نیچے کسی درخت سے باندھ دیتا ہوں اور پہاڑی پہ چڑھ کر وہاں چند گھنٹے گذارتا ہوں۔ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وقت کیسے گذرتا جا رہا ہے۔ اس چھوٹی سی پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہوں تو آس پاس کا منظر کتنا خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ یہاں وہاں چھوٹے چھوٹے ٹیلے بکھرے پڑے ہیں۔ اور ان کے بیچ بیچ میں کھیتوں اور باغوں کے زمردیں قلعے! پہاڑی کے دامن میں اور اوپر سایہ دار جھنڈ! جگہ جگہ اونچے اونچے درخت! کھیتوں میں لوگ کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی پیشانیوں پر ایک ایسا امن اور سکون ہے جیسی دھرتی ماتا کی شانتی ہے۔

گائیں بھینسیں اس آزاد زمین پر تازہ گھاس اطمینان سے جی بھر کر چرتی ہیں۔ ندی بھی اطمینان سے آہستہ آہستہ بہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس ندی میں جان ہے جیسے وہ گاؤں کے باشندوں اور گلوں کی خیریت پوچھتی ہوئی گاؤں کے اطراف پھرتی ہے۔ درختوں کے جھنڈ میں پرند اس امن وسکون اور اس چھائی ہوئی مسرت میں شریک ہوتے ہیں۔ اور ان سب کو سورج کی روشنی اپنی آغوش میں لئے ہوئے ان کا حسن دوبالا کر رہی ہوتی ہے۔ اور جب کوئی اس پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا ہوا یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ پہاڑی بھی

اس وسیع حسن کا ایک ٹکڑا ہے اور اس سکون و شانتی کے سمندر میں ڈوبے ہوئے اس پہاڑ پہ وہ خود ایک نقطہ ہے۔ اس شانت ساگر میں بہتا ہوا، تو اسے اتنی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ میں نے کئی دفعہ سوچا ہے۔ ”یہ لوگ بہت عقلمند ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آدمی کے دل میں کونسا جذبہ ہے جو مذہبی رجحان بن جاتا ہے۔ اور اسی بنا پر انہوں نے ایسی جگہوں پر مندر بنائے ہیں۔ جہاں یہ جذبہ تسکین پاتا ہے۔ یہاں کے لوگوں میں حسن پرستی کا جذبہ بہت قوی ہے۔ پھر میں سوچتا ہوں۔ کیا اس پہاڑ پہ آکر انہیں ان حسین مناظر میں خدا نظر نہ آتا تھا کہ انہوں نے یہ ٹوٹی پھوٹی عمارت کھڑی کر کے اس میں ایک مورتی رکھدی اور اس پر نظر جما کر خدا خدا پکارنے لگے۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ خدا کو کہاں دیکھیں۔ کیا ایسی جگہ میں بھی انہیں مورتی کی حاجت ہے؟ اسی طرح اس پہاڑی پر دو ایک گھنٹے گذارنے کے بعد میں اپنے کیمپ کو بے دلی سے لوٹتا ہوں۔ ندی پہاڑی کے قریب آکر اس کے تینوں طرف بہتی ہے اور ایک طرف کو مڑ جاتی ہے۔ مجھے دیکھکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ندی اطراف پھر کر یہ دیکھتی ہے کہ اپنی محبوب پہاڑی پر چڑھنے کیلئے کوئی جگہ ہے؟ اور یہ خیال کر کہ وہ چڑھ نہیں سکتی۔ مایوسی سے مڑ جاتی ہے۔ ”کتنی ہی اچھی جگہ کیوں نہ ہو“۔ ندی گویا کہتی ہے ”یہ میری جگہ نہیں ہے۔ میری منزل مقصود کہیں اور ہی ہے“۔

اسی مندر کے راما پر یہ لوگ ایمان لاتے ہیں۔ کسی نامعلوم وجہ سے یہ مندر خاص انہیں لوگوں کا مانا جاتا ہے۔ اور سال بھر اس کا انتظام انہیں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ صرف پندرہ دن، جب جاترا ہوتا ہے یہ مندر برہمنوں کو پوجا کے لئے دیدیا جاتا ہے۔ شاید ہم اپنے خدا سے ایسی صفات منسوب

نہیں کرتے جیسی کہ یہ وڈر لوگ اپنے دیوتا سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کا خدا مجموعی طور پر ایک اچھا خدا ہے۔ لیکن اگر وہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو اس کا قہر غضب کا ہوتا ہے۔ ان لوگوں پر جو سیدھی راہ پر چلتے ہیں وہ حد سے زیادہ مہربان ہے۔ اگر کسی سے گناہ سرزد ہو جائے تو وہ سخت سے سخت سزا دے سکتا ہے۔ اگر وہ کوئی جرمانہ دیں تو وہ اس گناہ کو معاف کر دیتا ہے اگر کوئی آدمی بیمار ہو یا تکلیف میں ہو تو دیوتا سے نیاز کر لیتا ہے کہ یہ بلا ٹل جائے تو وہ دیوتا کے حضور میں فلاں چیز نذر کرے گا۔ بیماری یا تکلیف ضرور دفع ہو جاتی ہے۔ کوئی اپنے ہم مذہب کے ساتھ کتنا ہی پوشیدہ طور پر برائی کرے اگر اسے دیوتا کے سامنے کھڑا کیا جائے تو اس کی زبان سے خود بخود سچ نکل جاتا ہے۔

اس طرح اس مندر کا "راما" گویا ان کے لئے گاؤں کے فرائض انجام دیتا ہے۔ انسانی سردار کبھی اپنے فرائض سے بے پروا ہو جائے اور اپنے ارادوں کو بدلے تو بدلے لیکن یہ الوہی سردار اپنے قانون سے بال برابر بھی نہیں ہٹیگا۔

وڈر لوگ اپنے خدا پر اسی قسم کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہی اعتقاد انہیں سیدھے راستہ پر چلاتا ہے۔ اور انہیں بات بات پر عدالت کو جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کوئی وڈر آج تک ملزم بن کر کسی عدالت کے سامنے پیش نہیں ہوا تھا۔ لیکن آج دو وڈر نوجوان عدالت کے سامنے کھڑے تھے کیونکہ مدعی دوسرے مذہب کا آدمی ہے جو انہیں سچا راستہ بتلانے کیلئے بہت دور سے آیا ہے۔

مسٹر ہنری نے مندرجہ ذیل بیان دیا۔ اس حصہ میں کئی سالوں سے وہ مشنری کا کام کر رہے ہیں۔ وہ رامابوئی اور تمابوئی کو مدت سے جانتے ہیں۔ کبھی کبھی خصوصاً سالانہ جاترا کے موقعہ پر مسٹر ہنری وعظ دینے راسپور آیا کرتے تھے تو یہ دو نوجوان ہمیشہ ہجوم میں موجود رہتے تھے۔ پہلے پہلے چند موقعوں پر

یہ دونوں وعظ میں یہ کہکر خلل ڈالتے تھے کہ ان کا راما ہنری کے خدا سے بڑا خدا ہے۔ دوسرے وڈر بزرگ اور چند روشن خیال اشخاص انہیں دخل دینے سے روک دیتے تھے۔ پادری صاحب کو اپنے خدا کے متعلق کہنے دو۔ اگر تم میں سے کوئی وعظ نہ سننا چاہے تو نہ سنے۔ لیکن اگر کوئی اپنے خدا کی تعریف بیان کرے، جیساکہ وہ اپنے دیوتا کی کرتے ہیں، تو انہیں نہ روکنا چاہئے۔ اس پر وہ دونوں خاموش ہو گئے تھے۔ چند دنوں مسٹر ہنری کا وعظ سننے کے بعد انہوں نے مندر جانا چھوڑ دیا۔ اور کہنے لگے کہ 'راما' پر انہیں ایمان نہیں۔ یہ دیکھکر مسٹر ہنری بہت خوش ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ اب انہیں آسانی سے اپنے مذہب میں لے سکتے ہیں۔ لیکن یکایک پانسہ پلٹ گیا۔ ایک دن یہ دونوں مسٹر ہنری کا وعظ سننے کیلئے بومیگی آئے۔ اور کہا کہ وہ شام کو اپنے گاؤں لوٹ رہے ہیں لیکن وہ گاؤں نہیں گئے وہیں اِدھر اُدھر پھرتے رہے اور رات کو گرجا گھر میں گھس آئے اور وہاں سے چند چاندی کی چیزیں چرا لے گئے۔ ان میں چند گرجا گھر کی ملکیت تھیں اور چند مسٹر ہنری کی اپنی چیزیں تھیں۔ جو انہوں نے کلیسا میں رکھ چھوڑی تھیں۔ دوسری صبح پادری کو اس چوری کا علم ہوا تو انہوں نے پولیس کو خبر کر دی۔ پولیس نے گھروں کی تلاشی لینی شروع کی۔ رامابوئی اور تمابوئی کے گھروں میں سے بہت سی گم شدہ چیزیں برآمد ہوئیں۔ پولیس نے دونوں کو گرفتار کر کے چارج شیٹ تیار کر دی۔ مسٹر ہنری نہیں چاہتے تھے کہ ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ لیکن معاملہ پولیس کے ہاتھوں دیدیا گیا تھا۔ اب مسٹر ہنری کو اس بارے میں کوئی اختیار نہ تھا۔ علاوہ بریں رامابوئی اور تمابوئی اپنے کئے پر پشیمان نہ تھے۔ مسیح کے بارے میں وعظ سن کر ابھی تک ان کے دل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اسلئے مسٹر ہنری کو خیال ہوا کہ انہیں اس جرم پر چھوٹی سی سزا ملے تو

شاید ان کے حق میں اچھا ہو۔ صرف اسی امید پر مسٹر ہنری نے عدالت کے سامنے یہ بیان دیا تھا۔

جب مسٹر ہنری یہ بیان دے رہے تھے میں ان دو نوجوانوں کے چہروں کا غور سے مطالعہ کرتا رہا۔ وہ دونوں تراشے ہوئے بتوں کی طرح کھڑے تھے۔ یہی مثل مشرق کے تمام لوگوں پر صادق آتی ہے۔ نہ جانے یہ ان کی لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے ہے یا بہادری کی وجہ سے۔ کیونکہ مکمل لاعلمی یا دلیری ہی انہیں خطرہ کے سامنے خاموش رکھ سکتی ہے۔ انہیں دیکھ کر مجھے سقراط کا خیال آگیا جو جمے ہوئے قدموں سے موت کے دالان میں آیا تھا .... یہ بات مجھے نہیں کہنی چاہئے ..... لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے اس بزرگ تر اور مکمل تر ہستی، خدا کے بیٹے یسوع مسیح کی اس وقت کی تصویر کھنچ گئی جب وہ روم کے سردار کے سامنے ایک عجب شان سے نڈر کھڑے تھے۔ ان نوجوانوں کا سکون دیکھکر مجھے ان پر بے حد رحم آگیا۔ مجھے تعجب ہوا بھلا ان خاموش بے ضرر آدمیوں نے چوری کیوں کی ؟ ۔

مسٹر ہنری نے اپنا بیان ختم کیا تو میں نے پوچھا۔ ”کیا ان لوگوں نے کہا کہ وہ عیسائی مذہب قبول کرلیں گے ؟“

”نہیں“

”پھر تمہیں کیسے خیال ہوا کہ وہ عیسائی بن جائینگے ؟“۔

”سب سے پہلے انہیں دو نوجوانوں نے اپنے دیوتا پر اعتقاد چھوڑا تھا۔ ان کا عقیدہ سب سے گہرا تھا۔ لیکن سب سے پہلے اس کو چھوڑنے والے بھی وہی تھے۔ یہ ان کی ہر بات سے ظاہر ہوتا تھا۔ چند دوسرے آدمی بھی جنہیں اپنے مذہب پر اعتقاد نہ رہا تھا۔ برابر مندر جاتے رہے۔ لیکن ان

دونوں نے مندر جانا بھی چھوڑ دیا۔"

پھر میں نے راما اور تمّا کی طرف مڑ کر پوچھا۔ "اچھا راما بوئی اور تمّا بوئی تم اپنا وکیل نہیں رکھو گے؟"

راما بوئی نے کہا۔ "نہیں سرکار وکیل کی کیا ضرورت ہے۔ ہم نے جرم کیا ہے۔ ہمیں کسی وکیل کی ضرورت نہیں۔"

"تمہارے جرم کا اقرار ابھی سے کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے آگاہ کیا "تم اگر چاہو تو پادری صاحب کے بیان کو جھٹلا سکتے ہو۔ اور ثابت کر سکتے ہو کہ یہ ٹھیک نہیں۔"

"سرکار" راما بوئی نے کہا "پادری صاحب جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔ اور ہم بھی یہ جرم کرنے کے بعد بچ نکلنا نہیں چاہتے۔ اس سے کیا فائدہ؟ آپ جانتے ہیں حضور ایسا کرنا برا ہے۔"

"صرف تمہاری بات کرو" میں نے کہا "جرم کا اقبال کرتے ہوئے اپنے ساتھی کو بھی اس میں نہ ملاؤ۔"

تمّا بوئی نے کہا "میں بھی یہی کہتا ہوں حضور، ہم دونوں نے مل کر چوری کی۔"

میں نے کہا "ذرا ٹھہرو۔ میں تمہارا بیان لکھے لیتا ہوں۔ پھر تمہیں پڑھ کر سناؤں گا۔" میں نے چارج لکھ کر انہیں پڑھ سنایا۔ اور پوچھا وہ اقبال جرم کرتے ہیں یا نہیں۔ انہوں نے اپنا جرم تسلیم کر لیا۔ میں نے یہ اقرار بھی لکھ لیا اور پوچھا۔ "راما بوئی تم دونوں تو عیسائی بننا چاہتے تھے۔ تم نے چوری کیوں کی؟"

راما بوئی نے کہا "ہم ہمارا دھرم چھوڑنا نہیں چاہتے حضور۔"

"لوگ کہتے ہیں تم نے تمہارے دیوتا کو چھوڑ دیا تھا"

"ہاں حضور" راما بوئی نے کہا "پادری صاحب نے کہا، تمہارے خدا کو دیکھو، اگر تم دیا نہ جلاؤ تو وہ اندھیرے ہی میں بیٹھا رہتا ہے۔ اس کی کوٹھی صاف نہ کرو تو دھول میں بیٹھا رہتا ہے۔ اس میں اتنی بھی قدرت نہیں کہ اپنی کوٹھی صاف کر کے اس میں روشنی کرے۔ ہم پادری صاحب کی بات آزمانا چاہتے تھے۔ بڑے بوڑھوں نے ہمیں اس سے روکا۔ لیکن ہم نے ہٹ کر کے زبردستی مندر کا دروازہ بند کر ڈالا۔ دس دنوں تک ہم نے دروازہ بند رکھا، پھر اندر جا کر دیکھا۔ بالکل وہی حالت تھی جیسا پادری نے کہا تھا۔ مورتی پر کچھ مٹی پڑ گئی تھی۔ دیوتا نے اپنے جسم پر سے مٹی تک نہیں جھاڑی تھی۔ ہم نے مندر جانا چھوڑ دیا۔ اور ایک دن وہاں مندر سے چند برتن چرا لئے اس پر بھی کوئی، عذاب نہ اترا۔ جب ہم جان گئے کہ مندر کا خدا کوئی قوت نہیں رکھتا"۔

"اگر اُس مندر کا خدا بے بس تھا تو تم نے اس گرجا گھر میں چوری کیوں کی؟"

"اس مندر میں تو حضور کوئی خدا ہی نہیں ہے۔ جس مندر میں خدا ہے اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں تو اس مندر میں ڈر کی کیا بات ہے جس میں خدا ہی نہیں۔ یہ سوچ کر میں اور رتنا بوئی اتوار کی رات گرجا گھر میں گھس کر چند چیزیں چرا لائے"۔

"اب دیکھو خدا تمہیں سزا دے رہا ہے نا!"

"نہیں حضور۔ پادری نے ہمارے خلاف دعویٰ دائر کیا۔ خدا کیا کر سکتا تھا۔ اُس خدا میں بھی کچھ نہیں اِس خدا میں بھی کچھ نہیں پادری صاحب کلیسا کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہمارے قبیلہ کا سردار مندر کی چیزوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ آپ اس جرم کی جو سزا دیں گے بھگتنے کے بعد، اس مندر کو نقصان پہنچانے کے جرم میں ہمیں قبیلہ کو بھی جرمانہ دینا پڑے گا۔ ہماری برادری نے یہی فیصلہ کیا ہے"

میں نے مڑ کر مسٹر ہنری سے پوچھا " شاید راما پر ان کا اعتقاد کمزور کرنے کے لئے تم نے یہ دلیل پیش کی ہوگی "۔

" ہاں " ہنری نے جواب دیا۔ " میں ان پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ مورتی خدا نہیں ہے۔ چند نوجوانوں نے میری بات آزمانے کے لئے مندر کا دروازہ بند کر دیا۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ انہوں نے وہاں سے برتن بھی چرائے ہیں۔ مجھے یہ خیال تک نہ گذرا کہ وہ اس نکتہ پر اس طرح بحث کر کے ہماری کلیسا میں بھی چوری کریں گے "۔

میں نے تمابوئی اور راما بوئی سے کہا کہ " وہ ایک چھوٹا سا جرمانہ ادا کر کے جا سکتے ہیں "۔

" نہیں حضور ہم نقدی نہیں دے سکتے " وہ بولے " غریب آدمی ہیں حضور۔ ہمارے دیوتا کو بھی جرمانہ دینا ہے۔ وہ بھی مشکل سے ہو سکیگا۔ ہم یہاں پیسے نہیں دے سکتے "۔

" تو مجھے مجبوراً قید کی سزا دینی ہوگی۔ چونکہ تم لوگوں نے جاہلی سے یہ کام کیا ہے۔ اس لئے معمولی قید کی سزا دیتا ہوں "۔

" لیکن حضور " تمابوئی نے کہا۔ " ہم سے ایک جگہ بیکار نہیں بیٹھا جاتا۔ سخت قید کی سزا دیجئے کہ کچھ محنت کرنا پڑے۔ یوں ہم آسانی سے وقت گذار سکیں گے "۔

میں نے بہت سوچنے کے بعد، نہایت افسوس کے ساتھ، ہر ایک کو پندرہ روز قید بامشقت کی سزا دی۔ فیصلہ سنانے کے بعد میں نے مسٹر ہنری سے پوچھا۔ " مسٹر ہنری! تم نے ان لوگوں کو وہ جگہ کیوں بتائی جہاں گرجا میں چاندی کا سامان رکھا جاتا تھا "۔

مسٹر ہنری نے جواب دیا "میں ایکدن انہیں گرجا گھر لے گیا اور انہیں خوش کرنے کے لئے ہمارے چاندی کی برتنوں کا خوبصورت نقش و نگار بتایا۔ وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس لئے جب کبھی وہ آتے تھے میں انہیں خوش کرنے کیلئے یہ چیزیں دکھایا کرتا تھا۔ تاکہ کسی وجہ سے بھی ہو وہ گرجا گھر آئیں۔ اور خدا کا کلام سنیں۔ اب دیکھتا ہوں کہ اس کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔"

ہاں اس کا نتیجہ یقیناً بُرا نکلا تھا۔ میں نے ان وڈر جوانوں کو سزا تو دیدی۔ اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ اس جرم کی آدھی ذمہ داری مسٹر ہنری پر بھی عاید ہوتی ہے۔

مجھے یہ ماننا پڑتا ہے کہ آج میرے دل کا چین اڑ گیا ہے۔ زندگی کے حادثات کا خیال کر کے ایک آدمی نیم تاریکی میں چلتا ہوا بھٹک کر غلط راستہ پر چلتا ہے۔ دوسرا آدمی آکر اُسے اُجالا دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اپنے ارادے کے خلاف، غیر ارادی طور پر اُسے ایک گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔ ایک تیسرا آدمی آتا ہے اور اس گرے ہوئے آدمی کو چھڑی سے پیٹنا شروع کر دیتا ہے کہ وہ کیوں گرا؟ یہ سب کیسی بے وقوفی ہے!

ہاں بے شک یہ سب دیوانگی ہے لیکن ایک وہ بھی ہے جو سب کچھ جانتا ہے، جو سب سے بڑا ہے اسی کے ہاتھ میں آخری اور ابدی فیصلہ ہے۔ ہم صرف یہاں انصاف کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارا یہاں کا انصاف ہے۔

(کنڑی افسانہ)

رادھا کرشن

ایک لاکھ ستانوے ہزار آٹھ سو اٹھاسی

یہ متھلا ہے۔

دیکھئے گاؤں کے کنارے سے کوسی ندی بہتی جا رہی ہے۔ سامنے وہ بوڑھا پیپل ہے۔ پیپل کے نیچے پختہ گھاٹ۔ اگلے زمانے کے کسی زمیندار نے یہ گھاٹ بنوایا تھا۔ اس زمانہ کے زمیندار تو مقدمہ بازی کرتے ہیں، مجرا اور رنڈی رکھتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور بنگلہ بنواتے ہیں۔ وہ گھاٹ واٹ بنوانے کے پھیر میں نہیں پڑتے۔ لہٰذا گھاٹ کی اینٹیں سرک گئی ہیں۔ پلستر چھوٹ گیا ہے شکستہ سیڑھیوں پر کائی جمی رہتی ہے۔ وہ گھاٹ ہمارے کام کا نہیں ہے، وہاں تو صرف عورتیں نہاتی ہیں۔ ہم بال گوپال گھاٹ کی بغل سے ندی میں اترتے ہیں۔ وہاں گائے اور بھینسوں کو نہلاتے ہیں چھپا چھپ خوب نہاتے ہیں اور سر سر پانی میں تیرتے ہیں۔ اُس پیپل پر کہتے ہیں بھوت رہتا ہے۔ بھوت بھی کیسا برہمو پشاچ، گاؤں والے کہتے ہیں کہ رات کو وہ گھاٹ پر بیٹھا رہتا ہے اگر ادھر سے کوئی جا نکلا تو اس کی جان لے لیتا ہے۔ ہم لوگ رات میں ادھر گئے ہی نہیں اور کبھی جانے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ پتہ نہیں برہمو پشاچ کی بات کہاں تک ٹھیک ہے۔

ہماری بستی کافی بڑی ہے۔ یہاں تاڑ کے درخت ہیں پاسی اپنے پیر میں پھندا ڈال کر اس کے اوپر چڑھ جاتا ہے اور لبنی میں بھر کر تاڑی اتار لاتا ہے۔ کھجور اور رسیلے آم کے درخت بھی ہیں۔ ہمارے یہاں کے آم کو آپ لوگ دربھنگی آم کہتے ہیں۔ آم تمام متھلا میں ہوتے ہیں لیکن آپ ہمارے آملم اور مہراج کو

صرف دربھنگے ہی کا کہتے ہیں۔ دربھنگہ تو صرف ایک شہر ہے۔ وہاں کچہری اور مہراج کا قلعہ ہے۔ اوس شہر میں ڈپٹی اور وکیل لوگ رہتے ہیں اور مقدمہ ہوا کرتا ہے۔ ہمارے گاؤں سے بہت سے لوگ ستو کی پوٹلیاں باندھ کر بغل میں کاغذ کے بستے دبا کر مقدمہ لڑنے جایا کرتے ہیں۔ دربھنگہ یہاں سے دور ہے ہمارے یہاں جس طرح دن میں آفتاب کی روشنی ہوتی ہے اُسی طرح وہاں رات میں برقی روشنی جگمگایا کرتی ہے۔ وہاں آگ اور پانی سے چلنے والی ریل گاڑی بھی ہے۔ موٹروں کو لوگ ایک بدبودار تیل کے ذریعے چلاتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں میں تفصیل کے ساتھ آپ کو نہیں بتا سکوں گا کیونکہ ایک تو میں لڑکا ہوں دوسرے کبھی دربھنگہ جانے کا اتفاق بھی نہیں ہوا۔

مجھے اپنی بستی سے بھی پوری واقفیت نہیں ہے اور نہ میں آپ کو سارے واقعات بتا سکتا ہوں۔ یہ کافی بڑی بستی ہے اور میرا خیال ہے کہ یہاں سات کوڑی سے زیادہ مکانات ہونگے۔ اسی گاؤں میں بھوکن ساہو رہتے ہیں اونکے یہاں کی عورتیں رنگین ساڑیاں پہنتی ہیں آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہیں اور چاندی سونے کے زیور پہن کر چھم چھم کرتی چلتی ہیں، اُنہیں کی لڑکی کی شادی میں ہم نے پہلی بار ہاتھی دیکھا تھا۔ گاؤں میں شدن جھا، لکھن جھا اور برجو جھا وغیرہ بڑے بڑے پنڈت ہیں۔ یہ لوگ چھان کر پانی پیتے ہیں اور رہو مچھلی کے علاوہ دوسری مچھلی قطعی نہیں کھاتے۔ ٹھمن ساؤ، ٹیسا ساؤ اور شکور میاں وغیرہ اتنے بڑے بڑے مہاجن ہیں کہ اُن کے یہاں پانچ کوڑی تک کا قرض مل سکتا ہے ماسٹر اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں ان کے علم و فضل کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ وہ انگریزی بھی جانتے ہیں اور کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ جاتے ہیں۔ بچت جھا اسی گاؤں کے لیڈر ہیں جو کہتے تھے کہ ہم کو سوراج لینا ہوگا۔ وہ بڑے اچھے آدمی

تھے اور بہت سی باتیں بتایا کرتے تھے۔ ہر ہفتہ ان کے پاس ایک اخبار آیا کرتا تھا جس میں بنا سپتی اور سوراج کی خوبیاں لکھی ہوتی تھیں۔ ہر ہفتہ اوسمیں داد کی دوا اور ڈونگرے کا بال امرت کا ذکر چھپا کرتا تھا۔ کاکا سچت جھا شروع سے آخر تک پڑھتے تھے اور پوچھنے پر کچھ ہم لوگوں کو بھی بتا دیتے تھے۔ انہیں دنوں کی بات ہے کہ سچت جھا اس گاؤں ایک بہت بڑے لیڈر کو بلا لائے تھے۔ ان لیڈر کی مونچھیں منڈی ہوئی تھیں۔ بھاری جسم تھا وہ چشمہ لگائے ہوئے تھے۔ اور ان کو گیندے کا ہار پہنایا گیا تھا۔ اوس روز آم کے باغ میں دری بچھائی گئی تھی اور بڑا اجیش ہوا تھا۔ ہم لوگ سبھی لڑکے اس واقعہ سے بہت خوش تھے۔ اور خوب زور زور سے جے جے چلاتے پھر رہے تھے۔ اُس لیڈر نے بڑی زبردست تقریر کی تھی وہ جنگ کی مخالفت کر رہے تھے اور ہر ایک کو چرخہ چلانے کی نصیحت کر رہے تھے مگر سوائے کاکا سچت جھا کے گاؤں میں کوئی چرخہ چلانے والا نظر نہ آیا۔ سب لوگ کہتے تھے کہ اس میں مزدوری کم ملتی ہے اگر کوئی دوسرا کام کرتے ہیں تو دو پیسے زیادہ مل جاتے ہیں۔ یہ تو بہت دنوں کی باتیں ہیں اب تو ہمارے سچت کاکا بھی جیل میں بند ہیں۔ بیٹے کے غم میں گھل گھل کر انکی ماں نے جان دیدی۔ مرنے کے بعد اُن کے گھر میں کفن کیلئے کوڑی بھی نہیں تھی۔ کیلے کے پتوں میں لپیٹ کر ان کی لاش اٹھائی گئی۔ سچت جھا کی بیوی آج کل پسائی کرتی ہیں اور پیوند لگائی ساڑی پہنتی ہیں۔ انہوں نے بتاشے بیچنے کا کام بھی شروع کیا تھا۔ مگر اب شکر کی نایابی سے وہ بھی بند کر دینا پڑا۔ پسائی کے علاوہ وہ گڑیاں بھی بناتی ہیں اور گاؤں کی لڑکیوں کے ہاتھ دھیلے پیسے میں بیچ ڈالتی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ نینا کاکی بڑی مصیبت میں ہیں۔ لیکن کوئی انکی مدد نہیں کرتا۔ تیمن ساؤ اور ٹیسا ساؤ کے پاس بہت پیسے ہیں مگر وہ

کبھی اونکو قرض نہیں دیتے۔ اگر سچت کاکا کسی ترکیب سے سوراج لے لیں تو اس سے انہیں امیروں کا زیادہ فائدہ ہوگا اور یہ لوگ۔ ہیں کہ بیچاری نیناکاکی کے ذرا بھی کام نہیں آتے۔ ہم لوگ تو چھوٹے لوگ ہیں۔ ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ ہماری نیناکاکی ایک وقت کھاتی ہیں دوسرے وقت فاقہ کرتی ہیں۔ پوچھتے ہیں تو کہتی ہیں بٹیا رات کے وقت مجھے بھوک نہیں لگتی۔ کیا جانے انھیں بھوک کیسے نہیں لگتی مجھے تو رات کو بھی ایسی بھوک لگتی ہے کہ کیا پاؤں اور کھا جاؤں۔

انہیں نیناکاکی کے مکان کے بغل میں میرا مکان ہے۔ ہم لوگ ذات کے سنار ہیں، بابوجی کا گہنا بنانے میں بڑا نام ہے۔ کنگنا، بچھیا، ہنسلی، ہار وغیرہ وہ نہایت عمدہ بناتے ہیں۔ مگر اب گاؤں میں گھنے زیور کا شوق نہیں رہا تو کیا کیا جائے تھوڑی بہت کھیتی ہے اوسی سے گذر بسر ہوتی ہے۔ گائے کا دودھ ہے بھینس کا مٹھا ہے گڑ کی مٹھائی ہے گاؤں میں ہم لوگ کھاتے پیتے اچھے ہیں۔ چھمی میری چھوٹی بہن ہے۔ کبھی کبھی وہ ضد کرتی ہے کہ ہم گھی کی مٹھائی کھائیں گے۔ لیکن میرا تو دعویٰ ہے کہ گھی کی مٹھائی سوائے دربھنگہ کے کہیں اور بن ہی نہیں سکتی۔ چھمی ابھی بچہ ہے اُسے اتنی عقل کہاں؟

سچت کاکا جیل کیا گئے کہ گاؤں کی دنیا ہی بدل گئی۔ ہم حیران تھے کہ یہ کیا ہوگیا۔ گڑ کی بھیلی جو ہم لوگ ایک پیسے میں دو لیا کرتے تھے وہ اب تین پیسے کی ایک ہوگئی۔ بھوگن ساہو نے اپنی دکان بند کر دی تھی۔ اب نہ وہ ہلدی دیتے تھے نہ دھنیا بیچتے تھے اور نہ کسی کو مٹی کا تیل ہی دیتے تھے۔ صاف کہہ دیتے تھے کہ ہے ہی نہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ساری چیزیں اُنکے یہاں

موجود تھیں۔ خود میرے بابوجی رات کے وقت ان کے یہاں جاتے اور منت سماجت کرکے مٹی کا تیل لے آتے تھے۔ کہتے تھے کہ بارہ ۱۲ آنہ بوتل لگتا ہے۔ لگتا ہوگا۔ اماں کیلئے ایک ہی ساڑی بارہ روپیوں میں آئی تھی۔ اس کے لئے بابوجی کو سوا من چاول بیچنے پڑے تھے۔ پھر میرے لئے کرتا دھوتی چاہئے، چھمی مچلتی تھی کہ میں لال ساڑی لونگی۔ ایک لالٹین خریدنے کی بھی سخت ضرورت تھی۔ اس کے لئے ہمارا تمام گیہوں بک گیا چاول کا ایک دانہ بھی نہیں بچا، چارہ کے بغیر گائے بھوکی رہنے لگی۔ صرف کپڑا لتّا اور لالٹین خریدنے میں ہم لوگوں کی جمع شدہ پونجی صاف ہوگئی۔ پتاجی پریشان رہنے لگے کہ اب کیا ہوگا۔

بابوجی فکر سے دبلے ہونے لگے بلکہ سوکھتے گئے یہاں تک کہ ایک روز دوپہر کے وقت وہ بری طرح کانپنے اور تھرتھرانے لگے اور انہیں بہت تیز بخار آگیا۔ انہیں ایسا سخت بخار آیا تھا کہ وہ ساری رات منہ کھولے پڑے رہے۔ بار بار پانی مانگتے تھے اور نہ جانے کیا کیا بکتے تھے۔ سب کے ہوش حواس غائب ہوگئے تھے، رات بھر بابوجی بخار میں پڑے رہے اور بکتے رہے۔ جب ذرا چپ ہوتے تھے تو اس وقت منہ کھولے رہتے تھے۔ رات بھر کے بعد دوسرے دن جیسے ہی سورج نکلا بابوجی کو پسینہ آنے لگا۔ سارا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا، بخار اتر گیا صرف کمزوری رہ گئی۔

سب کا خیال تھا کہ اب بخار سے پیچھا چھوٹا مگر دوسرے دن شام کو پھر بابوجی کے ساتھ وہی تماشہ ہوا اُسی طرح پھر جسم کانپنے لگا۔ بری طرح لرزہ ڑھا۔ رضائی دیگئی، کمبل دیا گیا میرا، چھمی کا، اماں، سب کا اوڑھنا بچھونا اوپر دیا گیا مگر کپکپی ایسی تھی کہ جان نہیں چھوڑتی تھی اس کے بعد پھر خوفناک ار چڑھا اور بابوجی نے آنکھیں بند کرکے منہ پھاڑ دیا۔ میں تو سمجھا کہ بابوجی

مر ہی گئے سچت کاکا کی ماں مری تھی تو اسی طرح آنکھیں بند اور منہ کھلا ہوا تھا۔ اس خیال سے مجھے بڑا ڈر معلوم ہوا۔ اماں سے میں نے اپنا شک بیان کیا تو وہ مجھے ایک تھپڑ مار بیٹھیں۔ میں روتے روتے سو گیا پھر صبح اٹھ کر دیکھا کہ بابوجی کو پسینہ آرہا ہے اور بخار اتر رہا ہے۔ مہینوں یہی قصہ چلتا رہا۔

اماں کے زیور بک گئے، برتن رہن رکھدئے گئے، کچھ دنوں کے بعد ایک ڈاڑھی والا آدمی آیا اور ہماری تمام گائیوں کو کھونٹے سے کھول لے گیا۔ ہم رونے لگے ڈھیلا اٹھا کر اس آدمی کو مارنے کیلئے دوڑے۔ بابوجی نے ہمیں ڈانٹ دیا اور کہا کہ انہوں نے ہماری گائیں خریدی ہیں۔

میں نے روتے ہوئے کہا یہ تو قصائی ہے ہماری گائیوں کو ذبح کر ڈالے گا۔ تب بابوجی نے مجھے اتنی زور سے ڈانٹا کہ میں سہم گیا۔ شاید یہ سچی بات کہدینا ہی میری غلطی تھی۔ لیکن اس میں میرا قصور کیا تھا؟ میں اپنے گوشالے کے کونے میں بیٹھکر سسک سسک کر رونے لگا۔

اماں کھانا کھلانے کو بلانے آئیں تو میں نے صاف انکار کر دیا اور کہدیا کہ جبتک میری گائیں نہیں آئیں گی میں ہرگز کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مگر میری ضد پوری نہیں ہوئی۔ بابوجی کا وہی حال تھا۔ روز بخار آتا اور روز سویرے اتر جاتا تھا۔ اب وہ بالکل دبلے پتلے ڈھانچ سے ہو گئے۔ سارا جسم سیاہ ہو گیا اور آنکھیں ڈراؤنی سی ہو گئیں۔

بابوجی کی بیماری کے بارے میں ایک اور نئی بات سننے میں آئی۔ انہیں ایک دوا ملتی ہی نہیں تھی، اس دوا کا نام ہے کونین۔ پتہ نہیں کیسی عجیب دوا ہے۔ بابوجی نے تمام سراغ لگایا ہر جگہ چھان مارا مگر انہیں وہ دستیاب نہیں ہو سکی۔ پہلے میں نے سنا تھا کہ کسی کو سانپ کا من نہیں مل سکتا، دوسرے میں سنا کہ

سونے کا پہاڑ کوئی ہزار تلاش کرے مگر نہیں پا سکتا۔ تیسرے میں نے یہاں سنا کہ لاکھ کوششوں کے بعد بھی کونین نام کی چیز نہیں مل سکتی۔

مگر مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ ایک روز میں نے نیناکاکی سے کہا۔ ایسا تو ممکن ہی نہیں کہ دنیا میں کہیں کونین مل ہی نہ سکے۔ کہیں نہ کہیں تو بہت سی کونین ضرور ہی ہوگی۔ کاکی مسکرانے لگیں۔

میں نے کہا دربھنگہ میں جو بڑا سا سرکاری اسپتال ہے جہاں سے لوگ پڑھ پڑھ کر ڈاکٹر بنتے ہیں کیا وہاں بھی کونین نہ ہوگی؟

نیناکاکی نے کہا کیا معلوم بیٹا شاید نہ ہوگی۔

میں نے کہا۔ ہمارے مہاراج بہادر کے یہاں تو ضرور ہی ہوگی چاچی۔ اور اگر ان کے یہاں بھی نہ ہو تو جو ان سے بھی بڑا راجہ ہوگا اس کے یہاں تو ضرور ہی ہونی چاہئے۔

چاچی نے کہا لڑائی ہے بیٹا اسی وجہ سے کونین نہیں ملتی۔

بات میری سمجھ میں نہیں آئی میں نے کہا۔ جب لڑائی ہی کرنی تھی تو تھوڑی کونین بھی اپنے پاس رکھ لینی چاہئے تھی۔ ایسی بھی کیا لڑائی کہ پاس میں مارنے کی تمام چیزیں ہیں اور جلانے کی کوئی چیز نہیں۔ اگر اس گاؤں میں ہر ایک کو ایسا ہی بخار لگ جائے تو سرکار کا ہی تو نقصان ہوگا۔ ہم لوگ بھی تو سرکار کے ہی آدمی ہیں نہ چاچی؟ پچھلے مہینہ رام رتن فوج میں بھرتی ہو کر چلا گیا۔ ہم بڑے ہو جائینگے تو ہم بھی لڑائی پر چلے جائینگے۔ لیکن ہمیں بھی اس بخار نے آ دبایا تو بھلا ہم سے کیا لڑا جائیگا۔

چاچی نے کہا جو سب سے مضبوط ہے وہی سرکار ہے، سرکار جس کے ساتھ جو چاہے کرسکتی ہے۔ اگر سرکار کونین نہیں رکھتی تو تم اس کو کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔

میں نے کہا کیوں نہیں کہہ سکتے۔ بے شک کہہ سکتے ہیں۔

چاچی نے جھنجھلا کر کہا۔ تمھیں بھی جیل کی ہوا کھانی پڑیگی۔ یاد رکھو۔ میرا دل کانپ گیا۔ جیل، سنتے ہیں کہ وہاں سے آدمی نکل نہیں سکتا اور یہ بھی سنا ہے کہ ایک ضلع ہے بھاگلپور وہاں کی جیل میں سرکار نے گولی چلا دی۔ خدا جانے جیل میں ہمارے سچت کاکا کیسے ہیں۔ جیل کا نام سنتے ہی میرا منہ سوکھ گیا۔

پھر بھی یقین نہیں ہوتا تھا۔ میں نے کہا۔ صرف ذرا سی بات کہنے پر سرکار جیل کی سزا نہیں دے گی۔

چاچی نے کہا۔ تمہارے کاکا نے کیا کہا تھا۔ صرف گاندھی جی کی جے کہا اور ان کو جیل میں ڈالدیا گیا۔ اس کے سوا انہوں نے کہا ہی کیا تھا۔

بات صحیح تھی میرا دل دھڑکنے لگا۔ کہیں میری بات بھی سرکار کو معلوم نہ ہو جائے۔

چاچی نے کہا بیٹا ایسی باتیں نہیں کرتے۔

ٹھیک ہے مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا اب کبھی نہیں کہوں گا۔

گاؤں میں صرف ہمارے بابو جی ہی نہیں بیمار تھے۔ رام دھن کا بھی یہی حال تھا، شیو وٹہل مہینوں سے اسی بخار میں مبتلا تھا۔ جانکی تو اس مرض کا شکار ہی ہو گیا۔

اسی طرح دن کٹ رہے تھے۔ گھر کا کیا حال بتاؤں۔ بابو جی نے غلّہ اس اُمید پر بیچ ڈالا تھا کہ سستی ہو گی تو پھر خرید لینگے مگر سستی کیا ہوئی کہ سوا سیر کا چاول بکنے لگا۔ اگہن کا مہینہ آیا دریافت کرنے پر اماں نے بتایا کہ اس فصل کا دھان

بھوکن سا ہو لے جائیں گے ۔

کیوں؟ میں نے پوچھا ۔

کیونکہ تمہارے بابوجی نے علاج کیلئے اونسے روپئے لئے ہیں ۔

میں نے غصہ سے کہا ۔ تو وہ اپنے روپئے لیگا کہ ہمارا دھان بھی لیگا ۔

اماں نے کہا ۔ وہ اپنے روپئے بھی لینگے اور ہمارا دھان بھی۔ کھیت میں نے اُن کے ہاتھ زرپیشگی میں دیا ہے ۔

تب ہم لوگ کھائیں گے کیا؟ میں نے پوچھا ۔

اماں رونے لگیں ۔ بیٹا جب تمہارے بابوجی اچھے ہو جائینگے تو سب ٹھیک ہو جائیگا ۔ ابھی دکھ کے دن ہیں صبر کرو ۔

شام کو میں نیناکاکی کے پاس گیا اور اُنسے پوچھنے لگا ۔ چاچی صبر کرنے کا کیا پھل ہوتا ہے؟

چاچی بولیں ۔ بیٹا صبر کا پھل بڑا میٹھا ہوتا ہے ۔

تب میں نے طے کر لیا ۔ مجھے صبر ہی کرنا چاہیئے ۔ اپنے لئے نہیں تو بابوجی کیلئے تو ضرور ہی مجھے صبر کرنا چاہیئے ۔

ادھر گھر میں مجھے روکھا بھات ملنے لگا ۔ دوسرے وقت وہ بھی ندارد ۔ میں اماں کی گود میں دبک کر سو جاتا تھا ۔ مجھے معلوم تھا کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے ۔ میری چھوٹی بہن چھمی ناسمجھ تھی وہی بھوک بھوک رٹتی تھی، خود بھی پریشان ہوتی تھی اور اماں کو بھی پریشان کرتی تھی ۔ چھمی نہیں جانتی تھی کہ صبر کا کیا پھل ملتا ہے ۔ کھانے کے لئے ماڑ میں تھوڑی ہلدی ملا دی جائے تو بالکل دال کے یسا مزہ ہو جاتا تھا ۔ ترکاری کی جگہ تھوڑی سی چٹنی ہی ملجائے تو وہی نعمت ہے ۔

اس طرح کے دن بھی آنے لگے اور جانے لگے ۔ اب لیجئے اماں کا بھی

وہی حال ہوگیا۔ صبح کے وقت اُن کے جسم میں بھی کپکپی ہونے لگی۔ دن بھر بخار رہتا اور رات کو اتر جاتا تھا۔ رات کے وقت بابوجی بخار میں پڑے رہتے تھے۔ دن میں بابوجی کھانا پکاتے اور رات میں اماں بابوجی کے پیر دباتی تھیں۔

صرف کونین کے بغیر؟ سنتے ہیں کہ کونین جاپانیوں کے ہاتھ میں ہے صرف کونین کیلئے ہی، میں پوچھتا ہوں کہ جاپانیوں کو نیست و نابود کیوں نہیں کردیا جاتا۔ سب سے پہلے کونین ملنی چاہیئے۔ پہلے کونین کی لڑائی ہونی چاہیئے پھر باقی لڑائیاں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ رات کے وقت میں سوچا کرتا تھا کہ میں جاپانیوں سے لڑنے جارہا ہوں، میرے پیچھے بہت بڑی فوج ہے۔ سب جاپانی مارے جارہے ہیں۔ اب دنیا میں ایک جاپانی بھی باقی نہیں ہے۔ اب کونین پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ میں پکارتا ہوں آؤ کونین لیجاؤ۔ سب لوگ دوڑتے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں کیا میں کبھی ان کا شمار بھی کرسکتا ہوں۔ اماں میری بلائیں لیتی ہیں بابوجی مجھے دعائیں دے رہے ہیں۔ مگر بھوکن ساہو کو میں کونین ہرگز نہیں دونگا۔ وہ ہمارا سارا دھان اٹھالے گیا۔

گرمی کا موسم کسی مشکل سے ختم ہوگیا۔ اب برسات آئی ہے۔ موسلادھار بارش ہورہی ہے۔ رات کا وقت ہے۔ بابوجی بخار میں پڑے ہیں اماں کی طبیعت بھی اچھی نہیں ہے۔ سارے گھر میں اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اب تو نہ مٹی کا تیل ہے اور نہ اس کے خریدنے کے لئے پیسے ہیں۔

آج کل تو میں ہی گھر میں کمانے والا ہوں۔ دن کے وقت کوسی میں لڑکوں کے ساتھ مچھلیاں مارتا ہوں شام ہوتے ہی کسی باغ میں گھس کر کچھ پھل اور ترکاریوں

بیل گاڑی کھڑی تھی اُس پر چاول کے بورے لدے ہوئے تھے۔ ہم سب نے مل کر ایک پورا بورا غائب کر دیا گاڑی والوں کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ اس میں مجھے تیرہ سیر کا فائدہ ہوا تھا۔ چھمی بھی اب سمجھدار ہو گئی ہے۔ اس نے بھی صبر کرنا سیکھ لیا ہے۔ اب وہ سرخ ساڑی پہننے کے لئے غل نہیں مچاتی۔ پھٹا پرانا چھیتڑا پہنے پھرتی ہے۔ جلانے کے لئے لکڑیاں چُن لاتی ہے۔ اماں کو دن بھر بخار رہتا ہے بابوجی چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے سے معذور ہو گئے۔ چھمی خود ہی روٹی پکاتی ہے۔ اوسے پکانا تو آتا نہیں ترکاری میں وہ نمک ہی نہیں ڈالتی پوچھتا ہوں تو کہہ دیتی ہے کہ گھر میں ہے ہی نہیں تو میں کیا کروں۔ اب اس بے وقوف کو کون سمجھائے۔ بھولن ساہو کے یہاں نمک کے بیسیوں بورے پڑے ہوئے ہیں ذرا نظر بچا کر ایک آدھ مٹھی غائب کر دینا کونسی بڑی بات ہے۔ کون دیکھتا ہے۔ اتنے میں ہی تو کام چل جائے۔ بغیر نمک کے کھانا بڑا بدمزہ معلوم ہوتا ہے۔

رات کے وقت گھر اندھیرا پڑا ہے بابوجی بخار میں بیہوش ہیں چھمی سو رہی ہے۔ اماں اور میں جاگ رہے ہیں۔ آج میری طبیعت بہت سست ہے۔ آج زمیندار کے نوکروں نے مجھے مارا ہے۔ ہم لوگ ارہر اور سرسوں چرا رہے تھے کہ کم بخت بسیسر نہ جانے کدھر سے آ گیا۔ اور لڑکے تو ہوا ہو گئے صرف میں ہی پکڑا گیا۔ اس نے چھڑی سے، گھونسے سے، پتھر سے، میری خوب مرمت کی، تین بار تھوک کر چٹوایا تب جان چھوڑی۔ اس وقت تو اس نے چھوڑ دیا لیکن اب بھی معلوم ہوتا ہے کہ جان ضرور چلی جائیگی۔ سارے جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ ڈر کے مارے کراہتا بھی نہیں ہوں کہ اماں سنیں گی تو پوچھیں گی۔ اماں سے کہنے کی بات بھی نہیں ہے اور نہ میں نے اماں سے کچھ کہا۔ اگر بابوجی سے کہہ دوں تو بسیسر کے ہوش ٹھکانے کر دیں۔ اب وہ اچھے ہو جائیں، بیماری کی حالت میں

سنیں گے تو رونے لگیں گے

ہر طرف سناٹا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں میں کوئی زندہ ہی نہیں ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ جھما جھم کے سوا دوسری آواز سنائی نہیں دیتی۔ اسی وقت ایک بھیانک آواز سنائی دی "چھمی کی اماں"! اماں چونک پڑیں اور میں ڈر گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی عورت چلا رہی ہے اور نوحے کر رہی ہے۔ میں نے آہستہ کہا 'چڑیل'۔

اماں نے مجھے اپنے سینہ سے لگا لیا۔ "چھمی کی آماں!" پھر آواز آئی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے نیتا کاکی کی آواز ہے۔

اماں باہر گئیں اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر کہنے لگیں۔ انہیں ہیضہ ہو گیا ہے قے اور دست ہو رہے ہیں تو چپ چاپ سو جا میں ان کی خدمت کے لئے جا رہی ہوں صبح ہوتے ہوتے نیتا کاکی کا انتقال ہو گیا۔ اور میری اماں کو قے آنے لگی بے ہوشی میں دست ہو جاتے تھے۔ جب میں نے دیکھا ان کو تشنج ہو رہا تھا۔ بار بار تیز ہچکی آتی تھی۔ سارا جسم کانپ جاتا تھا۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں نے سمجھایا۔ ٹھہرو اماں گھبراؤ نہیں، میں لوگوں کو بلائے لاتا ہوں اور میں دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ جگیسر کے ہاں گیا اس نے کہا مجھے کھیت میں جانا ہے۔ سیتا رام کے تین بچے اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ رام دھن کی ماں اسی بیماری کی نذر ہو گئی معلوم ہوا کہ تمام گاؤں میں ہیضہ پھیلا ہوا ہے، گھر گھر لوگ بیمار ہیں اور مر رہے ہیں۔ سامنے سارا گاؤں تھا۔ لیکن ہمارے لئے کوئی نہیں۔ سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ کوئی آنے کو تیار نہیں ہوا۔

آخر کار میرا دوست رام ناتھ کام آیا۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑا تھا، سات مہینہ دربھنگہ میں بھی رہ آیا تھا۔ وہ بڑا دلیر اور باہمت آدمی تھا۔ اس نے دو چار دوستوں کو اور جمع کیا۔ اور جب ہم لوگ گھر پہنچے۔ تو دیکھا کہ اماں کی دونوں آنکھیں

کھلی ہیں ٹکٹکی بندھی ہوئی ہے، سارا جسم اکڑ گیا ہے۔ مارے تعفن کے ناک پھٹی دی جا رہی تھی۔ وہ برآمدے میں پڑی تھیں اور ان کے سارے جسم پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔

رام ناتھ نے کہا "یہ تو مر گئی۔"

میں چونک پڑا۔

جیجی نے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر ہوئی پانی مانگ رہی تھیں۔ مری نہیں ہیں۔ نیناکاکی بھی تو اسی طرح پڑی ہوئی ہیں۔

رام ناتھ نے کہا۔ ارے نہیں یقینی یہ مر گئیں اب انہیں لے چلنا ہوگا۔

رام ناتھ نے ایک ہی چارپائی پر نیناکاکی اور اماں کو لٹایا۔ ہم چار پانچ لوگ لے چلے۔ بابوجی میں تو اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ وہ بستر پر سے اٹھ بھی سکتے

راستہ میں رام ناتھ نے بڑی بڑی عجیب باتیں بتائیں۔ مرنے پر جسم بھاری ہو جاتا ہے۔ جب تک انسان زندہ رہتا ہے وزن کا پتہ نہیں چلتا وغیرہ

اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے ہم لوگ مردہ گھاٹ پہنچے۔ رام ناتھ کے ساتھ مل کر ہم لوگ بہت بے فکر تھے۔ وہ ہم لوگوں کا سردار تھا۔

گھاٹ پر پہنچکر ہم نے دیکھا۔ کچھ چتائیں جل رہی ہیں، کچھ بجھ چکی ہیں وہاں ہمیں تیسا ساؤ بھی نظر آئے۔ ان کی لڑکی مر گئی تھی مدن جھا، لکھمی جھا اور برجو جھا وغیرہ جیسے بڑے بڑے پنڈت ان کے ساتھ تھے۔ تین لاشیں اور بھی تھیں، آسمان پر چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ چراندھ پھیلی ہوئی تھی، ہم لوگ بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ ٹھیک اسی وقت رگھو چمار ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ وبا کے زمانے میں لاشیں بہا دی جاتی ہیں۔ ایسے وقت میں لکڑی کہاں ڈھونڈتے پھروگے۔ اپنی عورت کو میں خود لیتا آیا

اور بہا کر واپس جا رہا ہوں۔ تم لوگوں کو لکڑیوں کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے تم لوگ بھی ایسا ہی کرو۔

یہ رائے دیکر وہ فوراً چلا گیا۔ اس کو جلد سے جلد گھر پہنچنا اور اپنی خالہ اور بچوں کو دیکھنا تھا۔ رام ناتھ نے کہا۔ تم کو بھی یہی کرنا چاہیئے۔ سب کو یہ رائے پسند آگئی۔

پہلے نیناکاکی کی لاش بہائی گئی۔ میں نے ان کی ڈوبتی ہوئی لاش کو دیکھکر کہا۔ جاؤ چاچی دنیا میں تم نے بہت سختیاں جھیلیں۔ لیکن اب خدا کے گھر میں تمہیں آرام ملیگا۔

اماں کی لاش بہاتے وقت میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، بڑی مشکل سے برداشت کرکے میں نے ان کو تسکین دی۔ تم اطمینان سے جاؤ میری کوئی فکر نہ کرنا، آج سے باپوجی کی دیکھ بھال میں ہی کروں گا۔ چھمی کا میں ذمہ دار ہوں۔ اس کو آرام سے رکھوں گا۔ جب وہ بڑی ہوجائیگی تو اس کی شادی کردوں گا۔ تم ہم لوگوں کے لئے ذرا بھی پریشان نہ ہونا۔ اتنا کہکر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور دیر تک روتا رہا۔

گھر لوٹنے میں مجھے دیر ہوگئی تھی۔ راستے میں میرے دوست رام ناتھ کے ساتھ الگ ہوگئے تھے۔ میں اکیلا گھر آیا۔ مجھے دیکھتے ہی باپوجی نے زور سے چلا کر کہا۔ تو کہاں رہ گیا تھا۔ دیکھتا نہیں کہ مجھے تنفے اور وحشت ہو رہے ہیں۔ لا پانی دے۔ تھوڑی سی چاول کی پیچ دیدے۔ شری رام دید کو بلا لا۔

میں پریشان ہوکر پھر رام ناتھ کے یہاں آیا۔

رات کے وقت میں، رام ناتھ اور چھمی باپوجی کی لاش لے جا رہے تھے گھر میں مردہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ رام ناتھ کا قول تھا کہ اس سے بیماری اور

بدبو پھیلتی ہے۔ باپوجی کی لاش اماں کی طرح وزنی نہیں تھی، پھر بھی جھمی کہتی تھی کہ بڑی بھاری ہے، مجھ سے چلا نہیں جاتا۔

مسان میں پہونچتے ہی جھمی کو قے ہونے لگی۔ اور وہ کانپنے لگی۔ اس نے بتایا کہ گھر پر مجھے تین چار دست ہو گئے تھے۔ مگر میں نے ڈر کے مارے کسی کو بتایا نہیں

رام ناتھ نے کہا "کس کا ڈر ری پگلی؟"

"مرنے کا" جھمی نے کہا۔ "کاکی باپوجی اور اماں کو مرتے دیکھکر مجھے بڑا ڈر لگتا تھا۔ پانی دو۔"

رام ناتھ اس کے لئے پانی لینے آیا اور مجھ سے بولا "سنتا ہے رے۔ اس جھمی کو بھی ہیضہ ہو گیا۔"

"تب"؟ میں نے پوچھا۔

چلو کسی درخت کے نیچے بیٹھ جائیں۔ اگر کسی طرح اسے گھر لے بھی جائیں تو مرنے پر پھر لانا پڑیگا۔ اس سے بہتر ہے کہ اس برگد کے نیچے بیٹھ جائیں۔ ابھی بارش بھی نہیں ہو رہی۔ آسمان پر چاند نکل آیا ہے۔ تو جا کر ایک لوٹا لے آ۔"

رام ناتھ کی بات ٹھیک تھی۔ گھر بھی مسان سے کم نہیں تھا۔ جو آرام گھر میں تھا وہی اس برگد کے نیچے نظر آ رہا تھا۔ باپوجی کی لاش رکھکر ہم لوگ جھمی کی طرف متوجہ ہوئے اس کو لیکر اس برگد کے نیچے چلے گئے۔ پھر میں لوٹے کی فکر میں دوڑ گیا۔

جب میں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ جھمی کے دست تو کم ہو گئے ہیں، مگر پیاس بہت زیادہ ہے، پانی پیتی ہے اور قے کر دیتی ہے۔ کہتی تھی کہ سارے جسم میں آگ لگی ہوئی ہے، وہ بہت زور زور سے چلا اٹھتی تھی اور دانت پیستی تھی، ظالم لوگوں کو ہزاروں گالیاں دیتی تھی۔ اور ہم لوگ جو کچھ کہتے تھے وہ سنتی

ہی نہیں تھی

آخر کار، وہ سست ہوتی گئی۔ صرف کراہتی تھی اور کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیتی تھی۔

میں نے رام ناتھ سے پوچھا۔ "یہ خاموش کیوں ہے۔ بولتی کیوں نہیں؟"

رام ناتھ نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور کہا "رام رام کہہ" اور وہ خود اونچی آواز میں رام رام کہنے لگا۔

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "رام ناتھ سچ بتاؤ یہ کیا ہوا؟"

رام ناتھ نے کہا "یہ مر رہی ہے۔"

"چھمی بھی مر رہی ہے؟"

ماں مر گئی، باپ مر گیا، نیتا کاکی مر گئی۔ اب چھمی بھی مر رہی ہے، اب میں کیسے رہوں گا؟" میں رونے لگا۔ روتے روتے پکارا "چھمی؟" کوئی جواب نہیں

"چھمی؟"

پھر بھی کوئی جواب نہیں۔ ہائے اب میں کیسے رہوں گا؟ اب میں کس کے ساتھ رہوں گا؟ کس کے لئے مچھلی ماروں گا۔ اور کس کے لئے امرود چرا کر لاؤں گا۔ چھمی، بولتی کیوں نہیں؟ میں نے بلکتے ہوئے کہا۔ دنیا میں جس کی حکومت ہے، وہ ہماری سنتا نہیں۔ لیکن آسمان پر تو خدا کی حکومت ہے، وہ سب کی سنتا ہے۔ اس سے تو ہمارے بارے میں کہنا۔ چھمی تو اس سے ہماری مصیبتوں کا حال ضرور کہنا۔

کیا چھمی نے اس دنیا کے مالک سے ہمارا حال کہا ہوگا؟ اگر کچھ کہا ہوگا تو اس نے ابھی تک .... جانے دو۔ اب میں اپنی کہانی ختم کرتا ہوں۔

(ہندی افسانہ)

پرل بک:۔ مترجمہ اُزیر احمد

موت کا استقبال

کل صبح اسے باڑ ماردی جائیگی اور زندگی کا چراغ بجھ جائیگا —— بس یہی ایک خیال اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ گذشتہ مہینوں کی دہشت انگیزیوں اور ہنگامہ پروری کے تمام خیالات یکسر محو ہوگئے تھے۔ بہت دن پہلے جب وہ مشن سکول کے صنعتی جماعت میں پڑھتی تھی تو اس نے ایک کورے کپڑے کو پھاڑ کر اس کے نئے پن کی آب و تاب کو غارت کر دیا تھا۔ بالکل اسی طرح کل صبح اس کی زندگی کا چراغ گل ہو جائیگا۔ اور اس کے ذہن سے وہ تمام یادیں جو اس وقت تک اس کے احساسات پر چھائی ہوئی ہیں۔ آن واحد میں مٹ جائینگی۔ اسے سینکڑوں اور انقلابیوں کے ساتھ باڑ ماردی جائیگی۔ اور پھر ایک بے جان ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا۔ اس کے مردہ جسم پر کوئی خاص نشانی بھی تو نہیں جو وہ پہچانی جا سکے اس کے علاوہ کوئی اس کی نعش لینے بھی تو نہ آئیگا کیونکہ کسی کو یہ معلوم ہی کہاں ہے کہ کل صبح اسے گولی سے اڑا دیا جائیگا۔ دس ماہ کے طویل عرصہ میں جب سے انقلابیوں نے شہر پر حملہ کیا تھا، سوائے ایک لمحہ کے جب اس نے ان کی بیچارگی اور پریشانیوں کو نہایت بیقراری سے یاد کیا تھا۔ اسے والدین کی یاد کبھی نہ آئی وہ لوگ سست طبع اور سادہ مزاج تھے۔ گاؤں میں ان کا گھرانہ کھاتا پیتا تھا اور شرافت کے ساتھ نبھ رہی تھی

—— لیکن اس وقت تو ان کا خیال بالکل ہی بے موقع ہے۔ اس وقت بس ایک خیال ستا رہا تھا۔ کل صبح چھ بجے اسے گولی سے اڑا دیا جائیگا۔

اس تمام عرصہ میں جو وہ سوچ سکی وہ بس اتنا ہی تھا کہ ہر شئے کو تباہ و برباد ہونا ہے۔ ہر شئے کو بدلنا ہے اور ان کی بنیادوں پر نئے اور عالی شان محل تیار ہونا ہیں۔ دس ماہ پیشتر وہ کتنی نا سمجھ تھی۔ وہ وقت جب وہ اپنے ہاسٹل میں سلائی سیکھا کرتی تھی اور اس کی امریکی استانیاں الفاظ کو چبا کر بولتیں اور جماعت میں ادھر ادھر ٹہلا کرتی تھیں۔ کس قدر جلد گزر گیا۔ صرف ایک دن —— اور پھر ہر چیز بدل گئی۔ اسکول کا تختہ الٹ گیا۔ انقلابی مارچ کرتے ہوئے سڑکوں اور بازاروں میں درانہ گھس آئے۔ وہ اپنے گانے میں مدہوش تھے اور ان میں کچھ اس قسم کا جوش بھرا ہوا تھا کہ لڑکیاں مارے ڈر کے ادھر ادھر چھپ گئیں۔ لیکن وہ تو ذرا بھی نہیں ڈری تھی۔ بلکہ جب کھڑکی میں سے جھانک کے اس نے جھنڈوں کے عجیب رنگ کو دیکھا۔ جو ایک نئی دنیا کا پیغام لایا تھا۔ تو وہ وہ بھی باہر نکل گئی تھی اور زور سے پکار کر کہا تھا۔

"انقلاب زندہ باد! انقلاب پائندہ باد۔"

اور اس کی آواز سنتے ہی تمام انقلابیوں کے پرجوش چہرے اوپر کی طرف اٹھ گئے۔ اور یک بیک وقت سیکڑوں صورتوں نے اس کو دیکھا تھا۔ سب کے سب ایک ہی جیسے تھے۔ آنکھیں سیاہ اور بدن تپتے ہوئے تانبے کی طرح۔ سارے کے سارے سوائے اس ایک کے —— لیکن اسے اس گھڑی اس کا خیال کیوں آ رہا ہے؟ اب جبکہ اس کی زندگی کی صرف چند گھڑیاں باقی ہیں۔ اس کا خیال نہ آنا چاہئے۔

تمام انقلابی حیرت انگیز تیزی اور بے باکی کے ساتھ اسکول میں داخل ہو گئے اور وہاں کی ہر چیز گڑبڑ کر دی۔ غیر ملکی استانیاں اپنی جان بچانے کے خیال سے بھاگ کھڑی ہوئیں۔ مارے خوف اور دہشت کے بہت سی ملکی طالبات بھی چیختی چلاتی ایندھن کی کوٹھریوں میں جا چھپیں —— لیکن وہ اس واقعہ کو یاد ہی کیوں کرے؟

اب تو سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اور جو گنتی کی چند گھڑیاں بچ گئی ہیں وہ کیا اپنی ان مہمل باتوں میں ضائع کر دے۔

پھر بھی اسے یاد آیا کہ جب تمام لڑکیاں ڈر کر بھاگ گئیں تو وہ مردانہ وار دروازہ پر جا کھڑی ہوئی اور جب وہ انقلابی اس کے پاس سے گزرے تو اس نے بہت ہی عقیدتمندانہ طور پر ان کو سلام کیا، اور زور سے کہا

"انقلاب زندہ باد! انقلاب پائندہ باد"

سب لوگ جو ایک جیسے تھے آگے بڑھ گئے۔ لیکن ایک اپنے قد کی لمبائی، نیلی آنکھوں اور سرخ و سفید جلد کی وجہ سے ان سب میں ممتاز تھا۔ اس کے قریب آگیا۔ اور بڑی بے دردی سے اس کے شانوں کے گرد اپنے بازو کا حلقہ کر کے بولا۔

"ساتھیو! یہ میرا حصہ ہے۔"

اسے بڑا تعجب ہوا۔ کیونکہ یہ بات کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھی کہ کوئی غیر ملکی اس قدر صاف چینی بول سکتا ہے۔ اس نے اس کی کمر تھپ تھپائی اور ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی میں شوکت و ہوس ہم آہنگ تھیں ——— لیکن اس وقت اسے وہ یاد کیوں آرہا ہے۔ کل صبح چھ بجے تو وہ قتل کر دی جائیگی؟ مگر جب اس وقت اس کی یاد اس بری طرح ستا رہی ہے تو کیا برائی ہے۔

اس نے سارا دن اسے کہیں نہیں جانے دیا۔ بس ہر وقت اپنے بازوؤں میں لپٹائے رہا۔ وہ اپنی بھاری آواز میں بار بار کہتا "تمہیں مجھ سے خوف نہیں آتا؟ تب تو تم میری ساتھی ہو، مجھے ان لڑکیوں کا بھاگنا اور چھپنا بہت ناگوار گذرا۔ تم اچھی ہو کہ تمہیں میرے ساتھ چلے آنے میں ذرا ڈر نہیں معلوم ہوا۔"

مگر وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ جب بھی اس نے اس کی طرف دیکھا بولنے کا امکان جاتا رہا۔ لیکن ڈر اسے کسی بات کا بھی نہ تھا وہ اس سے جو چاہے کہے۔

اسے کوئی اعتراض نہ تھا اور جب دن بھر کی مشغولیت کے بعد انقلابی تھک گئے اور ان کا گانا بے ربط چیخوں میں تبدیل ہو گیا تو رات کے وقت اس نے اسے ایک عمارت کے سایہ میں اپنے کمبل میں لٹا لیا۔

ہر طرف مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ پہلے انہوں نے صرف مخالفین کو قتل کیا۔ لیکن بعد میں دوست اور دشمن کی تمیز مشکل ہو گئی اور سب کے سب اپنے جذبے میں دیوانے ہو گئے۔ سوائے اس ایک شخص کے جس کی آغوش میں وہ تمام دن پڑی رہی تھی، وہ کبھی کبھی ہنستا رہا اور اس کی آنکھیں چمکتی رہیں۔ اس نے تو خونریزی بہت ہی کم کی۔ ایک دفعہ اس نے ایک موٹے سوداگر کو قتل کر دیا۔ انقلابیوں کے گھستے ہی یہ ریشم کا چغہ پہنے گھر سے کانپتا ہوا نکل رہا تھا۔ اس کو قتل کرنے کے بعد جب اس نے اس کے ریشمی چوغہ سے خنجر صاف کیا تو وہ اس وقت بھی نہیں ڈری۔ اس وقت وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں برف کی طرح صاف و شفاف تھیں۔ اور ان میں بے رحمی جھلک رہی تھی۔

"موٹے، کریہہ المنظر اور ضرورت سے زیادہ کھانے والوں کو زیادہ دنوں تک زندہ رہنے کا حق نہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ظالم سرمایہ دار" اور یہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں نفرت کی جھلک آئی ——— لیکن آخر وہ اس کے متعلق کیوں سوچے چلی جا رہی؟

سوچ کبھی ختم نہ ہونے والے سفر کی منزلیں طے کر رہا تھا اور اب اس کی کرنیں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ جیل خانے کے اندر زندگی کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ لوگ انگڑائیاں اور جمائیاں لے لے کر جاگتے جا رہے تھے۔ کسی کو کھانسی کے دورے پڑ رہے تھے اور کوئی تھو کے چلے جا رہا تھا ——— لیکن صبح سارے کے سارے مرے ہوئے ہوں گے وہ ان ہی میں کھڑی کھڑکی کی سلاخیں تھامے

سرو قد کھڑی اس انتظار میں ہے کہ شاداب پتیوں میں سے گزرتا ہوا ہوا کا جھونکا ان کی خوشبو لے آئے چاہے وہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو —— اس کے بعد وہ کھڑی بھی نہ ہو سکے۔ اس کا جسم بے جان پڑا ہوگا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ کیا اس کے جسم سے تمام احساسات سلب ہو جائیں گے؟ اس جسم سے جس کے رگ رگ میں اس رات کے بعد سے زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ جب اس کے چاہنے نے اس کو اپنے کمبل میں لٹا کر زور زور سے بھینچ لیا تھا۔

اس رات اس نے اس سے ایک سوال کیا تھا۔ "تمہیں یہ انقلاب پسند ہے؟ دیکھو میں نے تمہیں ایک بہت بڑے حادثے سے بچا لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم دیہات کے کسی شریف زادے سے منسوب ہو چکی ہو —— تمہارا یہ سرخ چہرہ کہہ رہا ہے کہ تم کسی گاؤں کی رہنے والی ہو —— مگر وہ تم سے میرے برابر محبت کبھی نہیں کریگا۔" اس نے پہلے آہستگی اور پھر ذرا تیزی سے کہا تھا "پھر مجھے جواب دو، ورنہ میں خونخوار طریقوں سے پیار کر کے تمہاری جان لے لونگا۔ بولو! کیا میں تمہیں پیار کے ذریعہ مار ڈالوں؟ میں مار سکتا ہوں اور اگر تم نے جواب نہ دیا تو مار ڈالوں گا۔ کیا تم اس خیال سے خوش ہو کہ مجھے مل گئیں؟"

اس نے کھڑکی کی سلاخوں سے اپنا سر لگا دیا۔ اسے اس کا خیال کیوں آ رہا ہے؟ سچ مچ اس کی نسبت بچپن ہی سے پڑوس کے لڑکے سے طے ہو چکی تھی اور بچپن میں وہ دونوں ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ مگر بڑی ہونے کے بعد بھی دولہا کو روزانہ دیکھنا مناسب نہ تھا۔ اس لئے والدین نے اسے اسکول میں داخل کر دیا۔ اب اس نے ایک عرصہ سے اس کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر دولہا کی ماما رازدارانہ اشاروں میں اس کی خوبروئی کی تعریف کی تھی اور بتایا تھا کہ وہ بڑا سعادت مند ہے۔ اور افلاطونیات کنفیوشس کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے کرتا ہے

اخلاقیات، کنفوشس ـــــ مگر وہ تو اس کے سوا اور نہیں جانتی کہ ایک رات وہ ایک مرد کے پہلو میں لیٹی رہی تھی۔

"ہم دونوں اب تک ایک دوسرے کے نام سے بھی ناواقف ہیں۔" اندھیرے میں اس کی بھاری ہنسی کی آواز گونجی تھی ـــــ اس ہنسی سے بے فکری اور ہوس کا اظہار ہوتا تھا۔ "لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں انقلابی پیمبر کے نام سے مشہور رہوں۔ اور میرا پتہ "دنیا" ہے اور آج کی رات میرا گھر تمہارے پاس ہے۔ ـــــ ہوں۔"

اور وہ بولی۔ "تم مجھے چھوڑ تو نہ دو گے؟ ـــــ سچ بتاؤ۔"

اس پر وہ ہنسا۔ "ارے تم اس کی فکر نہ کرو۔"

"مجھے تو بڑی فکر ہے اس کی۔" اس نے سرگوشیانہ لہجہ میں کہا۔ اور سراپا انتظار بن گئی۔ وہ اس کا جواب سننا چاہتی تھی مگر تاریکی میں پیمبر کی ہنسی کی آواز سن کر ایک بیک اس کے دل میں اس کو دوبارہ دیکھنے کی تمنا پیدا ہوئی۔ اب اسے احساس ہوا تھا کہ تاریکی پھیلنے کے بعد سے وہ اس کے خد و خال کو بھول گئی ہے۔ کچھ ہی فاصلے پر آگ لگے ہوئے مکانوں سے شعلے بلند ہو ہو کر روشنی پھیلا رہے تھے۔ اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کاش قریب کے کسی مکان سے شعلے بلند ہوں۔ اور وہ اسے اچھی طرح دیکھ سکے۔ مگر اس کے نزدیک کی آگ تو بجھ چکی تھی۔ اور اب وہاں صرف خاک کے تودے ہی باقی رہ گئے تھے۔

اس مرتبہ ہنسنے کی بجائے اس نے ذرا سنجیدگی اور جلدی سے کہا۔ "اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتی ہو۔ مگر میرا ایک قیام بھی تو نہیں ہوتا۔ ہمیشہ ہمیشہ مارا مارا پھرتا ہوں۔ اس حالت میں عورتوں کو کس طرح اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ ابھی دنیا میں مجھے بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔"

یہ سن کر اس نے خاموشی اختیار کر لی، اور ذرا تلخ کامی کے ساتھ سوچنے لگی۔ کون جانے ہو سکتا ہے کہ کل یہ کسی دوسری لڑکی کو ہتھیا کر اس کے ساتھ رات بسر کرے۔ لیکن فوراً ہی پیتر کے تند و سخت ہاتھوں کے لمس نے اس کے غرور کو عجز میں تبدیل کر دیا۔ کوئی پروا نہیں، کوئی فکر نہیں، کوئی نقصان نہیں۔ یہی تو انقلاب ہے۔ کل کیا ہوگا، یہ کون جانتا ہے۔ اس وقت حال ہی اس کی نظر میں سب کچھ تھا۔ اور اس نے اس کے سینے سے چمٹ کر اس کے کھردرے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اس وقت وہ بالکل خاموش تھی اس لئے کہ وہ محبت کے الفاظ سے قطعی ناآشنا تھی۔ پھر اس نے کہا تھا۔ "میں اسی طرح لیٹی رہوں گی — سوؤں گی نہیں۔" مگر صبح ہونے سے پہلے وہ سو چکی تھی۔ اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ جا چکا ہے۔ اور آفتاب کی زرد کرنیں دنیا کو اپنی روشنی سے منور کر رہی ہیں۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہر چہار طرف اس نے اینٹوں اور ملبوں کو دیکھا۔ یہیں پر کل عمارتیں کھڑی تھیں۔ پھر کچھ لوگ نظر آئے۔ سہمے سہمے۔ یہ وہ لوگ نہیں تھے جن کا وہ ایک رکن تھا۔ یہ اس کے ہم وطن تھے۔ جو ادھر اُدھر اپنا کھویا مال تلاش کرتے پھر رہے تھے — وہ تو چلا گیا۔ اور پھر وہ اسے کبھی نہ دیکھ سکی۔

تو پھر اب اس کی فکر ہی کیا کہ اسے گولی سے اڑا دیا جائیگا۔ اسے رنج تھا تو اس کا کہ وہ پیتر کو دوبارہ نہ دیکھ سکی۔ اس نے ہر ممکن جگہ اس کی تلاش کی۔ انقلابیوں کے مجمعوں میں بھی اسے ڈھونڈھا۔ ان سے وہ کہتی۔ "ساتھیو! میں انقلابی ہوں، بتاؤ وہ بلند قامت روسی پیتر کہاں ہے جس نے مجھے انقلابی بنایا۔ اگر تم میں سے کسی نے بھی اسے دیکھا ہو تو مجھے بتاؤ۔" مگر وہ ناکام رہی۔

ان لوگوں نے اسے پیتر کے بنائے ہوئے انقلابی گانے اور نعرے سکھائے

پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے سنا کہ اب انہیں ان روسی انقلابیوں کی ضرورت نہیں۔ وہ لمبا موسی گرچہ اشتراکی تھا پھر بھی اسے چینیوں کو قتل نہ کرنا چاہئے تھا۔ اب "چینی انقلاب" کے متعلق سارا کام وہ خود ہی کریں گے۔

اور اس کے بعد جوش و خروش کی اس طوفانی آندھی کا رخ بدل گیا۔ جو لوگ اشتراکیت اور انقلاب کے خلاف تھے۔ اور جن کے مکانوں کو آگ لگائی گئی تھی اور جن کے عزیز اقارب موت کی گھاٹ اتارے گئے تھے پھر برسر اقتدار آ گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشتراکیوں کو پہلے تو جیل میں بند کیا گیا اور پھر ہر روز ان باغیوں کو سزائے موت دی جانے لگی۔

اس کی گرفتاری میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ اسے تو اشتراکی ہونے پر فخر تھا۔ اس کے والدین نے اس کو گاؤں واپس بلانا چاہا۔ مگر اس نے ملازم کو لوٹا دیا اور کہلا بھیجا کہ میں بالکل محفوظ ہوں۔ پھر اس کا باپ ڈرتا ڈرتا شہر آیا۔ وہ ایک سرائے میں اشتراکی عورتوں کے جتھے کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ اپنے باپ سے دروازہ پر ملی اور اس کے سوالوں کے جواب میں اس نے کہا کہ میرا کوئی ماں یا باپ نہیں۔ میرا ماں باپ انقلاب ہے اور اس کے ساتھ میرا بیاہ بھی ہو چکا ہے۔ اس نے اس کی ہر التجا کو ٹھکرا کر دروازہ بند کر لیا —— آخر وہ اس پرسکون اور خاموش گاؤں میں کیسے جا سکتی تھی۔ وہاں تو پیشتر سے ملاقات کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا تھا۔ اور وہاں وہ اپنے پڑوسی کے لڑکے کی منسوبہ کی حیثیت سے گھر کی چہار دیواری کے اندر قید کر دی جائیگی۔

آسمان پر سے سرخی دور ہوتے ہی اس کونے سے اس کونے تک روشنی کی ایک سفید لہر دوڑ گئی۔ اور نور سحر کے ساتھ ہی محافظوں کی آمد بھی شروع ہو گئی۔ وہ آج کے مرنے والے قیدیوں کو لینے آئے تھے۔ شہریوں کے جاگ اٹھنے سے

پہلے پہلے وہ انہیں ان کی مقررہ جگہ پر لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن اب شہریوں کے لئے یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں رہی تھی۔ باغیوں کو روزانہ ہی گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ وہ برسرِ اقتدار سامراجی حکومت کے اس ظالمانہ کھیل سے کماحقہٗ واقف تھے ——

—— ہاں تو اب گھڑی کی گھڑی میں اسے گولیوں کا نشانہ بنا دیا جائیگا۔ اور وہ زندگی سے محروم ہو جائیگی۔ وہ جو اس انقلابی طوفان کا ایک معمولی ذرہ تھی۔ اس کے قریب ہی ایک تنومند شخص جمائی لیتا ہوا اٹھ بیٹھا اور پھر بولا۔ "آج ہم میں سے سو اور موت کے گھاٹ اتارے جائیں گے۔"

—— اب اسے بھی چلنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ مگر وہ ان چند لمحوں کی یاد کیسے مٹائے جب وہ سچ مچ کسی کی آغوشِ الفت میں زندہ تھی۔

جب محافظ سبھوں کو باہر نکال چکے تو وہ قید خانے کی نمناک دیوار کا سہارا لئے اکیلی رہ گئی اور جب اس کا نمبر آیا تو محافظ اپنی بندوق چبھوتے ہوئے کہا ——
"چل باہر نکل۔"

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی ہی مایوسی تھی پھر اس نے کہا۔ "میں نہیں نکلتی۔"

"کیا تو مرے گی نہیں۔" محافظ نے سوال کیا۔

"مرنے کی مجھے پروا نہیں۔ مگر میں یوں بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکا کر لے جایا جانا پسند نہیں کرتی۔ میں مقتل میں گاتی ہوئی جاؤں گی۔"

"تو عیسائی تو نہیں۔" محافظ ہنسا اور پھر اس نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اچھی ہے —— پھول سی ہے نا؟" اور پھر اس سے پوچھا۔ "اچھا تو پھر تو کیا چاہتی ہے؟ گورنر کی گاڑی یا عروسی پالکی؟"

دفعتاً اس کے دل میں دوسرے قیدیوں سے ممتاز اور سربلند ہونے کا خیال آیا۔ اس نے کہا "دیکھو میں نے کل سے کچھ کھایا نہیں ہے۔ بہت کمزور ہو گئی ہوں میرے ملنے کا رنگا دو۔"

"اچھا دیکھو۔ انتظام کرتا ہوں۔" محافظ اس کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ لیکن جب اس کے لئے پولیس کی گاڑی آئی جس میں دو موٹے اور بھدے بیل جتے ہوئے تھے تو اس پر سوار ہونے سے انکار کر دیا۔ مگر محافظ کی ایک ڈانٹ سے اس کا انکار ختم ہو گیا

آفتاب دم بدم طلوع ہو رہا تھا اور اس کی روشنی ایک سیاہ بادل کے اندر سے چمک رہی تھی۔ لوگ اشتراکیوں کے جلوس کو دیکھنے کے لئے جوق در جوق اپنے اپنے گھروں کے دروازوں میں کھڑے چہ میگوئیوں میں مصروف نظر آرہے تھے۔

وہ بیل گاڑی کے چھت کو پکڑے کھڑی تھی۔ بیل بہت ہی سست رفتار تھے۔ اور انہیں دیکھ کر اسے اپنے والدین، اپنا گاؤں اور اپنی زمین یاد آرہی تھی۔ پانی سے لبریز کھیت دھان بونے کو تیار۔ مگر اب یہ سب کسی بہت ہی پرانی کتاب کا بھولا ہوا سبق تھے۔ پھر اس نے کسی کو کہتے سنا "ذرا اسے دیکھو — کس قدر کم سن لڑکی موت کے منہ میں ڈھکیلی جا رہی ہے"۔ اور دفعتاً اس کی سانس اور تیز ہو گئی اور اسے اس امر کا احساس ہوا کہ وہ بہت ہی قابل رحم ہے۔ اس نے اپنے دبلے پتلے جسم کو جو نیلے سوتی کوٹ اور پاجامے میں ملبوس تھا، دیکھا۔ اور پھر یکایک اسے یاد آیا کہ اس نے بھی اسے تو تھکی متی ہی کہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ رونے لگی۔ لیکن کیا وہ سچ مچ رونے لگی؟ نہیں تو۔ آخر یہ کوئی ایسا المناک واقعہ تو ہے نہیں۔ وہ تو آزاد مر رہی ہے۔

آزادی اور انقلاب کے واسطے۔ یہ آزادی اور انقلاب کا سبق سکھا کر پتنگے نے تو اسے آزاد کر دیا ہے۔ ان تمام آدمیوں میں صرف اکیلی وہی جنس رہی تھی۔ اسے اپنی مختصر زندگی میں ایک ایسی رات میسر آگئی تھی جو سالہا سال کی عمر سے بھی برتر ہے۔

آفتاب کی سیمیں کرنیں بادل کے ہر چہار طرف گوٹ کی طرح چمک رہی تھیں اس وقت وہ اپنے صاف، میٹھے اور مدھ بھرے لہجے میں ایک ایسا گیت گانے لگی۔ جس کا مطلب کوئی نہ سمجھ نہ سکا ــــ کیونکہ یہ گیت نغمہ تھا۔ اس ہستی کا، جس کی عمر صرف ایک ساعت تھی ــــ وہ ساعت جو اب گزر چکی تھی۔ جب تک وہ گاتی رہی اس کا جسم تنا رہا۔ اور اس کی آنکھیں چمکتی رہیں ــــ لوگ اس وقت اس کا گانا سن کر اس کی راسخ العقیدگی کی تعریف کر رہے تھے ــــ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ یہ اپنی موت کا استقبال نغموں سے کیوں کر رہی ہے۔

نیا دور کی چند ایجنسیاں

دہلی۔ ریجنٹ نیوز ایجنسی نئی سڑک
لاہور۔ مکتبۂ جدید انارکلی چوک
بمبئی۔ احمد بخش بک سیلر۔ جے جے ہاسپٹل کا ناکہ بمبئی ۳
گجرانوالہ۔ ادبی کتب خانہ چوک نیانی
حیدرآباد۔ دکن بک ڈپو عابد روڈ

پشاور۔ صادق کمیشن ایجنسی بازار قصہ خوانی۔
ہوشیارپور۔ مسلم نیوز ایجنسی بگاین گیٹ
امرتسر۔ اخبار گھر ہال گیٹ
کیمبلپور۔ پروگریس بک ڈپو
ناگپور۔ قریشی بک ڈپو

صمد شاہین

بھولے بھٹکے

"لوہے کی قیمت کتنی بڑھ گئی ہے۔ کیل، وہی معمولی کیل جو ساڑھے تین روپیہ میں من بکتی تھی۔ اب پچاس روپے میں بھی ملنی مشکل ہے۔"

"بوہری تو مالا مال ہو گئے صاحب! جنگ کے شروع ہی میں ان کے پاس کافی سے زیادہ لوہا تھا۔ اس کے بعد تو بہت سٹاک جمع کر لیا ہے۔"

"یہ اچھا ہوا لوہے کے سوداگر سب بوہری ہیں۔ اب بمبئی کے مارکیٹ میں کچھ مسلمان بھی نظر آئیں گے۔ اب تک تو صرف گجراتیوں اور پارسیوں کا راج تھا۔"

……

پاس ہی دو اور بچھونے پڑے تھے۔ تکیہ پر کہنی ٹیکے، سر تھامے ایک صاحب دوسرے صاحب سے کہہ رہے تھے۔ "آج واقعی سر پھٹا جا رہا ہے۔ بہت کام کرنا پڑا۔ دیکھئے تو کلکتہ جانے کے سیوین تار پورے چالیس گھنٹہ سے رکے پڑے ہیں۔"

"یہ کیوں، سبب؟"

"یہی کہ ملٹری کا کام بہت زیادہ ہے۔"

دوسرے صاحب نے اپنا گلہ شروع کیا۔ "افواہ ہے ٹریم کمپنی کے سارے نوکر جنگ کے الاؤنس کے لئے ہڑتال کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے دوستوں کو سمجھایا بھی "ارے بھئی! ہڑتال کرنا ہی ہے تو مہینہ کی تنخواہ لیا کرو۔ کیا بھوکے مرو گے....؟"

"تو پھر؟" "سنتے ہی نہیں سرپھرے، میں تو گھاٹے میں رہا۔"

………………

میرے دائیں جانب کونے کے قریب صرف اتنا سنائی دیا۔ "کیوں بھئی کرمنٹز جن کوئی کیپ ٹون سمگل (Smuggle) کر لے جائے تو کیا رہے سنتے ہیں، وہاں بہت قیمت پر بکتے ہیں"

………………

صرف اردو ہی، گجراتی اور مرہٹی زبانوں میں بھی باتیں ہو رہی تھیں لیکن میں ان زبانوں سے کورا ہوں۔ ہاں ایک اور جگہ ہندستانی میں گفتگو سنائی دی۔

"کرسنٹ کیفے میں کھانا اچھا نہیں مل رہا ہے آج کل،
معلوم ہوتا ہے گھی کے بجائے بناسپتی واپرنا (استعمال کرنا) ہے۔"

"دیکھئے۔ شہامت اشٹر سوران اچھا ہے۔ وہاں خالص پنجاب کا گھی استعمال ہوتا ہے۔"

"ایسے تو کریمی بھی اچھا ہے۔ لیکن مجبوری ہے، ذرا دور جانا پڑتا ہے۔ اور دونوں جگہ خوب رش رہتا ہے۔ پندرہ بیس منٹ تک کوئی پوچھتا تک نہیں اور پھر میں بزنس مین ہوں کھانے میں زیادہ دیر لگا نہیں سکتا۔"

………………

"آپ سن رہے ہیں نا" "ہوں"
"کہہ دیجئے اگر آپ کو دلچسپی نہ ہو۔"
"ہوں۔ جی نہیں۔ دلچسپی کیوں نہیں؟"
"ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ وہی ہوا جس کا خوف تھا۔"
"ہوں"

"لیکن جو ہونے والا تھا۔ پتھر پڑے میری عقل پر۔ افسوس! میں نے پہلے ہی ہشیار رہنا تھا۔"

"ہوں"

"آخر اس نے دعویٰ داخل کر ہی دیا۔ میرا خیال ہے مکان بیوی کے نام منتقل کردوں۔ دعویٰ داخل ہونے کے بعد بھی ہو سکتا ہے نا؟"

"ہوں"

"اس کے متعلق قانون کیا کہتا ہے۔ ذرا تفصیلی طور پر بتائیے۔ آپ فرما رہے تھے آپ نے وکالت کا امتحان پاس کیا ہے۔ دیکھئے تو، رہی سہی جائیداد میرا یہ مکان ہی ہے۔ وہ بھی اگر ہاتھ سے نکل گیا۔ ...... آپ کی کیا رائے ہے؟ اگر کل ہی مہر کے عوض یہ مکان اپنی بیوی کے نام پر لکھدوں تو؟"

"ہوں"

یہ "ہوں" کہنے والے صاحب، جن کا بچھونا میرے بازو، بائیں جانب لگا ہوا تھا۔ میں دیکھتا رہا برابر غیر حاضر رہے۔ وہ پیچ و تاب کھاتے رہے، پہلو بدلتے، نیم وا آنکھیں کرکے پیشانی پر شکنیں ڈالیں۔ شاید بے چینی کا اظہار کرنے کے لیے کچھ دیر چت پڑے چھت کا بغور جائزہ بھی لیا۔ ان کی ہیئت سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بڑی گہری سوچ میں مبتلا ہیں کہ کیسے ان صاحب سے چھٹکارا ہو۔ جو بلائے بے درماں کی طرح ان پر مسلط ہو گئے ہیں۔ جب انہوں نے میری طرف کروٹ لی تو ایک ٹھنڈی سانس لیکر انہیں یہ بھی کہتے سنا۔ "میں نے بھول کی۔۔۔ وکیل بتا کر" ممکن ہے، وہ ان دوسرے صاحب نے نہ سنا ہو۔ ورنہ اتنی بیدردی کے ساتھ مقدمہ کی تفصیلی روئیداد 'توڑ کر' سنانے ہی پر اکتفا کرکے اپنے نجی حالات بھی سنانے پر نہ تل جاتے ——— زمین کا نیلام، چھوٹی سی دکانداری میں گھاٹا۔۔۔۔

بچوں کی ناسازی، بیوی کی سرد مہری ...... بہت ہی تنگ آگیا ہوں' کہنے والے صاحب نے قطع کلام کر ہی دیا۔ لیکن وکیلانہ انداز میں بیچ میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں جناب! لینن گراڈ گرنے کی خبر سچ ہے نا؟ تکلیف معاف، ان صاحب سے سنٹینل (Sentinel) مانگ لیجئے گا۔" لیکن اس کا آپ بیتی کہنے والے صاحب پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ان کی زبان رکتی نہ نظر آئی۔

....

اتنے میں ایک صاحب جوتے وہیں دروازے کے پاس چھوڑ اندر آ گئے۔ آتے ہی کہنے لگے۔ "ڈونگری میں آج بہت اچھی قوالی ہے۔ عبدالرحمن کالج والا کی پارٹی"

"کئی بجے؟"

"شروع ہونے ہی والی ہے۔ شام میں چوپاٹی گیا تھا۔ وہیں ایک صاحب نے مجھے بتلایا۔ بیس نمبر کی ٹرام سے اسی بھنڈی بازار کے چوراہے پر اتر کر ابھی ابھی آ رہا ہوں۔ ایسے ہی سیدھے ڈونگری چلے جاتا۔ لیکن میں نے کہا، چلتے چلتے آپ صاحبوں سے بھی کہتا چلوں۔"

"مرزا صاحب کیا خیال ہے"۔ کسی دوسرے صاحب نے ذرا بلند آواز سے پوچھا۔ مرزا صاحب کو دن کے وقت میں نے اکثر اردو کی کتابت کرتے دیکھا ہے۔

"اچھا تو چلئے۔ جلدی کیجئے۔ ہاں، رہی برابر والے صاحب کو بھی سنا دیجئے"

لوگ جو اپنی اپنی دلچسپی کی باتیں کر رہے تھے، یک لخت باتیں موقوف کر کے بچھونوں پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تھکے ماندے، جن کے پپوٹے نیند

سے بوجھل ہوئے جا رہے تھے، وہ بھی گڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ کوئی لنگی اتار پائجامہ پہن رہا تھا۔ کوئی پائجامہ اتار سوٹ چڑھا رہا تھا۔ پانچ دس منٹ میں کاسکر ہاسٹل کے

بڑا دالان خالی ہو گیا۔ باہر دروازے کے پاس جوتوں کے پہننے کی آواز آئی، اور پھر سیڑھیوں سے اترنے کی چاپ چاپ، کھٹ کھٹ۔ میں ہی اکیلا رہ گیا تھا۔ کسی نے مجھے پوچھا تک نہیں۔ ایسے بھی میں بہت تھکا ہوا تھا۔ اور گانے کی پارٹی میں جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کے علاوہ دیسائی حمید اور بھروچہ نے بھی آج رات یہاں آنے کا وعدہ کیا تھا۔

……

کاسکر ہاسٹل کوئی طلبا کا ہاسٹل نہیں، مسافروں کی قیام گاہ ہے محمد علی روڈ اور کالبادیوی کے ناکہ پر بھنڈی بازار میں مانڈوی پوسٹ آفس کی تیسری منزل پر واقع ہے۔ اس میں ایک بڑا سا دالان ہے اور دالان کے دائیں بائیں کو ایک ایک کمرہ اور دائیں کمرے کے بالکل سامنے ایک حمام ٹھنڈے پانی کے نل کا، اور بازو میں رفع حاجت کے لئے البتہ فلش کا انتظام۔ کمرہ کے لئے زیادہ دینا پڑتا ہے، شاید ڈیڑھ روپیہ روزانہ۔ اس لئے کمرے کچھ ذی حیثیت لوگوں ہی کے قبضہ میں رہتے ہیں، دالان خاصہ بڑا ہے۔ لیکن اس کا ہر انچ استعمال میں رہتا ہے، پچیس تیس بچھونے ایک قطار میں دالان کے چاروں طرف بچھتے ہیں۔ درمیان میں جہاں کہیں جگہ بچ رہے وہاں بھی۔ چارپائیوں پر نہیں بلکہ فرش پر چینی بوریوں پر جو ہمارے لئے فرش ہی ہیں۔ دروازے کے پاس باہر جوتے چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ اور جیسے ہی دروازے کے اندر داخل ہوں، دائیں اور بائیں کونوں میں مسافروں کے صندوق ایک کے اوپر ایک قرینہ سے رکھے ہوتے ہیں۔ کاسکر ہوسٹل ہر طرح کے لوگوں کا مسکن ہے۔ عام طور پر یہاں کم مایہ بیوپاری آکر ٹھہرتے ہیں، اکثر چھوٹی تنخواہ کے ملازم بھی مستقل رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی بھٹکے ہوئے بے راہرو بے روزگار بھی۔ ہاسٹل میں رہنے والوں کو دن بھر کام کاج کے لئے باہر گزارنا پڑتا ہے۔ لیکن رات

ہوئی نو بجے، اور سب کے سب بچھونوں پر آ دھمکے۔ (بمبئی میں ۹ بجے کے آگے رات نہیں ہوتی) ذرا دیر ہوئی بچھونے پر کسی دوسرے کا قبضہ ہوا۔ اور رات کے لئے سونے کا خاطر خواہ انتظام نہ ہوا۔ ایک تو جتنے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ رات کے وقت تھکے ماندے واپس ہوتے ہیں۔ اور دوسرا ایک دوسرے سے جان پہچان نہیں ہوتی۔ اس لئے بات چیت زیادہ سے زیادہ بازو کے بچھونے والے سے ہوتی ہے۔ اور وہ بھی نیند کے آنے تک زبردستی کی بات چیت۔ اپنی دلچسپی کی مخاطب کون؟ اس کو اس موضوع سے دلچسپی بھی ہے؟ اس کا کوئی خیال نہیں۔ دن اور رات چوبیس گھنٹوں کے لئے یہاں فی بچھونا صرف چار آنے دینے پڑتے ہیں اور جو کوئی پورا ایک مہینہ پہلے کا بندوبست کر لے۔ اس کے لئے تو کُل پانچ ہی روپے۔

اس بڑے دالان میں، میں بالکل اکیلا! تنہائی سے میرا جی اکتا رہا تھا، نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ نو ساڑھے نو بجے کیسے نیند آجائے؟ مجھے تو بارہ ایک بجے تک کتابیں دیکھتے رہنے کی عادت تھی۔ یہاں آنے سے پہلے وقت کتابیں بھی ساتھ نہیں لایا سوچا تھا یہیں نئی نئی کتابیں لے لونگا۔ بمبئی جیسے شہر میں کوئی اچھی سی نوکری جلد ہی مل جائیگی۔ اور یہاں کے سیکنڈ ہینڈ بک سٹالس میں کتابیں بہت سستی مل جاتی ہیں۔ جب میں یہاں ایل۔ ایل۔ بی کے لئے آیا تھا۔ اس وقت میں نے دو تین کتابیں بہت سستے میں خریدی تھیں۔ جان گنتھر کی "ان سائیڈ یوروپ" Inside Europe مجھے چھ ہی آنوں میں مل گئی تھی۔ اور اپٹن سنکلیر کی ناول 'جنگل' Jungle دو آنے میں! خیر یہ کتاب تو پنگوئن سیریس میں تھی۔ اور ہاں سنا ہے، بہت سی کتابیں جو میں خریدنا چاہتا تھا اب پنگوئن سیریس میں آگئی ہیں۔ ملک راج آنند کی ان ٹچ ایبل Un-touchable تو ضرور خریدنی چاہئیے۔ لیکن گاؤں سے جو روپئے لیتے

آیا تھا وہ ختم ہونے آ رہے ہیں۔ دو چار دن میں فاقوں کی نوبت آئیگی۔ کتابیں کہاں سے خریدوں؟ میں بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ یہ تارا سنگھ، پرکاش کہاں جا مرے؟ دس بجنے کو آئے ابھی تک نہیں لوٹے۔ ان کے بچھونے پر دوسرے آن کر قبضہ جما لیں تو مزہ معلوم ہوگا۔ اور حمید، ویسائی اور بھروچہ نے بھی تو آج یہاں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی نہیں آئے۔ ابھی تک۔ اچھا کیا منگاؤں ان کے لئے؟ سموسے؟ بسکٹ؟ ابھی سے کیوں منگاؤں۔ وہ نہ آئے تو پیسے مفت میں ضائع ہوں گے۔ آنے پر باہر والے کو آواز دے کر سموسے اور چائے منگوا لوں گا۔۔۔۔۔۔۔۔

ابھی تک نہیں آئے کم بخت! لاؤ میں ہی ایک پیالی چائے منگوا کر پی لوں۔ دوپہر سے کچھ کھایا نہیں ہے۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ صبح میں صرف سوکھی چپاتی ساگ کے ساتھ کھائی تھی۔ میں نے ایک پیالی چائے منگا کر پی۔ گرم گرم چائے پینے سے بدن میں پھرتی سی آگئی۔ اب بچھونے پر پڑے رہنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

نہ جانے وہ ابھی تک کیوں نہ آئے۔ تارا سنگھ، پرکاش، حمید، ویسائی، بھروچہ لے دے کے یہی میرے ایک آدھ درجن دوست تھے۔ پردیس میں دوست کہاں؟ ان سے یونہی شناسائی ہو گئی تھی۔ ٹائمز انڈیا آفس میں۔ پھر تارا سنگھ اور پرکاش تو کالسکر ہاسٹل ہی میں مقیم تھے۔ البتہ ویسائی سے کالج کے زمانہ ہی سے جان پہچان تھی۔ جب میں ایل ایل بی کے پہلے سال میں تھا۔ ویسائی دوسرے سال میں تھا۔ سب کے سب میری طرح ٹائمز آف انڈیا آفس کا طواف کرتے تھے۔ ہماری ایک ٹولی سی بن گئی تھی۔ ہم میں گجراتی، مرہٹی، یوپین، پنجابی، مدراسی سبھی موجود تھے۔ اور ذات پات کے لحاظ سے ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی ـــ نہیں تھے تو صرف بنگالی، سرحدی اچھوت اور عیسائی۔ پہلے میں اخبار ٹائمز آف انڈیا خریدا کرتا تھا اور یہیں سے درخواستیں لکھ بھیجتا۔ ایک دن فیروز صاحب نے یہ دوستانہ مشورہ دیا، کہ ڈاک ٹکٹ اور

ٹائمز پر روزانہ آٹھ دس آنے خرچ کرنے کی بجائے میں خود ہی ٹائمز آف انڈیا آفس چلا جاؤں اور وہیں اوپر درخواستیں دیتا آؤں۔ فیروز صاحب بھی ہمارے کاسکر ہاسٹل ہی میں رہتے ہیں۔ بہت ہی بھلے آدمی ہیں۔ بڑے مذہبی، نماز کے پابند۔ ایف۔ اے میں فیل ہیں۔ اور خوجہ خان سکول میں ماسٹر ہیں پینتیس روپیہ ماہانہ پاتے ہیں۔

تو میں نے ٹائمز آف انڈیا آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ ٹائمز آف انڈیا آفس کی نچلی منزل میں جیسے ہی آپ پٹھان پہرہ دار سے گزرتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔ سیدھے اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں ہیں۔ اور دائیں جانب دو سٹانڈ لگے ہوئے ہیں جن پر روزانہ ٹائمز لگا دیا جاتا ہے تاکہ آنے جانے والے پڑھ لیں۔ اور یہاں آن کر مجھے اندازہ لگا کہ میری طرح ٹائمز کے دوسرے صفحے پر ٹوٹ پڑنے والے اور کتنے ہیں! یہیں ان سب سے میری شناسائی ہوتی تھی۔ کیونکہ ہم کم و بیش ایک ہی وقت پر آیا کرتے تھے۔ میں نے چائے کی خالی پیالی لے جانے کے لئے باہر والے کو آواز دی۔ اتنے میں تارا سنگھ، بھیروچہ اور ڈیسائی نمودار ہوئے بغیر علیک سلیک کے سب میرے بچھونے پر آ دھمکے۔

"اچھی دیر لگائی تم نے! خیر ہوئی یہ لوگ عبدالرحمن کالج والا کی پارٹی سے نہیں لوٹے۔ ورنہ تارا سنگھ! تمہیں رات سونے کے لئے بچھونا بھی نہیں ملتا۔"

"نیند کیسے بھی آ جائیگی آج پیٹ جو بھرا ہے" گھنی داڑھی اور مونچھوں کے درمیان تارا سنگھ کے موٹے موٹے ہونٹ کانوں تک پھیل گئے۔ "واہ کیا مزے کی پارٹی اڑائی۔"

"کیسی پارٹی؟" میں نے پوچھا۔

"ارے یار تمہیں معلوم نہیں، آج پرکاش کو ٹرانسپورٹ آفس میں انٹرویو کے لئے بلایا گیا ہے۔ پھولے نہ سماتا تھا۔ ہم نے بھی اس کی خوب گت بنائی۔ پیشگی ہی پارٹی دے

پر مجبور کر دیا۔ پارٹی! اسپیرو ہٹ رسٹوران میں۔"

"کہاں؟ میرین ڈرائیو پہ؟"

"میرین ڈرائیو پہ کہاں یار! یہیں بوری بندر پہ" "لیکن تھا مزے کا شری کھنڈ! لطف آگیا کھانے میں تو۔"

"اور میں یہاں بھوکا مر رہا ہوں۔ جناب کا انتظار کرتے ہوئے۔"

"سچ، ہمیں بھی بہت برا لگا کہ تم پارٹی میں نہیں تھے۔ پرکاش کو آنے دو ایک اور پارٹی کے لئے اصرار کریں گے۔"

"بھئی پرکاش کی قسمت پر مجھے رشک آتا ہے" بھردوج نے کہا۔ "کہاں ہم کہ مہینوں سے درخواست دیتے آرہے ہیں۔ ایک کا بھی جواب تک نہیں آیا۔ اور پرکاش نے صرف تین چار ہی درخواستیں لکھ بھیجیں اور تبھی انٹرویو کے لئے بلا لیا گیا۔"

پرکاش بھی میری طرح مسافر تھا۔ یو۔پی۔ میں۔ اس کو یہاں آئے ہوئے ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا۔ "بھئی میرا تو خیال ہے یہاں سے چلا جاؤں۔ کتنی امیدیں لیکر نکلے تھے۔" میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ "آخر بمبئی میں کیا رکھا ہے۔ ہمارے گاؤں ہی میں کوئی چھوٹا موٹا کام کیوں نہ دیکھ لوں۔ وہاں خرچ بھی تو اتنا نہیں پڑتا۔ یوں سر مارتے پھرنے سے تو یہی بہتر ہے۔"

"ارے یار! اتنا جلد کیوں مایوس ہوتے ہو؟ پھر تمہارے چانس [illegible] تو ہم سے زیادہ ہیں۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پاس ہو۔ اتنا وسیع مطالعہ ہے۔ بہت اچھا لکھتے بھی ہو۔"

"لیکن کوئی میری تحریر دیکھیں بھی! بمبئی کرانیکل آفس کتنی دفعہ مارا مارا پھرا اپنے انگریزی آرٹیکلس کے مسودے بھی ساتھ لیجاتا تھا۔ لیکن وہاں کوئی پوچھ کر بھی نہ دیکھتا۔"

"سچ ہے قابلیت کو کوئی نہیں پوچھتا۔" بھروچہ نے کہا۔ "لیکن یار! تم سکرین پر کیوں نہیں چلے جاتے؟ بمبئی کی فلم کمپنیاں تو منھ مانگے دیتی ہیں۔ ایشور نے تمہیں ایسی اچھی صورت دی ہے۔ پھر سجیلے اور جامہ زیب بھی ہو۔ بھئی تم تو اشوک کمار سے نظر آتے ہو۔ سکرین پر کیوں نہیں چلے جاتے؟ اخلاقیات کو ایک طرف رکھو۔"

"تم فلمستان کو کیا سمجھ بیٹھے ہو بھروچہ؟" دیسائی نے جھپٹ کر کہا۔ "جاتے ہی جناب ہیرو بنا دئے جاؤ گے۔ ہزاروں ہیر بناؤ گے ایہہ؟ ارے بھائی تم کیا جانو۔ میں نے اس پرستان کی خوب خاک چھانی ہے۔ بیسیوں کمپنیوں میں مارا مارا پھرا۔ ایک دفعہ تو میں نے سمجھا کچھ بن آیا ہے۔ پروڈیوسر نے خود انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔ میں نے اپنی درخواست کی چٹھی میں خوب خود ستائی کی تھی۔ میں بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی پاس ہوں۔ آرٹ کے متعلق میرے نظریے یہ ہیں۔ ہمیں ابھی سائن آرٹ کو بہت بلندی پر پہنچانا ہے۔ میں اس آرٹ کو کتنی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ ہندوستان کے کون سے ڈائرکٹر اور اداکار کامیاب فنکار ہیں۔ اور ڈائرکٹروں کا نام گناتے وقت میں نے اس کمپنی کے ڈائرکٹر کا نام سب سے پہلے لکھا۔ اور اس کمپنی کی خوشامدانہ تعریف بھی کی تھی۔ جب پروڈیوسر نے انٹرویو کے لئے بلوا بھیجا تو میں بڑی امیدیں لئے سٹوڈیو گیا۔ وہاں اندر داخل ہوتے ہی مسٹر جاوید دکھائی دئے۔ "ارے تم یہاں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ ان سے میری کچھ جان پہچان تھی۔ "مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی جاوید! بھئی خوب لکھتے ہو میں نے تمہارے افسانے کئی اردو رسالوں میں پڑھے ہیں!"

"ہاں اسی لئے تو مجھے ایسی اچھی جگہ پر لیا گیا۔ میں یہاں مکالمہ نویس ہوں"۔

"بھئی مبارک ہو۔ خوب کما لیتے ہوگے۔ آں؟" "ہاں، ہاں،" انہوں نے ہنستے ہوئے ٹال دیا۔ "آپ کا آنا کیسے ہوا؟"

"میں اس کمپنی میں ایکٹر کی حیثیت سے شامل ہونا چاہتا ہوں"

"بڑی اچھی بات ہے۔ دیکھئے مسٹر دیسائی، یہاں کام مل جائے تو بہت اچھا ہے، چونکہ کمپنی بہت مشہور ہے۔ یہاں کام ملنا ہی مشکل ہے۔ مل جائے تو اپنی خوش قسمتی سمجھو۔ پروڈیوسر کے جو بھی شرائط ہوں منظور کر لو۔ یہاں عام طور پر بہت کم تنخواہ پر سٹارٹ کیا جاتا ہے۔ لیکن چانسس (Chances) بہت اچھے ہیں۔"

بہت کم تنخواہ پر؟ ہزاروں نہیں تو چار پانسو تو ضرور مل جاتے ہونگے۔ میں نے خیال کیا۔ اتنے میں ایک قبول صورت نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔

"مسٹر کرن سے ملئے" جاوید نے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ اس کمپنی میں نئے آئے ہیں۔ اس کے پہلے تین چار پنجابی پکچروں میں کام کیا ہے"

"نمستے" نوجوان جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔ اس نے جواب میں مسکرا کر سر کو ذرا سا خم کیا، اور جلدی سے باہر چلا گیا۔

"دیکھئے، ان صاحب کو یہاں چالیس مل رہے ہیں،" "چالیس؟" میں بوکھلا گیا۔ "ہاں! لیکن کمپنی کی شہرت تو دیکھو! اس کمپنی کا ایکٹر کہلانا بھی فخر کی بات ہے۔ کتنے ہی نوجوان تو یہاں اپرنٹس کے طور پر بغیر تنخواہ کے کام کرتے ہیں۔"

میری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس نوجوان کو جو پہلے بھی تین چار پکچروں میں کام کر چکا تھا اور کافی خوبصورت تھا، چالیس مل رہے ہیں۔ تو مجھ جیسے کو کیا پوچھا جائیگا؟ شاید زیادہ سے زیادہ تیس مل جائیں۔ تیس روپئے کے لئے شہر سے اتنی دور آنا پڑیگا۔ سات آٹھ میل۔ میں شہر چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ مجھے یم۔ اے کے لئے ٹرم Term ڈالنے تھے۔

"تو کارڈ بنا کر سیدھے مسٹر چیٹرجی کے پاس چلے جائیے" جاوید کہہ رہے تھے

"لیکن اب میں پروڈیوسر صاحب سے نہیں ملوں گا" یہ کہکر باہر چلا آیا۔

تو کیا وہاں بھی پراسپیکٹس (Prospects) اتنے کم ہوتے ہیں؟" میں نے دیسائی سے پوچھا۔ "لیکن یہ جو اخباروں میں ہم پڑھتے ہیں کہ فلاں ایکٹر یا ایکٹریس کی تنخواہ کئی ہزار ہے۔"

"وہ تو محض پبلسٹی ہے۔ ہاں چند ایک کو مل جاتے ہوں گے۔ شانتا آپٹے، موتی لال، چندر موہن وغیرہ کو تو اتنے مل جاتے ہیں۔ لیکن اکثر ایکٹروں کی تنخواہ بالکل معمولی ہے۔"

"بھئی، اچھا ہوا۔ تم سے یہ بات معلوم ہو گئی۔ ورنہ میرا بھی اسی کوچہ میں جانے کا ارادہ تھا۔ میں نے 'منروا' میں کوشش کرنی چاہی۔ ایک خط بھی لکھا۔ سٹوڈیو کو گیا بھی۔ یار بڑی سردردی اٹھانی پڑی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کونسی ٹرام میں جانا چاہئے۔ دوسری ہی ٹرام میں سوار ہو گیا۔ پھر اتر کر وہاں سے بہت دور پیدل جانا پڑا۔ خدا خدا کر کے سیوری (Sewri) پہنچا۔ سٹوڈیو کے گیٹ کیپر نے وہیں روک دیا کہ مسٹر مودی اب کسی سے نہیں ملیں گے۔ میں نے کہا 'میں نے پہلے انہیں ایک خط بھی لکھا ہے۔ اندر جا کے پوچھ تو آ۔' وہ اندر گیا۔ جواب کے لئے کوئی گھنٹہ بھر انتظار کرنا پڑا۔ خوش قسمتی سے وہیں ایک ایکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے باتیں کرنے میں وقت کٹا۔ آخر کسی نے آ کر کہا 'مسٹر مودی سکندر کی تدوین میں بہت مصروف ہیں۔ وہ ستمبر سے پہلے نئے آرٹسٹوں سے نہیں ملیں گے۔' اور یہ اپریل تھا۔ میں جانے لگا تو ایکٹر نے مجھے ہمت دلائی۔ 'آپ ستمبر میں ضرور آئیے گا مسٹر مودی نئے آرٹسٹوں کی بہت ہمت افزائی کرتے ہیں۔ وہ ضرور تمہیں لے لیں گے۔' ستمبر میں پھر کوشش کرنے کا ارادہ تھا۔ اب کون سر مارے گا۔ جانے دو بھئی! کہاں کی ٹکریں۔" میں نے بیزاری ظاہر کی۔

ہم باتوں میں اتنے مصروف تھے کہ ہمیں پرکاش کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ "ارے پرکاش" تارا سنگھ کے منہ سے نکل گیا۔ ہم سب نے چونک کر دیکھا۔ پھر اس

پر ٹوٹ پڑے۔ "کہو کیا بن آیا؟" "بھئی۔ بڑے خوش نصیب ہو۔" "ارے یار تم تو ہمیں تو بھول ہی گئے۔ ایک اور پارٹی دینی ہوگی۔ ہم نہیں چھوڑنے کے۔" "کہیں وہی جگہ تو نہیں۔ جہاں ہم سب نے ایک ایک درخواست بھیج کر قسمت آزمائی کرنی چاہی تھی؟" میں نے پوچھا۔ "نہیں یار، پرکاش تو اس کے علاوہ ایک اور ہی طرف بازی لگا رہا تھا۔ ورنہ پرکاش میں کون سے سرخاب کے پر لگے تھے کہ ہم سب کو چھوڑ کر وہی انٹرویو کے لئے بلایا گیا؟" تارا سنگھ نے جواب دیا۔ "میں نے پہلے بتایا نا تمہیں! کہ ٹرانسپورٹ آفس میں۔" "واہ یار تم تو چھپے رستم نکلے ہمیں بتایا ہی نہیں اس کے بارے میں۔ ہم سے کہہ دیتے تو کیا ہم تمہارا چانس (chance) چھین لیتے۔" ہر طرف سے سوالوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ پھر پرکاش کو خاموش دیکھ کر ہمیں کچھ شک ہوا۔ ہاں، اس کے چہرے پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر سب یک لخت چپ ہو گئے۔ جیسے موسلا دھار مینہ برس کر چھوٹ جائے۔ کچھ دیر ہم سے کوئی بولنے کی جرأت نہ کر سکا۔

"تو نوکری نہیں ملی پرکاش؟" تارا سنگھ نے ہمت کر کے پوچھا۔

"ملی تو، لیکن میں نے خود انکار کر دیا۔" پرکاش نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"کیوں بھئی؟ آخر ایسی بیوقوفی کیوں کی؟" دیسائی نے پوچھا۔

"ارے بیٹھو تم سب لوگ۔ سب تفصیل سے سناتا ہوں۔" ہم سب پرکاش کے آنے پر بے تابی سے اٹھ کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر سب کے سب بچھونے پر بیٹھ گئے اور میں نے باہر والے کو آواز دے کر بسکٹ سموسے اور چائے منگوائی۔ پرکاش نے کہنا شروع کیا۔ "لکھنؤ میں میرے ایک بچپن کے دوست رہتے ہیں۔ پرسوں میں ان سے ملنے گیا تھا۔ باتوں باتوں میں، میں نے بھی آنے کا سبب اور اپنی بے روزگاری کا حال سنایا۔ "بھئی تم نے یہ بات پہلے ہی کیوں نہ بتائی۔" میرے دوست نے بہت

افسوس کے ساتھ کہا: "تمہیں آنے نہ ہو سکا تو کم از کم خط ہی لکھ دیتے۔ میں ضرور تمہارے لئے کوشش کرتا۔ میں جس جگہ کام کرتا ہوں، وہاں کئی ایک جگہیں خالی تھیں پرسوں ہی کی بات ہے ایک نوّے والا جاب (Job) خالی تھا۔ تم درخواست بھیجدیتے تو ضرور کامیاب ہو جاتے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ وہ جگہ ایک انٹر میڈیٹ فیل کو مل گئی" میں نے پوچھا "وہاں کوئی اور جگہ خالی نہیں؟" انہوں نے کہا: "ہیں تو لیکن کلیریکل جابس (Clerical Jobs) پرسوں ہی اشتہار دیا گیا کہ ٹرانسپورٹ آفس میں ایکسٹرا ہانڈس (Extra hands) کی ضرورت ہے خیر تم اسی کے لئے کوشش کرو۔ شرائط بھی معمولی ہیں۔ امیدواروں کے لئے کوالیفکیشن صرف میٹرک ہے" "کتنے گھنٹوں کا کام ہوگا؟" میں نے دریافت کیا۔ "بارہ سے چھ تک" "یہ تو کچھ زیادہ نہیں" مجھے اطمینان ہوا۔

"تو ٹرانسپورٹ لائن میں اتنے اچھے پراسپکٹس prospects ہیں؟"

"ہاں پٹرول راشننگ کے لئے ایک نئی شاخ قائم ہوئی ہے۔ بھئی جب سے یہ جنگ شروع ہوئی ایسے بیروزگاروں کے نصیب کھل گئے۔ آج کل میٹرک پاس یا بالکل ان پڑھ لڑکے اتنا کما لیتے ہیں کہ پہلے بی۔ اے یم۔ اے پاس نوجوان اچھے اچھے پوسٹس (posts) میں نہیں کما سکتے تھے۔ جنگ بھی گویا ایک طرح سے رحمت ہی ہوئی۔ مجھی کو دیکھو۔ مجھے خواب میں بھی کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ دوسو روپئے کی نوکری اتنی آسانی سے مل جائیگی۔"

"کیا کہا تمہیں دوسو روپئے مل رہے ہیں؟" حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے اپنے دوست کو سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے وہ کوئی دوسرا آدمی بن گیا ہے۔ دوسو روپئے؟ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اور اپنے دوست کے درمیان ایک خلیج حائل ہو گئی ہے۔ شاید انہوں نے میرے چہرے

سے میرے خیالات کو بھانپ لیا۔ بہت ہی گرم جوشی سے مجھے گلے لگایا۔ بھئی پرکاش تم بھی عجیب آدمی ہو، کہیں روپیہ ہماری دوستی میں فرق کر سکتا ہے؟ میں نے دو سو روپیے کما لیئے تو بڑا 'زادہ' ہو گیا؟ تم بھی جلد ہی کمانے لگو گے۔ ہماری ہی آفس میں آجاؤ تو کیا اچھا ہو گا۔ لو پرکاش ابھی درخواست لکھدو، میں بھی تمہارے لیئے کوشش کرونگا۔ انہوں نے میرے ہاتھ میں لیٹر پیپر پکڑوا دیا۔ میں نے خوشی خوشی بیٹھے بیٹھے درخواست لکھدی۔ آج مجھے انٹرویو کے لیئے بلایا گیا۔ میرے پہلے وہاں دو اور امیدوار بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ ان میں ایک بہت مصیبت زدہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ گاؤں میں اس کی چند بیگھے زمین ہے۔ ماں باپ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ جوں توں کرکے انہوں نے شہر بھیج کر اسے میٹرک تک پڑھایا۔ لیکن اب وہ چاہتے ہیں کہ کھیتی کا کام سنبھال لے۔ لیکن اس کے دل میں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ اس لیئے وہ اپنے گاؤں سے بھاگ آیا ہے۔ اسکالرشپ کی امید پر وہ جونیر انٹر میں داخل ہو گیا تھا۔ لیکن نہ تو اسکالرشپ ہی ملی، نہ فیس ہی معاف ہوئی خوشحال لڑکے بھی فارمس میں اپنے آپ کو مفلس ہی ظاہر کرتے ہیں۔ گورنمنٹ کو کیسے پتہ چلے کہ اصلی حقدار کون ہے؟ مجبوری سے تعلیم منقطع کرنی پڑی، لیکن وہ دل میں ٹھان چکا ہے کہ گاؤں واپس نہیں جائیگا۔ خود کما کر پڑھیگا۔ کچھ بچ رہے تو بوڑھے ماں باپ کو ہر ماہ بھیجتا رہیگا۔ مجھے اس لڑکے پر بڑا ترس آیا، ہم سمجھتے تھے کہ ہم ہی بڑی مصیبت میں ہیں۔ لیکن ہم سے بھی کتنے گئے گزرے ہیں۔ دوسرا امیدوار بہت ہی کم سن معلوم ہوتا تھا۔ غالباً میٹرک پاس ہوگا۔ سب سے پہلے مجھے طلب کیا گیا۔ منیجر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "تم ہی مسٹر پرکاش ہو، ایم۔ اے ہو نا؟" "ہاں" "تو تمہیں کو منتخب کیا گیا ہے؟" منیجر کچھ لکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔ "لیکن تمہیں معلوم ہے یہ کس قسم کا جاب Job ہے؟"

'ہاں۔ کلیرکل قسم کا۔ بارہ سے چھ گھنٹے تک کام کرنا ہوگا'۔ 'تو تم نے یہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی درخواست بھیجی تھی؟' 'ہاں' 'اچھا تو کل سے کام پر آجاؤ'۔ میں تشکریہ کہکر پلٹا ہی تھا۔ کہ منیجر نے پھر پوچھا۔ 'لیکن یہ بھی جانتے ہو تمہیں کتنا ملیگا؟' 'نہیں'۔ 'صرف پچیس روپے پر اسٹارٹ کیا جائیگا'۔ 'تو معاف کیجئے میں یہ قبول نہیں کرسکتا'۔ میں نے معذرت کی۔ 'اچھا۔ اب دوسرے امیدوار کو بلا لاؤ'۔ منیجر چپراسی سے کہہ رہا تھا۔ میں چلا آیا۔ باہر وہ دونوں کھڑے تھے۔ پہلے لڑکے نے بے تابی سے پوچھا 'کیوں' مل گیا کیا؟' 'ہاں ملا۔ لیکن میں نے قبول نہیں کیا'۔ 'کیوں؟' 'صرف پچیس روپیہ تنخواہ ہے'۔ یہ سنکر دوسرا کم سن لڑکا جانے لگا۔ لیکن پہلے لڑکے کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ 'میرے لئے' یہی بہت کچھ ہے'۔ کہکر وہ چپراسی کے ساتھ ہو لیا۔ جاتے ہوئے اس نے مجھے تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے میں نے اس کے خاطر نوکری کو ٹھکرا دیا ہو۔"

"پھر؟" تارا سنگھ نے پوچھا۔

"پھر کیا؟ میں یہاں تمہارے سامنے حاضر ہوں۔ پہلے کی طرح بے روزگار"

"شاید ہماری اس بے روزگاروں کی مجلس میں کمی ہوگی ہی نہیں۔" مجروح نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔

"اور یہ ہر روز ٹائمز آف انڈیا آفس کا طواف! بھئی میرا تو جی اکتا گیا ہے۔" دیسائی نے سر تھامتے ہوئے کہا۔

البتہ حمید کا خوب بن گیا۔

اور حمید تھا بھی بڑا 'وہ' اور نہ ہم سب کی نظریں بھی تو اس اشتہار پر ہر روز پڑتی تھی۔ ہم سے کیسے سوجھی کہ اسے درخواست بھیجیں، ہمیں خیال تک نہ گزرا۔ شریمتی جی کے آنے کے بعد بھی نہیں۔ حمید ہی کو مبارک ہو یہ کام۔"

"وہ شروع ہی سے ٹھاٹ میں تھا۔ ان شریمتی کو اپنی طرف ملتفت کرنے کی کیا کیا کوششیں کیا کرتا تھا۔ نئے نئے سوٹ پہن کر کیسے بن ٹھن کر آیا کرتا!"۔

"اور چھوٹی سی چھوٹی بات میں دیوی جی کا کیسے لحاظ رکھا کرتا۔ گویا ساری شولری (chivalry) اسی پر ختم ہوگئی ہے۔ جب حمید ایسی بھونڈی صورت لئے دیوی جی کی دوستی حاصل کر سکا تو کیا ہم کامیاب نہ ہو سکتے تھے؟ سلیم کی وجاہت تو دیوی جی کو . . . ." بھروچہ بولا۔

"ارے بھئی سلیم کا نام کیوں لیتے ہو؟" ڈیسائی نے قہقہہ لگایا۔ "وہ کہاں پڑینگے ایسے بکھیڑوں میں۔ وہ تو بیچارے عورتوں سے دور بھاگتے ہیں"

"میں نے اپنی تعریف ہوتی دیکھکر انکسار ظاہر کرنے کیلئے موضوع کو بدلکر کہا "آج حمید سے بھی آپ لوگ مل لینگے"

"ارے حمید یہاں کہاں؟ وہ ماتھیران سے بمبئی کیوں آیا؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ میں ماٹنگا جا رہا تھا، دادر کے چوراہے پر حمید نظر پڑا بہت بھیڑ تھی میں نزدیک جا کر بات نہ کر سکا۔ ایسے ہی دور سے سلام کر کے کہدیا۔ آج رات ضرور کاسکر ہاسٹل آنا۔ ڈیسائی اور بھروچہ بھی آ رہے ہیں۔ 'اچھا ضرور' کہکر چلدیا۔ لیکن بھئی نہ جانے کیوں وہ مایوس سا نظر آتا تھا"

"شاید لوگوں کو گمان ہوگیا ہوگا کہ وہ میاں بیوی نہیں ہیں"

"ہاں، نہ جانے وہ وہاں کیسے رہتے ہوں گے!"

"ارے . . . تم ہی چٹ کر رہے ہو" تارا سنگھ نے دیسائی کو ایک اور سموسہ لیتے دیکھکر کہا "حمید کے لئے کچھ رکھ چھوڑ دینا"۔ "ہاں بھئی خوب یاد دلایا" دیسائی نے سموسہ رکھدیا۔ دو سموسے اور چار بسکٹ رکابی میں بچ رہے تھے۔ ہم

سب نے کھانا ختم کر کے چاے پینی شروع کی۔

" تو آج ہماری پوری ٹولی یہاں حاضر ہے" بھروچہ نے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔

" لیکن وہ کہاں گیا جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہا کرتا تھا؟ وہی کم سن، خوبصورت سا نوجوان، میں نے پہلے تین چار دن اسے برابر ٹائمز آف انڈیا آفس آتے دیکھا۔ لیکن اس کے بعد وہ نظر ہی نہ آیا" میں نے دریافت کیا۔

" سرفراز کو پوچھ رہے ہو؟ وہ بیچارہ بھی بڑی مصیبت میں ہے" بھروچہ نے مغموم لہجہ میں کہا " وہ تم سے پہلے بھی ٹائمز آف انڈیا آفس آیا کرتا تھا۔ چند ہی دنوں میں میری اس سے گہری دوستی ہو گئی۔ بڑا سیدھا سادھا، ملنسار نوجوان ہے میں جس وقت ہر روز ٹائمز آف انڈیا آفس جایا کرتا تھا سرفراز بھی قریب قریب اسی وقت آ پہنچتا۔ ایکدن میں نے بہت انتظار کیا لیکن وہ نہ آیا۔ میں ایک درخواست اوپر دے کر نیچے آرہا تھا کہ سرفراز آتا دکھائی دیا۔ اس دن وہ خلاف معمول بہت خوش نظر آرہا تھا۔ وہ جلدی جلدی سیڑھیاں طے کرتا ہوا میرے پاس آگیا۔ 'سنتے ہو، بھروچہ؟ مجھے بہت اچھی جگہ نوکری مل گئی'۔ 'مبارک ہو بھئی' میں نے اس کی پیٹھ ٹھونکی'۔ 'کہاں ملی، تنخواہ کیا؟'

' پرائیویٹ ٹیوشن! کریم بھائی رحمت اللہ کی لڑکی میٹریکیولیشن کے لئے پڑھ رہی ہے اسے انگریزی اور میاتھس میں کوچ اپ کرنا ہوگا۔ یار، سیٹھ بہت اچھے آدمی ہیں۔ صرف ایک ہی لڑکی کو پڑھانے کے لئے انہوں نے تیس روپیہ دینا منظور کرلیا ہے'۔ مجھے بہت تعجب ہوا کہ اس نے تیس روپیہ کی نوکری قبول کرلی ہے۔ میں نے کہا 'یہ تم نے کیا کیا سرفراز! کچھ اور دن انتظار کر لیتے۔ کوئی اچھی سی نوکری مل جاتی۔ بمبئی ایسی جگہ تیس روپیہ میں کیا گذر ہو سکیگا؟' 'تم نہیں جان سکتے بھروچہ، تیس روپئے میرے لئے کیا ہیں!' سرفراز کی آنکھوں میں آنسو آگئے"۔

پھر اس نے بتایا کہ اس کا باپ بچپن ہی میں چل بسا۔ بیوہ ماں نے اپنے گہنے بیچ کر، قرض لیکر کتنی مصیبتوں سے اسے بی۔ اے تک پڑھایا۔ اب ان کے پاس ایک پھوٹی کوڑی نہیں۔ کبھی کبھی وہ دن بھر صرف چاء پی کر گذارتا ہے۔ خیر وہ کیسے بھی گذار لیگا۔ بوڑھی ماں کی تکلیف اس سے دیکھی نہیں جا سکتی۔ سیٹھ بہت رحمدل ہیں۔ انہوں نے اسکی بپتا سنی تو کہا 'میں معمولاً پندرہ یا بیس روپیہ ہی دیا کرتا تھا، لیکن تمہیں تیس دیتا ہوں'۔ پھر رفتہ رفتہ سرفراز نے سیٹھ جی کے دل میں گھر کر لیا۔ انہوں نے کہدیا کہ کھانا بھی وہیں کھا لیا کرے۔ سرفراز سیٹھ جی کے گھر کھا لیا کرتا اور دن کا بیشتر وقت وہیں گذارتا۔ وہ ایم۔ اے کی تیاری کر رہا تھا۔ سیٹھ صاحب کے بڑے لڑکے ایم اے میں پڑھ رہے تھے۔ وہ اپنی کتابیں ضرورت کے وقت دیدیا کرتے۔ سرفراز اپنی تنخواہ میں سے بیس روپیہ اپنی ماں کو دیدیتا۔ وہ بہت خوش تھی۔ پھر ایک اور مصیبت آن پڑی۔ لڑکی اس پر ریجھ گئی۔ پہلے تو سرفراز نے بہت احتراز کیا۔ کہ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ دونوں میں کتنا فرق ہے۔ لیکن آخر کب تک؟ وہ بھی آخر کھنچ گیا۔ اسکول کے سبق کے ساتھ ساتھ پریم کے سبق بھی ہونے لگے۔ سرفراز روز روز کے واقعات مزے لے لیکر سنایا کرتا۔ میں بھی اسے خوب چھیڑتا......."

"پھر کیا ہوا؟ کیا سیٹھ صاحب کو پتہ چل گیا؟" دیسائی نے پوچھا۔

"نہیں سیٹھ صاحب کو ابھی اس کا پتہ نہیں چلا تھا"

"تو پھر؟"

"آج کل جنگ کے ڈر سے بہت سے لوگ بمبئی چھوڑ رہے ہیں نا؟ سیٹھ جی بھی اپنی فیملی کے ساتھ چلے گئے۔ انہوں نے سرفراز کو بلایا بھی کہ ان کے ساتھ چلے آئے۔ لیکن وہ اپنی ماں کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ سرفراز مجھے پرسوں ملا تھا۔ وہ اب

کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ ایک تو پھر وہی بے روزگاری اور.... پھر تو تم جانتے ہی ہو۔ کہنے لگا 'پھر دیکھ میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں گا'! مجھے اسکی کم سنی پر رحم آیا۔ میں نے اسے سمجھایا۔ 'اتنے مایوس نہ ہو سرفراز! کوئی دوسری نوکری مل جائیگی۔ اپنی زندگی کا سودا کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟' 'زندگی' جینا؟' اس نے طنز سے ہنس کر کہا 'یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ آخر میں کس امید پہ کس لئے جیوں۔ فوج میں بھرتی ہو جاؤں تو میں اپنی بوڑھی ماں کی تو مدد کر سکوں گا۔ میں مر جاؤں بھی تو گورنمنٹ اسکی مدد کرتی رہیگی۔ ماں کی زندگی تو آرام سے کٹ جائیگی!'۔ لیکن اسکی ماں روتی ہے مجھ سے گڑگڑا کر کہتی ہے۔ 'کسی طرح اسکے دل سے یہ خیال نکال دو' بیٹا! میں بھوکوں مروں گی مگر اپنے لال کو موت کے منہ میں نہ بھیجونگی۔ مجھے روپیہ نہیں چاہئے۔ یہی تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے! لیکن سرفراز مانتا ہی نہیں۔"

سرفراز کی داستان سنتے وقت محفل پر اداسی سی چھائی ہوئی تھی۔ آہٹ پر ہم نے مڑ کر دیکھا۔ حمید آ کھڑا ہوا تھا۔ "حمید تم نے بہت دیر کی۔ سلیم نے سموسے منگوائے تھے۔ ہم سب چٹ ہی کرنے والے تھے"۔ حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ دیسائی کے پاس آ بیٹھا۔ "کیوں بمبئی نوکری ملنے پر ہم بے روزگاروں کو بھول گئے؟ ہم سے بات کرنا تک عار سمجھتے ہو؟" وہ پھر خاموش رہا۔ "لو کھاؤ تو حمید!" میں نے اصرار کیا۔ "میں باہر والے کو آواز دیتا ہوں۔ وہ صاف کر دیگا۔ بیچارہ کب تک انتظار کرے"۔ وہ کھا نہیں رہا تھا۔

"چھوڑو سلیم! وہ ہم غریبوں کے گھر کیا کھائیں گے۔ انکو تو دیوی جی مزے مزے کی چیزیں پکا کر کھلاتی ہونگی"۔ تارا سنگھ نے حمید کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں حمید تم بمبئی کیوں آ گئے۔ کیا دیوی جی بھی ساتھ آئی ہیں؟"

"نہیں وہ تو چلی گئی"۔ حمید نے مایوسانہ لہجہ میں کہا۔

"چلی گئی؟ کیا کہہ رہے ہو؟ تمھیں دھوکا دیکر۔ وہ تو تمہاری دوستی کا یوں دم بھرا کرتی تھی!"

" اسمیں اسکا کچھ قصور نہیں۔ بورڈنگ والوں کو شک ہونے لگا تھا کیونکہ ہم الگ الگ کمروں میں رہا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں یہ بھی پتہ چل گیا کہ میں مسلمان ہوں اور وہ ہندو۔ اگر وہی نوکری سے برطرف کردیتے تو کتنی بے عزتی ہوتی! ہم سوچ ہی رہے تھے کہ استعفیٰ دیدیں۔ اتنے میں مس کملا کو اچھی سی نوکری ہاتھ لگی۔ یہ کام قبول کرنے کے پہلے ہی اس نے ایک اور جگہ درخواست بھیجی تھی۔ اس کا جواب اب آیا۔ میں نے اس سے کہا۔ نوکری ضرور قبول کرے۔ وہ پہلے کچھ ہچکچائی کیونکہ میرا کام بھی ہاتھ سے جاتا۔ لیکن میں نے اصرار کیا تو وہ چلی گئی۔"

" ہم تو تمہیں کو خوش قسمت سمجھتے تھے اب پھر سے تم اس بے روزگاروں کی ٹولی میں شامل ہوگئے!"

" اب کیا کیا جائے؟" بھروچہ نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا " اس بے روزگاری کا کوئی حل بھی ہے؟" "کیوں نہ ہم بھی سرفراز کی طرح جنگ کے لئے اپنی خدمات پیش کردیں؟ آج کل ملٹری میں گریجویٹس کی مانگ ہے۔ دو تین سو روپئے پر سٹارٹ کیا جا رہا ہے"۔

" ایسی مصیبت بھری طویل زندگی سے کیا فائدہ۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ چند دن جئیں لیکن اچھی طرح جئیں"۔

میں بھی اس فیصلے سے متفق ہوں۔ اگر مرنا ہی ہے تو کوئی ایسی جگہ مرے جہاں دو ہاتھ زمین بھی نہ مل سکے۔ کیا ضرور رہتا کہ کوئی مرے تو اس کی گھناؤنی نعش پر لوگ نماز پڑھیں اور کسی جگہ دفن کرکے اس کا ایک نشان باقی رکھیں۔

(نام اور مقام فرضی ہیں)

جون سنہ ۱۹۴۲ء

ضیاء الاسلام

اقبال کی شاعری میں علائم کا استعمال

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ؎ ساقی نے بنا کی روش لطف و کرم اور اقبال کے پیام نے دل و دماغ کو اس طرح مسحور کر لیا ہے کہ اسکے آرٹ کی طرف بھول کر بھی نظر نہیں جاتی، حالانکہ اقبال کی عظمت کا دار و مدار فلسفہ اور پیغام عمل سے کہیں زیادہ محاسن شعری پر ہے۔ بحیثیت صناع و لفظ تراش ہمارے اساتذہ میں اقبال کا کوئی حریف نہیں۔ انکی ادبیات کی فہرست طویل ہے، لیکن اسوقت ہمیں بحث ایک ایسے وصف سے ہے جو اقبال سے پہلے بھی اردو شاعری میں موجود تھا۔ یعنی علامتوں کا استعمال۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام   چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

غالب کے ان مشہور اشعار سے ہماری کلاسیکل شاعری کی اس خصوصیت کی توصیف بھی ہو جاتی ہے اور تجدید بھی۔ علائم سے یہی دو کام لئے جاتے ہیں یعنی مشاہدہ حق کی گفتگو اور ناز و غمزہ کا بیان یا دوسرے الفاظ میں تصوف اور تغزل۔ تغزل میں علائم کے پردے میں محبوب کے خد و خال اور جور و ستم کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مثلاً محبوب کے لئے سرو، شمشاد، قاتل اس ہی قسم کے اور الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں اور اسکی اداؤں کے لئے تیر و سنان، دشنہ و خنجر وغیرہ۔ تصوف میں محبوب حقیقی کا ذکر معشوق مجازی کے اوصاف کی آڑ میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً زلف، رخ، نقاب، وصل و فراق۔ غمزہ و ناز سے روحانی کیفیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔

جس طرح استعارات کثرت استعمال سے اپنی خصوصیت کھو بیٹھتے ہیں اور محاورات میں ضم ہو جاتے ہیں بعینہ اسی طرح علامتیں جب نادانستہ طور پر اور بغیر امتیاز رسماً استعمال کیجاتی ہیں تو بجائے ادائے مطلب میں معاون ہونے کے وہ مضمون کا گلا گھونٹ دیتی ہیں۔ ہماری غزلوں کی کثیر تعداد پکار پکار کر یہی گلہ کر رہی ہے۔ اقبال نے پرانی علامتوں کو نئے مضامین کے اظہار کے لئے آلۂ کار بنایا، انکے مردہ قالبوں میں دوبارہ جان ڈالی اور پرانی میناؤں میں نئی شراب بھر دی۔ اقبال کی یہ اصلاح ورڈسورتھ کی مشہور اصلاح سے کم نہیں لیکن خوش قسمتی سے ہمارا مصلح انگریزی شاعر کی بے اعتدالیوں سے محفوظ رہا۔ ورڈسورتھ نے اس رسمی اور مصنوعی زبان کو یک قلم ترک کر دیا تھا جو ڈرائیڈن، پوپ اور ان کے اسکول کا طرۂ امتیاز تھی۔ اقبال نے اس سے زیادہ دشوار مگر صحیح راستہ اختیار کیا۔ اس نے اپنے پیروؤں کی زبان خصوصاً ان کی علامتوں کو رسمیت اور تصنع کی زنجیروں سے آزاد کیا اور ان سے عشق اور تصوف کے مضامین کے علاوہ نئے نئے خیالات و افکار ہم تک پہنچائے۔ انفرادی احساسات اور جذبات و توہمات کے بجائے پرانی علامتوں نے اجتماعی تصورات اور قومی اور ملّی افکار و تخیلات سے رسم و راہ پیدا کی۔ شراب کہنہ تو لطف دیتی ہے لیکن اس کے ذکر کا طرز کہنہ ہو تو طبیعت اسے قبول نہیں کرتی۔ ہمارے شعرا کی شراب آتش سیال نہیں رہی تھی بلکہ گدلا پانی بن گئی تھی۔ اقبال نے اسے اور اس کے لوازمات کو زندہ کر دیا۔

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے   ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

اور

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے   مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

شراب، جام، ساقی، نشہ، محفل ان بوسیدہ علامتوں کے کوزہ میں اس نے ایک دریا بند کر دیا۔ ان تنگناؤں کو اس نے کائنات کی وسعت عطا کی۔ ان نگوں کو تراش کر اس نے انکو ہشت پہلو بنا دیا اور ہر پہلو کو ایک نئے مفہوم کا حامل۔ احیا اور

تجدید کی۔ یہ لہر خم اور ساغر سے نکل کر خنجر کی آب، تلوار کی باڑھ، اور بسمل کی تڑپ، میں جلوہ گر ہوئی۔ مختصر یہ کہ کوئی پرانی علامت یا نقش ایسا نہ ملیگا جسے اقبال نے نئے مفہوم میں استعمال نہ کیا ہو۔ مثال کے طور پر "شمع و شاعر" کے اس بند کو لیجئے۔

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے   لیکے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا
انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے   ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی   پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا
آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ   صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا   اب کوئی سودائیِ سوزِ تمام آیا تو کیا

پھول بے پروا ہیں تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آوازِ درا ہو یا نہ ہو

اس میں عاشق و معشوق، مے اور میخوار، بسمل و قاتل، شمع و پروانہ، گل و بلبل۔ ان تمام کلاسیکل علامتوں کے تار پود سے شاعر نے قومی و سیاسی افکار کے لئے ایک نئی فضا تیار کی ہے وہ الفاظ جن سے لوریاں دیجاتی تھیں اب رجز میں استعمال ہونے لگے۔ وہ الفاظ جو دل شکستہ عاشق استعمال کرتے تھے۔ اب ملک و قوم کے فدائیوں کی زبان پر رقص کرتے ہیں۔ یہ اقبال کا سب سے بڑا فنی کارنامہ ہے اور کسی دوسرے ادب میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔

لیکن اقبال کی صناعی تجدید و احیا پر ہی ختم ہو کر نہیں رہگئی اس نے ایجاد و اختراع کے مراحل بھی طے کئے۔ ذیل کی علامتوں میں زندگی تیزی کے ساتھ سانس لے رہی ہے۔ وہ نقوش زیادہ بلیغ اور پر اثر رہتے ہیں جو متحرک ہوں مثلاً شاہین و عقاب، بال و پر، موج و طوفان، شعاع و شبنم، آتش و آہن، کارواں و درا، رحیل و سفر، رستخیز و محشر، سیارہ و سیماب، گردوں و گرداں، مہر و ماہ وغیرہ۔

کسی ایسے شخص کو جو اقبال کی شاعری سے واقف نہ ہو اگر صرف یہ بتلایا جائے کہ یہ الفاظ اقبال کے کلام میں بار بار استعمال ہوتے ہیں تو وہ ان کے نقوش سے شاعر کے کلام کا مطالعہ کئے بغیر اس کے پیام، شخصیت اور فلسفہ کا اندازہ بخوبی کر لے گا. شاعری میں علائم کا کیا مقام ہے ان میں شاعر کے ارادہ کو کہاں تک دخل ہے انسے شعر میں کیا اضافہ ہوتا ہے، ادبی روایات میں انکا کہاں تک جواز ملتا ہے، یہ تمام مسائل ہمارے موضوع سے متعلق ہیں، لیکن ہم ان پر صرف ایک سرسری نظر ڈال سکتے ہیں۔

شاعر کا تخیل تصاویر کے بازوؤں پر اڑتا ہے. شاعر کا اوڑھنا بچھونا نقوش ہیں وہ نقوش جو تحت الشعور میں محفوظ رہتے ہیں، جن کا انتخاب اور جنکی تنظیم شاعر کا شعور ہیجان کی حالت میں کرتا ہے، لہٰذا علامتوں کے استعمال میں شاعر کے مقصد کا حصّہ بہت کم ہے اور نہ یہ علامتیں خارجی تنزیں کے لئے استعمال کی جاتی ہیں یہ شعر کا زیور نہیں اس کا گوشت پوست ہیں۔ یہ علامتیں اور نقوش نہ صرف ادائے مطلب میں معاون ہوتے ہیں، یہ نہ صرف کسی کیفیت یا منظر کا جیتا جاگتا مرقع سامنے لے آتے ہیں، بلکہ شعر کے زور، حسن اور اختصار میں انسے نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ ہی نہیں انکی تکرار جدّت، اثر اور معنوی یگانگت کی ضامن ہے۔ کھرے اور کھوٹے، فطری اور مصنوعی تمیز کے لئے نقوش و علائم سے بہتر کوئی کسوٹی نہیں۔ انکا وجود آرٹ کو پروپگنڈے اور شاعرانہ خیالات کو فلسفیانہ افکار سے ممتاز کرتا ہے۔

بیسویں صدی میں مغربی تنقید نے الفاظ کے اس شعبہ پر بہت زور دیا ہے۔ شکسپیر جیسے اساتذہ کی تصانیف کی لفظ شماری کی گئی دیکھا گیا کہ ایک ڈرامہ میں ایک نقش، ایک تصویر، ایک لفظ کتنی بار استعمال ہوا ہے۔ اس طرح تصنیف اور مصنف کے تعلق قابل قدر انکشافات ہوئے، جنکی صداقت میں کلام نہیں کیونکہ نقوش کی تکرار شاعر کے شعور کی ملمع کاری سے محفوظ رہتی ہے، ہمارے بعض نقاد

اقبال کے علائم کو اس کی شاعری کا مدفن سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ تو اسکی عظمت کا ثبوت ہیں۔ ان میں تصنع اور رسمیت کی بو ان ناقدین کو آتی ہے جو اردو اشعار کو جانچنے سے پہلے انکا انگریزی میں ذہنی ترجمہ کرتے ہیں۔

اقبال اور انگریزی شاعر شیلے کی شخصیتوں میں بعد المشرقین ہے لیکن انکے نقوش و علائم بعض خصوصیات میں مشابہ ہیں۔ شیلی کی طرح اقبال بھی اکثر قدروں کو ختم کر دیتا ہے۔ شیلی عقاب اور سانپ کی کش مکش میں بالترتیب بدی اور نیکی کا تصادم دیکھتا ہے اور شہاب ثاقب کو جیسے دنیا منحوس سمجھتی ہے وہ مبارک بتلاتا ہے۔ اقبال بھی رائے عامہ کے خلاف شاہین اور کبوتر میں شاہین کو ترجیح دیتا ہے۔ اسکی نظر میں وہ خونخوار اور ظالم نہیں بلکہ غیرت، جد و جہد اور بلند حوصلگی کا پیکر ہے۔ اسی طرح موج کے طمانچے ساحل کی آغوش سے زیادہ دلکش ہیں۔ زمانہ اور اسکی قدروں کے خلاف ان دونوں شاعروں نے جو بغاوت کی تھی اس کا عکس انکی علامتوں میں بھی ملتا ہے۔ کیٹس کے برعکس اور شیلی کی طرح اقبال بڑی حد تک سکوت اور سکون کے تصور تک سے قاصر تھا شیلی کی طرح اس کے حواس کو حرکت کا شدید احساس تھا متحرک تصاویر سے اقبال کا کلام پڑھئے لیکن شیلی سے اسکی مماثلت یہاں ہی ختم ہو جاتی ہے۔

علائم میں نہ حرف و نقوش داخل ہیں جن کے ذریعہ شاعر اپنے زندگی کے نظریہ اپنے جذبات و احساسات، افکار و تخیلات متشکل کرتا ہے بلکہ وہ لفظ وہ تصورات اور وہ نقوش بھی جن کا وہ نادانستہ طور پر اعادہ کرتا رہتا ہے۔

اقبال کے علائم اسکی وسعت مطالعہ، اسکی فلسفہ زندگی اور اس کے مسائل حاضرہ پر عبور کے مرہون منت ہیں۔ اسکے اشعار میں ہر ہر قدم پر بیرونی فطرت کی طرف اشارات ملتے ہیں جنکی تکرار نے اقبال کے لب و لہجہ کو آفاقی آہنگ کی دولت عطا کی ہے۔

ہر بڑا شاعر جو کچھ کہتا ہے اس سے زیادہ کہہ جاتا ہے یعنی الفاظ کی سطح کے نیچے معانی کی بے شمار تہیں پوشیدہ ہوتی ہیں اور شاعر پر ہی کیا منحصر ہے اچھے نثر نگار بھی مختلف قارئین کو ان کے ظرف کے مطابق محفوظ کرتے ہیں۔ ڈین سویفٹ کا شاہکار "گلیور کی سیاحتیں" بچوں کے لئے ایک دلچسپ کہانی ہے مورخین کے لئے اٹھارویں صدی کے سیاسی اور معاشی نظام پر ایک گہرا طنز ہے۔ سوانح نگار کو اس میں لاتعداد کارٹون نظر آئیں گے اور اخلاقیات کے طالب علم کو اس میں مشکک کے ہذیان کی صدا آئیگی۔

ہمارے شاعروں میں اقبال نقوش کی کثرت اور انکی وسعت اطلاق میں منفرد ہے۔ انکے اشعار ایسے ہیں جن میں بیک وقت عاشق محبوب، میخوار دخت رز، صوفی معرفت اور مورخ سیاست کی جھلک دیکھے گا۔ دراصل اقبال کے کلام کی بنیاد ہی علائم پر ہے اور انکی تعبیر ہی نقوش و تصاویر کے عنصر سے ہوتی ہے۔ یہی خصوصیت ہے جس نے فلسفہ کو شاعری کا مرتبہ دیا ہے، جس نے خیالات کو جذبات کی دلکشی بخشی ہے، جس کی بدولت افکار و احساسات گھل مل گئے ہیں، جس کے طفیل میں خشک مسائل غزل کے حسن سے دمکنے لگے ہیں، جس کی بدولت اقبال کے کلام کے معنوی امکانات بے کراں اور اس کے اشعار کی گہرائیاں اتھاہ ہو گئی ہیں۔

سخن برہنہ نہ گفتن کمال گویائی ست

سلطان حیدر جوش کا تازہ ناولٹ
ہوائی
نظامی پریس بک ایجنسی، بدایوں، قیمت ۸/

ممتاز شیریں

۱۹۴۴ - افسانوی ادب کا ایک اہم سال

۱۹۴۳ء میں اردو افسانوی ادب کی رفتار کچھ سست سی رہی تھی، لیکن ۴۴ء نے اس صنف ادب میں بہت اضافہ دیکھا۔ اس سال کا ادب Rich ہے، وسیع، بحث اور تنوع کا حامل۔ گو سال بھر کے مختلف رسالوں میں فہرست پر نظر ڈالتے ہوئے اس دفعہ کبھی کئی مشہور نام نظر نہیں آتے اور بعض نے صرف ایک یا دو افسانے لکھ کر جیب سادہ لی ہے پھر بھی اس سال اچھے افسانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انکی فہرست پیش نہیں کی جا سکتی۔ ۴۳ء میں یہ حال تھا کہ اچھے افسانے انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ اس سال چند اچھے لکھنے والے اپنے فن کے معراج پر ہیں اور چوٹی کے افسانہ نگار بھی اپنے بہترین روپ میں نظر آتے ہیں۔ انکے علاوہ، ۴۴ء نے لکھنے والوں کے ایک نئے سٹ کو پیدا ہوتے دیکھا۔ ان نئے لکھنے والوں کے فن کی ابتدا ہی نہیں ہوئی بلکہ اس ایک ہی سال کے اندر ان کے فن نے تشکیل بھی پا لی ہے۔ لکھنے والوں کا یہ نیا سٹ ہر لحاظ سے، مجموعی طور پر، درمیانی سٹ سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

درمیانی سٹ سے میری مراد وہ سٹ ہے جو پچھلے تین چار سال میں بنا تھا۔ اس میں مہندر ناتھ، مدھوسودن، بلونت سنگھ، چندر کانت، راماننداسا گر، شیر محمد اختر، شکیلہ اختر، ابراہیم جلیس، ابو الفضل صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ افسانہ نگار ہیں جن کی پہلی کوششیں دیکھ کر ان سے مستقبل کی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں، لیکن ان میں سے دو تین کے علاوہ کسی کا فن ابھرا نہیں۔ اور بعض زیادہ لکھنے کے باوجود معیار سے اتنے گھٹ گئے ہیں کہ دورِ جدید کے افسانہ نگاروں میں، ان کا نام گنانے کو جی نہیں چاہتا۔

شیر محمد اختر کے نئے افسانے —— زخم، خدا، سہارا، کیمرہ ٹانگٹ، ہار، پروانہ، ڈاکٹر جان، فطرت پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اسی افسانہ نگار کے قلم سے کبھی پی سی ایس، اور سراب، جیسے افسانے بھی نکل چکے ہیں؟ 'فطرت' قدرے اچھا افسانہ ہے۔ 'ہار' کا موضوع اچھا ہے لیکن افسانے میں موضوع ہی نہیں بلکہ موضوع کا مناسب انداز سے پیش کرنا، زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اچھے سے اچھا موضوع ایک معمولی لکھنے والے کے ہاتھوں تباہ ہو سکتا ہے اور معمولی موضوع سے اعلیٰ فن کار کے ہاتھوں ایک شہ کار کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بیدی کا 'نگالی' پڑھیئے۔ کتنا معمولی موضوع ہے اس سے اتنا اچھا اور اتنا دلچسپ افسانہ تیار کرنا بیدی ہی کا حق تھا۔ شیر محمد اختر کے یہ افسانے پڑھتے ہوئے جملہ جملہ پر کاوش محسوس ہوتی ہے، تسلسل اور روانی نام کو نہیں، جیسے بہت سے الگ الگ ٹکڑے جوڑ دیئے گئے ہوں۔ افسانے کیلئے یہ اسلوب بیان بہت ناموزوں ہے بلکہ اس سے افسانوں میں، 'افسانویت' ہی مفقود ہو جاتی ہے —— ابراہیم جلیس کو ایک اچھا افسانہ نگار ماننے میں مجھے تامل ہے گو دو ایک چیزیں انہوں نے اچھی لکھی ہیں۔ ان کے اس سال کے افسانوں میں —— یونیورسٹی کے باہر، چور، بلیک اوٹ، بیب، درانتی اور ہتوڑا، میں صرف 'چور' اچھا افسانہ ہے۔ ہاں، وہ اپنے افسانوں میں بہت تلخ طنز استعمال کرنے کے قائل ہیں، لیکن یہ حد سے زیادہ تلخی طنز کو بے اثر بنا دیتی ہے۔ ہمارے افسانہ نگار طنز کو لازمی سمجھ بیٹھے ہیں گویا چند تلخ طنزیہ جملے ٹھونس دیئے تو افسانہ بہت "ترقی پسند" ہو گیا لیکن اختر رائے پوری، انور، کرشن چندر اور اپندر ناتھ کا سا پر اثر طنز ہر ایک کے حصہ میں نہیں آیا۔ ابراہیم جلیس اکثر اپنے افسانوں میں soap box oratory کرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں فن کا اتنا احساس نہیں۔ میں فن برائے فن یا ادب برائے ادب کی قائل نہیں ہوں۔ لیکن فیض کے اس نظریہ سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ ترقی پسند ادب صرف ترقی پسند ہی نہیں بلکہ ادب بھی ہے۔ ترقی پسند تحریک کا ایک معاشرتی اور انقلابی

پہلو ضرور ہے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کا لازمی نتیجہ ظلم و استبداد ہے اس کو سرے سے بدل دینے کی ضرورت ہے۔ جو افسانہ ہمیں ذہنی طور پر اس انقلاب کیلئے تیار کرے وہ ترقی پسند افسانہ ہے۔ لیکن "ایک افسانے میں محض واقعات کے انتخاب اور ترتیب' اور کرداروں کی (تعمیر و تجزیہ) سے 'ترقی پسندی' کا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس میں سیاسیات اور اقتصادیات پر مستقل لیکچر بھی شامل کئے جائیں" (فیض)۔ ابو الفضل صدیقی بھی اسی درمیانی سمت سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اکثر ایسے موضوع پر لکھتے ہیں جن پر ہمارے دوسرے افسانہ نگاروں نے نہیں لکھا ہے۔ لیکن صد درجہ طویل افسانے لکھتے ہیں اور انہیں پڑھنے میں بے حد اکتاہٹ ہوتی ہے۔ انکا انداز بیان ہی کچھ ایسا گراں بار ہے۔ البتہ اس دفعہ ایک اچھی کہانی لکھی ہے ـــ "اتیمی' جس کے پڑھنے میں آخری وقت تک دلچسپی قائم رہتی ہے اور جسکی ٹریجڈی دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے ـــ شکیلہ اختر کبھی کبھار کوئی افسانہ لکھتی ہیں اور ان کے افسانے کافی اچھے ہوتے ہیں۔ انکا افسانہ "نین ستارے' بہت جذباتی اور رومانی ہے، ایک دوسرا افسانہ 'سوکھا ہوا پودا' رکشے والے کی دردناک کہانی ہے۔ لیکن کوئی خاص چیز نہیں۔

راما نند ساگر اور چندر کانت نے اگرچہ بہت لکھا ہے اور انکا پایہ بھی اوپر ذکر کئے گئے افسانہ نگاروں سے کہیں بلند ہے لیکن انہوں نے ابتک اپنے لئے ایک معین جگہ نہیں بنائی ہے اسلئے کہ وہ کبھی اتنا اچھا لکھتے ہیں کہ داد دینی پڑتی ہے اور کبھی اتنے معمولی افسانے کہ یقین نہیں آتا یہ ان کے ہیں۔ راما نند ساگر کے قلم سے ایک طرف 'موت کے بستر سے' اور "ننگ مرگ کے اڈے پر' جیسے شہ پارے نکلے ہیں تو دوسری طرف انہوں نے اس سال "ایک اور تازیانہ' جیسا بیکار اور اکتا دینے والا افسانہ بھی لکھا ہے۔ ان کا ایک اور افسانہ "بخشش' اس سال "ادبی دنیا' کے فروری نمبر میں شائع ہوا ہے۔ یہی افسانہ "زور و شور' کے عنوان سے "ہندوستان ویکلی' میں گذشتہ سال شائع ہوا

تھا۔ اور اس پر میں نے تفصیلی بحث بھی کی تھی لیکن اس دفعہ افسانے کا آخری پیراگراف اڑا دیا گیا ہے۔ 'آب و آتش' اور 'ناقابل برداشت' رامانند ساگر کے اس سال کے دو اور افسانے ہیں۔ اول الذکر میں بوڑھے مالک مکان لالہ مگن لال کا کیرکٹر سکیچ بڑے خلوص سے کھینچا گیا ہے۔ 'ناقابل برداشت' شادی کے گھر کی بڑی اچھی تصویر کشی ہے۔ اس افسانے کا موضوع جہیز کی بدعت ہے اور اسے بہت ہی موثر اور فن کارانہ انداز میں نبھایا گیا ہے — چندر کانت نے بھی جہاں گذشتہ سال 'سایہ' جیسا شاہکار پیش کیا تھا۔ اس دفعہ 'عمر قید' جیسی معمولی کہانی لکھی ہے جو 'آجکل' میں شائع ہوئی ہے لیکن ۱۹۴۴ء میں دوسرے رسائل میں چھپی ہوئی ان کی دو کہانیاں 'تماشائی' اور 'ڈرٹی ڈاگ' بہت اچھی ہیں۔ 'تماشائی' فریب دہی کا دلکش افسانہ ہے اس میں چندر کانت کی خرد بینی اور Deft Touches سے چندرا اور شنکر کی کردار نگاری خوب ہے۔ 'ڈرٹی ڈاگ' پنڈت جی کا بہت اچھا کیرکٹر سکیچ ہے۔

اس سٹ میں صرف تین افسانہ نگار ایسے ہیں جنہوں نے اپنا پایہ قائم رکھا ہے — مدھوسودن، مہندر ناتھ اور بلونت سنگھ۔ ان میں مدھوسودن اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ مہندر ناتھ نے جیسے جست لگا کر ستاروں کو چھو لیا ہے، صرف 'جہان میں رہتا ہوں' نے انہیں صف اول کے تین چار افسانہ نگاروں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا ہے۔ مہندر ناتھ آگے بڑھ رہے ہیں اور بلونت سنگھ انہیں closely follow کر رہے ہیں۔ ان کا 'دیمک' اس سال کا ایک شاہکار ہے۔

ان تینوں کے سوا باقی سب پیچھے ہٹ رہے ہیں اور لکھنے والوں کا ایک نیا سٹ آگے بڑھ رہا ہے اس سٹ میں اکثر بہت ہونہار ہیں، ان میں تین چار نے تو صرف تین چار افسانے لکھ کر ہی اپنے فن کا سکہ بٹھا دیا ہے — شمس آغا، انور، قدرت اللہ شہاب اور ابن سعید۔ شمس آغا کا فن بہت وسیع ہے، ان میں

ہمہ گیر قابلیت نظر آتی ہے۔ ان کے بہت ہی کامیاب افسانے 'سراب' "صبح و شام' اور شکست' تینوں بالکل الگ الگ طرح کے افسانے ہیں۔ 'سراب' میں ایک وسیع ماحول سمو دیا ہے۔ مختلف قسم کے کردار پیش کئے ہیں، اس افسانے میں فطرت کی عکاسی ہے، رومان ہے (رومان' جو "ناپاک" حقیقت کو دیکھکر ٹوٹ جاتا ہے۔) طنز ہے۔ 'شکست' میں داخلی کیفیتوں کی عکاسی ہے۔ اور 'صبح و شام' میں خارجی ماحول کی تصویر کشی۔ تینوں افسانے ہر لحاظ سے الگ ہیں، لیکن ہر ایک میں شمس آغا کا قلم وہی کاریگری دکھاتا ہے — ہمارے ادب میں ایک دوسرا منٹو پیدا ہوا ہے — آنور — انور ایک شعلہ بن کر نمودار ہوا ہے۔ اس کے قلم میں بلا کا زور ہے، اس کے طنز میں منٹو سے زیادہ تیزی ہے۔ وہ منٹو سے زیادہ بے رحم جراح ہے لیکن بہتر معالج وہ جنس کا ذکر کرتے ہوئے اتنے ہی graphic descriptions دیتا ہے۔ لیکن اپنے افسانوں میں برائیوں سے شدید نفرت دلاتا ہے۔ گو آنور کا کوئی افسانہ ۴۴ء میں شائع نہیں ہوا۔ لیکن انور ۴۵ء کے آرٹسٹ نہیں ہیں۔ انہوں نے پہلے بھی لکھا ہے۔ پھر جانے کیوں خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اب پھر لکھنے لگے ہیں۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی ہے — قدرت اللہ شہاب ان دونوں کے مقابلے میں خاموش فن کار ہیں، وہ ان دونوں کی طرح دھوم دھام سے نقارہ بجاتے ہوئے نہیں نمودار ہوئے۔ لیکن ایک باریک بین نگاہ ان میں جلد ہی ایک کامیاب آرٹسٹ تلاش کر لیتی ہے۔ ان میں یہ خوبی ہے کہ وہ جو موضوع بھی چنتے ہیں اسے اتنے مکمل طور پر اور اتنی اچھی طرح نبھاتے ہیں کہ اور اچھا بنانے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ یہ رائے میں نے ان کے اب تک کے شائع شدہ افسانے پڑھ کر قائم کی ہے۔ 'شلوار' غریب خانہ' 'سٹینوگرافر' سب کا مالک' وغیرہ ۴۴ء میں انہوں نے صرف شلوار لکھا۔ 'شلوار' great story نہیں ہے کیونکہ اس موضوع سے صرف ایک ہلکا پھلکا افسانہ ہی تیار کیا جا سکتا تھا۔ یہ اٹھتی ہوئی جوانی کا افسانہ ہے۔

اور اس میں جوانی کی [illegible] نئی سمت آئی ہے — جوانی کی ساری Vital [illegible] buoyancy۔ پڑھنے والے پر خود یہ کیفیتیں طاری ہو جاتی ہیں ایک کامیاب فن کار کا اس سے زیادہ اور کیا Test ہو سکتا ہے؟ — ابن سعید کی اٹھان بھی اتنی ہی خاموش تھی لیکن ۱۹۴۵ء کے آتے آتے انہوں نے "ماما" جیسا لاجواب افسانہ پیش کیا۔

ان چار کے علاوہ اس نشست پر چند ایسے لکھنے والے بھی ہیں جن کی ابتدا کچھ striking نہیں تھی لیکن جنہوں نے ہر رسالے میں لکھ کر ناظرین کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہ ٹھیک ہے کہ بہت لکھنے سے ان میں سہل انگاری آگئی تھی۔ لیکن اس مشق سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان کے فن میں پختگی آگئی۔ ان کے نئے افسانے بہت کامیاب ہیں۔ ان میں ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور قرۃ العین حیدر پیش پیش ہیں۔ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے ایک ہی سال کے اندر اتنا لکھا کہ ان کی محنت کی داد دینی پڑتی ہے۔ ہر رسالے میں ان کا کوئی نہ کوئی افسانہ ضرور ہوتا تھا پہلے پہل جب انہوں نے لکھنا شروع کیا تو ایسے محسوس ہوا جیسے ان کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہے بلکہ وہ عصمت چغتائی کی تقلید کر رہی ہیں۔ اور زیادہ تر ایک ہی موضوع پر لکھتی ہیں۔ بے جا روک کی وجہ لڑکیوں میں جنسی جذبہ کا پھوٹ نکلنا۔ لیکن اب انہوں نے اپنی انفرادیت قائم کر لی ہے اور دوسرے سوشل افسانے بھی لکھنے لگی ہیں۔ خود ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور میں اتنی مطابقت ہے کہ یہ یاد رکھنا دشوار معلوم ہوتا ہے کہ فلاں افسانہ ہاجرہ مسرور نے لکھا ہے فلاں خدیجہ مستور نے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ ایک ہی موضوع اور پلاٹ پر افسانے لکھتی ہیں۔ لکھنے کی طرز بھی قریب قریب ایک ہی ہے۔ لیکن جہاں ہاجرہ مسرور کے ہاں زیادہ روانی اور فن کا زیادہ احساس ہے، خدیجہ مستور کے افسانوں میں زیادہ پختگی اور گہرائی ہے۔ وہ جنس کا ذکر بڑے ماہرانہ انداز میں کر جاتی ہیں۔

ہاجرہ مسرور نے اس سال آٹھ افسانے لکھے ہیں۔ 'ہائے اللہ'، 'موہنی'، 'نیلم'[1] 'تل اوٹ پہاڑ'، 'میرا بھیا'، 'فروزاں'، 'کمینی'۔ 'ہائے اللہ' اور 'موہنی' اچھے افسانے ہیں۔ لیکن اس کے بعد کے بہت سے افسانے معمولی ہیں شاید سہل انگاری کا باعث 'تل اوٹ پہاڑ' لحاف سے ملتا جلتا افسانہ ہے، کوئی خاص چیز نہیں۔ 'میرا بھیا' اور 'فروزاں' بہت معمولی ہیں۔ 'بندر کے گھاؤ' میں اگر بندر کے گاؤ کا ذکر ہی نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ سماج کی برائیوں کو مضامین میں بیماریوں اور پھوڑوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ افسانوں میں بھی سچ مچ کا پھوڑا بنا دیا جائے۔ 'نیلم' بیکار افسانہ ہے توہمات پر حملہ کرنے کو ترقی پسندی سمجھ کر اتنے معمولی سے (superstition) پر کہ بلی کو منحوس سمجھا جاتا ہے' افسانہ لکھنا تضیع اوقات ہے یوں بھی اس افسانے میں فن کاری کا فقدان ہے، لیکن ان کا افسانہ 'کمینی' جو 'ادبِ لطیف' کے افسانہ نمبر میں شائع ہوا ہے اتنا کامیاب ہے کہ سال کے بہترین افسانوں میں شمار ہو سکتا ہے۔ موضوع 'تکنک' اندازِ بیان ہر لحاظ سے بہت کامیاب ہے اس میں انہوں نے اپنے انداز سے ہٹ کر لکھا ہے اور ایک اہم معاشرتی حقیقت کو بڑی صناعی سے پیش کیا ہے۔ اور اس کے بعد ۴۵ء میں جو افسانے لکھ رہی ہیں وہ کامیاب کوششیں ثابت ہو رہی ہیں۔ 'گربہ مسکین' اور 'کوٹھی' اور 'کوٹھری' دونوں بہت اچھے افسانے ہیں۔ خصوصاً کوٹھی اور کوٹھری بہت بڑھیا کہانی ہے۔

خدیجہ مستور بھی اب ایک پختہ فن کار بن گئی ہیں۔ ان کے پہلے افسانوں 'جوانی'، 'موہنی'، 'یہ بڈھے'، 'یہ ہم ہیں'، 'کیا پایا'، 'لاشیں'، 'پتنگ'، 'دہائی'، 'ہنہ'۔ میں 'جوانی' اور 'موہنی' اچھے ہیں۔ 'یہ بڈھے' ایک ہلکا پھلکا افسانہ ہے۔ ہاجرہ مسرور نے اسی طرح کے موضوع کو 'گربہ مسکین' میں زیادہ صناعی سے نبھایا ہے۔ 'یہ ہم ہیں' دلچسپ افسانہ ہے طرزِ تحریر بھی چست اور شگفتہ ہے لیکن بالکل عامیانہ چھیڑ چھاڑ کے ساتھ ساتھ کچھ 'مہذب' قسم کی چھیڑ کا بھی ذکر ہوتا ـــ جس کی مثالیں منٹو نے اپنے مضمون 'چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد' ـــ میں

---

[1] نیلم۔ اپریل ۴۴ء کے منزل میں شائع ہوا تھا اب ۱۵ جون ۴۵ء کے آجکل میں بھی شامل ہے۔

دی ہیں ــــ تو افسانہ اور فطری اور کامیاب ہوتا۔ 'پتنگ' اور 'دلہائی' بالکل معمولی افسانے ہیں۔ 'کیا پایا' اور 'لاشیں' میں اہم موضوع چنے گئے ہیں لیکن ان سے سنبھلے نہیں۔ 'کیا پایا' بالکل سطحی ہو کے رہ گیا ہے۔ اور "لاشیں" کے اختتام میں سب لڑکے لڑکیوں کا Wholesale Transformation افسانے کو تخیلی بنا دیتا ہے۔ 'ہُنہ' جو ادب لطیف کے افسانہ نمبر میں شامل ہے بے حد کامیاب افسانہ ہے۔ رونق میاں کی بیوی کی بے بسی کی بہت اچھی تصویر کھینچی ہے۔ بیچاری کے پاس عزت کے سوا رہ کیا گیا ہے بس اسی سے بسم اللہ پر اپنی فوقیت جتاتی ہے۔ "ہُنہ" سال کے بہترین افسانوں میں سے ہے۔ ان کے فن میں اب بہت پختگی آ گئی ہے۔ ان کے ۴۵ء کے افسانوں میں "یہ گاؤں ہے" کامیاب افسانہ ہے۔ "تکنیک میں جدت کی ہے۔ "چپکے چپکے" بہت کامیاب افسانہ ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے 'ہنگائی الاؤنس' سے بہت ملتا جلتا ہے لیکن احمد ندیم قاسمی لطیف اشاروں میں کہکر آگے بڑھ گئے ہیں۔ خدیجہ مستور نے کھلا کھلا بیان کیا ہے۔ اور "ملمع" میں انہوں نے موضوع کو پوری گہرائی سے دکھایا ہے۔ ایک بہت Poignant story تخلیق کی ہے۔ یہ ان کی بہترین کوشش ہے۔

قرۃ العین حیدر نے بھی پہلے پہل حجاب امتیاز علی کے انداز میں لکھنا شروع کیا لیکن ان کے افسانوں کا پس منظر جدید ماحول سے بنا ہے۔ "دیودار کے درخت" "خوابوں کے محل" اور "میری گلی میں ایک پردیسی" اسی طرح کے رومانی افسانے ہیں۔ طرز تحریر بھی حجاب کی سی ہے لیکن قرۃ العین حیدر کی تحریر میں زیادہ روانی ہے۔ اور وہی اونچے طبقے کے ساز و سامان اور عشرتوں کا ذکر۔ لیکن بعد میں قرۃ العین حیدر ان چیزوں کو اس طرح پیش کرنے لگیں جیسے انکا مقصد اس زندگی کی سطحیت اور کھوکھلا پن بتانا ہے اور وہ خو اسے ایک دفتر بے معنی خیال کرتی ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے "دریچے کے سامنے لکھا یہ خاکہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس طرح کی چیزوں کو بھی افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے

سب سے پہلے اس صنف کی ابتدا احمد علی نے "ہماری گلی" سے کی تھی۔ اسی طرح کا ایک اور افسانہ "لندن کی ایک کھڑکی" (آغا محمد اشرف) اس سال ساقی میں شائع ہوا ہے جو بہت کامیاب افسانہ ہے۔ "دریچے کے سامنے" بھی ایک ہلکا پھلکا اچھا افسانہ ہے۔ "ایسے ہی" ایک lightessay ہے۔ اس سال ان کا سب سے کامیاب افسانہ "ستاروں کے آگے" ہے۔ کامریڈوں کی ایک پارٹی کا بیل گاڑی میں سفر ـــ سفر کی تفصیل، انکی تھکان اور بیزاری، اور پارٹی کی اونچی اونچی "کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں" کی سی امیدوں سے Sceptic ہو جانا، بیچ بیچ میں پارٹی میں آنے سے پہلے انکی زندگی کی جھلک ...... بہت صناعی سے نبھایا ہے۔ اس افسانے میں انکے دوسرے افسانوں کے برخلاف جامعیت، تسلسل اور وحدت تاثر ہے۔ یہ افسانہ سال کے بہترین افسانوں میں گنا جا سکتا ہے "دھندلکوں کے پیچھے" میں بے ثباتی کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ کالج کے نوجوانوں کے کیا کیا آئیڈیل ہوتے ہیں اور پھر کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ افسانے میں خلوص بہت ہے۔ اس کے بعد قرۃ العین حیدر نے ایک الگ ہی تکنیک اختیار کی۔ "آہ اے دوست" (ساقی کا طنز نمبر ۴۵ء) تلازم خیالات (Association of ideas) کی بہت اچھی مثال ہے۔ لیکن اس کے بعد ان کی تکنیک کسی فارم سے ہی آزاد ہو گئی۔ حال ہی میں میں ورجینیا وولف کی مختصر کہانیوں کے مجموعے Monday or Tuesday اور The Haunted House پڑھ رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا قرۃ العین حیدر بھی کچھ اسی طرح کی تکنیک میں لکھنے لگی ہیں۔ "گومتی بہتی رہی" اور "ایں دفتر بے معنی" وغیرہ کہانیوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے افسانہ نگار "اڑتے اڑتے" چیزوں کا جائزہ لے رہا ہو۔ اور پڑھنے والوں کو بھی جگہ جگہ اڑائے لئے جا رہا ہو۔ اس "نوولٹی" کا باعث انکے افسانے بہت جاذب نظر آئے۔ لیکن ان کے افسانوں میں کوئی خاص موضوع اور "ٹھوس" خیالات نہیں ہوتے ـــ ہاں ہر افسانے میں کہیں کہیں محبت کی ناکامیوں کا ذکر ہوتا ہے لیکن

افسانے کی دوسری تفصیلات میں دب کر رہ جاتا ہے ـــــ ان کے افسانے دلچسپ تو ہوتے ہیں لیکن دماغ پر دیرپا اثر نہیں چھوڑتے۔ بار بار اسی انداز پر لکھنے کے علاوہ انہیں باتوں کا ہر افسانے میں ذکر کرنے سے نوولٹی نوولٹی نہیں رہی۔ اور ان کے افسانے پڑھتے ہوئے اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ لیکن ’چمنستان‘ کے افسانہ نمبر ۴۵ء میں ان کا جو افسانہ چھپا ہے ”پرواز کے بعد“ اس میں انہوں نے منظر کشی، کرداروں، اور واقعات کے بیان میں توازن قائم رکھا ہے اس افسانے میں Sense of proportion ہے۔ اس سے ان کے مخصوص طرز نگارش کی دلکشی اور بڑھ گئی ہے اور افسانہ poignant اور پُر اثر بن گیا ہے۔ اس ٹکنیک میں ان کا یہ سب سے کامیاب افسانہ ہے۔ اور بہت بڑھیا چیز ہے۔ اس نئے سٹ سے ہمیں بہت توقع ہے۔ اگر وہ اپنا پایہ قائم رکھیں تو ان نئے لکھنے والوں سے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کی امید کی جا سکتی ہے۔

۱۹۴۴ء اردو افسانوی ادب کا ایک اہم سال ہے ۴۴ء نے آٹھ لافانی شاہکار پیش کئے ہیں۔ ’ان داتا‘ (کرشن چندر) ’موبی‘ (کرشن چندر) ’گالی‘ (بیدی) ’بُو‘ (منٹو) ’جہاں میں رہتا ہوں‘ (ہیندر ناتھ) ’سراب‘ (شمس آغا) ’صبح و شام‘ (شمس آغا) اور ’دیمک‘ (بلونت سنگھ) ان میں سے ہر افسانہ ماسٹر پیس ہے۔ اور سب کے سب اسقدر اچھے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہے، اس سال اچھے افسانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بہترین افسانوں کی دوسری لسٹ پیش کی جائے تو اس میں کم سے کم بیس افسانے شامل ہونگے۔

موضوع کے اعتبار سے بھی اس سال کا ادب تنوع کا حامل ہے۔ گذشتہ سال یہ شکایت رہی تھی کہ جنگ پر کچھ نہیں لکھا جا رہا ہے۔ اس دفعہ، جہاں تک جنگ کا اثر ہندوستان پر پڑا ہے اس موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ قحط بنگال بھی ایسا موضوع ہے جس پر بہت سے ادیبوں نے لکھا، یوں تو کئی افسانوں میں بنگال کے متعلق

نیا دور

اشارے ملتے ہیں۔ لیکن بنگال پر مکمل افسانے اردو میں کرشن چندر، ستیارتھی اور ابراہیم جلیس نے لکھے ہیں۔ ابراہیم جلیس کے 'چور' میں بنگال کی بے بس کنواری جو اپنے بے روزگار منگیتر کے خیال میں مگن رہتی ہے، پانچ سکوں کے لئے اپنے آپ کو ایک ماڑواڑی کے حوالے کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ بہت دردناک کہانی ہے۔ عورت کے جذبات کی بہت اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ قبروں کے بیچوں بیچ (ستیارتھی) مصیبت زدہ بنگال کے پس منظر میں کمیونسٹ پارٹی کے چند افراد کی کہانی ہے جو گاؤں گاؤں پھر کر بھوک موتوں کی تعداد معلوم کرتے ہیں۔ زیادہ تر پارٹی ہی کا ذکر ہے۔ کہیں کہیں بنگال کی مصیبت کی تصویریں ہیں۔ فنی طور پر بہت کامیاب افسانہ ہے۔ لیکن اسے بنگال کی ٹریجڈی کی ایک کہانی سمجھ کر پڑھا جائے تو اتنا موثر نہیں۔ ستیارتھی کا اس موضوع پر ایک اور افسانہ ہے۔ "نئے دھان سے پہلے" (۵۴) لنگر کے سامنے کھڑی، بھات کے دو نوالوں کے لئے انتظار کرتی ہوئی اس گربھ وتی کی کہانی ہے۔ جو سوچتی ہے کہ وہ اب دکھ جھیل رہے ہیں۔ لیکن ست جگ جلد آئیگا۔ اس کا ہونے والا بچہ ست جگ میں جنمے گا۔ لیکن اس ست جگ میں جینے والا مردہ پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ خود ان دکھوں سے ہمیشہ کیلئے نجات پاتی ہے۔

اور کرشن چندر نے 'ان داتا' لکھ کر اس کا نقش ابدی کر دیا۔ ان داتا میں کرشن چندر نے اپنی روح تحلیل کر دی ہے۔ بنگال کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا لیکن ان داتا کی Comprehensiveness، اس کا بے پناہ satire 'تلخ طنز' اسکی گہرائی، اس کا خلوص، وہ اسلوب بیان جس میں موضوع کی ساری poignancy سمٹ آتی ہے، اس کی جدید تکنیک، اسے outstanding بناتی ہے۔ کرشن چندر نے اس عظیم الشان ٹریجڈی کو تین زاویوں سے دکھایا ہے — پہلے حصہ میں ایک غیر ملکی قونصل کے مکتوبات ہیں۔ غیر ملکی قونصل جو یہ چاہتا ہے کہ سوکھیا کی بیماری کہہ کہہ کر لاکھوں آدمی مریں تو مریں لیکن بنگال قحط زدہ علاقہ نہ قرار دیا جائے کیونکہ اگر حکومت انکی امداد کرے تو

ان کے لئے غذا مہیا کرے تو Refugees کا کیا بنیگا؟ بین الاقوامی تعلقات میں فتور آجائیگا۔ شاید یہ کسی آنیوالی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ اس شخص کے ضمیر میں کانٹا ہے۔" ان کو بچانے کیلئے ہر ممکن کوشش کیجا رہی ہے" کہکر وہ اس کھٹکتے ہوئے کانٹے کو دبانا چاہتا ہے لیکن کرشن چندر کی حقارت بھری طنز آمیز ہنسی اسے بار بار ابھارتی ہے۔ دوسرے حصے میں وہ نوجوان ہے جسے بنگال کے مصیبت زدوں سے اتنی ہمدردی ہے کہ ان کیلئے رزولیوشن تک پاس کرانے کو تیار ہے۔ جو جام گلے گرم گرم ٹوسٹ، آملیٹ اور سیب کے قتلے کھاتے ہوئے بنگال کی بھوک کا اندازہ کرتا ہے۔ جو شراب دو آتشہ، اپنی ہم رقص کے معطر بالوں اور گرم سانسوں کی قربت، اور وجد آفرین موسیقی کی لذتوں سے مدہوش ہو کر بنگال کی مصیبت کا تصور کرتا ہے۔ اور مطمئن ہے کہ انہوں نے یہ رقص کی محفل سجا کر بنگال کے بھوکوں کے لئے ہزاروں روپیہ جمع کیا ہے۔ تیسرے حصہ میں قحط زدہ بنگال کی روح بلک رہی ہے، کراہ رہی ہے۔ اور اس کراہ میں، اپنی سحر نگاری سے کرشن چندر نے وہ درد بھرا ہے جو سخت سے سخت دل آدمی کے دل سے بھی رحم نچوڑ لیتا ہے۔

ان داتا میں کرشن چندر نے اپنے سحر کار قلم کی ساری قدرت صرف کر دی ہے ان کی تحریر کی جادو نگاری اس افسانے میں اپنے معراج پر نظر آتی ہے۔ اس افسانہ میں کرشن چندر کی شعریت سے پُر، کندنی مرصع، تحریر کے کئی ٹکڑے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان داتا میں صرف زبان کی تعریف کرنا ظلم ہے۔ اس میں کرشن چندر کے Satires کے نمونے دیکھئے:۔

" چند مریضوں (قحط زدہ بنگال کے بھوکوں کا) کا خون لیکر مغربی سائنس دانوں کے پاس بغرض تحقیقات بھیجا جا رہا ہے۔ یا ایک رائل کمیشن بٹھا دیا جائیگا جو چار پانچ سال میں اچھی طرح چھان بین کر کے اس امر کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کریگا۔ ان غریبوں کو بچانے کیلئے ہر ممکن کوشش کیجا رہی ہے۔ آگے جیسا بائیبل میں لکھا ہے۔ اللہ مالک ہے"۔

" بشپ آف کلکتہ کا خیال ہے کہ بنگال میں شدید قحط ہے اور حالت بے حد خطرناک

نیا دور

ہے اور مجھ سے اپیل کی کہ اپنی حکومت کو بنگال کی مدد کیلئے آمادہ کروں۔ میں نے اسے اپنی حکومت کی ہمدردی کا یقین دلایا۔ لیکن یہ امر بھی اس پر واضح کر دیا کہ یہ قحط ہندوستان کا اندرونی مسئلہ ہے اور ہماری حکومت دوسری قوم کے معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتی ہم سچے جمہوریت پسند ہیں۔ اور کوئی سچا جمہوریہ آپ کی آزادی سلب کرنا نہیں چاہتا۔"

"بچہ (اپنی مردہ ماں کے تھنوں سے دودھ چوستا ہوا ایک قریب المرگ بچہ) ابھی سفارت خانہ میں ہے سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ حضور پُرنور کی ہدایات کا انتظار ہے۔ اپنی حکومت کے صدر سے مشورہ کئے بغیر کوئی ایسا اقدام کروں ......"

دوسرے حصّہ میں —— "ناچتے ناچتے پیتے پریشان ہوگئی ہوں"

"اپنے وطن کی خاطر سب کچھ کرنا پڑتا ہے ڈارلنگ!" اس نے سیٹھ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اور تیسرے حصہ میں زبردست طنز ہے۔ بنگال کے متعلق ایک اور افسانے نے مجھے اتنا ہی متاثر کیا۔ رادھے کرشن کی وہ ہندی کہانی جو نیا دور کے اس نمبر میں شامل ہے۔ اس افسانے میں بھی ان داتا کا سا خلوص، گہرائی اور تاثر ہے یہ افسانہ اتنا اچھا ہے کہ اسے پڑھ کر رچرڈ للیولن کے ناول How Green was my valley کی یاد آگئی۔ یہ افسانہ اسی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ ایک بچہ اپنی Family کی کہانی بیان کرتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ اپنے گاؤں اور وہاں کے دوسرے کرداروں کا ذکر بھی کرتا ہے۔

وہ پہلے ہمیں اپنی Green valley کی سیر کراتا ہے ..... یہ بتلاتا ہے، یہاں کوسی ندی بہتی ہے۔ اس ندی میں نہانا، مچھلیاں پکڑنا، میٹھے رسیلے آم اور کھجور کے درخت ..... : How Green was my valley then اور پھر اس چھوٹے سے خوشحال گاؤں کو ایک کے بعد ایک بلائیں گھیر لیتی ہیں۔ قحط، وبا، اور یہ چھوٹی سی فیملی ان کی نذر ہو جاتی ہے۔ یہ بچہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ بے حد دردناک کہانی ہے۔

’ان داتا‘ میں کرشن چندر نے اپنے فن کی قدرت اپنے قلم کا سارا زور صرف کر کے اپنی تحریر کے جادو سے یہ بے پناہ درد پیدا کیا ہے۔ لیکن رادھا کرشن کے افسانے میں سادگی ہے اور Art less ness ۔ لیکن یہ Art less ness لانے کیلئے ہی فن کار کو کتنی کوشش کرنی پڑی ہوگی This is art That conceals art ’ان داتا‘ میں فن کار خود اپنے اسلوب اور زور بیان سے یہ poignancy پیدا کرتا ہے رادھا کرشن ایک بچہ کی زبان سے ہلکے پھلکے رنگ میں کہانی بیان کر کے باقی پڑھنے والوں کے تخیل پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور پڑھنے والا لڑکے کے اس معصوم انداز بیان کے پیچھے ایک ایسی ٹریجڈی دیکھتا ہے جسے خود بولنے والا پورے طور سے نہیں جانتا۔ .... کسی کی موت ہوگئی ہو۔ قریبی عزیز واقارب ایسا واویلا کر رہے ہوں جیسے ان کا دل بیٹھا جا رہا ہے انکو دیکھکر ہم پر بھی رقت طاری ہو جاتی ہے، لیکن اگر مرنے والے کا بچہ ہمارے سامنے آ کھڑا ہو۔ بچہ جو موت کی mystery کو نہیں سمجھ سکتا، لیکن یہ محسوس کر کے کہ حالت غیر ہے پھٹی پھٹی معصوم نگاہوں سے تکتا رہے تو بچے کو سینے سے چمٹا کر رو پڑنے کو جی چاہتا ہے۔ یہی کیفیت رادھا کرشن کا افسانہ پڑھکر طاری ہوتی ہے

درد پیدا کرنے میں کرشن چندر کی صناعی اور سحر طرازی دیکھئے :۔ "ابھی کلکتہ دور تھا اور میری بچی بھوکی تھی۔ وہ اب رو بھی نہ سکتی تھی۔ اس کے گلے سے آواز نہ نکلتی تھی۔ وہ بار بار اپنا منہ کھولتی جیسے مچھلی جل سے باہر نکل کر پانی کے گھونٹ کیلئے اپنے ہونٹ وا کرتی ہے۔ ہائے یہ ننھی سی جل پری! اپنے چھوٹے سے کھلونے کو اپنے سینے سے چمٹائے ایک گھلتی ہوئی شمع کی طرح میری آنکھوں کے سامنے ختم ہو رہی تھی، بجھ رہی تھی ...... اے خالق ارض وسما! اس معصوم بچی کی طرف دیکھ۔ کیا تیرے دربار میں اس کیلئے دودھ کی ایک بوند بھی نہیں ان داتا! دیکھ یہ کس طرح بار بار منہ کھولتی ہے، بے قرار ہوتی ہے اور تڑپ کر رہ جاتی ہے اور میری بچی بھی مر گئی۔ کس طرح تڑپ تڑپ کر اس نے جان دی۔ اس کا کرب اور اندوہ میری ان پتھریلی، ساکن، جامد، بے نور، بے بصر آنکھوں سے پوچھو!" .... کون سنگدل ہے جس

کا دل یہ درد و کرب میں ڈوبے ہوئے جملے پڑھکر ٹکڑے نہ ہوجائیگا ؟ - اب رادھا کرشن کا کمال بھی دیکھئے۔ دیکھئے بچے کے منہ سے یہ جملے کیا اثر رکھتے ہیں۔

" اماں کے زیور بک گئے، برتن رہن رکھدئے گئے۔ ایک داڑھی والا آدمی آیا اور ہماری تمام گایوں کو کھونٹے سے کھول لیگیا۔ ہم رونے لگے۔ ڈھیلا اٹھاکر اس آدمی کو مارنے کیلئے دوڑے،

"چاچی نے کہا 'لڑائی ہے بٹیا۔ کونین نہیں ملتی" بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ جب لڑائی ہی کرنی تھی تو تھوڑی کونین بھی اپنے پاس رکھ لینی چاہئے تھی۔ ...... ایسی بھی کیا لڑائی کہ آدمی مارنے کی تمام چیزیں ہیں اور جلانیکی کوئی چیز نہیں۔ اگر اس گاؤں میں ہر ایک کو ایسا ہی بخار لگ جائے تو سرکار ہی کا نقصان ہوگا۔ ہم لوگ بھی سرکار ہی کے آدمی ہیں نہ چاچی!"

اور بچہ کا انتقام۔ "مگر بھوکن ساہو کو کونین ہرگز نہیں دونگا۔ وہ ہمارا سارا دھان اٹھالے گیا"۔

"چاچی بولیں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، .... ادھر مجھے روکھا بھات ملنے لگا۔ دوسرے وقت وہ بھی ندارد میں اماں کی گود میں دبک کر سو جاتا تھا مجھے معلوم تھا کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ میری چھوٹی بہن چھمی ناسمجھ تھی۔ بھوک رٹتی تھی، اماں کو بھی پریشان کرتی تھی۔ چھمی نہیں جانتی تھی کہ صبر کا پھل کیا ہوتا ہے۔

اور صبر کا پھل" اماں مرگئی، بابوجی مرگئے، مینا کاکی مرگئی، اب چھمی بھی مرری ہے۔ اب میں کیسے رہوں گا۔ اب میں کسکے ساتھ رہونگا کسکے لئے مچھلی پکڑوں گا۔ کس کیلئے امرود چرالاؤنگا؟"

رادھا کرشن نے یہ کہانی ہندی میں لکھی تھی۔ اب اردو کے روپ میں "نیا دور" کے اس نمبر میں شامل ہے۔ کرشن چندر کی کہانی بھی ایسی ہے کہ دوسری زبانوں میں منتقل ہوکر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ احمد عباس نے کیاہے 'ana camrt 9' کرشن چندر کے اس شاہکار کیلئے احمد عباس ہی کی انگریزی چاہئے تھی۔ بہت کامیاب ترجمہ ہے۔

پھر کرشن چندر نے سال بھر میں کتنی ہی چیزیں لکھیں۔ لیکن ان داتا کی آواز یوں گونجی

رہی کہ سب اس میں ڈوب کر رہ گئیں۔ بیوقوفی، ردّی، اردو کا نیا قائدہ، شعلہ بے دود، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، یرگا، آج میں پھر قسم کھاتا ہوں، آتا ہے یاد مجھکو... خوشی، ایک نافسطائی کی ڈائری، بدصورت راجکماری، یہاں سب غلیظ ہیں، اور شکست کے بعد، —— ان میں افسانے بھی ہیں مضامین بھی ہیں ڈرامے بھی۔ یوں تو کرشن چندر کے فن میں تنوع ہے... موضوعات میں تنوع، کرداروں میں تنوع، وہ ہر طبقے کے افراد پر لکھتے ہیں، زندگی کی ہر پہلو سے عکاسی کرتے ہیں۔ لیکن اس دفعہ انہوں نے تکنیک اور presentation میں طرح طرح کے تجربے کئے ہیں۔ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی جدت —— کبھی بچوں کو بٹھا کے کہانیاں بول رہے ہیں، ایک تھا ہمارا تمہارا بادشاہ، کبھی ان کے لئے فائدہ تیار کر رہے ہیں کبھی اپنے بچپن کی داستانیں سنا رہے ہیں، کبھی چھوٹے چھوٹے سکیچس پیش کر رہے ہیں، کبھی ڈائری لکھ رہے ہیں، کبھی Satire کے نمونے دکھا رہے ہیں، کبھی ریلزم کی حدوں سے نکل کر Surrealism کی فضاؤں میں پرواز کر رہے ہیں۔ کبھی صوتی تجربے کر کے نئے الفاظ ایجاد کر رہے ہیں۔

'اردو کا فائدہ' اور 'ہمارا تمہارا خدا بادشاہ' میں بچوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ لیکن کئی جگہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ بچوں کی چیزیں نہیں ہیں۔ اگر زبان اور سادہ ہوتی اور بچوں کی دلچسپی زیادہ ملحوظ خاطر ہوتی، یہ لاجواب چیزیں ہوتیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ کرشن چندر کا اصل مقصد موجودہ نظام پر طنز کرنا ہے۔ لیکن انہیں بالکل بچوں کی چیز بنا کر بھی طنزیہ بنا سکتے تھے۔ اس طرح کا ایک کامیاب نمونہ "نیرنگ خیال" میں پیش ہوا تھا۔ ولی اللہ ادیب ایبٹ آبادی کے قلم سے، یہ بھی اردو کا نیا قائدہ ہی تھا —— محمد حسین آزاد کے قائدہ کی پیروڈی، بالکل اسی طرح کے جملے، بچوں کیلئے بالکل آسان اردو، اور ساتھ ہی موجودہ تہذیب کا مضحکہ اڑایا گیا تھا۔

کرشن چندر نے چار ڈرامے بھی لکھے ہیں، ایک نافسطائی کی ڈائری، بدصورت راجکماری، یہاں سب غلیظ ہیں، شکست کے بعد، —— "دروازے" کے ڈراموں کے بہ نسبت یہ ڈرامے بہت کامیاب ہیں، 'یہاں سب غلیظ ہیں' میں اونچے طبقے کے لوگ نچلے لوگوں کو غلیظ کہتے ہیں۔

[illegible]ت کرتے ہیں لیکن وہ خود غلیظ ہیں، انکی روحیں غلیظ ہیں۔' 'شکست کے بعد' میں جان سٹین بک کے ناول 'دی مون از ڈاؤن' کو ایک مختصر ڈرامے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ بڑی کامیاب کوشش ہے، میں نے یہ ناول پڑھا ہے اور فلم بھی دیکھی ہے۔ کرشن چندر کی صناعی پر حیرت ہوتی ہے کہ سارے ناول کا نچوڑ ایک چھوٹے سے ڈرامے میں پیش کر دیا ہے۔ ناول کی شاذ ہی کوئی جزئیات ہوں جو کرشن چندر کے ڈرامے میں موجود نہ ہوں۔ اسی طرح کا ایک اور مختصر ڈرامہ 'شکست خوردہ' شاہد احمد ایڈیٹر ساقی نے موپساں کے افسانے سے اخذ کر کے لکھا ہے۔ بہت کامیابی سے نبھا کر پادری کے گھنٹی بجانے والے سین پر ختم کیا ہے۔

کرشن چندر کے فن کی وسعت و ہمہ گیری، تنوع و تازگی دیکھکر یہ احساس ہوتا ہے کہ کرشن چندر کبھی پرانے نہ ہوں گے، ہم ان سے کبھی نہیں تھکینگے اور ان کا ہنر ایک کان ہے جو کبھی خالی نہ ہوگی۔ اختر انصاری اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں (صفحہ ۳۶۸) "کرشن چندر کی افسانہ نگاری نہ تو ترقی کر رہی ہے نہ اپنے پرانے معیار پر قائم ہے بلکہ قطعی طور پر زوال پذیر ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ اب کرشن چندر نے بہت لکھنا شروع کر دیا ہے اور انکی بہت ساری نئی چیزوں میں وہ بات نہیں جو ان کے پہلے افسانوں میں تھی لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ انکی افسانہ نگاری ہی زوال پر ہے کرشن چندر نے جب اردو ادب میں اپنے لئے ایک بلند جگہ بنالی تو انہوں نے محض تنوع اور جدت کی خاطر طرح طرح کی چیزیں لکھنی شروع کیں اور اس سے ہمیں اپنی Versatility کا قائل کر دیا۔ اب بھی وہ پہلے کی طرح لکھ سکتے ہیں، چنانچہ 'بالکونی'، 'نکڑ'، 'مقدس'، 'ایکسٹرا لڑکی'، 'ان داتا'، 'خوشی'، 'پال' اور سب سے زیادہ 'مولی' میں افسانویت موجود ہے، پھر بھی انکی اس سال کی بہت ساری چیزیں پڑھ کر جانے کیوں جی چاہتا تھا کہ کرشن چندر کچھ کم لکھیں لیکن اپنی پرانی طرز پر لکھیں، افسانے لکھیں، افسانے جو فن کے مکمل ترین نمونے ہوتے ہیں،...... ہاں اس سال انکا ایک اور افسانہ 'خوشی' شائع ہوا ہے۔ بہت کامیاب افسانہ۔ ایک لڑکی مردوں سے دھوکا کھا کر، مصیبتیں اٹھا کر مردوں سے بدظن ہو جاتی ہے۔ انکی زندگی میں مسرت کا سرچشمہ سوکھ جاتا ہے،

یہاں تک کہ وہ اس وقت بھی خوش نہیں ہوتی جب ایک آدمی اسکی حالت جان کر بھی اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کا آقا اسے اپنی ماں کے گھر بھیج دیتا ہے تاکہ ماں کی محبت اور بچوں کی معصومیت میں اسے شاید کوئی ہوئی مسرت مل سکے۔ کہیں کہیں لطیف مزاح بھی ہے۔ پھر جب ادب لطیف کا افسانہ نمبر ۴۴ء ایک طویل انتظار کے بعد ۴۵ء میں نکلا تو اس میں کرشن چندر کا ایک اور شاہکار شامل تھا 'موبی'۔ اس کے پہلے میں نے 'ساقی' کے سالنامہ ۴۵ء میں "پال" بھی پڑھ لیا تھا۔ 'پال' اور 'موبی'، دو غیر ملکی فوجیوں کے افسانے ہیں، اور ان افسانوں میں وہی فرق ہے جو امریکی اور فرانسیسی میں ہے۔ ہر طرح کے کرداروں سے کرشن چندر کی واقفیت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ پال — عیش پسند، حسن پرست، طوطا چشم، جمہوریت اور مساوات کی رٹ لگانے والا لیکن ان جذبات سے عاری نیشلسٹ فرانسیسی کبھی "موبی" کا ہیرو نہیں بن سکتا۔ پال کے فرانسیسی کردار سے 'پال' کا سا افسانہ تیار کیا جا سکتا ہے اور امریکی کردار سے 'موبی'۔ 'موبی' پڑھتے ہوئے مجھے For whom The Bell tolls کا ہیرو جورڈن یاد آ گیا۔ امریکی کسی قدر آسانی سے دوسری قوموں کے افراد سے گھل مل جاتے ہیں۔ ان میں Superiority complex اتنا زیادہ نہیں ہوتا۔ اس لئے موبی کی کہانی حقیقت سے دور نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن پھر بھی جس صناعی سے کرشن چندر نے موبی کے دل سے اس complex کو نکالا ہے اور اس میں ہندوستانیوں سے محبت پیدا کی ہے قابل داد ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں میں مستقبل کی امید کی جھلک بھی ہوتی ہے انسان کی ترقی کی امید۔ 'موبی' کے کردار اور اسکی نرم سیال فطرت میں وہ ایک Humanism اور انٹرنیشنل برادر ہڈ کا پرتو دیکھتے ہیں۔ اس طرح کے موضوعات کا نبھانا مشکل ہے، جن پر آسانی سے پڑھنے والوں کو قائل نہ کیا جا سکے۔ اس کیلئے بڑی صناعی درکار ہے اور کرشن چندر نے اسے بڑی فن کاری سے نبھایا ہے D. F. Karaka کے سے کچے پن سے نہیں جنہوں نے اپنے ناول We Never Die میں بڑی آسانی سے ایک ہندو، ایک مسلمان (لڑکی)

اور ایک انگریز کو اکٹھا کر دیا اور نہ صرف ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ حل کر دیا بلکہ ہندوستان کی آزادی کی امید بھی دلا دی۔ کاش یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو سکتا! اتنا پھسپھسا ناول ہے۔ لکھنے والا اپنے مواد پر ذرا بھی حاوی نہیں۔ صرف Flight of fancy ہے اور کئی جگہ یہ لاعلمی (ignorance) اتنے نمایاں طور پر ابھر آئی ہے کہ we don't know whether to weep or laugh at it.

اگر 'ان داتا' اور 'موبی' جیسے شاہکار اہم موضوعات سے بنے تھے تو 'گالی' کا معمولی موضوع بیدی کے فن کے سانچے میں ڈھل کر ایک فن پارہ بنا ہے۔ گالی کا موضوع ——— چند ڈاکیے جب پھر پھرا کر تھکان سے چور پوسٹ آفس لوٹ آتے ہیں تو ایک دوسرے کو گالیاں دیکر تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ گالی میں جیسے کوئی برقی قوت ہو، انکی تھکان دور ہو جاتی ہے۔ اس افسانے میں بیدی کی زبان بھی سلجھی ہوئی ہے۔ بیدی میں یہ خوبی ہے کہ وہ ایک بھی غیر ضروری جملہ نہیں لاتے۔ اختصار میں سب کچھ کہہ دیتے ہیں۔ ان کی زبان میں مشکل پسندی اور الجھن ہونے کے باوجود ہم داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہ فلاں معنی کے اظہار کیلئے بیدی نے بہت ہی موزوں phrase یا جملہ استعمال کیا ہے یا اس معنی کے لئے اس سے اچھا لفظ تراشا نہیں جا سکتا گالی میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اتنے ثقیل موضوع کے باوجود۔ افسانے میں اس قدر دلکشی پیدا کرنا بیدی ہی کا کام ہے۔ موضوع اور مواد چاہے ایک ہی طرح کے کیوں نہ ہوں اس میں ہر ایک وہی اثر نہیں پیدا کر سکتا۔ "یہ دلکشی ایک مستقل اور مسلسل کیمیاوی عمل کے بعد حاصل ہوتی ہے جب لکھنے والا اپنے موضوع اور مواد کو سیال بنا کر اپنے اسلوب کے سانچے میں ڈھال لے" (احتشام حسین)۔ شاید کوئی اور کہانی کو غلیظ و ثقیل گالیوں سے بھر دیتا۔ بیدی کے فن کا کمال دیکھئے کتنی لطافت سے نبھایا ہے۔ وہ جانتا ہے پوسٹ مین بالکل نیچ نہیں ہیں۔ ان میں کچھ subtleness بھی ہے ثقیل گالیوں کے ساتھ ساتھ Refined مذاق کی آمیزش سے ایک عجیب شی پیدا ہو گئی ہے اور وہ رحمت نور کی نادری! بیدی نے تو کمال کر دیا ہے!

"رحمت نور کانوں کو چھوتے ہوئے بولا ع "چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی" پرتاب سنگھ تلملایا۔ فارسی اس کے باپ دادا کو بھی نہیں آتی تھی۔ خواجہ صاحب اس کے معنی بتاتے ہیں۔ "رحمت نور کہہ رہا ہے 'کفر کعبہ ہی سے پیدا ہونے لگے تو مسلمانی کدھر جائیگی'۔ پرتاب سنگھ نے نہایت کریہہ انداز سے بدلہ چکاتے ہوئے کہا" تو مسلمانی (مسلمان عورت) میرے پاس چلی آئیگی۔ یہاں واہگورو کا دیا بہت کچھ ہے"؛ اگر افسانے میں صرف گالیاں اور مذاق ہوتا تو صرف تفریحاً پڑھنے کی چیز ہوتی۔ لیکن ان کے پس منظر میں بیدی نے ڈاکیوں کی زندگی کی تصویر بڑی کامیابی سے کھینچی ہے۔ اور اس سے "گالی" کو اردو ادب میں ایک مستقل جگہ حاصل ہو گئی ہے "گالی" فن کا ایک مکمل ترین نمونہ ہے۔

اکثر افسانہ نگار جب سال میں صرف دو یا تین افسانے لکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے یہ سال ان سے خالی خالی رہا ہے۔ لیکن بیدی اگر ایک افسانہ بھی لکھیں تو سال کی بزم ادب میں ان کی شرکت کا احساس ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ انکے افسانے کے خدوخال ذہن میں محفوظ رہتے ہیں۔ بیدی بہت بڑا فن کار ہے۔ ان کا فن سب سے زیادہ mature ہے۔ کئی دفعہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کرشن چندر اور بیدی میں کون بہتر افسانہ نگار ہے۔ دونوں بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔ کرشن چندر کی سحر نگاری میں ہم کھو جاتے ہیں۔ ہم پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ بیدی کے افسانے پڑھتے ہوئے یہ ہیجان نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن افسانہ ختم کرنے کے بعد ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے۔ we have read a great story بیدی نے اس سال دو اور افسانے لکھے ہیں۔ 'نامراد' اور 'بیکار خدا'۔ نامراد بہت poignant کہانی ہے۔ اس کی منگیتر مر جاتی ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ ایک دفعہ اسے دیکھ لے جو اس کی ہونیوالی تھی۔ ماں کہتی ہے۔ "نامراد اٹھ تیری خوشدامن نے تجھے بلایا ہے"۔۔۔۔۔۔ اپنی منگیتر کے بارے میں وہ کیا کیا خیال کرتا تھا۔ اس کی ماں نے لڑکی کو دکھائے بغیر رشتہ طے کر دیا تھا۔ ماں کہتی ہے لڑکی بہت خوبصورت ہے۔ لیکن ماں کو کیا پہچان۔

اس کی اپنی پسند الگ ہے اور اس کے مرنے کے بعد اسے بلایا جاتا ہے کہ اسے ایک نظر دیکھ لے۔ وہ دیکھتا ہے.... حسن کی ایک کافوری مورت! اسکی پسند کے مطابق ملبوس زرد چہرہ ...... واقعی وہ نامراد تھا۔ "بیکار خدا" یہ افسانہ ایک عام عقیدے کے گرد بنا گیا ہے۔ "بیوپار میں اگر بوہنی (سب سے پہلے گاہک کے ہاتھ بکری) اچھی ہو تو دن بھر بیوپار خوب چلتا ہے۔ مراری، عورتوں کے سنگھار کا سامان بیچنے والے کیلئے نتھو تیلی کی بوہنی بڑی کام آتی ہے۔ بے در پے اسکے نصیب کھل جاتے ہیں۔ اور وہ نتھو تیلی کا اتنا عقیدتمند ہو جاتا ہے کہ اس سے تیلی کا کام چھڑا کر اپنے دوکان پر رکھ لیتا ہے اور اس کا سارا خرچ چلاتا ہے 'نتھو' ڈنبے کی طرح موٹا نتھو' دکان میں بیکار پڑا رہتا ہے، وہ پیٹو ہے، گانجا پیتا ہے، کسی عورت کیلئے دوکان سے جو چاہے اٹھا لیجاتا ہے لیکن مراری کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ گوشت کی بوٹیاں لا کر کھلانے پر مراری اس سے بگڑ کر نکال دیتا ہے تو بہت گھاٹا اٹھانا پڑتا ہے، وہ پاؤں پڑ کر نتھو کو لے آتا ہے۔ نتھو اس کا دیوتا ہے' بیکار خدا جو بیکار بیٹھا رہ کر اسکے دوکان کی حفاظت کرتا ہے، مراری نتھو کو شراب پیتے، ماس کھاتے، رنڈی بازی کرتے دیکھتا ہے لیکن اسے عقیدتمندانہ احساس ہوتا ہے کہ نتھو کا گناہ بھی گناہ نہیں ہوتا وہ اپنے بیکار دیوتا کو دیکھ کے کہتا ہے "بابو تو تو پاپ پُن سے پرے ہے"۔ کامیاب افسانہ ہے۔ لیکن ایسا نہیں کہ بیدی کی خاص چیز کہی جا سکے۔ بیدی نے اس سال دو خاصے کامیاب ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ چانکیہ اور زہر خند۔ [illegible] کا ایک اور شاہکار "بُو" ہے۔ منٹو نے اس سال صرف ایک افسانہ لکھا لیکن ایسا لکھا کہ اگر وہ اور دو تین سال تک کچھ نہ لکھیں تو صرف "بُو" کی وجہ منٹو کا نام گونجتا رہے گا۔ منٹو نے 'ہتک' کے بعد کتنے ہی افسانے لکھے لیکن اب تک ہمارے دماغ پر 'ہتک' کا نقش تازہ ہے۔ 'بو' بھی برسوں ہمارے دماغ پر چھایا رہے گا۔ منٹو کے 'بو' کے متعلق بہت لے دے ہوئی ہے۔ اس افسانہ کو فحش نگاری کی ایک نمایاں مثال کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے یہاں تک کہ ترقی پسندوں نے بھی گھبرا کر اس افسانے کو ترقی پسند افسانوں کی فہرست میں شامل کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ چنانچہ سجاد ظہیر صاحب کہتے ہیں "میں نے خود منٹو صاحب سے ایک مرتبہ

انکے افسانے "بُو" کے متعلق یہ کہا کہ آپکا یہ افسانہ ایک بہت ہی دردناک لیکن فضول افسانہ ہے اسلئے کہ درمیانی طبقہ کے آسودہ حال فرد کی جنسی بدعنوانیوں کا تذکرہ چاہے کتنا ہی حقیقت پر مبنی کیوں نہ ہو لکھنے اور پڑھنے والے دونوں کے لئے تضیع اوقات ہے۔ اور در اصل وہ زندگی کے اہم ترین تقاضوں سے اسی قدر فرار کا اظہار ہے جتنا کہ قدیم قسم کی رجعت پسندی"! مجھے سجاد ظہیر کی رائے سے پورا پورا اتفاق تو نہیں ہے۔ لیکن اکثر اردو ادیبوں کی اس مریضانہ جنس پرستی سے بیحد کناہٹ ہوتی ہے۔ اردو ادیب جنس پر بہت لکھتے ہیں اور جنس کو بھی صرف ایک ہی زاویے سے دکھاتے ہیں۔ بہت سارے افسانے جنسی بے راہ روی اور بے اعتدالی کی داستانیں ہیں صحت مند محبت کا شاذ ہی ذکر آتا ہے۔ اور میاں بیوی کی محبت کو تو شاید ہمارے نئے ادیب حقیقت سے بہت دور خیال کرتے ہیں! وہ محبت جس نے بیدی کے گرم کوٹ میں اتنا حسن اتنی دلکشی پیدا کر دی ہے، ہمارے اکثر ادیبوں کیلئے شاید اس قدر غیر اہم اور دلچسپی سے خالی ہے کہ اس تار و پود سے افسانہ تیار کرنا فضول سمجھتے ہیں! ...... ہاں وہ کہتے ہیں کہ وہ برائیوں کو اپنی اصلی کریہہ گھناؤنی صورت میں پیش کر کے، لوگوں کے دلوں میں ان سے نفرت پیدا کر کے انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ یہ تخریبی دور ہے، تعمیر بعد میں ہوگی۔ پہلے اس فرسودہ عمارت کو ڈھ جانے دو۔ لیکن عمارت ڈھانے کی غرض سے ہمارے ادیب انسانی کردار کے صرف تاریک پہلو ہی پیش کرنے جائیں۔ تو انسانی فطرت ہی سے مایوسی ہو جائے! ہمیشہ اسی طرح کے افسانے پڑھتے پڑھتے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے دنیا سے انسانیت دم توڑ چکی ہے۔ جب ایسی قنوطیت چھا جائے تو آنے والے دور کی امید کہاں سے رہیگی؟ انسان برائیوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ انسانی کردار کے اچھے پہلو بھی ساتھ ساتھ پیش کئے جائیں تو یہ احساس باقی رہتا ہے کہ تند ہوا کے تھپیڑوں سے انسانیت کی شمع بالکل بجھ نہیں گئی، اس کی لَو ڈوب رہی ہے۔ اور ایک محفوظ، سازگار ماحول میں پھر سے لپک اٹھیگی۔ یہ احساس تعمیر کیلئے بہت ضروری ہے۔ لیکن منٹو کا "بُو" تو اس "عمارت ڈھانے والے" زاویئے سے بھی ترقی پسند نہیں۔ "بو" اگر

زغیبانہ نہیں تو جنسی بے اعتدالیوں سے نفرت بھی نہیں دلاتا۔ سارے افسانے میں ایک ٹکڑا بھی ایسا نظر نہیں آتا جس میں منٹو نے اس برائی سے نفرت دلانے کی کوشش کی ہے۔ صرف ایک Graphic description دیدیا ہے اور بس یہ نفرت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان گھناؤنی تفصیلوں کے پیچھے شدید طنز جھلکتی رہے۔ انور کے افسانوں میں یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے۔ اسی لئے میں نے انور کو منٹو سے بہتر معلم کہا ہے۔ چنانچہ 'کلوپیٹرا' پڑھتے ہوئے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ حمیدہ کو اپنی بدعنوانیوں کی لذتوں کا ذکر کرتے ہوئے بھی یہ احساس ہے کہ اسے سچی مسرت نہیں مل سکی۔ حمیدہ کے لہجہ میں تلخی ہے۔ 'بو' میں یہ بات نہیں گو منٹو کا افسانہ انور کے افسانے سے زیادہ فن کارانہ چیز ہے۔ "بو" 'ترقی پسند' ہو یا غیر ترقی پسند اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ واقعہ نگاری اور تفصیل نگاری کا ایک شاہکار ہے۔ منٹو نے موضوع کو اتنے مکمل طور پر اتنا اچھا نبھایا ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔ صرف 'بو' اور اس کی 'اپیل' کے Description کی بنا پر ہی یہ افسانہ فن کاری کا ایک بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

'جہاں میں رہتا ہوں' مہندر ناتھ کا وہ لاجواب Grand افسانہ جس کا ایک ایک پیراگراف پڑھ کر جی پھڑک اٹھتا ہے ۱۹۴۴ء کا ایک اور شاہکار ہے۔ مہندر ناتھ نے اس کے علاوہ اس سال چند اور افسانے لکھے ہیں۔ 'وحشی' 'میری آواز' 'شادی کے بعد' 'برف' 'دیوانہ' — 'وحشی' ایک ایسے غریب نوکر کی دردناک کہانی ہے جس میں غلامی نے پستی اور کمتری کا احساس نہیں پیدا کیا ہے۔ اس کے آقاؤں پر یہ بات گراں گذرتی ہے۔ وہ بے جا ظلم کر کے زبردستی اپنی برتری کا احساس دلانا چاہتے ہیں۔ اور یہ آقا کوئی سرمایہ دار نہیں آج کل کے تعلیم یافتہ نوجوان ہیں جو اپنے آپ کو نچلے طبقے کا بہت ہمدرد خیال کرتے ہیں! 'میری آواز' کوئی خاص چیز نہیں۔ "شادی کے بعد" بہت ہی کامیاب مکالمہ ہے۔ 'برف' کا موضوع اچھا ہے۔ لیکن فنی لحاظ سے کامیاب افسانہ نہیں ہے۔ مواد اچھی طرح پیش نہیں

کیا گیا beginning بہت طویل ہے پڑھنے میں اکتاہٹ ہوتی ہے۔ عریاں افسانہ ہے لیکن اس میں غیر روحانی اور محض جسمانی جنسی تعلق سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے۔ آخری حصہ بہت اچھا نبھایا ہے۔ غریب عورت جو صرف دو روپیہ کیلئے اپنا جسم بیچنے کیلئے تیار ہو جاتی ہے آتی ہے جس اور [illegible] p پڑی رہتی ہے۔ اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ مرد اسے یونہی دو روپیہ دے کر بھیج دیتا ہے . . . . اس سال کے آخری حصے سے ہندرناتھ اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔ اسی زمانے میں ان کے افسانے 'دیوانہ' اور 'جہاں میں رہتا ہوں' شائع ہوئے 'دیوانہ' مذکورہ بالا سب افسانوں سے اچھا ہے۔ اس میں ہندوستانی محبت کی کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ ہندوستانیوں کی "خاموش" محبت' وہ گھٹے گھٹے ارمان جن کا وہ اظہار نہیں کرسکتے، پھر انکی ناکامی اور بے بسی! —— افسانے میں بے محل افراط تفریط نہیں ہے جس سے بالکل جذباتی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ سنجیدگی اور توازن ہے جس کی وجہ اس میں دگنا اثر پیدا ہوگیا ہے۔

"جہاں میں رہتا ہوں" ہندرناتھ کا بہترین افسانہ ہی نہیں، سال کا ایک شاہکار ہی نہیں، بلکہ اردو ادب میں ایک بہترین کارنامہ ہے۔ ایسا کارنامہ جو مغربی ادب کے شہپاروں کے مقابل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ 'جہاں میں رہتا ہوں' میں مشاہدے کی گہرائی ہے، مطالعہ کی صداقت ہے، شدت کا درد ہے، تلخی ہے، تیز طنز ہے، اور یہ سب خلوص کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور زبان میں بے پناہ روانی ہے۔ یہ ہندوستانی نوجوانوں کی زندگی ہے، آج کل کے نوجوان جن کے دل میں آگے بڑھنے اور بلند ہونے کے ارمان ہیں، ان کے ideals، ambitions ایک گھٹا دینے والے ماحول میں پس کر رہ جاتے ہیں پھر وہ despair os "hopelessness" os Frustration" ... . (ان اس زندگی میں کبھی کبھی تازگی اور شگفتگی کی ایک جھلک جو فطرت کا حسن اور عورت کا حسن دیکھکر پیدا ہوتی ہے لیکن عورت کو وہ صرف دیکھ سکتے ہیں، انہیں عورت کا قرب میسّر

نہیں، انکی سچی محبت میسر نہیں ۔ اسی لئے انکی زندگی اسقدر ہیجان ہے، بے کیف ہے، غیر مطمئن، بے معنی، مایوس کن زندگی ...... فلاٹ کے اس کمرہ میں رہنے والوں کے اسکیچیس کتنے portraits like [illegible] ہیں ——— چیٹرجی، جو بنگال سے تلاش روزگار کیلئے بمبئی آیا ہے مسلسل بیماری اور فاقوں کی وجہ دق کا مریض دکھائی دیتا ہے. لیکن دماغ میں یہ سودا لئے ہوئے کہ پروڈیوسر بنیگا۔" اف، ان خشک لبوں پر ایک بے جان مسکراہٹ ، یہ مسکراہٹ نہیں خون ہے "مسلسل فاقوں کی ایک تصویر ہے جو زندہ ہوکر اس کے لبوں پر ناچتی ہے" جسے سب گالیاں دیتے ہیں، نکالنے کی دھمکی دیتے ہیں اور وہ جھنجھلاکر خط لکھنے بیٹھتا ہے. لیکن کسے ؟ کون اسے روپیہ بھیجیگا ؟ ...... اور ڈپو میں نوکری کرتے ہوئے ایکٹر بننے کے خواب دیکھنے والا ہری چند، جو زندگی سے جوا کھیلنا چاہتا ہے، یہ ضد سے نوکری چھوڑ دیتا ہے کہ یا تو امیر بنے گا یا بھکاری اور ..... وہ بھکاری ہی رہتا ہے، سستے ہوٹل میں کھانا کھاتے کھاتے کمزور ہوتا چلا جاتا ہے اور ایک کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہتا ہے " اس ٹرنک میں میری بی. اے کی ڈگری ہے میں مرگیا تو یہ ڈگری لکھنو یونیورسٹی کو واپس بھیجدینا. ڈگری کا کافی حصہ دیمک چاٹ گئی ہے اور باقی ——— ہے بھی کیا ؟" ..... صبیح رنگ اور سنہرے بالوں والا گھبیر جو ایک ناچنے والی کی محبت میں گرفتار ہوکر اس کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے اور اس سے دھوکہ کھاکر محبت سے کھیلنے لگتا ہے ان گنت لڑکیوں سے ۔ لیکن جس کی زندگی میں مسرت کا سرچشمہ سوکھ چکا ہے وہ اپنی زندگی کا غم شراب میں گھولکر پیتا ہے اتنی پیتا ہے کہ کپڑوں کی بھی ہوش نہیں رہتی ..... اور اوتار سنگھ ڈپو کا ایک کلرک جو اس غلامی کی زندگی سے تنگ آکر کہتا ہے "یہ زندگی نہیں ہے، دوست، یہ موت ہے"۔ ہر سکیچ کے بعد Summing up کا Brilliant ہے. اور پھر وہ ہندوستانی تہذیب پوری آشیانہ بلڈنگ کی سیر کراتے ہیں۔ آشیانہ بلڈنگ جس میں حسن نہیں ہے صرف

بھوک ہے، غم اور مصیبتیں۔" ایک ہی بلڈنگ میں تمام ہندوستان کو دیکھ سکو گے"۔ ایک پاگل، ایک بھوکا کتا ("صاف ظاہر ہے کہ جس گھر کا کتا بھوکا ہے وہاں کے رہنے والے کتنے بھوکے ہونگے") ایک بھٹیارے کی شکل کا میوزک ماسٹر جس نے ایک طوائف کو پھانس کر کمرے میں قید کر رکھا ہے یہ عورت روتی ہے دریچے سے آنے جانے والوں کو پریشان نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے ـــــ" اب ذرا سیڑھیاں چڑھو" ایک کمرے میں ایک ابھری ہوئی ہڈیوں والی کرسچین لڑکی جس کے تین بچے ہیں، لیکن گھر میں کوئی مرد نہیں، یہ لڑکی جو ہر روز جیسے کسی کا انتظار کرتی رہتی ہے، فلیٹ کے دائیں جانب، ایک بوڑھا گجراتی جس کی جوان، بدصورت بیوی، روز جوڑے میں پھول لگا تکیہ میں منہ چھپائے پاؤں ہلاتی رہتی ہے جسکی آنکھوں سے یاس ٹپکتی ہے...... ایک مدراسن بیوہ اور اسکی بیٹیاں، بدصورت، جذبات سے عاری چہرے، آنکھوں میں نہ مٹنے والی پیاس، بھوک، زندگی سے نفرت اور مایوسی ـــــ اس افسانے میں زندگی کے کتنے پہلو نظر آتے ہیں۔ "زندگی کی سچی تصویر کشی"

یہ فقرہ اتنے بار استعمال ہوا ہے کہ اسکے معنی جاتے رہے ہیں۔ کسی افسانے کی تعریف کرنا ہے تو جھٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ اس میں زندگی کی سچی تصویر کشی ہے۔ لیکن آج تک مجھے اردو کا کوئی افسانہ پڑھ کر اتنی شدت سے یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ اس میں زندگی کی سچی تصویر کشی ہے، جتنا کہ "جہاں میں رہتا ہوں" پڑھکر ہوا۔ 'جہاں میں رہتا ہوں' میں زندگی کی جھلک ہی نہیں، زندگی کی تصویر ہی نہیں، زندگی ہے، اس سے بڑھکر ایک افسانے کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔

'جہاں میں رہتا ہوں' سے ملتا جلتا افسانہ شمس آغا کا "صبح و شام" ہے جو اس سال کا ایک اور شاہکار ہے (اس طرح کی افسانوی ٹکنیک کا سہرا احمد علی کے سر ہے۔ ہماری گلی) لیکن 'صبح و شام' میں بیرونی، زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے اور "جہاں میں رہتا ہوں" میں بلڈنگ کی اندرونی زندگی کی اور کہیں کہیں بلڈنگ کے باہر کی۔ دونوں میں مشاہدے کی

گہرائی اور تلخ طنز ہے۔ لیکن "جہاں میں رہتا ہوں" میں مصنف نے اپنے آپ کو افسانے کی فضا میں گھلا دیا ہے، مدغم کر دیا ہے اور 'صبح و شام' میں مصنف ایک باہر کے آدمی کی طرح بالکل الگ تھلگ کھڑے تماشہ دیکھتا ہے اور ہمیں دکھاتا ہے۔ شمس آغا نے گرد و پیش کی عکاسی کی ہے۔ مہندرناتھ نے اپنی تصویروں میں رنگ بھر کر دکھایا ہے اور ان میں آرٹسٹ کی شخصیت (Personality) ظاہر ہوتی ہے۔ ہاں اختتام پر شمس آغا بھی اپنے نظریہ کی جھلک دکھاتے ہیں 'زینت کے آنسوؤں' میں —— 'صبح و شام' جزو بینی اور تفصیل نگاری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ صرف ایک دن کا افسانہ ہے صبح — شام' لیکن اسی ایک دن میں زندگی کتنی بدل نہیں جاتی، صبح اپنی چھت پر چپ چاپ کھڑی ہوئی وہ غریب جوان لیکن متین 'بے نیاز' مردوں کی پروا نہ کرنے والی لڑکی شام کو عورت بن کر اپنی روح کے کرب کو آنسوؤں میں بہاتی ہوئی اپنے گھر لوٹتی ہے۔ مجھے شمس آغا کی کہانیوں کے اختتام بہت پسند ہیں آخر میں کوئی [illegible] ضرور ہوتی ہے لیکن اس طرح کی نہیں کہ ناممکن دکھائی دے۔

'نئے لکھنے والوں کی چیزیں پرکھنا' ان میں کوئی ہونہار ہوں تو ان کی چیزیں شائع کر کے انہیں روشناس کرانا بہت بڑی خدمت ہے۔ اردو رسالوں میں سب سے زیادہ "ساقی" یہ خدمت انجام دیتا آ رہا ہے۔ آج کے کئی اچھے فن کار "ساقی" کے پیش کئے ہوئے ہیں۔ "ادبی دنیا" نے اس سال شمس آغا کو روشناس کرایا ہے جنہوں نے ایک ہی سال کے عرصہ میں اردو ادب میں گرانقدر اضافہ کیا۔ انہوں نے ۴۴ء میں پانچ افسانے لکھے ہیں اور ان میں سے تین سال کے بہترین افسانوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں، 'سراب' اور 'صبح و شام' تو شاہکار ہیں، 'شکست' بھی اس قدر اچھا ہے کہ شاہکاروں کی لسٹ میں آتے آتے چوکتا ہے۔ 'صبح و شام' خارجی زندگی کی تصویر ہے، 'سراب' خارجیت اور داخلیت کا امتزاج ہے۔ 'شکست' خالص داخلی کیفیتوں کا مرقع ہے لیکن شمس آغا سب کو اسی آسانی سے نباہ سکے ہیں۔ 'شکست' ایک حسرت بھری کہانی ہے۔ اس کا ہیرو بھابی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن اس کے دل

ائی کی عزت ہے، بھائی سے محبت ہے۔ ممتاز مفتی کے "ماتھے کا تل" کا بھی کچھ اسی طرح
رح تھا۔ لیکن "ماتھے کا تل" میں سعید کو خود اپنی محبت کا علم نہ تھا۔ وہ تسلیم میں بھابی کو
ا تھا۔ لیکن ہلکے ہلکے اشاروں سے مفتی نے یہ محبت پڑھنے والوں پر واضح کر دی ہے۔
و خود اس کا علم نہیں۔ یہ جذبہ اس کے تحت الشعور میں ہے۔ لیکن 'شکست' میں یہ جذبہ
الشعور سے نکل کر شعور کی حدوں میں آگیا ہے۔ ریاض بھابی کے جادو سے بچنا چاہتا ہے
اُٹھنا چاہتا ہے لیکن بھابی اپنی ساری دلکشیوں کے ساتھ اس کے دل و دماغ پر اسکے
حواس پر چھا جاتی ہے۔ . . . شمس آغا نے ریاض کی دماغی کش مکش، اسکے کرب اور
کی اتنی صناعی سے مصوری کی ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔ جب انکا پہلا افسانہ 'خواب'
تھا تو ہمیں بالکل یہ احساس نہ ہوا تھا کہ 'خواب' لکھنے والا اتنا جلد اتنا اچھا فن کار
ئیگا۔" اندھیرے میں جگنو" کردار نگاری کی ایک اچھی مثال ہے۔ یہ افسانہ بہت اچھا
ا لیکن ایک نئے لکھنے والے کے قلم سے قابل قدر تھا۔ پھر انہوں نے 'سراب' کا سا
ہ ۲ص افسانہ پیش کیا۔ 'سراب' پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کرشن چندر کا ناول
ت "دوبارہ پڑھ رہی ہوں۔ یہ افسانہ اختتام کو چھوڑ کر شکست کی epitome
م ہوتا ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں گاؤں کی کہانیاں ہیں اور گاؤں کی زندگی
. نقشے ایک ہی طرح کے ہونا ممکن ہے۔ لیکن ـــــ سراب کا ہیرو وحید بھی شکست
م کی طرح کالج سے گھر آ رہا ہوتا ہے جہاں اس کے ابا ایک عہدہ دار ہیں۔ شیام کی طرح
. کے بھی ایک بھائی اور چھوٹی بہن ہے جو مٹھائیوں کیلئے ضد کرتے ہیں۔ شکست کے ملی جو
ب لے کے وٹرنیری ڈاکٹر بن گئے ہیں گو شکست میں بھی ایک وٹرنیری ڈاکٹر ہے۔ چودھری
محمد بڑی بے تکلفی سے ماں بہن کی گالی ٹھاک دیتے ہیں۔ 'شکست' میں بام دیو کا تکیہ کلام۔
اسکے گھر بھی اسی طرح کام بنانے کیلئے عورتیں آتی تھیں اور وحید کے گھر بھی۔ البتہ شعر
رے گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں ـــ کو ـــ گنا رہتے خوشی کے چند گھنٹے

پڑھنے والے (سراب کے) سردار صاحب شکست کے بسنت رام کا سا حسین تصرف نہ کر سکے۔ جو "مجرا کالب" کے ایک مصرع کیوں آہ بھر کر سناتا ہے: ہنڈلیاں بجارنے سرسام مجھے رُلا دیا۔ ــــ اور شکست کے کئی مناظر، اگر ان میں سے کرشن چندر کی رنگین بیانی نکال دی جائے تو 'سراب' کے مناظر بھی ہیں۔ اور وحید بھی شیام کی طرح سوچنے والا کردار ہے ــــ اتنے توارد کی وجہ یہ بالکل کاپی (نقل) معلوم ہوتی ہے۔ ہاں سراب کا اختتام بالکل الگ ہے اور میرے خیال میں شکست کے اختتام سے اچھا ہے۔ شکست کا آخری حصہ ــــ میرا مطلب شیام کے شگن اور شیام کے کالج لوٹنے سے نہیں بلکہ ونتی کی موت سے ہے ــــ حد درجہ Sentimental (جذباتی) ہو کر رہ گیا ہے۔ اختتام کے سوا "سراب" شکست کی نقل ضرور ہے لیکن اتنی اچھی نقل ایک کامیاب آرٹسٹ ہی کر سکتا ہے۔ چنانچہ ڈائرکٹر شانتارام کے فلم "آدمی" کو انگریزی فلم Waterloo Bridge کی نقل یا چربہ بتایا جاتا ہے پھر بھی آدمی ہندوستان کا بہترین فلم ہے اور social content کی وجہ واٹرلو برج سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ اچھی نقل ایک کامیاب آرٹسٹ ہی کر سکتا ہے۔ ایک معمولی لکھنے والا نقل کرنے میں منہ کی کھاتا ہے۔ عالمگیر (۴۵ء افسانہ نمبر) میں طفیل ملک نے 'راکھ کے نیچے' میں ممتاز مفتی کے Beautiful افسانے "آپا" کا ہو بہو چربہ اتارا ہے اور اتنی دیدہ دلیری سے کہ "باجی" کے لئے جلتے ہوئے اُپلے والی تشبیہ بھی کہ 'آپا' کی جان ہے استعمال کر دی ہے۔ اور دامن بچانے کیلئے بھائی جان کے بجائے آپا (باجی) کی شادی کر دی ہے۔ 'راکھ کے نیچے' 'آپا' کا ایک بگڑا ہوا اور بھینگا ہوا عکس ہے۔ لیکن شمس آغا نے بہت صناعی سے کام لیا ہے۔

صبح و شام بھی احمد علی کے افسانہ "ہماری گلی" اور ان کے ناول Twilight in Delhi کے پہلے چند صفحوں کا ــــ امتزاج معلوم ہوتا ہے۔ . . . . . .

لیکن شمس آغا نے اس سے ایک نئی ہی چیز تخلیق کی ہے۔ پھر شکست اور دوسرے افسانے لکھ کر انہوں نے یہ دکھا دیا کہ ان کا اپنا انفرادی رنگ بھی ہے وہ اوریجنل افسانے بھی لکھتا ہے۔

لکھ سکتے ہیں۔

ادبی دنیا دسمبر میں شمس آغا کے شہ پارے 'شکست' کے ساتھ ایک اور معرکہ کا افسانہ شامل ہے۔ 'دیمک'۔ بلونت سنگھ نے اب تک جتنی کہانیاں لکھی ہیں دیمک بلا شبہ ان سب میں بہترین ہے۔ موضوع، مواد، presentation، تکنیک ہر لحاظ سے بہت ہی بلند پایہ افسانہ ہے۔ فن کاری کا ایک بہترین نمونہ! ایک ہی دن کے واقعات میں عورت کی پوری زندگی دکھا دی ہے اور کتنی کامیابی سے! گھر کی چار دیواری میں بند، بچوں کے جنجال سے جھنجھلاتی ہوئی، گھر کے کاموں سے ہلکان، متوسط طبقے کی عورت، جس کی زندگی میں اب کوئی دلچسپی نہیں، کوئی مسرت نہیں، کوئی تازگی نہیں۔ ہاں اسکا شوہر آجائے تو شاید یہ بے کیف دن اچھی طرح ختم ہو۔ وہ اسکی راہ تکتی ہے، لیکن اس کا شوہر کیوں اس جنجال بھرے گھر میں رہیگا؟ مرد کو اس گھر سے وحشت ہوتی ہے۔ وہ کہیں اور نکل جاتا ہے۔ اس بیزاری، بے کیفی، وحشت کو محسوس کرتے ہوئے بھی عورت کو گھر میں بند رہنا ہوتا ہے۔ مرد کیوں رہیگا؟ اور عورت بے بس عورت، چپکے چپکے رونے اور اداس نگاہوں سے آسمان کو تکنے کے سوا اور کیا کر سکتی ہے؟ متوسط طبقے کی یہ ہندوستانی عورت، اٹھائیس برس تک پہنچتے پہنچتے اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ اس کے پہلے عورت کی زندگی کیا ہوتی ہے؟ بارہ تیرہ برس، بچپن سے جوانی میں قدم رکھتی ہوئی، جوانی کی اٹھان بھرا بھرا لچکدار جسم، بے داغ جلد، تازگی، رعنائی، صحت مندی، اتنے گھنے بال کہ قابو میں نہیں رہتے، الھڑ لڑکی جسے اپنی جوانی کا اتنا احساس نہیں ہوتا، معصوم امنگیں۔ انڈوں کی سفیدی میں دودھ ملا کر بالوں کو گھنگریالے بنا لینے کی سی معصوم خواہشیں ...... پھر جوان لڑکی۔ اپنی جوانی کا اپنے حسن کا احساس، کسی کو اپنے حسن کے جادو سے مسحور کر کے اپنا بنا لینے کی تمنا، اپنے ہونے والے شوہر کے تصور میں گم، اور اپنے اندر اس اٹھتے ہوئے ہیجان، ان ناقابل اظہار جذبات کو شرم میں چھپاتی ہوئی جوان لڑکی جس کی آنکھوں

میں ساری دلکشی سمٹ آئی ہے ...... اور پھر عروسِ نو، اپنے شوہر کے دل پر راج کرنے والی اس سے اپنی ہر بات منوانے والی۔ اور اس وقت اس کا شوہر بھی قدموں پر بچھا جاتا ہے، دفتر سے گھر لوٹنے کیلئے بے چین رہتا ہے ... پھر یہ آزاد رانی، گھر گرہستی سنبھالنے والی سگھڑ بیوی بن جاتی ہے۔ اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہونے لگتا ہے، وہ اپنے شوہر کی خدمت کرنا چاہتی ہے اس کے دکھ درد میں کام آنا چاہتی ہے ...... لیکن ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ بچوں کا جنجال گھر کے کاموں کی drudgery یہاں تک کہ وہ اپنی کنگھی چوٹی، اپنے کپڑوں پر تک دھیان نہیں دے سکتی .... اور اس کا شوہر دفتر میں دن بھر سر کھپا کر اس جنجال بھرے گھر میں رہنا نہیں چاہتا۔ اپنا زیادہ وقت باہر گذار دیتا ہے۔ اس سے بے پروا ہو جاتا ہے ... یہ ہے ہندوستانی عورت کی ٹریجڈی جسے بلونت سنگھ نے کمال صناعی سے ایک ہی دن کے واقعات میں پیش کر کے دکھایا ہے۔ عورت کی زندگی میں یہ stages بلونت سنگھ نے بیانیہ (narrative) انداز میں نہیں پیش کئے ہیں، بلکہ انہیں کرداروں کے ذریعہ بتایا ہے اور اس سے کہانی بہت ہی فنکارانہ ہو گئی ہے۔ مصنف اس کا ہمیں شعوری احساس نہیں دلاتا۔ ایک ذہین پڑھنے والا خود بخود یہ دیکھ لیتا ہے تیرہ برس کی لڑکی خود زینو کی بیٹی نجمی ہے۔ جوان سترہ سالہ لڑکی سلمیٰ ہے جو زینو کی سہیلی ہے اور جس کی زینو کے دیور سے نسبت ٹھہرائی گئی ہے۔ (دلہن والا اسٹیج میں نے اپنی طرف سے بڑھایا ہے تسلسل کے لئے) اور اٹھائیس سالہ زینو کی زندگی، افسانے کے دوسرے ناچتے کودتے، خوش و خرم کرداروں کے پس منظر میں اور بھی Tragic معلوم ہوتی ہے۔ اور کہانی کی poignancy اس لئے اور بھی بڑھ گئی ہے کہ پڑھنے والے جانتے ہیں ان ہنستی کھیلتی لڑکیوں کی قسمت میں بھی آئندہ چل کر ایسی طرح کی بے کیف زندگی لکھی ہے۔ جس سے اب وہ خود بے خبر ہیں۔ کئی جگہ تو بلونت سنگھ نے اتنی perfect عکاسی کی ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی، بارہ تیرہ برس کی لڑکی کی کتنی اچھی تصویر کھینچی ہے۔ جو اٹھان اور تنومندی میں

ہوتی ہے وہ بالکل جوان ہونے پر باقی نہیں رہتی۔ اور شرمیلی جوان لڑکی کی آنکھوں میں ـــ شوہر کی ٹھکرائی ہوئی عورت کا بچوں میں تسکین ڈھونڈھنا، خالد اتنا بڑا ہونے پر بلائے جانا اور نجمی کو لپٹا کر اسکی اٹھان پر فخر کرنا کہ اس جسم کو اس نے اپنی کوکھ سے جنم ، . . . . . یہ سب پڑھکر حیرت ہوتی ہے کہ بلونت سنگھ کا مطالعہ کتنا گہرا ہے ـــ ے لاجواب افسانہ ہے لیکن اختتام پر زینو کا شوہر کسی اور عورت یا رنڈی کے ہاں لی بجائے ـــ گو اس شے سے کہانی میں زیادہ درد پیدا ہوگیا ہے ـــ برج ہی کھیلنے لب یا سکنڈ شو، جیسا کہ میں نے کہا ہے، گھر سے اُکتا کر دل بہلانے کیلئے، تو افسانہ میں universality ہوتی۔ زینو کی زندگی میں اتنا دکھ تو نہیں، لیکن وہی خلا، ، اور اداسی رہتی اور یہ کہانی ایک عورت کی نہیں، کئی عورتوں کی نہیں بلکہ woman ا کی کہانی ہوتی۔ اب بھی اس میں عورت کی زندگی نظر آتی ہے لیکن موڑ نے اس کی وسعت کو محدود کر دیا ہے۔ ایک اور چھوٹی سی بات جو ذرا کھٹکتی ہے لہ صبح اور دوپہر کے واقعات بہت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ شام کا ذکر کرتے ہوئے ے کے ہنگامے کے بعد شام کے ہنگامے کا دور شروع ہوا' رونا دھونا' چیخنا چلانا' مارنا پیٹنا' ' پینا' ناچنا' گانا' پیار دلاسا سب کچھ ہو چکا" کہہ کر Abrupt طور سے آگے گئے ہیں۔ اسی کی تفصیل دی جاتی۔ لیکن 'دیمک' فن کا ایک ایسا مکمل نمونہ ہے کہ ئی بات نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ اختتام میں وہ چھوٹی سی ترمیم ہو جاتی تو 'دیمک' ، ابدی شاہکار رہتا۔ 'دیمک' ۴۴ء کا ایک شاہکار ہے اور پچھلے سات شاہکاروں ی کسی طرح کم نہیں۔ بلونت سنگھ نے امسال حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ 'دیمک' لاوہ انہوں نے دو اور بہت کامیاب افسانے لکھے ہیں 'سمجھوتہ' اور 'واپسی' بھی ے کے بہترین افسانوں میں سے ہیں۔ اور اپنی طرف سے ہٹ کر ایک رومانی افسانہ ہہ شہناز ـــ 'واپسی' میں بالا سنگھ ڈاکو کئی سال بعد قید جھیل کر اپنے گاؤں لوٹتا ہے

اس کے دوست جو خود بھی ڈاکو ہیں اسے نہیں پہچانتے اور دوسرے راہگیروں کی طرح اسے بھی تنگ کر کے اسکے پیسے چھین لیتے ہیں وہ انہیں پہچان لیتا ہے لیکن اکیلا ہی تینوں کو پچھاڑ کر ان کے روپئے بھی نکال لیتا ہے پھر روپئے واپس کر کے انہیں بتاتا ہے کہ وہ بالا سنگھ ہے۔ اور رننے، بشنے، کشنے پھوٹ پڑتے ہیں۔ "ابے بالی، تیری ماں کو بھگا لیجائیں چور، ابے آگیا تو، ابے تو؟ کتے کے پلے! کمینے! چور، کتے کے پلے!" کہہ کر بغلگیر ہوتے ہیں اسے چومتے ہیں! دیہاتیوں کی سادہ، پرخلوص، تصنع سے عاری محبت! ان گالیوں سے بھی کتنی محبت پھوٹی پڑ رہی ہے۔ 'واپسی' میں بلونت سنگھ نے پنجابی دیہات کی بہت اچھی تصویر کھینچی ہے۔ 'سمجھوتہ' میں جس کامیابی سے عورت کی فطرت کو بے نقاب کیا ہے قابل داد ہے۔ بلونت سنگھ نے جیسے عورت کے دل میں گھس کر سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ 'سمجھوتہ' کی "میں" ایک عام عورت ہے، نہ وہ sex starved ہے نہ آوارہ اس کے پچھواڑے کے مکان میں دس کنوارے رہتے ہیں۔ بلونت سنگھ نے ان کے sketches بہت اچھے کھینچے ہیں ہندوستان کی جنسی بھوک کے دس نمونے۔ پڑوس کو 'عورت' سے آباد دیکھ کر ان میں زندگی آجاتی ہے۔ اسے دیکھ کر آوازے کستے ہیں! ناچتے ہیں، آنکھیں مٹکاتے ہیں، قلابازیاں کھاتے ہیں۔ دھما چوکڑی مچاتے رہتے ہیں۔ دور ہی سے طرح طرح سے عشق جتاتے ہیں۔ اور وہ اس سے ناراض نہیں ہوتی، اس چھیڑ چھاڑ سے مانوس ہو جاتی ہے۔ اس سے بچنے کیلئے اندر رہنے کی بجائے کبھی کبھی آپ ہی چھت پر چلی آتی ہے۔ کوئی التفات نہیں دکھاتی لیکن اس چھیڑ چھاڑ کو پسند کرتی ہے۔ ایک دن گھر کی مالکن کے یہ دیکھ لینے پر وہ گھبرا جاتی ہے ان کے سامنے جا کر شریفانہ برتاؤ کرنے کی التجا کرتی ہے۔ اور دوسرے دن سے وہ گھر مرگھٹ بن جاتا ہے۔ دسوں آدمی خاموش اور اداس رہتے ہیں۔ اب گھر میں اس کا دل نہیں لگتا اور یہ گھر چھوڑنے پر اپنے شوہر کو مجبور کرتی ہے۔ وہ اس گھر سے جاتے وقت انکی مایوس صورتیں دیکھ کر محسوس کرتی ہے آخر کیوں اس نے ان سے یہ مسرت چھین لی؟ بہت کامیاب افسانہ ہے سال کے بہترین افسانوں میں گنا جا سکتا ہے۔

ممتاز مفتی کو بھی عورت کی فطرت اور عورت کی نفسیات کا تجزیہ کرنے میں کمال حاصل ہے۔ "تحت الشعور" کے افسانوں میں تو خیر یہ بات آسان ہے کسی حد تک کیونکہ ہم کسی eccentricity کا ذکر کرکے اگر لوگوں کو اس کا یقین دلانا ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو لاشعور کی تہوں میں چھپا ہوا راز ہے لیکن ممتاز مفتی یونہی کسی پیچیدگی کا ذکر کرکے اسے تحت الشعور سے منسوب نہیں کر دیتے۔ ان کے اکثر تخلیقات گہرے اور وسیع مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ ممتاز مفتی Abnormal عورتوں کو ہی نہیں عام عورتوں کی فطرت کی عکاسی میں بھی وہی اعجاز دکھاتے ہیں۔ "آپا" اس کی بہترین مثال ہے۔ 'بدماش' 'نیلی' اور 'جپ' میں تین الگ الگ طرح کی عورتوں کے کردار صناعی سے پیش کئے گئے ہیں۔ 'بدماش' کی 'دل آرا' ایک بہت ہی گرم مزاج Passionate لڑکی ہے 'جپ' کی 'جنیاں' ایک Typical عورت ہے۔ عیاری سے مردوں کو پھانسنے والی' اور دونوں کے برخلاف 'نیلی' کی صفیہ ایک سچی ہندوستانی بیوی ہے جو اپنے شوہر کی خوشی میں اپنی خوشی سمجھتی ہے۔ ممتاز مفتی نے ۴۴ء کے ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ انکی یہ تینوں کوششیں سال کے بہترین افسانوں کی (دوسری) لسٹ میں پہلی جگہ لے سکتے ہیں اور 'بدماش' تو اس قدر اچھا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے اسے ۴۴ء کے آٹھ شاہکاروں کے ساتھ شامل کر لیا جائے یا دوسری لسٹ میں سب سے پہلی جگہ دی جائے۔ ان تینوں شہ پاروں کے علاوہ ممتاز مفتی نے دو افسانے 'پریم نگر' اور 'آزاد' اور ایک ڈرامہ 'مدراہا' لکھا ہے 'آزاد' (سالنامہ ہندوستان) کافی اچھا افسانہ ہے۔ 'پریم نگر' میں محبت کی ٹریجڈی پیش کی گئی ہے، کئی محبت کرنے والے جوڑے اور لڑکیاں ہیں لیکن ایک عاشق کی محبوبہ کسی اور سے محبت کر رہی ہوتی ہے اور اس "کسی اور" کا دل ایک اور لڑکی کے زلف گرہ گیر میں پھنسا ہے اور وہ لڑکی کسی اور پر مرتی ہے۔ سب ایک سی Tragic زنجیر میں بندھے چلے جاتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی Fantasy ہے لیکن زندگی میں بھی تو کئی دفعہ ایسا ہو جاتا ہے۔ پریم نگر میں ممتاز مفتی کی [illegible] معلوم ہوتی ہے اور طرز نگارش

اس مواد کیلئے بہت موزوں ہے۔ بڑی فن کارانہ چیز ہے۔ 'دوراہا' میں بھی ایک ماہ پریم نگر کو جاتی ہے لیکن اس پریم نگر میں سچا پریم نہیں ہے۔ دوراہا کا فائدہ اٹھا کر وہاں "غلطی سے carried over ہو جاتے ہیں" اور یہ پرکیف دن گذار آتے ہیں اور یہ کہانی ریلوے کے مختلف آدمیوں کی زبانی جو اپنے جملوں میں آدھی سے زیادہ انگریزی استعمال کرتے ہیں بڑی دلچسپ معلوم ہوتی ہے ہلکا پھلکا لیکن دلچسپ ڈرامہ ہے۔ اس سال انکی بہترین کوشش "بدمعاش" ہے۔ 'بدمعاش' فنکاری اور صناعی کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ اسکی ہیروئین ایک passionate لڑکی ہے جو اپنے نفیس، خوش پوش، نرم مزاج شوہر کو — جس کی "بلوری، شربتی آنکھیں صرف اس لئے بنی ہیں کہ انہیں دیکھا جائے وہ خود دیکھ نہیں سکتی" — ایک بچہ سمجھتی ہے جیسے اسے ایک مرد نہیں کھلونا دیکر دل بہلا دیا گیا ہو۔ اس کا تو جی چاہتا ہے کہ دو چنگاری کی سی آنکھیں اسے ایک ہی نگاہ میں جھلس دیں۔ مضبوط بازوؤں، بے رحم سخت ہاتھوں اور مونچھوں والا گبرو — جو اس کے گھر کے سامنے رہتا تھا۔ اس کے احساسات پر چھاتا چلا جاتا ہے، شیرا۔ "وہ بدمعاش ہے بھی تو یوں، بس دیکھ کر دہشت آتی ہے۔ دیکھتا یوں ہے جیسے کچا ہی کھا جائیگا' بی بی' جو ایک دفعہ اس کی آنکھ میں چڑھ جائے بس، اس اللہ کی بندی کا اللہ ہی بیلی ہے . . . . وہ بے چاری نرس . . . . . میرے اللہ بے ہوش پڑی تھی . . . اب اس پورن پر ریجھا ہوا ہے۔" دل آرا یہ بڑی دلچسپی سے سنتی ہے اسے بدمعاش نہیں سمجھتی' لیکن جب وہ کہتا ہے "جان جائے پر منہ سے کہی ہوئی بات نہ جائے۔ محلہ والیاں تو ہماری مائیں بہنیں ہوئیں" تو دل آرا سوچتی ہے "بڑا بگلا بھگت بنا پھرتا ہے محلہ والیوں کو ماں بہن سمجھتا ہے بدمعاش کہیں کا" . . . . اور وہ کسی خیال میں پورن کے کپڑے پہن کر چلی جاتی ہے لیکن وہ شیرا کیلئے بھی "زبردست" ثابت ہوتی ہے۔ "حد ہو گئی' وہ سالی پورن تو یوں ہی پی گئی جیسے شیرا نہ ہوا پانی کا گلاس ہوا" شیرا کہتا ہے۔ ادھر وہ گھر واپس آکر مونچھوں والا بچہ' مونچھوں والا بچہ کہتی ہے اس unsatiated passion کی وجہ دل آرا' پر جو کیفیتیں طاری ہوتی ہیں' اس کی بڑی صناعی سے تصویر کشی کی گئی ہے۔

کہانی جس بات کے ارد گرد بُنی گئی ہے، اس سے افسانے کے فحش ہو جانے کا امکان تھا، لیکن مفتی نے طرح طرح کی تشبیہوں — گرداب، رنگین ساحل، ریت کا تودہ، ناؤ، صابن کا جھاگ وغیرہ میں اسے یوں چھپایا ہے کہ 'بو' اور 'بارہ گھنٹے' تو فحش قرار دئے گئے۔ لیکن 'بدماش' جوان دونوں افسانوں سے کہیں بڑھا ہوا ہے صاف اس الزام سے بچ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 'نیلی' بے حد دلکش افسانہ ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ مرکزی خیال پر ہی یقین نہیں آتا۔ 'آپا' کو اپنے شوہر کی محبوبہ نیلی کا سا بچہ کیسے پیدا ہوا جب کہ اس نے نیلی کو دیکھا تک نہ تھا؟ یہ بات بہت کھٹکتی ہے۔ ورنہ افسانہ اتنا دلاویز ہے کہ 'آپا' کی طرح اسے بھی بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ تحریر اور انداز بیان میں کچھ ایسی دلکشی ہے کہ پڑھنے میں عجیب لطف محسوس ہوتا ہے۔ ممتاز مفتی جب کبھی عورت کی زبان سے افسانہ بیان کرتے ہیں انکی زبان بڑی ہی پیاری ہو جاتی ہے۔ ہندی والا ٹھاٹھ 'آپا' اور 'نیلی' میں تو اور بھی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ 'نیلی' کی آپا کا کردار وہی "آپا" والی آپا کا lovable کردار ہے۔ بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ قربانی کرتی ہے۔ آپا کی گھور کالی آنکھیں جو بھائی جان کی بے اعتنائی سے چھلک اٹھتی ہیں وہ یہ چھلکی ہوئی آنکھیں چھپائے پھرتی ہے — بے بس لڑکی! لیکن بھائی جان بھی تو اتنے ہی بے بس تھے۔ 'آپا' میں ایک سچی ہندوستانی بیوی کا ایثار ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کا شوہر شادی سے پہلے دل کسی اور کو سونپ چکا ہے۔ وہ مجبور ہے۔ وہ اس کے قریب رہ کر اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ "آپا اندر ہے تو وہ باہر جا بیٹھے۔ اور وہ باہر آ گئی تو یہ کمرے میں چلے گئے۔ بہانے بہانے، ہائے بیچاری آپا کیسے منہ دیکھتی رہ جاتی۔ اس کے بعد تو آپا بھی چپ ہو گئی۔ بھائی کسی کام سے کمرے میں آئے تو وہ آپ ہی آپ بڑبڑائی، "میں تو بھول گئی" اور باہر نکل گئی۔ وہ باہر آئے تو ادھر ادھر ہو گئی لیکن کیا مجال جو چہرے سے ظاہر ہو۔ پہلے میرا خیال تھا آپا جل گئی ہے بھائی جان سے، لیکن توبہ آپا — آپا جلنے والی کہاں؟ وہ تو گنگنا جاتی ہے — اٹھتی اور چل پڑتی لیکن نیچی نظر سے دیکھتی جاتی۔ جیسے جی چاہتا ہے اب

بھی بلالیں تو بیٹھ جاؤں۔ ہائے یہ بھی کیا مصیبت ہے۔ یہ عورتیں یوں مٹ جاتی ہیں"... ...انہیں بچہ ہوتا ہے...... پھر جب 'نیلی' آنے والی ہے "صفی کل مہمان آئینگے"...... آپا نے نگاہ بھر کر دیکھا پھر مسکرا دی، عجیب مسکراہٹ تھی وہ، تعجب، خوشی اور غم میں بھیگی ہوئی... "گھر والی گھر آگئی۔ ہم دونوں بہنیں اکٹھی رہا کریں گی۔ میں خدمت کروں گی" آپا کی آواز بھر آگئی۔ "نہیں نہیں" بھائی چیخنے لگے، "اب نہیں، ہم میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا صفی!" کتنی حسین کتنی دردناک کہانی ہے! کیا یہی مواد بس نہیں تھا کہ مفتی نے ایک ناقابل یقین بات پر افسانہ کی بنیاد رکھی — صفی کو نیلی کی شکل کا بچہ ہونا۔ حمل کے دنوں میں ماں کے دل میں جو impression قائم ہوتا ہے بچہ اسی شکل کا ہوتا ہے، آپا ایک سچی ہندوستانی بیوی ہے وہ اپنے شوہر کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتی ہے یہاں تک کہ نیلی سے شادی کرانا تک اسے منظور ہے۔ لیکن نیلی کے خد و خال، رنگ روپ کا impression دماغ میں بٹھا کر (وہ بھی شاید سُنا سنایا، اس نے خود نیلی کو نہ دیکھا تھا) اسی طرح کا بچہ پیدا کرنا This is demanding far too much from her

شاید ممتاز مفتی نے بوڑھیوں کے اس قول کے گرد کہانی بننے کی کوشش کی ہے — "سچ کہتے ہیں سیانے، باپ کی نظر میں جو دلہن کی صورت جچ جائے تو بچے کو ماں پر جانا ہی ہوا"۔ بڑھیا کا یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے باپ کی نظر میں ماں کی صورت کا جچنا بجائے خود بچہ کی شکل پر اثر نہیں کر سکتا۔ بلکہ یوں اس کا اثر ہوتا ہے اگر وہ اپنی دلہن کے سامنے ہمیشہ اس پسند کا اظہار کرے اور خواہش کرے کہ بچہ اس کا سا ہو تو وہ بار بار آئینہ میں اپنی شکل دیکھتی ہے۔ ایسا Impression دماغ میں بٹھا لیتی ہے تو بچہ ماں کی شکل پر ہو جاتا ہے۔ اگر نیلی کی کہانی الٹی ہوتی تو یہ قابل یقین تھی الٹی یعنی بھائی جان دوسری لڑکی سے محبت کرنے کی بجائے 'آپا' شادی سے پہلے کسی اور سے محبت کر رہی ہوتی تو بچہ کا آپا کے محبوب کی شکل پر ہونا بالکل فطری بات ہوتی — 'نیلی' کی ہیروئن جتنی وفادار ہے 'جیب' کی اتنی ہی بیوفا اور طوطا چشم۔

وہ ایک مرد سے جی بھر کر کھیلتی ہے۔ لیکن اس سے شادی کرنے کے بعد اس سے بیزار ہو جاتی ہے اور دوسرے سے پینگیں بڑھانے لگتی ہے، اپنے شوہر کو زہر دے کر یا طلاق لیکر آشنا سے شادی کر لیتی ہے۔ پھر اس سے تھک جاتی ہے اور کسی اور کو ڈھونڈ لیتی ہے۔ مصنف نے جیناں کے کردار کو بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔ اختتام بہت اچھا ہے۔ سامرسٹ مام کے "اوف ہیومن بونڈیج" میں مائلڈرڈ فلپ کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے کیونکہ اسے اپنی ناپاک زندگی ہی پسند تھی۔ اور پہلے سے بھی زیادہ ناپاک زندگی بسر کرتی ہے۔ فلپ کو یہ معلوم ہے۔ پھر بھی ایک دن، عرصے بعد وہ کہیں نظر آتی ہے تو فلپ اسکی طرف بے پناہ کشش محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح قاسم جو جیناں کو مومن کے ساتھ رہتے دیکھکر اسے طلاق دیدیتا ہے۔ طلاق ملتے ہی مومن سے شادی رچتی دیکھکر تلملا اٹھتا ہے۔ اس شکاری دھوکہ باز عورت سے دل کی گہرائیوں سے نفرت کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا سحر کچھ ایسا ہے کہ پھر اسکی طرف بے اختیار کھنچا چلا آتا ہے۔ اور اب تو جیناں کی آغوش اس کے لئے کھلی ہی ہے کیونکہ اب وہ اس کا شوہر نہیں ہے!

عورت کی نفسیاتی پیچیدگیوں کی بڑی اچھی تصویر کشی ایک اور افسانے میں کی گئی ہے مدھوسودن کے "اعتراف" میں۔ یہ افسانہ بھی سال کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے شیلا ایک شادی شدہ عورت سے ایک کنوارا مرد (کرشن) محبت کرنے لگتا ہے۔ کرشن کے برتاؤ پر شیلا کے رد عمل کو مدھوسودن نے جس استادانہ کاریگری سے نبھایا ہے قابل داد ہے۔ شیلا کی شادی محبت کا نتیجہ تھی۔ وہ اب بھی اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے لیکن پھر بھی کرشن کی محبت سے دل ہی دل میں خوش ہوتی ہے۔ طرح طرح کی چالوں سے اس شعلہ کو اور بھڑکاتی ہے۔ کبھی آپ دور کھنچ کے اسے تڑپاتی ہے۔ کبھی پاس آکر، مسکراہٹیں بکھیر کر، کرشن کی پسند کے مطابق آنچل سے سر ڈھک کر، اسے لبھاتی ہے۔ کبھی اسے یہ احساس دلاکر چڑاتی ہے کہ وہ تو اب اس کی نہیں ہو سکتی۔ وہ کسی دوسرے کی ہے۔ کبھی اپنے شوہر سے بہت محبت جتا کر اس کے دل پر چوٹ لگاتی ہے۔ ... لیکن وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ وفاداری کے [illegible]

کی وجہ سے۔ اور کرشن اس کے اس کھیل سے تنگ آ کر کہتا ہے "مجھے تم سے نفرت ہے" مجھ سے نفرت ہے، یہ توہین اس کی برداشت سے باہر ہے وہ اپنے نسوانی غرور کی شکست پر تلملا اٹھتی ہے۔ افسانہ کا اختتام بھی اچھا ہے مجموعی طور پر بہت کامیاب افسانہ ہے۔ مدھوسودن کی بہترین چیزوں میں ہے۔ مدھوسودن نے اس سال ایک، اور افسانہ لکھا ہے 'سرخ روشنی'۔ اس کا مواد بہت اچھا ہے۔ ایک نوجوان اپنے گھر والوں کی غربت اور بے بسی سہہ نہیں سکتا گھر سے بھاگ آتا ہے کہیں اور جا کر کمائے۔ سٹیشن میں کہیں سرخ روشنی دیکھ کر اسے کچھ امید سی ہوتی ہے۔ افسانہ کا موضوع اتنا اچھا ہے کہ اس سے ایک بہت ہی poignant کہانی تیار کی جا سکتی تھی لیکن افسانہ ختم کر کے ایسا محسوس ہوتا ہے سرخ روشنی والے استعارے پر افسانے کو ختم کرنے کیلئے مدھوسودن مضطرب ہیں کہ وہ افسانے کے درمیانی حصے پر اتنی توجہ نہیں دے سکے، جتنی توجہ کا وہ مستحق تھا۔ یہ افلاس اور مصیبت کا اندھیرا ہندوستان میں بہت بڑی حقیقت ہے اور سرخ روشنی ابھی تک صرف دور افق پر دکھائی دے رہی ہے 'سرخ' سے جو نظام وابستہ ہے وہ ابھی محض موہوم امید ہے۔ اور اتنی دور سے یہ سرخ روشنی اتنی مدھم ہے کہ اس اندھیرے میں کمی نہیں کر سکتی۔ ابھی ابھی گھر سے بھاگ آئے ہوئے نوجوان کو جو اپنی اور اپنے گھر والوں کی بدنصیبی کو اس شدت سے محسوس کر رہا ہو، ایک سرخ جلتی ہوئی بتی کس طرح مطمئن کر سکتی ہے؟ اگر اسے سرخ روشنی دیکھ کر اس نظام کا خیال آیا بھی تو اسے یہ محسوس ہوتا ہوگا کہ یہ نئے نظام کی جو رٹ لگائی جاتی ہے محض جھوٹی تسلی ہے۔ جانے یہ نظام کب آئیگا۔ ابھی تو ہر سمت نئی مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں!

دیوندر ستیارتھی نے بھی اس سال کے ادب میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ قبروں کے بیچوں بیچ، چیت اور کمین گاہ سال کے بہترین افسانوں میں گنے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے دو اور افسانے لکھے ہیں، جگنو ہی جگنو، اگلے طوفان نوح تک۔ دیوندر ستیارتھی اکثر اپنے افسانے گیتوں کے [illegible] سے بنتے ہیں۔ [illegible] ان کے

کا ماحول اور پس منظر پیش کرتا ہے۔ لیکن ان کے اس سال کے افسانے ایسے نہیں ہیں گو دو ایک گیتوں کا کہیں کہیں ذکر آ گیا ہے۔ ستیارتھی کے افسانوں میں بہت تنوع ہے۔ اسلئے کہ ان کے افسانوں کا ماحول الگ الگ ہوتا ہے۔ ستیارتھی دیس دیس پھرتے ہیں اور ہمیں بھی ان دیسوں کی سیر کرا دیتے ہیں۔ "جیت" میں وہ ہمیں کٹک لے چلتے ہیں جہاں بڑے دفتر پر ترنگی جھنڈا لہرا رہا ہے اور دیوں کی قطاریں روشن ہیں۔ ـــ کیونکہ اڑیسہ کو الگ صوبائی حیثیت مل گئی اور کانگریسی وزارت بھی قائم ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔ پھر سات مہینے بعد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہمیں ایک جھونپڑی میں لیجاتے ہیں۔ اس کانگریس کی حکومت میں بھی غریبوں کی زندگی وہی تھی!۔ نیلامبر اپنی کانور میں لکڑیاں لاتا اور بیچتا پھرتا۔ سیمل دن بھر اپنی رکشا کے آگے جتا رہتا۔ کھانے کو بھات بھی مشکل سے میسر آتی۔ نیلامبر مستی کا بہانہ کر کے لیٹ جاتا ہے تاکہ روپی بھوکی نہ رہے۔ روپی اپنے پتی کے لئے بھات اٹھا کر رکھ دیتی ہے" اور خود بھوکی رہ جاتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ نیلامبر نے تو اپنی پرچی کانگریس کی صندوقچی میں ڈالی تھی اور گاندھی بابا کو ایک کانور ایندھن بھینٹ کر آیا تھا" اس نے سوچا تھا گاندھی بابا ہمیں اس کے بیاہ کا پربندھ کر دیں گے۔ کسی کو اس کا دھیان ہی نہ رہا۔ گاندھی بابا سے تو وہ زمیندار ہی اچھا نکلا جس نے سیمل کی مدد سے اپنے نام کی پانچ سو پرچیاں ڈلوا کر اسے نئی رکشا دی اور اپنے خرچ سے اسکا روپی کے ساتھ بیاہ بھی کروایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سیمل کی زندگی میں کچھ خوشی تھی۔ اس مصیبت بھری زندگی میں روپی کا ساتھ اسے سورگ معلوم ہوتا تھا۔ نیلامبر انکا پریم دیکھکر اور بھی کڑھتا۔ اسکی زندگی کتنی روکھی پھیکی تھی وہی کانور، دن بھر لکڑیاں بیچنا۔ ایک دن ایک خریدار اسے چپت لگاتا ہے تو اس کا دل ایسے ڈوب جاتا ہے کہ وہ ندی میں کود پڑنے کیلئے بھاگتا ہے لیکن سیمل اور روپی کی یاد اسے روک لیتی ہے۔ بہت اچھا افسانہ ہے۔ اور طنز — جیسے چھپ کر وار کیا جائے۔ "قبروں کے بیچوں بیچ" میں وہ ہمیں قحط زدہ بنگال کی ایک جھلک دکھاتے ہیں۔ یہ زیادہ تر کامریڈوں کی ایک پارٹی کی کہانی ہے جو بنگال میں بھوک موتوں کی تعداد معلوم کرنے گاؤں گاؤں پھرتے ہیں۔ بہت کامیاب افسانہ ہے۔ اوپند

'کمین گاہ' میں وہ ہمیں جنگ زدہ برما کی ایک کمین گاہ میں لیجاتے ہیں جہاں سولہ ہندوستانی سپاہی دشمن کی تاک میں بیٹھے ہیں مرہٹہ، سکھ، بنگالی، اہیر، سنیل کے حکم کے انتظار میں جو جنگی Strategy کا ماہر ہے ...... یہی سنیل کبھی سنگتراش تھا مجسموں میں حسن اور ابدی زندگی کھلاتا رہا تھا۔ جب وہ فن سنگتراشی کی بلندیوں کو چھو رہا تھا جنگ نے زور پکڑا۔ دشمن کے بموں نے اس کا نگارخانہ تباہ کر دیا۔ پھر اس نے فوج میں نام لکھوا لیا اور اب 'فن جنگ' میں بھی اتنا ہی ماہر تھا۔ وہ لڑ رہا تھا۔ فن اخلاق، انسانیت کے دشمنوں کو تباہ کرنے کا عزم لئے!

"جگنو ہی جگنو" میں کوئی خاص بات نہیں۔ افسانہ میں دلچسپی بھی نہیں ہے۔ "اگلے طوفان نوح تک" بڑے مزے کی چیز ہے۔ موضوع کے اعتبار سے عین مقتضائے حال، ناشروں کی سرمایہ دارانہ ذہنیت پر بڑی کامیاب طنز ہے۔ "زندگی کی ستم ظریفی دیکھئے سرمایہ داری پر ضرب لگانے والے مصنفوں کی کتابیں بھی ایک سرمایہ دار ناشر ہی شائع کرتا ہے، دس فیصدی رائلٹی دے کر سب نفع اپنے پیٹ میں انڈیل لیتا ہے۔" پبلشر کیلئے بلی کی تشبیہ اچھی طرح مناسب موقعوں پر استعمال کی گئی ہے۔ "نئے دیوتا" کی طرح اس میں بھی چند ادیبوں کا ذکر آگیا ہے۔ پبلشر کا کردار بہت خوبی سے کھینچا گیا ہے۔ 'اگلے طوفان نوح تک'۔ عنوان کی داد نہ دیجئے گا؟ دیوندر ستیارتھی واقعی پھڑکتے ہوئے عنوان چنتے ہیں۔ چنانچہ کنہیا لال کپور نے بھی 'اجتماعی کوشش' سے افسانہ تیار کرنے کا ذکر کرتے ہوئے عنوان تجویز کرنے کیلئے دیوندر ستیارتھی ہی کا نام پیش کیا ہے۔

عصمت چغتائی نے امسال بہت کچھ لکھا ہے: ڈرامے، مضمون، افسانے جن میں ناول کے باب بھی شامل ہیں۔ ٹیڑھی لکیر اور پہلی منزل کوئی خاص اچھی چیزیں نہیں ہیں۔ ممکن ہے یہ اسلئے ہو کہ یہ الگ افسانے نہیں ناول کے ٹکڑے ہیں۔ شیطان، تصویریں، خواہ مخو دلچسپ ڈرامے ہیں لیکن بقول پطرس ان کے ڈرامے کمزور ہوتے ہیں۔ عصمت چغتائی کو ڈرامہ نگاری پر اتنا عبور نہیں جتنا افسانہ نویسی پر ہے انکے اکثر کردار Types معلوم ہوتے ہیں۔ اور پلاٹ بھی made to pattern ہوتے ہیں۔ انہوں نے صرف ایک افسا

لکھا ہے "ہیرو" بہت کامیاب افسانہ ہے اور سال کے بہترین افسانوں میں سے ہے۔ 'ہیرو' ایک نوکر کی اپنے مالک کی 'کالج میں پڑھنے والی لڑکی' سے جذباتی محبت کی داستان ہے جو اس کو اپنے کزن کی چھیڑ چھاڑ سے بظاہر ناراض ہوتے دیکھکر بچانے جاتا ہے تاکہ لڑکی اسکی gallantry کی داد دے لیکن لڑکی سے داد کی بجائے جوتیاں ملتی ہیں۔ اور وہ بڑے گھر کی لڑکی کا خیال چھوڑ کر باورچی کی لڑکی عدیا ہی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ عصمت کو جزو بینی میں کمال حاصل ہے۔ انکے طرز نگارش میں بلا کی چستی ہے۔ ان کی اس سال کی بہترین کوشش انکا مضمون 'ہیروین' ہے۔ معرکہ کی چیز ہے۔ عصمت چغتائی کے مضامین پُرمغز ہوتے ہیں۔ تحریر میں بےساختگی ہوتی ہے پھر بھی وہ موضوع سے بہک نہیں جاتیں۔ ان کا یہ مضمون 'ہیروین' ان کے سال بھر کے افسانوں اور ڈراموں پر بھاری ہے۔

اوپندر ناتھ اشک نے بھی اس دفعہ زیادہ تر ڈرامے ہی لکھے ہیں۔ تولیے، پاگل، شادی کے دن..... ڈرامے میں اتنی Free scope نہیں رہتی صرف ڈائلاگ کے ذریعہ پوری کہانی بیان کئے جانے کا باعث اس میں کچھ غیر فطری انداز آجاتا ہے۔ لیکن اشک کے ڈراموں میں بالکل افسانوں کا لطف آتا ہے۔ 'ساقی' کے سالنامہ ۴۵ء میں ان کا ایک نہایت کامیاب ڈرامہ شائع ہوا ہے۔ ازلی راستے۔ یہ ایک ایسا شاہکار ہے کہ اردو ڈرامہ نگاری میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ پیچیدہ پلاٹ ہے اور کتنے ہی کردار ہیں، لیکن اشک نے اتنے فن کارانہ اور ایسے سلجھے ہوئے انداز میں نبھایا ہے کہ کہیں بھی کوئی بات غیر فطری معلوم نہیں ہوتی۔ ان کے دو افسانے "آجکل" میں شائع ہوئے ہیں۔ خلش، کیا چارہ ہے! کیا چارہ ہے، معمولی افسانہ ہے۔ یہ کئی دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ہمارے اچھے ادیب بھی "آجکل" کیلئے معمولی چیزیں لکھ بھیجتے ہیں۔ شاید اسلئے کہ "آجکل" کا معیار اتنا اعلیٰ نہیں ہے۔ آخر اشک کے قلم سے نکلے ہوئے افسانے کو یہی سمجھ کر جانچا جاتا ہے کہ یہ اشک کا ہے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ فلاں رسالہ میں چھپا ہے اسلئے معمولی ہے۔ 'خلش' اچھا افسانہ ہے لیکن

Beginning طویل ہوگئی ہے۔ اشک صرف ڈراموں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور یہ بات اچھی بھی ہے کیونکہ ہمارے ہاں کوئی اشک کا سا کامیاب ڈرامہ نگار نہیں ہے۔ لیکن انہیں افسانوں کو بھول نہیں جانا چاہیئے۔ زیادہ تعداد میں افسانے نہ بھی لکھیں تو 'کاکڑاں کا تیلی' کے سے ایک دو افسانے ہی لکھیں۔

محمد حسن عسکری نے اس سال بہت مفید اور پر مغز مضامین لکھے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو مضامین کیلئے وقف کر دیا ہے۔ 'جھلکیاں' کے مستقل عنوان سے 'ساقی' میں لکھتے ہیں۔ جھلکیوں سے ہمیں ادب کے پڑھنے اور سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اشرف صبوحی، اکبر اور نیر پر بھی بہت اچھے مضامین لکھے ہیں۔ سال کے شروع میں انکا ایک افسانہ گھٹلیوں کے دام شائع ہوا تھا۔ بے حد اکتا دینے والا افسانہ ہے۔ اتنا کہ اگر عسکری کی چیز نہ ہوتی تو ایک صفحہ پڑھنے کے بعد آگے بڑھنے کو جی نہ چاہتا۔ افسانہ کا آدھا حصہ تو دقیق فلسفیانہ مضمون معلوم ہوتا ہے۔ زبان اتنی دقت پسند کہ الفاظ گلے میں پھنستے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کرشن چندر نے "نئے افسانے" کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اردو افسانہ نویسوں میں منٹو کے بعد عسکری کے پاس ہی الفاظ کا اتنا اچھا ذخیرہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے عسکری اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے بالکل ٹھیک الفاظ چنتے ہیں اور کبھی کبھی نئے الفاظ بھی اختراع کرتے ہیں۔ حرامجادی یہ خوبی معلوم ہوتی ہے گٹھلیوں کے دام میں خامی۔ ہاں ایک پیراگراف بڑا چست اور expressive ہے جیسے 'کچوری' کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ 'چھیڑ مانگ نظریہ' کی سی اصطلاح کی کون داد نہ دیگا۔ لیکن یک رخا۔ استقطراطی اور شلوبجدیہ کے سے الفاظ کا اضافہ نہ ہو تو اچھا ہے۔ تین صفحوں کے بعد کہانی میں روانی آگئی ہے۔ جہاں سے 'بازار حسن' کا ذکر شروع ہوتا ہے وہ حصہ بہت اچھا ہے بڑا اچھا description دیا ہے۔ افسانہ کا ہیرو بدی کی تلاش میں ہے۔ ایک ایسی عورت جو مکمل بدی ہو۔ یہاں افسانہ منٹو کے ڈرپوک سے ملتا ہے۔ لیکن منٹو کا افسانہ [illegible] ہے۔ گٹھلیوں کے دام میں بہت extraneous matter

بھر دیا گیا ہے۔ بیچ بیچ میں تجزیہ کرنے کی بجائے [illegible] کی طرح خود مصنف کے [illegible] observations جس سے تاثر میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن اس میں تاثر ہے ہی کہاں؟ پورا افسانہ unconvincing ہے۔ لیکن عسکری نے ایک اور بہت اچھا افسانہ "ذکر انور" لکھا ہے۔ یہ پرانے تذکرہ نویسوں کی طرز پر لکھا گیا ہے عسکری نے بڑی کامیابی سے اس طرز کو اپنایا ہے حافظ محمد متین اپنے آباؤ اجداد کی کرامتوں کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے اس دبدبہ اور اثر پر اینٹھتے ہیں۔ خاندان کا وقار گھٹتا آتا ہے۔ پھر بھی یہ پدرم سلطان بود کی داستان نہیں چھوڑتے۔ ... افسانے میں کامیاب طنز ہے۔ عسکری اشاروں اشاروں میں کئی باتیں کہہ گئے ہیں۔ بہت کامیاب افسانہ ہے۔

اس سال بھی ہمارے کئی بہت اچھے فن کار خاموش سے رہے سہیل عظیم آبادی نے بھی صرف دو ہی افسانے لکھے ہیں۔ ایک چھوٹا سا دلچسپ مضمون لکھا ہے جس میں ٹاگور کے گیتوں کی تشریح کرتے اور انہیں جوڑتے ہوئے گاؤں کی زندگی کا بھی ایک حسین منظر ہمارے سامنے کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ دو افسانے "رام اور راون" اور "پھوڑا" ہیں "رام اور راون" اچھا افسانہ ہے اور اس میں نیکی اور بدی کے امتزاج کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ (کرشن چندر) 'پھوڑا' ایک کوٹھے والی کا بہت موثر اور درد انگیز افسانہ ہے۔ مواد کو اختصار نے یہاں بہت اچھی طرح تشکیل دی ہے۔ سہیل عظیم آبادی کے افسانے مختصر اور دلاویز ہوتے ہیں۔ 'پھوڑا' 'ہتک' سے ملتا جلتا افسانہ ہے، نرگس طوائف ہے۔ وہ اپنی پاکدامن ملازم لڑکی کے سامنے اپنے آپ کو کمتر محسوس کرتی ہے اور اس احساس سے جھلا کر اس لڑکی کو خواہ مخواہ "ڈانٹتی ہے" اری چنبیلی رات تو نے اتنی شراب پی یہ بڑی خراب بات ہے" کہہ کر اپنے احساس گناہ کو دبانا چاہتی ہے" لیکن چنبیلی میں اتنی تمیز کہاں تھی کہ وہ سمجھے لوگوں کو اپنے گناہوں کا ذکر کرنے میں بڑا لطف آتا ہے اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ان گناہوں کو دوسروں کے سر تھوپ کر بیان کیا جائے۔ (کتنا لطیف نفسیاتی نکتہ ہے!) جب نرگس کہتی ہے" اور یہ تو نے کیا سیکھا

ہے۔ ہر آنے والے مرد سے آنکھیں لڑایا کرتی ہے"۔ تو چنبیلی کہہ اٹھتی ہے "نہیں بی بی جی۔ میں کسی مرد سے نہیں بولتی۔ میں کیوں کسی کُتّے کو منہ لگاؤں"۔ اور نرگس کے دل کو ایک زبردست دھکا لگتا ہے۔ رات کسی آدمی نے کہا تھا "تم عورتیں سماج کے بدن کا پھوڑا ہو" وہ سُن کر چپ رہ گئی تھی۔ اسے کوئی جواب نہ سوجھا تھا۔ اگر وہ دوبارہ یہ بات کہے تو وہ منہ توڑ جواب دے سکتی تھی "پھوڑا تو ہیں۔ مگر غلاظت خور کیڑوں کی خوراک بھی۔ اگر ہم نہ رہیں تو ان ناپاک کیڑوں کا پیٹ کیسے بھرے"؟ (کیسی زبردست طنز!) لیکن اس وقت اس نے یہ بات خاموشی سے سُن لی تھی۔ خاموشی سے اپنی توہین برداشت کر لی تھی اور اب اس خفت کو مٹانے کے لئے غریب چنبیلی پر برس رہی تھی۔ لیکن چنبیلی نے تو یہ بات کہہ کر جیسے اس کے منہ پر ایک اور طمانچہ مار دیا۔ "کسی کُتّے کو منہ نہیں لگاتی"۔ واقعی وہ کتنی کمتر ہے۔ بھوکے نجس لالچی کتّوں کے ساتھ رہتی ہے اور وہ اس زندگی کو خیرباد کہہ کر جمال کا پیام منظور کر لینا چاہتی ہے۔ جمال ایک نوجوان جو اس سے عشق جتاتا تھا اور شادی کر لینے پر اکساتا تھا۔ لیکن اس وقت اسے خیال آتا تھا جمال حسد کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کوئی دوسرا اس کے راستہ میں آئے۔ وہ شادی کرنے پر کبھی تیار نہ ہوتی تھی۔ لیکن اب فیصلہ کر لیتی ہے۔ یہ سب قصّہ صرف ایک صبح کے واقعات میں بیان کیا گیا ہے۔ پلاٹ آہستہ آہستہ unfold کیا ہے بہت فن کارانہ چیز ہے اور سال کے بہترین افسانوں میں سے ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے امسال اتنے اچھے افسانے نہیں لکھے جتنے کہ گذشتہ سال لکھے تھے۔ نشیب و فراز، بے تحاشہ، محدب شیشے میں سے اور مہنگائی الاؤنس میں پہلا افسانہ معمولی ہے۔ بے تحاشہ بیکار محض ہے۔ "محدب شیشے میں سے" میں دلکش رومانی منظر کشی حسین ہے۔ لیکن خواہ مخواہ طول دیدیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف مہنگائی الاؤنس میں احمد ندیم قاسمی نے اختصار میں ایک شہ پارہ پیش کیا ہے۔ "مہنگائی الاؤنس" نہایت اچھا افسانہ ہے۔ فن کا ایک دلاویز نمونہ۔ تحریر میں بلا کی چستی اور دلکشی ہے۔ مہنگائی الاؤنس

سکے لالہ مراری لال ایک پیٹنٹ دوا استعمال کر رہے ہیں اور انہیں پرہیز ہے...... انکی بیوی کُسم جس نے ابھی تک اپنے اور اپنے پتی کے بیچ میں بیس برس کی طویل مسافت نہیں کاٹی تھی: "آنکھوں میں رس اور باہوں میں مس کی تمنائیں گھول کر تکان کی نامکمل انگڑائی لیتی ..... کُسم کی رگ رگ میں جھنجھناہٹیں بیدار ہوئیں۔ وہ ہنڈیا کے ڈھکنے کو کھسکا کر بڑبڑاتے ہوئے آلوؤں کو چمچے سے الٹتی پلٹتی۔ رُکی ہوئی بھاپ راستہ تلاش کر لیتی۔" (کیسا پھبتا کنایہ ہے)..... کُسم کے رُکے ہوئے جذبات لالہ امیر چند کا راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔ وہی لالہ امیر چند جن کے مذاق سے پہلے وہ چڑ جایا کرتی تھی" انہیں اندر آنے نہ دیتی تھی۔ جب کسم کی گود ہری ہونے کی مراری لال کو خوشخبری سنائی جاتی ہے۔ تو وہ سوچتے ہیں یہ کیسے ہو سکا؟ بچہ کا نام کبیر چند تجویز ہوتا ہے تو اس وقت مراری لال چونکتے ہیں"۔ "ہنگائی الاؤنس" سال کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

احمد عباس نے بھی صرف ایک ہی افسانہ لکھا ہے "بارہ گھنٹے"۔ ان گھنٹوں نے بڑی گونج پیدا کی۔ لوگوں میں ہلچل مچ گئی۔ سب اسے مخش اور ترغیبی بتانے لگے۔ یہ افسانہ مخش اور عریاں ہو یا نہ ہو لیکن۔ (صلاح الدین احمد) "عورت کے جوہر عصمت کو ایک طبقے کی سیاسی تحریک میں عورت کی طرف سے ایک ناچیز ہدیے کا درجہ" نہ دیا جاتا........ بینا" وجے سنگھ کی کریہہ صورت سے نفرت کرتے ہوئے بھی ایک ایثار کے جذبہ کے ماتحت اس کے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ علی عباس حسینی کی "بٹی" بھی اسی طرح ایک سپاہی کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ لیکن 'بٹی' میں یہ بات گراں نہیں گزرتی کیونکہ بٹی ایک اینگلو انڈین لڑکی ہے اور اس سوسائٹی "کی جنسی اقدار ان معاملات میں عام ہندو مسلمانوں سے مختلف ہیں" (تاثیر) 'بٹی' میں Natural development ہے۔ "بارہ گھنٹے" میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مصنف کے سامنے ایک نظریاتی خاکہ ہے۔ اور بینا کی قربانی' مقصد — اور اس کے لئے کئی situations یکجا کر کے کہانی کو کھینچ تان کر اس

مگر چلا گیا ہو۔ بچی کے آخری فیصلہ کا محرک بھی جذبہ ایثار ہی ہے لیکن افسانہ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس کا جنسی جذبہ بھی آہستہ آہستہ ابھرتا آتا ہے اور اسے ایثار کا سہارا مل جاتا ہے۔ "بارہ گھنٹے" میں بھی ایسا ہونا ممکن تھا کیونکہ بینا کے دل میں اپنے انقلابی لیڈر کیلئے جذبہ پرستش ہے گو، پھر وہ وجے سنگھ کی فوٹو میں کشش محسوس کرتی ہے۔ "(تصویر کی) ان آنکھوں میں ایک حیوانی کشش بھی تھی، ایک جنون انگیز شرارہ، ممنوعہ لذتوں کا اشارہ" —— یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب کسی کی طرف کشش ہو جاتی ہے تو وہ خواہ کتنا ہی بدل جائے، بدصورت بھی ہو جائے تب بھی وہ پہلا infatuation قائم رہتا ہے۔ وہ پہلے دیکھی ہوئی صورت کا نقش باقی رہتا ہے۔ ممکن ہے بینا کو بھی وجے سنگھ کے جھریوں دار چہرے کے پیچھے اس فوٹو والے دلکش چہرے کی جھلک، رسیلی آنکھوں میں وہی کشش نظر آتی اور وہ غیر شعوری طور پر ہی سہی، اس کشش کے ماتحت ایثار کا سہارا لیکر یہ اقدام کرتی۔ افسانہ کا development ایسا ہوتا تو فطری معلوم ہوتا اور پڑھنے والوں کو یہ احساس نہ ہوتا کہ مصنف نے خود بینا سے یہ کام کرایا ہے اور وہ اس کے اس عمل کو احسن سمجھتا ہے۔ افسانہ unconvincing سا معلوم ہوتا ہے۔ تخیل کو کھینچ تان کر واقعات کو کہانی میں منضبط کرنا پڑتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی سال (سالنامہ ادب لطیف ۴۵ء) احمد عباس نے اتنی فطری، اتنی human کہانی پیش کی ہے۔ 'چڑھاؤ اتار' سالنامہ کا بہترین افسانہ ہی نہیں ۱۹۴۵ء کے اب تک لکھے گئے افسانوں میں بلاشبہ بہترین ہے

علی عباس حسینی نے 'بچی' کے علاوہ ایک اور افسانہ لکھا ہے۔ 'مصنف'، مصنف پرلطف افسانہ ہے اور ان لوگوں پر بہت کامیاب satire ہے جو اپنے افسانوں میں حقیقت سے فرار ہو کر تخیلی دنیا بناتے ہیں محلوں اور شہزادیوں کے قصے لکھتے ہیں۔ ایک مصنف ٹوٹی پھوٹی کرسی پر بیٹھا۔ ایک شہزادی کے مخملیں بستر لگی مسہری پر سونے کا خیالی طرح طرح کے دلکش تشبیہوں کے ساتھ کر رہا ہے۔ اس کے اردگرد بچے شور مچا رہے ہیں' [illegible]

گھر والی چلا رہی ہے اور خود ایسی بے کیف فضا میں گھرا افسانے میں ایک کیف آور، رومانی، سہانی فضا کی تعمیر کر رہا ہے۔ جب وہ شہزادی کے کنول کے پاؤں کا ذکر کر رہا ہوتا ہے۔ مہترانی پاس سے گذرتی ہے۔ اس کی نظر اس کے پاؤں پر پڑتی ہے، کالے، کھردرے، جگہ جگہ سے پھٹے پھٹے پاؤں۔ "مصنف نے کانپ کر آنکھیں بند کر لیں۔ دل نے کہا" مہترانی اور رانی کے پاؤں میں فرق ہونا چاہئے" عقل نے "کیوں، کس لئے، کس وجہ کیا دونوں بنت حوا نہیں؟" کے سے سوالات کی بارش کر دی۔ مصنف پریشان ہوگیا"۔ ... لیکن پھر وہ "حور لقا" کے متعلق لکھنے میں محو ہوگیا۔ پھر شہزادی کے کمرے کے سکوت کو کئی تشبیہوں سے بیان کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس کے اردگرد سکوت کہاں؟ بچے دھاڑیں مار کر رو رہے ہیں بڑی مشکل سے آنکھیں دکھا کر انہیں روانہ کرتا ہے لیکن اتنے میں سڑک پر لوگوں کا شور سنائی دیتا ہے "رام نام ست رام نام ست" اردگرد کی تلخ حقیقتوں نے آخر کار مصنف سے یہ جملہ لکھوایا "ایسا سکوت جو چتا پر جلنے اور قبر میں دفن ہونے کے بعد ہی نصیب ہو سکتا ہے"۔ علی عباس حسینی بہت پرانے افسانہ نویس ہیں۔ لیکن ان میں اس قدر adaptability ہے کہ وہ ہر دور کا ساتھ دیتے ہیں پریم چند اسکول کے افسانہ نگاروں میں یہی ایک فن کار ہیں جن کا نام آج بھی مشہور ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ 'رفیق تنہائی' کے اکثر افسانوں اور 'آئی، سی، ایس' میں پریم چند کا رنگ ہے۔ باسی پھول کے افسانے نئے اور پرانے دور کی درمیانی کڑی ہیں۔ 'کچھ ہنسی نہیں ہے'۔ اور بعد کے افسانے جدید طرز کے ہیں۔ اور 'بچی' تو بالکل آج کا افسانہ ہے۔ بچی ایک شرمیلی اور مردوں سے گھبرانے والی لڑکی ہے۔ علی عباس حسینی نے اس میں یہ تبدیلی آہستہ آہستہ پیدا کی ہے۔ بس کے سفر کے دوران میں ایک گورے سپاہی کا ساتھ، اس کا سلوک، بچی کے جذبات کی کشمکش، سب بہت اچھی طرح بیان کئے گئے ہیں۔ بچی اور سپاہی سے ہندوستانی جو رشتے کا کہیں کہیں ہلکا موازنہ کر کے اینگلو انڈین طبقے کے مقابل میں ہندوستانیوں کی عظمت بتائی ہے بس کے سفر کا description بہت اچھا ہے۔ "بچی" سال کے بہترین

افسانوں میں گنا جا سکتا ہے۔

اختر اورینوی نے صرف ایک افسانہ لکھ کر چپ سادھ لی۔ 'کواڑ کی اوٹ سے' موضوع اچھا ہے۔ درد انگیز داستان ہے لیکن بہت طویل اور اکتا دینے والی۔ نہ جانے کیوں اختر اورینوی آج کل اچھا نہیں لکھ رہے ہیں۔ "بیداری" کے بعد اب تک سوائے 'سمنٹ' کے انہوں نے کوئی اچھا افسانہ نہیں لکھا۔ ان کے دوسرے افسانے جو معاصر اور چمنستان میں شائع ہوئے ہیں معمولی ہیں۔ ان سب افسانوں میں زبان تک اچھی نہیں لکھی گئی۔ 'کلیاں اور کانٹے' اور "بیداری" کی دلکش تحریر کہاں گئی؟ -

اختر رائے پوری نے بھی [illegible] ایک ہی افسانہ لکھا ہے "تلاش گم شدہ"۔ اختر رائے پوری، حیات اللہ انصاری اور دھرم پرکاش آنند نے بہت کم لکھا ہے، لیکن ایسا لکھا ہے کہ ان کی یاد کبھی محو نہ ہوگی لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ خاموش ہی بیٹھ جائیں۔ ان کے قلم سے ایک یا دو افسانے بھی اردو ادب میں گرانقدر اضافے کا باعث ہو سکتے ہیں۔

اختر رائے پوری نے پھر لکھنا شروع کیا ہے ۴۵ء میں بھی ایک معرکہ کا افسانہ شائع ہوا ہے۔ ویران خانہ۔ دھرم پرکاش آنند نے بھی ۴۵ء کی بزم ادب میں شرکت فرمائی ہے۔ کیا ہم حیات اللہ انصاری سے بھی یہ امید کر سکتے ہیں؟ — ہاں مئی ۴۵ء کے 'ساقی' میں ان کا بھی ایک افسانہ شائع ہوا ہے۔ سہانا سپنا۔ لیکن یہ افسانہ تو کچھ ایسا ہے کہ حیرت ہوتی ہے اس افسانے کیلئے "آخری کوشش" لکھنے والا قلم چاہئے تھا؟ اختر رائے پوری بہت بڑے آرٹسٹ ہیں۔ افسانوں پر ان کا فن ایک بھڑکیلے رنگ کی طرح چڑھا نہیں ہوتا کہ ہر عام پڑھنے والے کی توجہ جذب کر لے۔ بلکہ کندہ ہوتا ہے جواہر ریزوں کی طرح۔ ان کے جملے بہت "پرمعنی" ہوتے ہیں۔ اختصار میں بہت کچھ کہہ دینے میں انہیں کمال حاصل ہے اشاروں اشاروں میں کئی باتیں کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ maximum of effect in minimum of words جتنا اختر رائے پوری کے ہاں موجود ہے وہ شاذ ہی اردو کے کسی اور

افسانہ نگار میں ہو۔ وہ جملہ بہ جملہ کہانی کی تعمیر کرتے ہیں اس طرح کہ ہر جملہ پچھلے جملے پر اضافہ ہے۔ وہ تلخ طنزیہ جملے نہیں لکھتے لیکن انکے جملے جملے میں طنز اور satire کے نشتر چھپے ہوتے ہیں۔ انکا طنز بھی فن سے ڈھکا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر 'تلاش گم شدہ' کا پہلا پیراگراف ہی لیجئے۔ سردار جی جو جنگ کی حمایت کرتے ہیں۔ انکی پھولی ہوئی توند، ہاضمہ کی دوا اور سرکاری ٹھیکوں کا ذکر طنزیہ جملوں میں نہیں کرتے۔ بلکہ یونہی افسانے کے development میں آہستہ آہستہ یہ باتیں بتاتے جاتے ہیں۔ اور انہیں ٹھیکہ دار سردار جی کے ساتھ جن کا نظریہ ہے "جنگ حفظ حیات کے لئے از بس ضروری ہے" اسی دوسرے درجہ کے ڈبے میں سپاہی بنو خاں بھی ہے جو جنگ کی سختیاں جھیل کر ایک "ٹانگ گنوا آیا ہے۔ جب وہ گاؤں پہنچتا ہے اسکے گاؤں کے لوگ اسکی بہادری کے کارناموں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ سب اسکی گم شدہ "ٹانگ کا دھیان کرتے ہیں۔ اسکی مصنوعی" ڈھائی سو سے کم میں نہ ملنے والی" ٹانگ کی کوئی قدر نہیں کرتے۔ لیکن اس کے لئے "سب سے زیادہ صبر آزما گھڑی وہ ہوتی جب اسکی بیوی اسکی دکھتی ہوئی ران پر حقارت سے مالش کرتی ہوئی پاس پڑوس کے نوجوانوں سے آنکھ ملاتی اور اسکی ہر ادا پکار کر کہتی مجھے زندگی کا رس کون دیگا؟" بنو خاں ڈی۔ ایچ لارنس کے "لیڈی چاٹرلیس لور" کا clifford جو بن کر آیا تھا، اور لیڈی چاٹرلی نے gamekeeper میلار؟ کو تلاش کر لیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"آج اگر کوئی انعام دیا جائے تو بنو خان کو ضرور ملے جس نے بڑی حد تک اس معمہ کا حل تلاش کر لیا ہے کہ زندگی بغیر بیساکھی کے ایک "ٹانگ کے سہارے کس طرح گذاری جا سکتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ایک روز اس نے سنا کہ کوئی صوبہ دار میجر زخمی سپاہیوں کی حالت دریافت کرتے ہوئے اس کے گھر بھی آنے والے ہیں اور اسے یہ اُمید ہو چلی کہ کوئی نہ کوئی دوا ضرور ہوگی جو دوبارہ "ٹانگ لگا دے۔ اسی طرح جیسے بنجر زمین میں فصل آ جاتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس نے خواب میں دیکھا کہ فوجی وردی میں ملبوس ایک فرشتہ آیا جس نے اس کے داہنے گھٹنے میں ایک ایسا عرق سینچا کہ وہاں سے ایک پیڑ تنے اور پانچ ٹہنیوں کے ساتھ ابھر آیا۔ ۔ ۔ راوی کا بیان ہے

کو موضوع نام پورا کے لنگڑے سپاہی بنو خاں کے سر کٹے ہوئے گھٹنے سے ازسرنو شجرِ زندگی پھوٹ رہا ہے" اختر رائے پوری افسانے کا اختتام ان جملوں سے کرتے ہیں۔ ان سے اختر رائے پوری کی کیا مراد ہے۔ ٹھیک طرح سے سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا لیڈی چیاٹرلی کی طرح بنو خاں کی بیوی نے بھی ساتھی تلاش کر لیا تھا؟ کر لئے تھے؟ یا صوبہ دار میجر ای . . . . . اور اس کی بیوی نخل بار آور ہوگئی تھی! بنجر زمین میں فصل آنے اور "ازسرنو شجرِ زندگی پھوٹنے" کے شاید یہی معنی ہوں۔ بنو خاں نے خود یہ گوارا کر لیا ہو شاید روپیوں کی خاطر . . . اور رسوائی سے بچنے کیلئے یہ مشہور کرا دیا ہو کہ کسی افسر نے آ کر اسے ایسی دوا دی ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ شاید اسی لئے "راوی کا بیان ہے" کی آڑ لی گئی ہے یا ممکن ہے اختر رائے پوری نے اختتام میں یہ بتانا چاہا ہو ۔۔ "اور اب بھی ہے امید فردا کسی ساحرِ بے نشاں سے" . . . . . افسانہ میں شروع ہی سے ہندوستانیوں کی اس ذہنیت کی طرف اشارے ہیں۔ ہندوستانی جو غلامی میں بھی خوش ہیں۔ اپنی وفاداری پر نازاں ہیں "سرکار" سے جو کچھ ملا اس پر قانع ہیں۔ اتنی دفعہ مایوسی کی صورت دیکھ کر بھی اس سے بڑی بڑی امیدیں رکھتے ہیں۔ سپاہی بنو خاں "ٹانگ گنوا کر بھی حکومت کی اس مہربانی پر خوش ہوتا ہے کہ اسے اتنی اچھی مصنوعی ٹانگ دی گئی جو "ڈیڑھ سو پر بھی ملنی مشکل ہے" اور ساتھ ہی نئی بیساکھی بھی جس سے تازہ وارنش کی بو آ رہی تھی۔ پھر اسے اصلی ٹانگ کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ تو اسے سرکار کی اتنی امید ہے کہ وہ کسی کو ایسی دوا کے ساتھ ضرور بھیجیں گے جس سے اس کی ٹانگ دوبارہ اُگ آئیگی . . . اور آخر میں "راوی کا بیان ہے" سے شاید یہ بتانا مقصود ہو کہ دیہاتی کیسے ناقابلِ یقین باتوں پر بھی یقین کر لیتے ہیں اور افواہیں پھیلاتے پھرتے ہیں ۔۔۔ اختتام کے معنی خواہ کچھ بھی ہوں اس میں شک نہیں کہ یہ افسانہ سال کے بہترین افسانوں میں ہے۔

احمد علی گو بہت کم لکھتے ہیں، ان کا شمار اب بھی چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہے۔ انہیں نئے ادیبوں میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سال ان کا کوئی افسانہ رسالوں

میں نظر سے نہیں گذرا ۔ البتہ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "قید خانہ" اس سال شائع ہوا ہے۔ اس میں یہ افسانے شامل ہیں' قید خانہ' پریم کہانی' قلعہ' گذرے دنوں کی یاد' ان سب کہانیوں میں فلسفیانہ رنگ ہے بلا کی گہرائی اور شدید پُراثر طنز۔ قید خانہ' اور پریم کہانی' بہت بلند پایہ افسانے ہیں۔ میں نے پہلے بھی یہ دونوں افسانے انگریزی میں پڑھے تھے۔ قید خانہ Prison House کے عنوان سے Tomorrow کے پہلے نمبر میں اور پریم کہانی The man accursed کے نام سے Longman's miscellany کے پہلے نمبر میں شائع ہو چکے تھے۔ انگریزی میں یہ کہانیاں اور بھی great معلوم ہوتی تھیں۔ اردو میں وہ تاثر باقی نہیں رہا خصوصاً پریم کہانی میں۔ انگریزی میں اسے پڑھتے ہوئے ایک وارفتگی سی چھا جاتی ہے۔ اس کا درد دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے' پریم کہانی' محبت کی المناک ٹریجیڈی ـــ وہ ایک لڑکی سے محبت کرتا ہے لیکن محبت سے زیادہ محبت کے خیال سے محبت کرتا ہے۔ ایک طرح کی platonic محبت' یہاں تک کہ ایسے موقعوں پر بھی جب لڑکی خود اپنی محبت کا اظہار چاہتی ہے وہ اپنے آپ کو روکے رہتا ہے۔ اور اس بے جا روک تھام کا نتیجہ! دونوں کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ لڑکی دوسرے سے شادی کر لیتی ہے لیکن دق کا شکار ہو جاتی ہے گھل گھل کر جان دیدیتی ہے۔ اور وہ ایک دفعہ اس بری طرح ناکام ہو کر محبت سے کھیلنے لگتا ہے۔ کئی عورتوں کو جانتا ہے انھیں دھوکا دیتا ہے اور اسے اپنی کامیابی تصور کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسکے کچلے ہوئے دل سے وہ پہلی سچی محبت کی خلش کبھی نہیں مٹتی۔ دل کا زخم خراب ہوتا جاتا ہے۔ زندگی میں پھر کبھی سچی مسرت اور چین نصیب نہیں ہوتا۔ حد درجہ poignant اور درد میں ڈوبی ہوئی کہانی ہے۔ — It is a great story! 'قید خانہ' میں مصنف نے مختلف تخیلی تصویروں کے ذریعہ سے اپنی ذہنی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ زندگی خود ایک مستقل قید خانہ ہے۔' زماں و مکاں کی قید' پھر غلامی کی زنجیریں .... دنیا کی پریشانیوں سے گھبرا کر وہ اپنے آپ

میں پناہ لینا چاہتا ہے تو یہ Self اور بھی تنگ قید خانہ معلوم ہوتا ہے حساس نوجوان —— اس کا تخیل ہی اسکے لئے سب سے زیادہ اذیت دہ قید خانہ بن جاتا ہے۔ اوران سب کے اندر مقید، اس کا دم گھٹا جاتا ہے۔ وہ اپنی بے چارگی، بےبسی پر تڑپتا ہے —— قلعہ فلسفہ، سیاسیات سے تعلق رکھتا ہے۔ دشمن اس کے شہر پر قابض ہو جاتا ہے اس کے گھر والوں کو طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں۔ وہ گھبرا کر نکل کھڑا ہوتا ہے اور قلعہ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے جہاں اسے پناہ مل سکتی ہے اور وہ انتقام بھی لے سکتا ہے لیکن قلعہ پر پہنچکر اسے معلوم ہوتا ہے قلعہ بھی اب اس کیلئے جائے پناہ نہیں ہے کیونکہ دشمن اس پر بھی قابض ہو چکے ہیں۔ آخری آس بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ اب وہ کہاں جائے گا؟ . . . . . بہت موثر اور درد بھرا افسانہ ہے۔ "گذرے دنوں کی یاد" میں افسانے کا 'میں' اپنی گذشتہ محبتوں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ پھر وہ سوچتا ہے "کیا وہ سب واقعی زندہ حقیقتیں تھیں؟" اور اسی سے اپنے دل کو تسکین دے لیتا ہے۔

احمد علی کی یہ کہانیاں اردو افسانوی ادب میں واقعی گرانقدر اضافہ ہیں۔

چودھری محمد علی۔ ہمارے ماہر جنسیات جنہوں نے "تیسری جنس" پیش کی تھی۔ اس دفعہ اپنے مخصوص موضوع کے چند اور پہلو "یہ جنس" میں پیش کئے ہیں۔

کنہیا لال کپور اپنے میدان میں تنہا ہیں۔ کامیاب مزاح و طنز نگار۔ انکا شمار باقاعدہ افسانہ نگاروں میں نہیں ہوتا اور انہوں نے اس طرف زیادہ دھیان بھی نہیں دیا ہے۔ صرف مضامین لکھتے رہے ہیں۔ اس دفعہ انہوں نے 'نے چراغ نے گلے' اہل زبان اور میر کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ اور شیخ چلی لکھے ہیں۔ کامریڈ شیخ چلی میں مختصر افسانے کے سارے لوازمات موجود ہیں۔ اس کو ایک افسانہ ہی کہنا چاہئے بہت کامیاب Satire ہے۔ بے حد دلچسپ چیز ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

چند اور افسانے بھی ہیں جو سال کے بہترین افسانوں کی فہرست میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ سیڑھی۔ (کوثر چاندپوری)، شادی (مجتبیٰ حسین)۔ فیصلہ (کوشلیا اشک)

'لندن کی ایک کھڑکی'۔ (آغا محمد اشرف) 'پاتر' (ظفر قریشی) 'کسک' (تسنیم سلیم) انکے لکھنے والوں میں سے اکثر نے بہت لکھا ہے، دو ایک صاحب تصنیف بھی ہیں، لیکن موجودہ افسانوی ادب میں ان کا کوئی خاص پایہ نہیں۔ اور باقی نے بہت کم لکھا ہے۔ کوثر چاندپوری کو میں نے اب تک ایک مزاحیہ نگار کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ سیڑھی پڑھ کر پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ وہ grim افسانے بھی اتنے اچھے لکھ سکتے ہیں۔ سیڑھی زمیندار کیلئے بھاگوان ہے۔ اس کے ذریعہ اس کی بڑی بڑی کوٹھیاں بنتی ہیں۔ لیکن مزدوروں کے لئے؟ بوڑھا مزدور اس سے گرکر قریب قریب موت کے منہ میں چلا جاتا ہے اور اسی کے ذریعہ جوان مزدور رشاما کی رہی سہی دولت لٹ جاتی ہے...... کوثر چاندپوری نے نہایت فن کارانہ انداز میں اسے پیش کیا ہے۔ descriptive passages اتنے اچھے ہیں کہ انہیں پڑھتے ہوئے مجھے Leslie Halward کا ایک افسانہ BOSS اور انکی آٹو بیاگرافی Let me Tell you کے وہ حصے یاد آگئے جس میں تفصیل کے ساتھ مزدوروں کے پلاسٹر کرنے کا بیان ہے۔ لیسلی ہالورڈ خود پلاسٹرر رہے تھے۔ لیکن ان میں صرف پلاسٹر اور چونا لگانے کی تفصیلیں درج ہیں۔ کوثر چاندپوری نے اپنے افسانے میں گھر بننے کا پورا نقشہ کھینچا ہے اور ایسا کھینچا ہے کہ عمارت ہماری آنکھوں کے سامنے بنتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اونچی، سربلند عمارت پیلی پیلی دھوپ میں چمکتی ہوئی، مزدور مردوں اور عورتوں کا اینٹ، گارے اور چونے کی ڈلیا لئے سیڑھی پر چڑھنا، اترنا، اینٹیں جمانا، گارا لگانا، پلاسٹر کوٹنا۔ اس کے ساتھ بوڑھے کے سیڑھی سے گرنے کا دردانگیز منظر، یہ واقعہ افسانے میں اس خوبی سے لایا گیا ہے کہ یہ بالکل نہیں معلوم ہوتا۔ مصنف نے کسی مقصد سے اسے بیان کیا ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کے متعلق لکھتے ہوئے اکثر افسانہ نگار کوئی نہ کوئی واقعہ ایسا لاتے ہیں جس سے پڑھنے والوں کے دل میں ان کے لئے ہمدردی پیدا ہو۔ اور اس طرح کے اکثر افسانوں میں، اگر یہ واقعہ غیر فطری نہ بھی معلوم ہو، تب بھی مصنف

کی یہ 'غرض' آسانی سے پہچانی جاسکتی ہے۔ لیکن کوثر چاندپوری اس واقعہ کو افسانے کی تعمیر کرتے کرتے اس صناعی سے لے آئے ہیں کہ ہمیں اس "غرض" کا بالکل پتہ نہیں چلتا.......

پھر شاما اور اسکی بیوی کی چھوٹی سی حسین دنیا — دن بھر پسینہ بہانے کے بعد پریم ٹھنڈک، کڑوں والی بات سے اس پریم میں جلا آجاتی ہے . . . وہ اپنی بیوی کے کڑوں کی مرمت کرادیگا خواہ آٹھ دن روکھی روٹی ہی کیوں نہ کھانی پڑے، اسکی کلائیوں میں وہ نقرئی کڑے کتنے بھلے معلوم ہوتے ہیں! وہ تصور کرکے خوش ہوتا ہے۔ لیکن صبح ہوتے ہوتے انکی یہ چھوٹی سی خوشی بھی چھین لی جاتی ہے۔ کڑے غائب ہیں وہی سیڑھی لگاکر کوئی چور لے گیا ہے "سیڑھی" بہت فنکارانہ چیز ہے۔ سال کے بہترین افسانوں میں اس کا شمار ہوسکتا ہے۔
—— مجتبیٰ حسین کا 'بوجھ' بھی اچھا افسانہ ہے لیکن "شادی" بہت کامیاب ہے۔ ہماری نئی تہذیب کے ایک اہم نفسیاتی پہلو کو بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے۔ ایک مرد جو خود بھی جنسی معاملات میں آزاد تھا۔ ایک آزاد بھڑکیلی لڑکی سے شادی کرلیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کئی نوجوان اس لڑکی کے گرد منڈلاتے رہے ہیں۔ لیکن اسی glamour کے باعث تو وہ اس سے شادی کرتا ہے لیکن شادی کے پہلے کی بات ہی اور تھی' شادی کے بعد اور" اس کے قبل جیسے اور کئی نوجوان تھے ویسا ہی وہ خود کو بھی سمجھتا تھا۔ لیکن اب وہ طلعت کو اپنی ملک سمجھنے لگا تھا" اب وہ اس کا شوہر تھا۔ اس کی آزادی سہہ نہیں سکتا۔ " اب ہم میں نہیں نبھ سکتی" وہ کہتا ہے " ممکن ہے نبھ سکتی اگر. . . . ." — " اگر شادی نہ ہوئی ہوتی. .
. . . میں بھی یہی سوچ رہی تھی" —— احمد علی کی "ہماری گلی" کی طرز پر آغا محمد اشرف کا افسانہ "لندن کی ایک کھڑکی" بھی بہت کامیاب ہے۔ جزو بینی اور کردار نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہے —— کوشلیا اشک نے اس دفعہ بھی ایک بہت اچھا افسانہ لکھا ہے "فیصلہ" گو یہ ان کے پچھلے سال کے "تھکان" کا سا کامیاب نہیں۔ ان کا ایک اور افسانہ "نمو" حالات حاضرہ کے پس منظر میں محبت کی درد بھری کہانی ہے۔ "فیصلہ"

کا موضوع بھی "نقصان" کی طرح unhappy marriage ہے اور مرد کے زاویے سے لکھا گیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کوشلیا اشک مرد کے جذبات اور احساسات کی اتنی کامیاب عکاسی کیسے کرسکتی ہیں۔ نہیں معلوم اتنی پختہ فن کار کیوں صرف 'آجکل' ہی کی ہوکر رہ گئی ہیں۔ اگر وہ کچھ زیادہ لکھیں اور دوسرے معیاری رسالوں میں بھی لکھتی رہیں تو انہیں نئے لکھنے والوں میں ایک نمایاں جگہ حاصل ہوگی —— تسنیم سلیم چھتاری کی چند چیزیں پڑھنے کا اتفاق ہوا لیکن ان میں صرف "کسک" بہت پسند آیا۔ 'کسک' کا مواد بہت اچھا ہے اور بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ مجید جانتا ہے کہ صبحی اس سے محبت کرتی ہے۔ اسے بھی صبحی سے محبت ہے لیکن یونہی اسے تڑپانے کیلئے نہ صرف اس سے بے نیازی برتتا ہے بلکہ دوسری لڑکیوں سے خواہ مخواہ دلچسپی ظاہر کرتا ہے صبحی جل کر انتقاماً اس کے سامنے کمال پر زیادہ توجہ دینی شروع کرتی ہے۔ مجید کی ستم ظریفی —— کبھی کبھی اپنی محبت کی جھلک دکھاتا ہے۔ صبحی خوش ہوکر اصلی حقیقت جاننا چاہتی ہے، تو پھر بے نیاز ہو جاتا ہے۔ صبحی جانتی نہیں وہ کیا سمجھے! اور ایک ان جانے لمحے میں کمال کو قبول کرلیتی ہے۔ اور اب اسے معلوم ہوتا ہے کہ مجید سچ مچ اس سے محبت کرتا تھا۔ لیکن اب بہت دیر ہوچکی تھی۔۔۔ وہ کمال کی ہوچکی تھی۔ اس کا سب کچھ کمال کا تھا لیکن اس کے دل میں ایک کسک رہ گئی تھی جو مجید کی تھی —— ظفر قریشی کا "بار" بہت اچھا افسانہ ہے ایک Finished piece کمیونسٹوں کے متعلق چند لطیف طنزیہ کنائے ہیں۔ ایسا چست انداز بیان ہے اور ماحول بھی کچھ ایسا ہے کہ یہ کوئی مغربی افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اور ان کا "یہ دس سگریٹ" تو Joseph Gurnard کے Twenty cigarettes (پنگون نیو رائٹنگ نمبر ۱۳) کا ہو بہو چربہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں کی دس سگریٹ کی پاکٹ کی مناسبت سے Twenty cigarettes کو "یہ دس سگریٹ" بنا دیا گیا ہے۔ البتہ بیوی اور سگریٹ کا موازنہ والا حصہ بڑھا دیا گیا ہے۔ اور کہیں کہیں اپنے بھی تین چار جملے شامل کرکے اسے بگاڑ

دیا ہے۔ "چھ پیسے کے اسٹامپ آنے پر نام بتایا جائے گا" یہ جملہ تک فٹ نوٹ میں دیا ہے۔

یہ تھا ۱۹۴۴ء کا ہمارا افسانوی ادب، نئے ادب کی زندگی میں ایک اور سال گذر چکا۔ اسمیں شک نہیں کہ گذشتہ چند سالوں میں ہمارے افسانوی ادب نے بہت ترقی کرلی ہے۔ اس دور کا ادب جاندار ہے اسمیں بلا کی تیزی، قوت اور vitality ہے لیکن یہ ساری قوت موجودہ نظامِ معاشرت پر حملہ کرنے کیلئے صرف کر دی گئی ہے۔ سماج کی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکنے اور پرانی قدروں کو مٹانے اور اس کیلئے ہمارے اکثر ادیبوں نے انسانی کردار اور زندگی کے روشن پہلو دیکھنے سے جیسے سرے سے انکار ہی کر دیا ہے۔ وہ زندگی میں صرف بدی، مصیبتیں اور مایوسیاں دیکھتے رہے ہیں۔ ان کی تحریروں میں کوئی رجائی پیغام، کوئی affirmative note نہیں، ہمارا ادب صرف "Literature of negation" ہو کر رہ گیا ہے۔ پڑھنے والوں اور خود لکھنے والوں پر ایک ایسی یاس پرستی اور قنوطیت چھا گئی ہے کہ کوئی امید ہی باقی نہیں رہی۔ یہ مایوسی ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ ہمارے ادیب اب ایسی چیزیں بھی لکھیں جن سے "انسانیت" پر بھروسہ اور انسانی ترقی کی امید قائم ہو۔ حقیقت کو بحیثیت مجموعی دیکھیں، اس کے صرف ایک پہلو میں الجھ کر نہ رہ جائیں، ساتھ ساتھ صحت مند نظریئے اور اثباتی اقدار بھی پیش کریں، کوئی ادب اس وقت تک صحیح معنوں میں زندگی کے لئے مفید نہیں ہو سکتا جب تک ہمارے سامنے اثباتی اور تعمیری (Positive and constructive) اقدار پیش نہ کرے ——— بھروسہ اور امید اسی وقت قائم ہو گی جب ہمارے ادیب انسانی کردار کے اچھے پہلو بھی بتائیں۔ اس حقیقت کو فراموش نہ کریں کہ دنیا میں غلاظت اور بدصورتی ہی نہیں پاکی اور حسن بھی ہے غم اور مصیبتیں ہی نہیں راحت اور مسرتیں بھی ہیں، تاریکی ہی نہیں روشنی بھی ہے۔ بدی ہی نہیں نیکی بھی ہے۔ اس وقت ہمارا ادب میں زندگی کی وسعت

ہوگی۔

اب جبکہ یہ ہولناک جنگ ختم ہو رہی ہے اور فسطائیت کا قلع قمع ہو رہا ہے، لوگ ایک نئی دنیا کی تعمیر کی آس لگائے بیٹھے ہیں، ایک ایسی دنیا جس میں آزادی ہو، مساوات ہو، مستقل امن ہو۔ اور ہندوستان کو بھی اپنی آزادی کی کچھ کچھ اُمید ہو چلی ہے۔ ممکن ہے ہمارے ادب میں رجائیت کی جھلک پیدا ہو۔ کرشن چندر جو نئے افسانہ نگاروں کے امام ہیں، ان کے افسانوں میں اسی سال یہ جھلک موجود ہے "ان داتا" میں اتنی بڑی ٹریجیڈی کے آخر میں بھی ایک optimistic note ہے، اور "موبی" تو ایک نوید جانفزا ہے۔ اگر ہمیں گذشتہ جنگ کے بعد جیسی مایوسی اور disillusionment دیکھنا نہ پڑے تو قرین قیاس ہے کہ Postwar literature کی نوعیت ہی بدل جائیگی۔ اس میں حقیقت ہوگی لیکن یہ یاسیت نہ ہوگی، ممکن ہے ۱۹۴۵ ہمارے ادب کی زندگی میں ایک موڑ ثابت ہو اور آئندہ سالوں میں ادب کی دھارا ہی بدل جائے۔

نیا دور نمبر ۵ کی ایک جھلک

مضامین: "اقبال بحیثیت شاعر و فلسفی" از احتشام حسین۔ "نئے نقاد" ـــ (۱) فراق گورکھپوری از عطا محمد۔ "جنگ اور ادب" از محمد شاہین۔

افسانے:- ہندرناتھ "سالی کہیں کی"۔ امرت رائے "غدار ماسٹر" (ہندی) مدھوسودن "شمع، پروانے، اندھیرا"۔ جان سٹینبک (امریکن) "چھاپہ"۔ قرۃ العین حیدر۔ "ہم لوگ" ان کے علاوہ کرشن چندر۔ احمد عباس۔ زہرہ پرکاش آنند۔ ممتاز شیریں۔ راما نند ساگر اور ہاجرہ مسرور کے افسانے آنے کی توقع ہے۔

نظمیں:- "کسان" الطاف مشہدی۔ "دیکھ دام سراب کا عالم" خورشید الاسلام۔ "تصویریں" عزیز حامد مدنی۔ "راستے" منظور حسین شور (علیگ) "نیا افق" اختر ہوشیارپوری وغیرہ ان کے علاوہ فراق گورکھپوری، احمد ندیم قاسمی، اختر انصاری، یوسف ظفر، دشوا متر عادل، اختر الایمان اور سلام مچھلی شہری کی نظموں کی توقع ہے ـــ یہ سب مضامین غیر مطبوعہ خاص "نیا دور" کیلئے بھیجے گئے ہیں۔

نئے نئے ڈزائن کی عمدہ اور جاذب نظر

ریشمی اور بنارسی ساڑیاں

بہترین دیدہ زیب

بارڈروں کے ساتھ

LATEST SILKS

&

UP-TO
DATE
SAREES

Specialists in Benares Sarees,
Brocades & Borders

چنڈی رام برادرس

نمبر ۴ سوتھ پریڈ
معسکر بنگلور

نیا دور

(دو ماہی رسالہ)

5

ایڈیٹر:- صمد شاہین

سالانہ چندہ
چھے روپئے

فی پرچہ
ایک روپیہ چار آنے

نیا دور، ۱۲ خلاصۃ الصفا بنگلور

ORIENT BOOK STALL
1810-830A Sahrah-e-Osmani

ترتیب

مضامین

		صفحہ
اقبال بحیثیت شاعر اور فلسفی	سید احتشام حسین	۶
نئے نقاد ۔ دی فراق گورکھپوری	عطا محمد	۱۸
ظفر علی خان اور انکی شاعری	عبدالقادر سروری	۸۷
اردو ناول نویسوں کا نیا دور	علی عباس حسینی	۹۶
جنگ اور ادب	صمد شاہین	۱۴۱
نقد و نظر	ممتاز شیریں	۱۵۹

کہانیاں

		صفحہ
غفار ماسٹر	امرت رائے	۴۵
سالی! کمینی کہیں کی	مہندر ناتھ	۵۶
شمع، پروانے، اندھیرا،	مدھوسودن	۷۰
ہم لوگ	قرۃ العین حیدر	۱۱۴
کلنک	سرلا دیوی	۱۲۳
تیسرے درجے کا بندوقچی	س۔م	۱۴۸

نظمیں

		صفحہ
آنکھ لگتے ہی	احمد مجتبیٰ وامق	۵
عزم و عمل	احمد ندیم قاسمی	۱۶
تاریک سیارہ	اختر الایمان	۳۹
اندیشے	منظور حسن شور (علیگ)	۶۸
دیکھ دام سراب کا عالم	خورشید الاسلام	۸۵
تضاد	سید جابر علی	۹۵

		صفحہ
ٹھنڈا الاؤ	نصیر حیدر	۱۰۹
فرار	احمد مجتبیٰ وامق	۱۱۰
تصویریں	عزیز حامد مدنی	۱۱۲
کسان	الطاف مشہدی	
جاؤ، کہدو	فکر تونسوی	

نوٹ: ۔ سارے مضامین غیر مطبوعہ ہیں اور خاص 'نیا دور' کو بھیجے گئے ہیں۔

احمد مجتبیٰ وامق

"آنکھ لگتے ہی.....؟"

اک نئے دور کا آغاز ہوا چاہتا ھے
زندگی کا درِ مسدود کھلا چاہتا ھے
اتنی مایوس نگاہوں سے مجھے مت دیکھو
یہی دو چار ہی دن اور انہیں بھی سہہ لو
ہنس کے رخصت بھی کرو دیکھو وہ شہپور بجے
وہ گرجنے لگیں توپیں وہ پرے بڑھنے لگے
وہ زمیں کھدنے لگی ٹاپوں سے رہواروں کی
وہ فضا ہلنے لگی گونج سے طیاروں کی
بیڑیاں گلنے لگیں طوق گراں کٹنے لگے
ابر مدّت سے جو چھائے ہوئے تھے چھٹنے لگے

سیّد احتشام حسین

اقبال بہ حیثیت شاعر اور فلسفی

اگر فلسفہ کی ابتداء حیرت سے ہوتی ہے تو اقبال دنیائے فلسفہ کے ایک محقق سیّاح تھے اگر شاعری روح کی بلند پروازی کے لمحات میں گایا ہوا گیت ہے تو اقبال حسین اور نایاب پُر اثر اور پُر جوش گیتوں کے شاعر تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی فکری زندگی کے اس موقعہ پر اقبال منظرِ عام پر نمودار ہوئے جب مسلمانوں کو ان کی شاعری اور انکے فلسفہ دونوں میں نئی قدروں کی جھلک اور نئے سواد کا بھاری پن نظر آیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اقبال میں خلاقانہ قوت کی کمی تھی انکا فلسفہ یا تو پرانے مسلمان حکماء کے یہاں سے مستعار تھا یا یورپ کے فلسفیوں کے یہاں سے، ان کی شاعری بھی نئی نہ تھی بلکہ غالب، حالی، اور اکبر کی پیدا کردہ روایات کے تسلسل کو برقرار رکھے ہوئے تھی۔ بحث مباحثہ کیلئے ان خیالات میں بڑی جان ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فارسی اور اردو شاعری میں اس لحاظ سے انکا کوئی مماثل نہیں ہے کہ انہوں نے ایک نیا نقطۂ نظر پیدا کیا۔ شاعری کو نیا مواد دیا، نئی وسعتیں بخشیں، مادّی، اخلاقی اور روحانی مسائل پر غور کرنیکے نئے راستے دکھائے اور شاعری میں نئی طاقت اور گہرائی، نیا نصب العین اور سوز پیدا کیا۔ اقبال کے یہاں حقیقت پسندی اور عینیت کا عجیب امتزاج ہے جسکی وجہ سے ان کا مطالعہ بہت دشوار ہوجاتا ہے اور جب تک ان کے افکار و خیالات کا مکمل تجزیہ نہ کیا جائے کوئی بات واضح نہیں ہوتی

اقبال جس گھر میں پیدا ہوئے اس میں مذہبیت کا اچھا خاصا زور تھا۔ انکے والد تصوّف پسند تھے اور صوفیانہ شاعری سے گہری دلچسپی لیتے تھے مثنوی مولانا روم کا اولین نقش جو اقبال کے دل پر گہرا بیٹھا انکے والد ہی کی مثنوی سے گہری عقیدت کا نتیجہ تھا۔ جب انہوں نے مشرق و مغرب کے فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ اس وقت مولانا روم ہی ان کو سنبھالے ہوئے تھے اور زندگی کی پُرپیچ

راہوں میں انکی رہبری کر رہے تھے اگر صوفیانہ رجحان کا کوئی تحفہ انسان اس لحاظ سے قبول کرسکتا ہے کہ اس سے زندگی کی گتھیوں کو حل کرنے میں فائدہ اٹھائے تو وہ ایک طرح کی وسیع النظری اور وسیع المشربی ہے اور اقبال کو یہ باتیں حاصل تھیں۔ قومیت کی وہ لہر جو غدر کے طوفان کے پیچھے پیچھے اٹھی جس نے ایک نئے متوسط طبقے کی ذہنی تشکیل کی اور بعد میں اس کا سہارا بھی لیا، اسی قومی بیداری کی تحریک نے اقبال کی بلند نگاہی سے مل کر ان میں وہ احساس پیدا کر دیا جو ہندو مسلم اتحاد کے ذریعہ سے ملکی ترقی کی پرجوش خواہش کا مظہر تھا اور جو ہندوستان کی قدیم عظمت اور کامران و کامیاب مستقبل پر ایمان رکھتا تھا۔

اگر اقبال کے کلام کا مطالعہ تاریخی ادوار کے لحاظ سے کیا جائے تو یہ بات بہت جلد واضح ہو جائیگی کہ بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں تک اسلامی دنیا کے واقعات یا بین الاقوامی حالات انہیں پریشان نہ کرتے تھے۔ ان کا خاص موضوع حسن فطرت کی عکاسی، انسان اور فطرت کا تعلق اور نہایت داخلی اور جذباتی انداز میں اس تمنا کا اظہار تھا کہ فطرت کی حسن کاریاں شاعر کو بھی اپنے آغوش میں کھینچ لیں اور وہ بھی جمال فطرت کا ایک عنصر بنجائے۔ سب سے بڑی بات جو اس وقت کی شاعری میں نمایاں ہوتی ہے وہ تحیر کا وہ جذبہ ہے جو ہر لحظہ بدلتی ہوئی کائنات کا راز جان لینا چاہتا ہے اور شب و روز کا مفہوم سمجھنے کا آرزومند ہے۔ یہ خیالات ان کی ابتدائی نظموں میں بار بار اتنی دفعہ دہرائے گئے ہیں کہ ایک زندگی کی رہنمائی کرنے والی طاقت کی جستجو کی اہمیت پر نگاہ پڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ سورج، چاند ستاروں اور دوسرے مظاہر فطرت سے زندگی کا مقصد پوچھ لینا چاہتے ہیں۔ ان خیالات پر زور دینے کی ضرورت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اسی حیرت و تشنگی اور راز جوئی نے دن رات ان پر مسلط ہو کر انہیں زندگی کے چھپے ہوئے بھیدوں کو سمجھنے پر مجبور کیا

اقبال کی ساری ابتدائی شاعری میں فلسفیانہ انداز نظر کی کمی نظر آتی ہے۔ انکی غزلوں میں صوفیانہ روایت پرستی اور داخلی تصوریت سے پیدا ہونے والے مثالی اخلاقی تصورات کا اظہار ہوتا ہے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں وہ یکایک جیسے ایک نئی دنیا میں داخل ہوگئے جو انکی منتظر تھی

انکا فلسفہ اور تاریخ کا مطالعہ اسلام کے عروج و زوال کے متعلق انکی واقفیت پختہ ہو چکی تھی جب انہوں نے ساحلِ ہند سے یورپ کی طرف رُخ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں جاتے ہی انکو اپنے سوالوں کا جواب مل گیا اور جذبۂ تحیّر کا محور بدل گیا۔ انہوں نے اپنے لئے وہ راستہ منتخب کر لیا جس پر انہیں مستقبل میں چلنا تھا۔ انہوں نے پہلی دفعہ یوروپین سیاسیات کی بازیگری دیکھی، وہاں کی تمدنی زندگی کی گہرائی اور کھوکھلے پن کا مشاہدہ کیا۔ فرنگیوں کے اصول زندگی کی ظاہری اور باطنی کیفیات پر نگاہ ڈالی۔ مختلف قوموں کی وہ آویزش دیکھی جو ایک دوسرے پر قابو پانے کیلئے ان کے درمیان جاری تھی، وطنیت اور نسل پرستی کا وہ بڑھتا ہوا طوفان نگاہوں کے سامنے آیا جو دوسروں پر عرصۂ زندگی تنگ کر دینا چاہتا تھا۔ جمہوری نظام کی نیلم پری کے پردے میں دیو استبداد کی پائے کوبی کی آواز سنی۔ سفید فام قوموں کی نفرت دوسری قوموں سے دیکھی، دول یورپ کی وہ مخالفانہ روش اقبال پر عیاں ہو گئی۔ جو ایشیائی طاقتوں سے برسرِ پیکار تھی اور انہوں نے طے کر لیا کہ اسلامی ممالک کی اس زبون حالی اور بے چارگی میں وہ انکا ساتھ دیں گے اور انہیں یورپ کے قدموں کے نیچے کچلے جانے سے بچائیں گے۔ اپنی شاعری میں اقبال نے مظلوم قوموں کے ساتھ عموماً اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً ہمدردی کا نعرہ بلند کیا اور انہیں مغرب کے خلاف منظم ہونے پر اکسایا۔ اتحاد اور تنظیم کا یہ پرچم اس سے پہلے بھی بعض مسلم مفکرین، خاص کر جمال الدین افغانی نے بلند کیا تھا لیکن اس خیال کو ہر دلعزیز اور عام بنانے اور مسلمانوں کے ایک حلقے کے لئے ایک زندہ حقیقت اور متحرک نصب العین بنا دینے کا سہرا اقبال ہی کے سر ہے۔

اقبال افکار اسلامی کی تاریخ سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور اسلام کے زوال کے اسباب اور صورت حال کو ظاہر کرنیوالے واقعات اور خیالات کے متعلق نتیجے نکالنے میں تامّل نہ کرتے تھے۔ اقبال خود اسلام کے اسی عہد زوال کی پیداوار تھے، اسی وجہ سے اپنی غیر معمولی ذہانت اور خطابت کے باوجود ماضی کے اسلام کی شان و شوکت کی مرعوبیت سے باہر نہ نکل سکے اور مستقبل کو کامیاب بنانے کیلئے وہ قریب قریب بالکل ماضی کی طرف پلٹ جانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ

اس انحطاط کے وجوہ اسلام کے عملی اور سیدھے سادے اصولوں میں افلاطون کے تصوّر پرست فلسفہ کے جراثیم کے داخل ہو جانے، رہبانی طرزِ زندگی کے خلاف اسلام کے کھلے کھلے احکام کی موجودگی میں رہبانیت کے زور پکڑ لینے اور روحانی طاقت کے زائل ہو جانے کی وجہ سے دنیوی کمالات کے زائل ہو جانے میں پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے تصوّف کے اس بے عمل اور رہبانیت پسند رویہ کی شدید مخالفت کی کیونکہ اسی نے نفیِ خودی کے تصوّر کو جنم دیا تھا۔ خودی کا استیصال تصوف کا اصل اصول بن گیا تھا۔ اقبال نے ایک پرجوش بت شکن کی طرح اس کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کا متخالف نظریہ استحکامِ خودی کی شکل میں پیش کیا جو قدیم عظمت کو واپس لانے اور نیابتِ الٰہی کے درجہ تک پہونچانے کا واحد ذریعہ تھا۔ خودی وہ محور ہے جس کے گرد زندگی —— اپنے وسیع ترین مفہوم میں —— چکر لگا رہی ہے۔ مسلمانوں نے خودی کھو دی اس لئے سب کچھ کھو دیا، اگر خودی پھر واپس مل جائے تو یقین ہے کہ سب کچھ مل جائے گا۔ ہر لفظ جو اقبال کے قلم سے نکلا اسی عقیدہ کی تشریح اور توضیح کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ آئیے اسے آسان ترین الفاظ میں سمجھنے کی کوشش کریں!

اقبال کا خیال ہے کہ جذبۂ خودی زندگی میں جاری وساری ہے، اسی سے زندگی میں حرکت اور تڑپ ہے۔ انسان کا سب سے بڑا نصب العین یہی ہونا چاہئے کہ اس کی ترقی اور استحکام میں لگ جائے۔ خودی کو مکمل طور پر حاصل کرنے کے سلسلہ میں انسان کو تین مراحل سے گزرنا پڑیگا۔ جنکے نام اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی رکھتے ہیں۔ اطاعت اصل روحِ اسلام سے آشنا کرتی ہے۔ جو عقیدۂ توحید، رسالت اور قرآن پر ایمان رکھنے پر مشتمل ہے۔ یہ باتیں منطق اور استدلال سے زیادہ اُن کے غیر معمولی وجدان سے ہم فطرت تھیں۔ تفصیلی تشریحات بہت دلچسپ ہیں لیکن انکا بیان طوالت سے خالی نہیں، پھر بھی اتنی بات ضرور ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اقبال توحید خداوندی کے عقیدہ سے وحدتِ انسانی کے عقیدے تک پہونچتے تھے۔ اور اُن کا خیال تھا کہ ایک خدا پر ایمان انسان کو بہت سے چھوٹے چھوٹے

خداؤں کے سامنے سر جھکانے سے بچاتا ہے۔ اسکی وجہ سے انسان مایوسی، خوف اور غم کا شکار ہونے سے بچ جاتا ہے جو خود بہت سی خرابیوں کی جڑ ہیں۔ اسے صرف ایک رسمی عقیدے کی حیثیت نہ دینا چاہیئے بلکہ اسی کے مطابق زندگی بسر کرنے کیلئے اس کی روح کو اپنے اندر جذب کرلینا چاہیئے۔ ایک سچے "انسان (اور اقبال کے نزدیک ایسا ہی انسان مسلمان ہے) کا فرض ہے کہ وہ حرص اور خوف پر قابو پالے اور یہ بات اسی وقت پورے طور پر ممکن ہے جب انسان ایک خدا پر عقیدہ رکھتا ہو۔ اسی طرح اقبال نے رسالت اور قرآن پر ایمان رکھنے کے عقیدوں کو واضح طور پر بیان کرکے اپنے نظامِ فکر کو مکمل طور پر پیش کیا۔

اطاعت کی منزل طے کرنے کے سلسلہ میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں ضبطِ نفس کی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ اسے بے روک ٹوک چھوڑ دیا گیا تو اس میں بھی خطرناک امکانات پیدا ہوسکتے ہیں اور خودی کا جذبہ بُرے نتائج تک پہونچاتا ہے یا کم سے کم پہونچا سکتا ہے اس لئے ضبطِ نفس ضروری ہے۔ جب کوئی شخص ان دو مراحل ــــ اطاعت اور ضبطِ نفس ــــ سے گذر لیتا ہے تو وہ مردِ کامل بن جاتا ہے اور اس کا شمار خدا کے برگزیدہ بندوں میں ہونے لگتا ہے۔ خدا اس کے ذریعہ سے اپنے مقاصد پورے کرتا ہے اور اس کی مدد کرتا ہے کہ وہ اپنی پسند کی دنیا بنائے۔ اگر اطاعت پر ضبطِ نفس کا احتساب جاری نہ رہے تو خودی کا متلاشی خطرناک راستوں پر جا سکتا ہے۔ اس خیال کو واضح کرنے کے لئے اقبال ابلیس کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں جو اطاعت میں پختہ ہونے کے باوجود ضبطِ نفس کی منزل میں لغزش کھا گیا اور خودی کی اصل بلندی حاصل نہ کر سکا۔ اسکے برعکس پیغمبروں نے یہ مراحل طے کرلئے، کسی مقام پر لغزش نہ کی یہانتک کہ وہ زمین پر نائبِ الٰہی قرار پائے کہا جاتا ہے اقبال نے مردِ کامل کا یہ خیال نیٹشے کے یہاں سے لیا جو فوق البشر کا قائل ہے اور یہیں سے فاشزم اور اقتدار پرستی کی راہیں کھلتی ہیں۔ اقبال نے اسے بار بار صراحت کیساتھ کہا ہے کہ انکا مردِ کامل نیٹشے کے فوق البشر سے بالکل مختلف ہے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اقبال کے یہاں

مظہرِ قوت کی پرستش کا تصور سرمایہ دارانہ نظام کے تضاد کو اصلاحی روک تھام کے ذریعہ سنبھال لینے کی کوشش میں نہیں پیدا ہوتا بلکہ ایک ایسی طاقت کی جستجو میں حاصل ہوتا ہے جو ساری دنیا کے مسلمانوں کو از سرِ نو زندہ اور طاقتور بنا دے۔ فاشزم کی پیدائش سے بہت پہلے اقبال نے اپنا خودی کا تصور اور مردِ کامل کا نظریہ مکمل کر لیا تھا۔ اقبال کے بعض خیالات اور فاشزم میں جو ایک قسم کی یکسانیت پائی جاتی ہے اس کا سبب دونوں کے پیش کردہ سماجی نظام کے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے میں نہ ڈھونڈھنا چاہیئے بلکہ وہ چیز انحطاط پذیر نظامِ زندگی میں روح پھونک کر زندہ برقرار رکھنے کی کوشش میں ملیگی۔ انہیں قوت اس لئے پسند نہ تھی کہ وہ فاشسٹ تھے بلکہ اسلئے کہ وہ مسلم اقوام میں اتنی طاقت دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ آزادی کیساتھ اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنی زندگی اور اپنے تمدن کی تشکیل کر سکیں۔

اقبال اسلام کے عروج و اقتدار کیلئے (اور اسلام اُن کے خیال میں تمام دنیا کے انسانوں کیلئے مناسب ترین تصورِ زندگی ہے) بیقرار رہتے تھے اور اسکے زوال کا تجزیہ کرتے ہوئے یا اس کی ترقی کے عناصرِ ترکیبی پر غور کرتے ہوئے ان تمام مقامات سے مدد حاصل کرنا چاہتے تھے جو قوت کی مظہر ہوں یا جو طاقت پیدا کرنے میں معین ہو سکیں۔ اس طرح وہ نٹشے کے ہم نوا بھی ہیں اور مخالف بھی، مارکس کو پسند بھی کرتے ہیں۔ اس پر معترض بھی ہیں، مسولینی سے متاثر بھی ہیں اور اس کے افعال کے ناقد بھی۔ برگساں کے جوشِ حیات میں کوئی چیز بھی جو اقبال پسند کرتے ہیں۔ گوئٹے، ہیگل، بھرتری ہری کے بہت سے خیالات سے انہیں اتفاق ہے۔ جزوی حیثیت سے وہ سبھوں کے ساتھ ہیں مکمل طور پر کسی کے ساتھ نہیں۔

انہیں کامل اتفاق صرف قرآن سے ہے یا تقریباً مولانا روم سے۔ اسطرح اس ظاہری تضاد کی تشریح کیجا سکتی ہے جو مطالعہ کرنے والے کو انکے وہاں نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے ہر شعبۂ حیات میں اسلام کی سچائی کا مطالعہ کیا تھا اور اسکے قابلِ عمل ہونے کا یقین صرف جذبہ اور

خواہش پرستی کی مدد سے نہیں بلکہ غور و فکر اور دوسرے نظام زندگی کے تقابلی مطالعہ کے بعد کیا تھا۔ اقبال نے جس طرح اسلام کو سمجھا تھا وہ ان کے خیال میں ایک مقدس نصب العین اور منتہائے نظر تھا اور دوسرے مکاتب فلسفہ صرف اُس حد تک صحیح اور درست تھے جس حد تک وہ خیال اور عمل میں اسلام سے متفق اور متحد تھے۔ فلسفہ کا جو حصہ اسکے علاوہ بچ رہتا تھا۔ اقبال اُسے قبول نہیں کرتے تھے۔ یہ خیال اس بات سے اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا روم ابتدا سے لیکر آخر وقت تک اقبال کے رہنما اور فلسفی رہے دوسرے لوگ اسی وقت تک کے لئے ذہن پر مسلّط رہتے تھے۔ جب تک ان سے ترقی اور طاقت حاصل کرنے کے ذرائع میں مدد ملتی تھی۔ گویا انکا نصب العین انکے ذہن میں مقرر ہو چکا تھا۔ لیکن اسکے حاصل کرنے کے ذرائع اُن کے علم اور مسائل حیات کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ نئے اثرات قبول کرتے رہتے تھے۔

اقبال زندگی کے امکانات پر مسلسل غور کرتے رہتے تھے۔ اپنی شاعری میں انہوں نے خود کو ایک حقیقت پسند ظاہر کیا ہے۔ لیکن اگر فلسفیانہ حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ خیال کو پہلی جگہ دیتے ہیں اور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ضمیر اور روح کا انقلاب مادّی زندگی میں انقلاب لاتا ہے پیام مشرق کے دیباچہ میں اقبال نے اس خیال کو بالکل غیر مشتبہ الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ پہلے اندرونی انقلاب ہونا چاہئے۔ یہ وہ بنیادی خیال ہے جو انہیں حقیقت پسندوں کی صف سے نکال کر تصور پرستوں کے حلقہ میں لا ڈالتا ہے گو انکی عینیت داخلی ہونے کے بجائے زیادہ تر خارجی ہوتی ہے۔ حقیقتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اقبال بار بار خیال کی دنیا میں پہنچ گئے ہیں اور انکا شعور داخلیت کی گرفت میں آگیا ہے۔ انہوں نے حقائق کا ادراک سماج کے واقعی عمل پذیر عناصر کی تحلیل سے نہیں بلکہ قوت متخیلہ کی مدد سے۔ نتیجہ نظریہ اور عمل کے افتراق کی شکل میں ظاہر ہوا اور "گفتار کا غازی" "کردار کا غازی" نہ بن سکا۔ اقبال ایک فلسفی کی حیثیت سے ثنویت کے سخت دشمن ہیں۔ لیکن ان کی شاعری ادراک، داخلیت، نظر اور جذبہ کے مقابلہ میں علم، سائنس، خرد اور مادّی حقائق کے خلاف ہلاکت آفریں تیر برساتی

ہے۔ اقبال کو سامراج شاہی اور سرمایہ داری سے نفرت ہے۔ لیکن وہ ان طاقتوں کے ساتھ کبھی اتحاد عمل نہ کر سکے جو ان کے مٹانے کے درپے تھیں۔ وہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے متعلق کبھی بہت واضح خیالات کا اظہار نہ کر سکے انہوں نے آزادیٔ خیال اور آزادیٔ نسوان کو بعض ایسے اخلاقی قیود کے ساتھ مشروط کر دیا تھا۔ جو موجودہ طبقاتی سماج کی اقتصادی اور معاشرتی زندگی سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ وہ تازیانے لگا لگا کر لوگوں کو گندے اور پست مقاصد سے جنگ کرنے پر اکساتے تھے اور ان میں جوش عمل پیدا کرتے تھے لیکن کوئی منضبط عملی خاکہ پیش نہ کرتے تھے۔ کوئی شخص آزادی کے علمبردار کی حیثیت سے ان کے خلوص میں شک نہیں کر سکتا۔ اُن کی سچی جمہوریت پسندی پر حرف نہیں لا سکتا، ترقی کی خواہش اور انسانی عظمت کے اظہار کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن انہوں نے ان نظریاتی حقیقتوں کے لئے عمل کی کسوٹی نہیں تیار کی۔ وہ اپنے خیالات کو اُن کے منطقی نتائج تک نہیں پہونچاتے تھے اپنی بعض نظموں میں اقبال اشتراکی نظریۂ حیات کے بہت قریب پہونچ جاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے سرمایہ داری کی مختلف شکلوں اور طبقاتی سماج سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں پر گہری نظر نہ ڈالی جذباتی حیثیت سے وہ آزادی، مساوات اور اخوت کے پرجوش حامی تھے۔ لیکن یورپ کی نام نہاد جمہوریتوں کی ناکامیابی دیکھ کر اقبال نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ کسی قسم کی جمہوریت میں ان مقاصد کے حاصل کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

اقبال میں غیر معمولی جوش حیات کی نمود تھی۔ اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہر لمحہ نئی تمنائیں پیدا کرنے کے قائل تھے۔ وہ مخلوق ہوتے ہوئے بھی خالق کے ساتھ تخلیق کے عمل میں شریک ہونا چاہتے تھے اور زندگی کو عمل کا مظہر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ حوادث سے بے خطر ہو کر فطرت کی تسخیر کو انسانی عظمت کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ اقبال وہ طریقے نہیں بتاتے جن کی مدد سے یہ اعلیٰ مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ صرف ایک طریقہ جس کا ذکر بار بار آتا ہے وہ ایک مخصوص طریقہ پر خودی کی ترقی اور استحکام ہے۔ اقبال کے یہاں یہ بات صاف نہیں

ہے کہ خودی کی یہ ترقی کیا ان سماجی قوانین کو جو مخصوص حالات میں انسان کو جکڑے رہتے ہیں نظرانداز کرکے بھی ممکن ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو انسانوں کا پہلا فرض یہی ہونا چاہیئے کہ وہ ایک ایسی دنیا تعمیر کریں جہاں افراد کو اپنی خودی کے ترقی دینے اور روحانی حیثیت سے بلند کرنے کی آزادی حاصل ہو۔ جہاں تک فطرت کیخلاف انسان کی جدوجہد کا تعلق ہے۔ اقبال کے خیالات اور خواہشات واضح ہیں۔ انکا خیال ہے کہ انسان کبھی نہ کبھی کائنات کو تسخیر کرکے اپنے کام میں لائیگا لیکن سماج کی متصادم اور متضاد طاقتوں کا جائزہ اقبال نے نہیں لیا۔ فرد کا تعلق جماعت سے اور عوام کا تعلق حکومت سے، یہ ایسے مسائل ہیں جن کی خاطر خواہ وضاحت اقبال کے یہاں نہیں پائی جاتی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے متعلق مختلف رائیں قائم کیجا سکتی ہیں وہ ایک حکومت اور ایک ملت کے قائل تھے۔ جس کے متعلق انکا خیال تھا کہ وہ ٹھیک طور پر ایک مرد کامل ہی کی رہنمائی میں قائم رہ سکتی ہے اور زمانہ اس مردِ کامل کیلئے چشم براہ ہے! اقبال کے نظام حکومت میں حاکم بھی ہے محکوم بھی، محکوم آواز نہیں بلند کرسکتا اور حاکم صرف اس قانون کے نافذ کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے ہے جو خدا نے اس کیلئے نازل کیا ہے۔

اقبال اگرچہ صوفی نہ تھے اور رسمی تصوّف کے مخالف تھے لیکن صوفیانہ رجحان ضرور رکھتے تھے اگر وجدان کو عقل پر ترجیح دینا تصوّف کا کام ہے تو اقبال کے یہاں یہ بات قدم قدم پہ ملتی ہے اور اقبال نے اس پہ پردہ کبھی نہیں ڈالا ہے۔ اقبال کی عینیت پسندی نے خود انکو انکے خلاف کردیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ حال سے بے نیاز ہوکر مستقبل کو ماضی کے ذریعہ سے سنوارنا چاہتے تھے وہ مغربی طرزِ زندگی کی تقلید سے متنفر تھے، وہ عصرِ حاضر کی مادّہ پرستی کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے تھے لیکن مغربی اقوام کے ذوقِ عمل کے ثنا خوان بھی تھے۔ اقبال جب مادّیت کا خیال کرتے تھے تو ان کے ذہن میں مادیت کا تصوّر نہ ہوتا تھا جو نظریہ اور عمل کے اشتراک سے سماجی ارتقا کا فلسفہ قرار پاتا ہے بلکہ وہ اس سے محض دہریت اور لامذہبیت کا فلسفہ بنالیتے تھے جو انسان کے ارتقا روح کا منکر ہے۔ انہوں نے اٹھارہویں صدی کی مادہ پرستی اور انیسویں صدی کی اس مادیت جو سائنس کی پیدا کردہ

تھی، فرق نہ کیا، اقبال کے دل میں متوسط طبقہ کی ایک ایسی پاسداری تھی جسے وہ غیر معمولی انسان دوستی کے باوجود دبا نہ سکے اور یہ چیز پھر اُن کے یہاں نظریہ اور عمل کے افتراق کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔

اس طرح کا متنازعہ فیہ فلسفہ رکھنے کے باوجود اقبال ایک بڑے مفکر اور شاعر تھے اور جب انکے متعلق یہ سب کچھ کہا جا چکا ہے۔ وہ ایک عظیم الشان شخصیت کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں جو اپنی نسل کے دماغ کو اپنے جوش کی شدت، اپنے انسان دوستی کے نقطۂ نظر اور انسان کے شاندار مستقبل کی امید سے متحرک کرتا ہے۔ اگر ان کے فلسفہ کی تفصیلات سے الگ ہو کر دنیا کی ترقی پسند طاقتوں کے مخصوص رجحانات کے متعلق انکے فیوض کا جائزہ لیں تو یہ معلوم ہوگا کہ ان کے افکار انہیں ہر زمانے کے بڑے شعرا کے جھرمٹ میں جگہ دلائینگے فن برائے زندگی کے متعلق اقبال کے جو اعتراضات اور خیالات ہیں انہیں دیکھکر کوئی انکو لفظوں کا بازیگر نہیں کہہ سکتا گو انہیں الفاظ پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ انکی فنی عظمت کا اظہار اُن کے اس شاعرانہ مزاج سے ہوتا ہے جس میں روایت اور بغاوت کا امتزاج ہوتا ہے۔ انہوں نے اردو فارسی کے بہترین شعراء سے بہترین ورثہ پایا تھا اور اس میں اپنے طرزِ اظہار کے نئے پن اور احساس کی تازگی سے اپنی قوتِ تخیلہ اور اپنی شخصیت کے زور سے رنگارنگی اور وسعت پیدا کرتے تھے۔ اقبال کا جذبۂ عمل انکا عقیدۂ عظمتِ انسانی اور انسان کی بے پناہ قوت میں یقین، جسم و روح کی غلامی سے انکی نفرت اور اُن کا رجائی اندازِ نظر سب مل کر موجودہ زندگی کے لئے عمل پسندی کا نشان اور ایک بڑی طاقت بن جاتے ہیں۔ اقبال صرف مسلمانوں کی بیداری اور حق خود ارادیت کی بنیاد پر ان کی آزادی کے مفکر اور فلسفی ہی کی حیثیت سے زندہ نہ رہیں گے۔ بلکہ ایک ایسے قدر اول کے شاعر کی حیثیت سے بھی جو غیر معمولی حسن اور طاقت سے بھرے ہوئے گیت گاتا تھا۔

(مصنف کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ)

احمد ندیم قاسمی

عزم و عمل

فکر انجام میں غلطاں ہے شباب   شوق عرفاں میں سلگتا ہے سراب
جڑ سے اکھڑیں گے ستاروں کے خیام   اپنی منزل سے گریزاں ہے شباب
جھول بن جائے نہ بے وقت تناؤ   اپنے ہی زور سے ٹوٹے نہ طناب
پھڑپھڑاتا ہے فنا کا دامن   اپنے گنبد میں مچلتا ہے حباب
وقت کی بات ہے، وقت آئے گا
کیوں برسنے کو ترستا ہے سحاب
ذوقِ پرواز سے اِنکار نہیں   پہلے احساسِ فضا پیدا کر
جو ستاروں سے الجھ کر نہ رُکے   وہ یک آہنگ صدا پیدا کر
اپنی ہستی کو مکمّل تو بنا   یعنی تریاقِ قضا پیدا کر
جو نشیبوں میں اُترتے ہی نہیں   ان خداؤں کا خدا پیدا کر
جو مشیّت کو بھی مسحور رکھے
وہ قیامت کی ادا پیدا کر

عزم کے ساتھ نہ شامل ہو عمل   تو مقدر کی ہے محکوم، حیات
جو فرشتوں کی گدائی سے ملے   زہر ہی زہر ہے وہ قند و نبات
جم کے رہ جائے اگر وقت کا سیل   دہر پر چھائی رہے رات ہی رات
بے مقامی سے رہا ہے دوچار   جس نے ڈھونڈا ہے زمانے میں ثبات
یہ خلاؤں کا پر اسرار سکوت
ہے تری عالی خیالی کی زکات
زود رس ہیں ترے افکار، مگر   یہ غلامی کا بہانہ ہی نہ ہو
یہ خیالات کا تانا بانا   محض پریوں کا فسانہ ہی نہ ہو
یہ جو آتی ہے صدا نعروں کی   تیرے گنبد کا ترانہ ہی نہ ہو
اپنے ماحول کے پردے تو اٹھے   زیر خاشاک خزانہ ہی نہ ہو
راہبانہ ہے ہر انداز ترا
تو مشیت کا نشانہ ہی نہ ہو

نئے نقاد ——— (۱) فراق گورکھپوری

اردو میں تنقید کی کمی ایک عرصہ سے محسوس ہوتی آئی ہے اور حالی نے اسے کیا کوسا کہ ہر ادیب اسے کوستا ہی رہا۔ اسی کوسنے سے نئی تنقید جنم میں آئی۔ ساتھ ہی نقاد اسی ڈھب پر چلے اور کوستے کوستے انہیں پتا بھی نہ لگا کہ وہ خود ایک تنقیدی کارنامے کو جنم دے رہے ہیں۔ ایسے ناقدین میں پروفیسر کلیم الدین احمد ایک خاص پوزیشن رکھتے ہیں۔ مگر حالی نے جب تنقیدی مواد کی کمی کا احساس کیا تھا۔ تو ساتھ ہی اسمیں تخلیقی تنقید کے گوشے بھی جگمگا اٹھے تھے اور تعمیری احساس بھی جھرجھری لے رہا تھا۔ شاید بعد میں آنے والے اس بری طرح تنقید کے پیچھے پڑے کہ انہیں اپنی اہلیتوں کا بھی احساس نہ رہا۔ اور اسی لئے حالی سے نئے زمانے تک کوئی جاندار تنقیدی کارنامہ نظر نہیں آتا۔ پھر ساتھ ہی ایک بات یہ بھی ہوئی کہ مغرب سے تعلقات قائم ہونیکی وجہ سے اور انگریزی تعلیم کی ترقی سے ہندوستان باقی ساری دنیا سے الگ تھلگ نہ رہا تھا اور باوجود غیر ملکی استحصال کے بھی یہاں باہر والوں کی تحریکات کی خبر کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ باسی ہو کر پہنچتی تھی۔ اسکے علاوہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ ثابت ہے کہ تاریخی قوتیں کچھ لاشعوری طور پر عمل کرتی ہیں۔ ساری دنیا میں ایک ہی قسم کی تحریکیں از خود گردش میں آتی ہیں یا یوں کہئے کہ ہوا برق کی لہروں کی طرح خیالات کی لاشعوری لہر بھی ساری دنیا کا احاطہ کرتی ہے۔ پھر چونکہ بیسویں صدی میں ہندوستان نے تعلیم کی طرف قدم اٹھایا اور سیاسی تحریکات نے شعور کو اور زیادہ تربیت دی۔ جس سے اپنے ادب میں تنقید کی کمی کا احساس بری طرح ستانے لگا مگر زندگی اب محض سادگی کیساتھ اور تقدیر پر بھروسہ کرتے کرتے صبح کو شام کر دینے کی کوشش کا نام نہ رہا تھا بلکہ دنیا بھر کے اقتصادی اور سیاسی شعور کی ترقی اور زندگی کی تضاد پسندی نے زندگی کے متضاد پہلو قائم کر دیئے۔ از خود ادب کو مختلف دھاروں کو سموتا تھا اور ساتھ ہی قوس قزح کی طرح سات

رنگوں کی مشترکہ جھلک کی نمائش بھی مقصود تھی۔ اردو تنقید میں اب یہی بات آ چلی ہے۔ ساتوں رنگ علیحدہ ہوتے ہوئے بھی ایک جگہ سمانے لگے ہیں اور اسی سے اردو ادب کی ترقی کے امکانات لامحدود ہوتے جا رہے ہیں۔ جس دن یہ بات پوری طرح آ جائیگی۔ اردو ادب میں آفاقیت اور لامحدودیت پیدا ہو جائے گی۔ یہ منزل نظر تو آنے لگی ہے۔ مگر قریب شاید ابھی نہیں۔

اردو تنقید کے میدان میں لوگوں کو اصول سازی کی فکر زیادہ ستاتی رہی اور ایک طرح یہ بات ٹھیک بھی تھی۔ محض مشاعرہ کی واہ سے بھی تو کام نہیں چلتا۔ یہ بتانا نہایت ضروری ہے کہ کسی مخصوص بات پر ہی "واہ" کیوں کہا گیا! یقیناً اس مخصوص بات نے اور باتوں سے کچھ مختلف عمل آدمی کے وجدان اور شعور پر کیا ہے۔ وجدان اور شعور کا یہ "انداز اثر پذیری" ہی اصل شئے ہے۔ جس کا کھوج لگانا ہے اور اسی کے ساتھ اس مخصوص بات کا "انداز اثر انگیزی" بھی شعور اور لاشعور کی لہروں کی گردش کو نمایاں کر دکھانا ہی تنقید کا کارنامہ ہے۔ اب یہاں سے آگے اختلافات شروع ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ جو زندگی کی نامیاتی حقیقت میں ایمان رکھتے ہیں۔ وہ ادب سے کچھ مخصوص مطالبات منوانے کے خواہشمند ہیں۔ کچھ لوگ جنکی نظر میں زندگی کہیں آسمانوں سے ٹپکی ہوئی لو از خود بزور پانے والی شئے ہے خود کو ادب کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ ادب جو شکل چاہے اختیار کرے۔ آدمی بے بس ہے۔ اسلئے اصول سازی سرے سے لغویات ٹھیری مگر شاید حقیقت بین بین ہے۔ ادب لاشعور کا کارنامہ سہی مگر شعور کو اتنا دخل اس میں ضرور حاصل ہے کہ وہ ربط و آہنگ کو ہاتھ سے نہ جانے دے مگر اس بین بین والی منزل تک پہنچنے کیلئے مختلف راستے ہیں۔ ترقی پسندی، ادب برائے ادب، جنسی مسائل، نیا ادب مختلف سیاسی اور مذہبی مدرسہ ہائے ادب وغیرہ وغیرہ۔

بین بین والا راستہ شاید وہ ہے جو خود زندگی کا ہے۔ ایسا ادب وہ ہے جو زندگی کے لئے جام جہاں نما کا کام دے اور بیک نظر لامتناہی فضا کا احاطہ کر سکے اور جس میں آفاقی احساس (WORLD FEELING) کا اثر سہارنے کے قابل لچک و لوچ ہو۔ جس میں قوس قزح کا

سا سات مختلف رنگوں کا امتزاج ہو گیا ہو۔ ایسے ادب کی تنقید میں بھی اتنی ہی جاذبیت اور نفوذ پذیری ہو گی جتنی خود ادب میں یا زندگی میں ہونی چاہئے۔ شاید پروفیسر فراق گورکھپوری کی تنقیدوں میں یہ صفت موجود ہے۔ اور یہی وہ انوکھا پن ہے جس کی وجہ سے وہ بہت جلد اردو کے اچھے نقاد مانے جانے لگے ہیں۔

فراق یوں تو کہنے کو ترقی پسند ہیں، اور اقتصادی اقدار میں مارکسیت کے قائل ہیں۔ مگر دیگر ترقی پسند نقادوں سے ان کے اصول نقد بالکل علحدہ ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین۔ عبدالعلیم اور سید سبط حسن کی طرح ان کے یہاں چند ایسے اصول نہیں ہیں جن پر وہ ہر چیز کو پرکھا کریں۔ اور ایک فنی کارنامے کی دیگر خوبیوں کو نظر انداز کر دیں۔ شاید سختی سے اصول پرستی تنقیدی زبان و بیان کی بافت (Texture) کو راس نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالعلیم کی نثر روکھی پھیکی نہیں۔ بلکہ سیٹھی سیٹھی معلوم ہوتی ہے۔ اور ادبی چاشنی اس میں کم ہی نظر آتی ہے سبط حسن کچھ صحافتی انداز کے (ادبی نہیں) نقاد ہیں۔ احتشام حسین میں پھر بھی پچھلے دو برس سے پختگی اور شگفتگی آچلی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اوپر قابو پا چلے ہیں۔ برخلاف اس کے فراق کی تنقیدیں ایک جمالیاتی شان بھی رکھتی ہیں۔ ان کی نثر شاداب ہے اور لہلہاتی ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے چھری کانٹا لئے ہوئے ایک تخلیقی کارنامے کی طرف نہیں بڑھتے۔ بلکہ وہ ادیب کی طرف انس و محبت سے جاتے ہیں۔ اور اس کے دل میں سما کر اس کی روح سے پردے اٹھاتے ہیں۔ اب کسی اصول کی ضرورت نہیں۔ جس طرح پوسٹ مارٹم ہونے کے بعد لاش کے کل اجزا ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ اسی طرح فراق کی تنقیدوں میں ہمیں صناع کی روح بے نقاب نظر آتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انکے یہاں ہمیں تنوع (Variety) بہت ملتا ہے۔ اتنا تنوع جو عصر حاضر میں کسی دوسرے نقاد کے یہاں شاید نہ ملتا ہو۔ اس باب میں کلیم الدین احمد۔ اور مجنوں ہی لگا کھا سکیں تو کھا سکیں۔ ترقی پسند ناقدین کی تنقید میں اصول پرستی کی وجہ سے یکسانیت اور تکرار کا امکان تھا۔ اور یہ تقریباً ناممکن تھا کہ ایک شخص

ترقی پسند بھی ہو اور تنوعات بھی رکھتا ہو۔ اس خیال کو احتشام حسین۔ ڈاکٹر عبدالعلیم اور سبط حسن، اور دوسرے چھوٹے بڑے ناقدین نے (اپنی تحریروں کے ذریعہ یعنی بالواسطہ) تقویت پہنچائی۔ لیکن فراق اس جگہ اکیلا نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ ممکن ہے یہ بھی ہو کہ فراق صاحبِ فکر بھی ہے۔ اور اسی لئے بعض جگہ وہ ترقی پسند اصولوں سے انحراف بھی روا رکھتا ہے۔ ترقی پسند مدرسۂ تنقید کے کارنامے چند باتوں کو بے محابا تکرار سے بھرے پڑے ہیں۔ اور اسی لئے اب ان میں وہ یکسانیت اپنا گھر کر چکی ہے جو ندیم صہبائی۔ ایم اسلم اور منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے ناولوں کا خاص، وصف ہے۔ کسی ناقد کے چند صفحوں کو پڑھ لینا گویا اس سارے مدرسے کے کل تنقیدی مواد کا احاطہ کرنا ہے۔ مگر اس کی لاج آگے چل کر فراق ہی کو رکھنی تھی۔

فراق جب تنقید کرتے ہیں تو گویا کسی مہم کو سر کرنے کی تیاری نہیں کرتے۔ بلکہ چپکے سے وہ ادیب یا شاعر کی روح میں اُتر جاتے ہیں۔ اور اُس کے کارنامے میں گم ہو جاتے ہیں۔ شاعری کے اس باغیچے میں وہ ہر روش کو دیکھتے ہیں، ہر پھول کو سونگھتے ہیں۔ اور ہر درخت کے سایہ سے لطف لیتے ہیں۔ پھر انہیں دوسرے شاعروں کے باغ یاد آتے ہیں۔ اُن کی کچھ باتیں یہاں ملتی ہیں۔ کچھ نئی ہیں جو پچھلے مقامات پر نہ ملی تھیں۔ انہیں نئی باتوں سے وہ یہ اندازہ کرتے ہیں کہ اس شاعر کے کچھ علیحدہ اوصاف بھی ہیں۔ اور اس کا مزاج دوسرے شعراء سے جداگانہ ہے۔ اسی سے وہ رنگ کلام کی تمیز کرتے ہیں۔ اور جب وہ اس میں چل پھر کر خوب سیر کرتے ہیں تو پھر اس کی مجموعی وضع اور خوبصورتی کا ادراک انہیں ہوتا ہے۔ اسی ادراک کی بنا پر وہ کسی شاعر کا درجہ متعین کرتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس سارے عمل میں ناقد نے کوئی بات اپنے منہ سے نہیں کہی۔ بلکہ وہ تو ایک باغ میں آپ کو سیر کرانے لیگیا ہے۔ اور اس کے گوشے گوشے میں آپ کو سیر کراتا اور گھماتا پھراتا پھر رہا ہے۔ باغ کے پھولوں اور پھولوں کے رنگ و بو کا احساس

کرا رہا ہے۔ حکم نہیں لگا رہا۔ کسی چیز کو بغیر دکھائے برائی بھلائی کے تذکرے نہیں چھیڑتا بلکہ تشریح و تجزیہ کا انداز ایسا ہے کہ خود کسی کی برائی بھلائی کئے بغیر وہ تو آپ سے کسی کی برائی بھلائی سننے کی امید کرتا ہے ——— کتنا تیز ہے کمبخت۔

"جذبات کی میانہ روی تخیل و وجدان کو قدم بہ قدم اس خارجیت کی طرف بڑھالے چلی ہے۔ جہاں سے ہم مصحفی کو دلّی اور لکھنؤ اسکول کے دوراہے پر کھڑے یا آگے بڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ایسی داخلی خارجیت سے اس معاملہ بندی کا شگون بھی ہوتا ہے جو لکھنؤ میں جرأت کے ہاتھوں کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ اور انشاء اور رنگین کے ہاتھوں کہاں سے کہاں بہک گئی ہے"۔ "میر و مصحفی میں وہی فرق ہے جو دوپہر اور غروب آفتاب کے وقت میں پایا جاتا ہے۔ اور جس طرح شام کو آفتاب میں ساتوں رنگ جھلکنے لگتے ہیں۔ اسی طرح رنگین فضا میں وہ خارجیت نکھری اور سنورتی ہے جس کی جھلک مصحفی کی شاعری میں ملتی ہے۔ اگر ہم سنگیت کے استعارے کو کام میں لائیں تو کہہ سکتے ہیں کہ مصحفی کے نغموں میں وہی دلفریب کیفیت پیدا ہو گئی ہے جو آواز میں پیچ لگ جانے سے پیدا ہوتی ہے"۔ "اب مصحفی کے چند ایسے اشعار سنئے جن پر میر یا میر کی تقلید کا دھوکہ ہو سکتا ہے۔ لیکن دونوں کے وجدان و لہجہ کے نازک فرق کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ ان اشعار میں میر کا سوز نہیں ہے۔ لیکن مصحفی کا ساز ضرور ہے"۔ "غم آمیز وجدان میں تنوع کے اتنے امکانات نہیں ہوتے جتنے نشاط آمیز وجدان میں ہوتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مصحفی کے یہاں بہ نسبت میر کے تنوع زیادہ پایا جاتا ہے" ان اشعار سے مصحفی کی ایک اور خصوصیت نمایاں ہوتی ہے۔ اور وہ خصوصیت 'ترسنے' کی ہے"۔ "اس مضمون میں کتنے شعر ایسے ملیں گے کہ رو میں آپ پڑھ جائیں گے۔ اور اس طرف مطلق دھیان نہ جائیگا کہ زمین کتنی سنگلاخ تھی"۔ یہ تمام اقتباسات فراق کے مضمون "اردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ" سے لئے گئے ہیں۔ ان تمام اقتباسات سے یہ کتنی

اچھی طرح نظر آجاتا ہے کہ فراق بات کہنے میں ماہر ہیں۔ ان تمام فقروں میں محاکمے کی قطعیت۔ اور رائے کے حتمی ہونے کا یقین بظاہر نظر نہیں آتا مگر انہیں کو جب آپ اصل مضمون میں پڑھتے ہیں اور سیاق و سباق کو نظر میں رکھتے ہیں تو دیگر نقادوں کے محاکمے سے زیادہ قطعی اور آخری محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ فراق کوئی معمولی آدمی نہیں۔ کافی تیز اور چالاک ہیں۔ وہ دوسرے درجہ کے ناقدین کی طرح اپنی رائے کو آخری لفظ کی حیثیت سے پیش کر کے قاری کی ذہانت کو چیلنج نہیں کرتے۔ لیکن ایک اول درجہ کے نقاد کی طرح انہیں اپنی رائے پر اعتماد بھی ہے۔ اور کافی سمجھنے اور غور کرنے کے بعد وہ کسی رائے پر پہنچتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ شاعر کی ذہنی دنیا میں رہنمائی کرنے کے باوصف بھی ساتھی ہونے کا احساس پیدا کرتے ہیں اور اپنی تنقیدی اہلیتوں سے کام لیکر وہ اس بات کا امکان چھوڑتے ہی نہیں کہ انکی رائے سے انحراف کیا جا سکے مگر اس سب کچھ کے باوجود وہ شاعر کی روح کو سمجھنے ہی میں تو مدد دیتے ہیں۔ اور سب کچھ قاری کے ذہن ہی پر تو چھوڑ دیتے ہیں۔ اسے ان کے مضامین پڑھ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کو یہاں ایک خلاف ہو سکتا ہے۔ اور وہ کہہ سکتے ہیں کہ کہیں کہیں نہیں بلکہ اکثر فراق خود فیصلہ کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ شاید فیصلہ نہیں ہوتا۔ بلکہ فیصلہ کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ نیز انکی نگاہ میں بلا کی نفوذ پذیری اور ذراکی ہے۔ اس لئے قاری کے ذہن کو ساتھ رکھنے کیلئے انہیں وہ باتیں ٹٹول ٹٹول کر۔ گدگدا گدگدا کر۔ ابھار ابھار کر دکھانی پڑتی ہیں۔ جنھیں وہ بیک نظر پہچان گئے ہیں۔ اور جن تک رسائی ہر ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔

فراق کیلئے تنقید خود ایک تخلیقی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا کام بزاز کا کام نہیں ہے کہ ایک مخصوص گز سے کپڑا ناپ کر کام ختم کر دیا۔ چنانچہ دیگر نقادوں سے جدا فراق کی ایک شان یہ بھی ہے کہ نہ تو وہ اُن تکنیک کے دیکھنے والوں میں سے ہیں جو [illegible] بیان

اور رفعت مضمون پر نگاہ نہیں رکھتے۔ نہ وہ ان خیال پرستوں میں سے ہیں جو ٹکنیک کو لغو سمجھتے ہوں اور نہ انکی تنقید نری مدحیہ APPRECIATIVE ہوتی ہے۔ ان تینوں باتوں کا حسین امتزاج انھیں کے یہاں نظر آتا ہے۔ اور اسی لئے ان کی تنقید کا مزاج متوازن ہوتا ہے لیکن سب سے اہم بات جو دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کسی صناع کے متعلق اپنے فوری تاثرات کو پھیلا کر بیان کرتے ہیں۔ اور اسی لئے اردو کے دوسرے نقادوں سے جدا انکی تنقیدیں ایک دریافت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دریافت صاحب دریافت کیلئے بھی کیف انگیز ہوتی ہے۔ اور دریافت کرلینے کا احساس اس میں گدگدی اور احساسِ مستی مستی و لذت پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ تحریر میں وہ جمالیاتی شان جھلکنے لگتی ہے جو پوری اردو تنقید میں نایاب ہے ——— ... اور پھر تنہا صاحب دریافت ہی کی پلکیں احساسِ مستی سے بوجھل ہو کر نہیں ڈھلکتیں۔ ہم سبھی ان منزلوں میں ساتھ ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ فراق کو انداز بیان کی یہ مٹھاس کہاں سے ہاتھ لگی؟ اور سرگوشی کا یہ انداز اس نے کہاں سے اڑایا۔ یہ رچی ہوئی ہندوستانی فضاء فراق کے علاوہ اور کہیں کیوں نظر نہیں آتی؟ پریم چند کی زبان تو کچھ اور بھی زیادہ رسیلی تھی۔ کرشن چندر کی اور زیادہ نشیلی۔ مگر آواز کے گاڑھے پن اور فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ زبان کی یہ شیرینی فراق ہی کے یہاں ملتی ہے۔ یہ لوچ اور سوندھا پن ہندو مزاج کی خاصیت ہے اور کل عالم کو چمٹا لینے EMBRACING اور اپنے رنگ میں رنگ لینے کا طریقہ ہندو کلچر کے ساتھ مختص ہے۔ مسلمانوں میں ایک قسم کا چٹخارہ اور شوخی ہوتی ہے۔ اور ہندوؤں میں ملاحت کی معصومیت اور صبح کی صباحت۔ مگر فراق اس چٹخارے سے قطعاً محروم تو نہیں ہے۔ جس طرح پریم چند تھے۔ ہلکی ہلکی شوخی اس میں بھی ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے قدما کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مطالعہ اس کی رگ رگ میں سرایت

کر چکا ہے۔ (۳) کی آواز نئے ادیبوں کی آواز کی طرح محض نئی مگر پتلی نہیں ہے۔ اس میں نئے پن کے ساتھ ساتھ تیزی اور گہرائی بھی ہے۔ سوچ کا بھاری پن بھی ہے۔ محض ہلکی پھلکی کی تھرتھری ہی نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک خوفناک طالب علم بھی ہے۔ جس نے بہت کچھ پڑھا لکھا ہے۔ اور جس کا دماغ اتنا حاضر ہے کہ ہر نئے شعر کو پڑھنے کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں وہ تمام پچھلے تجربے اور مطالعے تازہ ہو جاتے ہیں۔ جن کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی طرح بھی اس شعر سے تعلق ہے یا ہو سکتا ہے۔ دماغ کے اس ربط ASSOCIATION اس عجیب و غریب صفت سے وہ بڑا اچھا کام لیتا ہے اور باوجود اس کے کہ وہ کسی مخصوص وقت میں کسی ایک شاعر کے ذہن کو ٹٹول رہا ہے، پھر بھی دوسرے زمانوں اور دوسرے مقامات سے اس کا تعلق باقی رہتا ہے۔ اور اس طرح دیکھیے اس میں لامحدودیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ایک آفاقی ادب جنم لے۔ جو کل عالم کا ادب کہلا سکے۔ ایک ایسا ادب جس میں جذبات و احساسات کی وہ روح کارفرما ہو جو ہمیشہ آگے بڑھنے والی زندگی کا ساتھ دے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے ماحول کا شعور بھی رہتا ہے۔ اور یہی اس کی وہ ترقی پسندانہ رنگ ہے جس کی وجہ سے اگلے وقتوں کے لوگ اس سے خفا رہتے ہیں۔ اور اس کی تحریروں پر منہ بسورتے ہیں۔ لیکن آرٹ کی تمام نزاکتوں، فن کی باریکیوں، اور حسن بیان کے گداز کے ساتھ ساتھ خیال کی رفعت اس کی نگاہ میں لازمی چیز ہے۔ مگر محض رفعت خیال بھی وہ شئے نہیں ہے۔ جس پر فراق بس کر سکے۔ وہ خیال میں ایسا لوچ اور لچک دیکھنا چاہتا ہے۔ ایسی گمبھیرتا کا کھوج لگانا چاہتا ہے۔ اور غم نہیں بلکہ اس سوز کا متلاشی ہے جو انسان کو ہمیشہ آگے بڑھائے۔ شاید اسی لئے وہ میر اور شکسپیر کا قائل ہے۔ اور فانی اور ہارڈی Hardy کو بڑا مانتے ہوئے بھی، بہت بڑا نہیں کہنا چاہتا (اس کا یہ مطلب نہیں کہ فانی ہارڈی کے برابر پہنچ جاتے ہیں،

وہ تو غم کی ایک علامت بن گئے ہیں۔ پھر بھی ہارڈی کی گہرائی اور وسعتِ نظر ان میں کہاں؟) اور سچی بات تو یہ ہے کہ جس بُری طرح غم کے پیچھے فانیؔ ہاتھ دھو کر پڑے ہیں، کبھی کبھی تو اس کے تصور ہی سے فانیؔ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ مگر یہ ایک علاحدہ بحث ہے۔

البتہ ایک بات کہیں کہیں کھٹکتی ہے۔ وہ اپنی ساری خوبیوں کے باوجود کہیں کہیں بُری طرح ٹھوکر کھاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعصابی مریض ہیں۔ اور ایک دم سنسنا کر اور جھنجھنا کر کوئی بات کہہ دینا چاہتے ہیں۔ ایسے عالم میں لہجہ خواہ کتنا ہی پُراثر ہو۔ اور اظہار کتنا ہی حسین۔ بات کچھ یوں ہی سی ہوتی ہے۔ ایسے موقعہ پر وہ بات کہتے کہتے ہلائے دینے لگتے ہیں۔ ایسی ہی ایک بات اس مضمون میں ملتی ہے جو انہوں نے "اُردو کی عشقیہ شاعری" کے عنوان سے سنہ ۳۹ء میں "مدینہ" (بجنور) کے جوبلی نمبر (اپریل سنہ ۳۹ء) میں لکھا تھا۔ فیض احمد فیضؔ ادب میں نووارد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور انکا حلقۂ تعارف عمدہ نظموں اور ستھری تنقیدوں کی وجہ سے بڑھتا ہی جاتا تھا۔ ہمایوں میں انکی کوئی نظم چھپی "رقیب سے" اس میں شک نہیں کہ نظم پاکیزہ ہے اور خاص ہے۔ مگر فراقؔ نے اعصابی ہیجان میں اس کے لئے لکھ مارا کہ "میرؔ اور شکسپیر بھی اس سے زیادہ کیا کہتے"۔ دراصل نئے لوگوں پر تنقید لکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اور کسی زندہ ادبی شخصیت پر لکھتے وقت مصلحت اندیشی کا شکار ہو جانا لازمی ہے۔ فراقؔ میں جرأت رندانہ کی کمی ہے۔ مگر شاید اسی جرأت رندانہ کی کمی نے ان میں کلیم الدین احمد کی سی کلبیت پیدا نہ ہونے دی۔ اور اس لئے وہ بعض وقت بات کو گھما پھرا کر کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے مضمون طویل ہوتے ہیں۔ اور وہ نتیجے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا حالی والا مضمون پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہت کچھ بُرائی بھلائی کرنے کے بعد بھی کچھ دل کی دل

ہی میں رہ گئی ۔

حالی کے متعلق فراق نے لکھا ہے کہ ان پر انہی کا مصرعہ "کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ رازداں سے ہم" صادق آتا ہے۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ اسی غزل کے مطلع کا دوسرا مصرعہ "سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم" ان پر زیادہ اچھی طرح چسپاں ہوتا ہے۔ حالی کی ساری خوبیاں تسلیم مگر انکا ریاکارانہ مزاج نہیں چھپتا۔ یہ ریاکاری اختیاری نہیں تھی۔ بلکہ مزاجی تھی۔ اور اسی لئے وہ ہر ایک کو نظر آنے والی شئے نہیں۔ وہ انکی روح کا جزو بن چکی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ اس مزاجی ریاکاری میں شرارت کا عنصر نہیں تھا بلکہ شرافت کا عنصر تھا۔ اجتماعی بہبود کا احساس اور جماعتی فلاح کی تڑپ تھی۔ وہ دو مختلف اور متضاد راستوں کے دوراہے پر کھڑے تھے۔ اور انتہائے خلوص اور اعماقِ قلب سے ان میں مفاہمت کا راستہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اپنی پگڑی بچاکر۔ اور اسی لئے ان کے مزاج میں وہ ریاکاری پیدا ہوئی جس کا خود انھیں بھی پتا نہ لگا کہ یہ کدھر سے رینگ آئی۔ اس سلسلے میں طنز و مزاح سے بھی کام لیتے ہیں۔ جس کو فراق نے ہجویہ انداز کہا ہے۔ حالانکہ یہ استہزائی کیفیت ہے جو مکروہ ترین شدت کمتری کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر حالی کی مرنجان مرنج طبیعت اِسے حلق میں سے دہ آواز دے کر باہر نکالتی ہے جس سے اگرچہ دوسرے کے دل میں لکیر کھینچتی چلی جاتی ہے۔ مگر وہ بھی جواباً ایک خندۂ مجبور کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگرچہ ان کے طنز میں ظفر علی خان والا کھردرا پن نہیں ملتا جس کو سن کر اپنا اور دوسرے کا سر توڑنے کو جی چاہے مگر اکبر کا ٹھٹول اور مخول بھی نہیں ملتا۔ جس میں آدمی فن و گو کے ذوق کو بھول جائے۔ اور طبیعت صرف اس طنز کے اخلاقی اور نفع رساں پہلو پر غور کرنے لگے۔ اتنی ساری متضاد باتوں کو ایک جگہ سمونے کیلئے آدمی کو کیا کچھ نہ کرنا پڑتا ہوگا۔ ایسے ہی آدمی کو آپ مرنجان مرنج کہہ سکیں گے نا! مگر میں اسے

مزاجی ریاکاری کہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حالیؔ کی احتیاط بقول فراقؔ مصحفیؔ کی سی کھلی ڈھلی احتیاط نہیں ہے۔ اس کا لہجہ میرؔ کی نشتریت کے پاس نہیں پھٹکتا۔ اور غالبؔ کی سی شوخی کی انہیں ہوا بھی نہ لگی۔ غالبؔ کی شوخی ایک ایسے حساس اور خطرناک حد تک ذہین شخص کی شوخی ہے جسے صدمات پیہم نے اپنے اوپر بھی طنز کرنا سکھا دیا ہو۔

رات دن گردش میں ہے سات آسماں ؎ ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

اس بظاہر سپاٹ اور قلندرانہ شعر میں جو باطنی درد و کرب اور جو بے پناہ حسرتِ ناکام ہے وہ نظیرؔ کی مست قلندرانہ آزاد روی سے قطعاً مختلف ہے۔ حالیؔ کو یہ کہاں نصیب؟ لیکن دیکھئے آپ کہیں اس سے کوئی غلط مطلب نہ اخذ کریں۔ میں حالیؔ کی نیک نیتی کا قائل ہوں۔ آئیے حالیؔ کے چند اشعار پڑھیں۔

چھیڑ کر واعظ کو، حالیؔ خلد سے   بسترا کیوں اپنا پھنکواتے ہیں آپ

گرہ میں دام، نہ دفتر میں نام ہے حالیؔ   تمہیں تو شہر میں ہو اعتبار کے لائق

مال ہے نایاب، پر گاہک ہیں اکثر بے خبر   شہر میں کھولی ہے حالیؔ نے دکاں سب سے الگ

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں   مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر   ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم   سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم
خود رفتگیٔ شب کا مزہ بھولتا نہیں   آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم

فراقؔ کہتے ہیں کہ حالیؔ مقطعوں میں اکثر اپنے اوپر چوٹ کر جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں وہ ہمیشہ چوٹ دوسروں پر کرتے ہیں اور اپنی پگڑی صاف بچا جاتے ہیں۔ خیر بات کوئی بھی ہو۔ حالیؔ کے مقطعوں میں بلکہ میں تو یہ جرأت کروں گا کہ ساری شاعری میں احساس اور جذبہ ایک ہی ہے اور وہ ہے اپنا بھرم اور بھاری پن قائم رکھنا اور اسی لئے شاید وہ سب کچھ رازداں سے کہہ کر بھی کھل نہیں پاتے۔ یہی گھٹا پن یہی کم آمیزی

ان کے اشعار کی طبیعت ثانیہ ہے۔ وہ بھی کچھ کم آمیز ہی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے باوجود غنیمت ہی نہیں بہت اچھے ہیں اور ہمارے لئے ایک قیمتی ادبی ورثہ۔

حالی پر لکھتے لکھتے ایک جگہ فراق نے لکھا ہے کہ وہ (حالی) ان الفاظ کو بلا تکلف استعمال کر جاتے ہیں جن کو اُس وقت کی غزل شاید مشکل سے برداشت کرتی۔ کچھ اپنا بھی ان کا (نثر و نظم دونوں میں) کبھی کبھی یہی حال ہو جاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شفاف دریا میں کہیں سے گدلے پانی کی لہر آملی۔ یہ شاید اس لئے ہے کہ ابتداء سے ان کا تعلق زبان کے کسی مرکز سے نہیں رہا۔ بلکہ الہ آباد اور گورکھپور سے ہی رہا ہے۔ نئے اور نامانوس الفاظ کا ڈھنگ سے استعمال کرکے زبان کو وسعت دینا بہت مبارک فعل ہے۔ بات یہ ہے کہ الفاظ میں بذاتِ خود کوئی برائی بھلائی نہیں چھپی ہوتی۔ بلکہ ان کے محل استعمال میں برائی بھلائی ہوتی ہے۔ بعض جگہ جہاں وہ ہندو سماج۔ ہندو مزاج، اور ہندو بولی کو رچا کر استعمال کرتے ہیں تو یقیناً اردو کی وسعتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ مگر بعض جگہ وہ بلا تکلف اس طرح لکھتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے کوئی شخص گھر میں بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہو۔ اور چونکہ زبان کا ادبی معیار پیش نظر نہیں ہوتا، اس لئے مقامی بولی بھی اس میں کھنچی چلی جاتی ہو۔ مگر اس کے باوجود اس سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ فراق نے تنقید کے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالدی ہے۔ وہ ہندوستان میں میں اردو کا اکیلا IMPRESSIONISTIC CRITIC (تاثراتی نقاد) ہے جو اس رنگ کو کامیابی کے ساتھ نباہ سکا۔

فراق کی تنقیدوں میں ایک بات جو دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ مختلف شعرا کو پرکھتے وقت وہ ان کے مرتبہ کی حد بندی بھی کر جاتے ہیں۔ اور یہی وہ جگہ ہے جہاں اچھے اچھوں کو پسینہ آجاتا ہے اور اُن کا سانس اکھڑ جاتا ہے۔ یہ کہدینا نہایت ہی آسان ہے کہ میر اُردو کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ غالب پہلا فلسفی شاعر ہے۔ اور اقبال

نے غزل میں ایک نیا نکھار اور زندگی کی تڑپ پیدا کی۔ مگر یہ بتانا کہ ایسا کیوں ہے، اور ایسا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور اردو کے شعرا ایک صف میں حسب مراتب کھڑے کئے جائیں تو پھر انکی ترتیب کیا ہوگی اور کیوں ہوگی؟ یہ وہ بات ہے جسے بتانا ہفت خوان طے کرنا ہے۔ اور نیز یہ بتانا کہ ہر شاعر میں دوسروں کی سی بہت سی باتیں ملنے کے باوجود خود اُس کی اپنی وہ کونسی صفت ہے جس سے اُسے مشخّص کیا جائے؟ بڑے بڑے نقّاد یہاں چوکڑی بھول جاتے ہیں۔ مُنہ کھول کر غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر تعریف یا تنقیص ہر کوئی کرسکتا ہے۔ مگر یہ کون کرے؟ یہ تو بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔ اور بلّی کی گردن میں گھنٹی باندھنے کی برابر اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہاں پہنچ کر ہر ایک کی تنقیدی قوتوں کا پول کھل جاتا ہے۔ آئیے فراق کو کہیں کہیں سے پڑھیں ——

(۱) مصحفی :

" دل کی شاعری میر کا خاص حصہ ہے۔ جس میں اس کا دماغ بھی حل ہوکر رہ گیا ہے۔ لیکن ہاں اس عہد کے صفِ دوئم کے شعراء (جیسے یقین۔ اثر۔ قائم وغیرہ) ضرور صرف دل کے شاعر تھے۔ اور اسی لئے میر سے ملتی جلتی باتیں کہتے ہوئے بھی میر کی گہرائی اور گیرائی۔ اپنے نغموں میں پیدا نہ کرسکے.......... اس (سودا) کے یہاں داخلیت نے سوز و ساز اور درد و غم کا گہرا رنگ اختیار کرنے کی بجائے شگفتگی۔ البیلا پن۔ سرستی۔ نشاط اور رنگینی اختیار کر لی ہے.......... مصحفی کو تقلید اور انتخابیت کا حیرت انگیز ملکہ حاصل ہے۔ لیکن میر کا سوز و گداز یا تو مصحفی نے پیدا کرنا نہیں چاہا۔ یا ان سے پیدا نہ ہوسکا۔ اب رہ گئے میر سے کمتر درجہ کے شعراء سو ان کی کونسی بات مصحفی کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ وہی زبان و بیان کی نرمی۔ اور وہی خاموش سپردگی بلکہ اس کے ساتھ ایک خاص قسم کی لطافت۔ جو خالص داخلی رنگ کے شعراء کے کلام میں نہیں پائی جاتی.......... چونکہ میر کی جذباتی یا نفسیاتی امانیت مصحفی

ممکن نہیں ہے۔ اس لئے مصحفی کے یہاں ایک رکی رکی سی معصوم حیرت۔ ایک دبی ہوئی بے چارگی کی مسکراہٹ۔ اوپر کے دانتوں سے نیچے کا ہونٹ دبا لینے کی ادا ملتی ہے۔۔ ۔۔۔۔۔۔ مصحفی کے کلام میں بے پناہ اشعار نہ سہی۔ نرم نشتر نہ سہی۔ لیکن شبنم کی کی نرمی۔ اور شعلۂ گل کی گرمی کا ایک ایسا امتزاج ہے جو اس کی خاص اپنی چیز ہے۔ اس کے یہاں تنقید حیات نہ سہی لیکن ایک مزاج حیات ہے ۔۔۔۔۔۔ غالب کے یہاں۔ بہت ترنم ہے۔ لیکن وہ بہت تیز قسم کا ترنم ہے۔ مصحفی کا ترنم مدھم سر میں ہے۔ اس کا ٹھیراؤ۔ بہاؤ۔ اور اس کی نرم اور خفیف تھرتھری غالب کے ترنم سے مختلف ہے”

(۲) ذوق:

”۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں تو ذوق کے یہاں جس چیز کی کمی ہے۔ وہ شاعرانہ انداز احساس ہے۔ ۔۔۔۔۔۔ یہ اسلوب بیان نہ مومن کا ہے نہ غالب کا۔ یہ اسلوب بیان سو فیصدی اردو ہے۔ کم سے کم فارسی الفاظ آئے ہیں۔ اضافتیں اور بھی کم ہیں۔ اور یہ سب ٹھیٹھ اردو کے سانچے میں بلا تکلف ڈھل گئی ہیں۔ قافیے بھی ذوق کی اردویت کی طرف اشارے کر رہے ہیں۔ اخلاقی مضامین۔ پنچایتی روایتوں۔ مسلمہ کلیوں سے ذوق کی رغبت ان اشعار سے نمایاں ہے۔ انفرادی جذبات ذوق کے یہاں نہ ڈھونڈیئے ـــــ اردو کا اردو پن اس طرح نہ غالب کے یہاں نمایاں ہے نہ مومن کے یہاں۔ مگر اردو میں جو شعریت کا امکان ہے۔ وہاں تک ذوق کی پہنچ نہیں ـــ ردیف پر جس طرح اشعار کی تان ٹوٹ رہی ہے وہ فاتحانہ شان سے اردو کے آگے بڑھنے کی مثال ہے ـــ مگر میر کی طنز عنصری چیز ہے۔ جب ذوق یہ رنگ اپناتے ہیں تو یہ رنگ اڑ جاتا ہے ـــــ ذوق کی غزل سطحی بات چیت کو شعر میں ڈھال دینے کی مثال ہے ـــــ۔ ذوق کے فلسفیانہ

اشعار میں وہ یقین۔ وہ رمزیت۔ وہ تحیر کے عناصر نہیں جو غالب و میر خصوصاً میر کے فلسفیانہ اشعار میں ہیں ——— غالب کی بذلہ سنجی اور شوخی میں خیال کی چٹکیاں ہوتی ہیں۔ اندر سے داخلی طور پر گدگدی پیدا ہوتی ہے۔ ذوق کے یہاں صرف بول چال کی چٹکیاں ہوتی ہیں ——— ان (ذوق) کے اکثر مطلعوں میں قافیہ اور ردیف کی تکرار آواز میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیتی ہے —— ذوق کی آواز میں ایک رقاقت یا پتلا پن اور ہلکا پن ہے۔ مطلعوں میں دوہرے دوہرے قافیوں اور ردیف سے آواز میں جو تکرار پیدا ہوتی ہے۔ وہ پتلی اور ہلکی آواز کے بہاؤ میں روک تھام پیدا کر دیتی ہے۔ اس طرح روانی کے ساتھ ساتھ ایک ٹھیراؤ یا جماؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب مطلعوں میں آواز لہراتی یا ٹکراتی ہے تو اس میں ایک گاڑھا پن، اور حجم سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ذرا سی چمک بھی، یہ رکاوٹ یا ٹھیراؤ فی نفسہ رقاقت ہلکے پن اور پتلے پن کی صفات کی ضد ہے۔ جو ذوق کی آواز کی خصوصیت ہے۔ اور یہی ضد ذوق کی آواز کو مطلعوں میں چمکا دیتی ہے۔ اور اُس آواز کو اُجاگر کر دیتی ہے ——— مطلعوں میں ذوق خود اپنے خیالات کا بھید پا جاتے ہیں ——— ذوق کے اسلوب درک و تصور اور انداز بیان میں ایک قسم کی لاطینی کلاسیکیت ہے ——— ایک لحاظ سے ذوق معلموں کا شاعر ہے۔ یہ شاعری سب سے زیادہ ادبی یا قواعدی شاعری ہے ——— ذوق رائے عامہ کے شاعر ہیں، ——— ہم ذوق کو اُردو کا پنچایتی آرٹسٹ یا شاعر کہہ سکتے ہیں ——— وہ اہل دہلی کے جمہوری مذاق سے بہت قریب ہیں۔ بلکہ اس مذاق کی روح یا مرکز کو انھوں نے پا لیا ہے۔ ... ——— ذوق کی اردو میں مجھی ہوئی۔ بنی ٹھنی ہوئی۔ تراشی خراشی ہوئی عموميت ہے۔ ذوق زبان کے لحاظ سے عمومیت زدہ ہرگز نہیں ہے بلکہ عمومیت ذوق زدہ ہو کر چمک گئی ہے اور اس میں فصاحت کی جھلک پیدا ہو گئی

ہے. نظیر کے یہاں یہ عمومیت جوں کی توں نظم ہوگئی ہے ——— داغ کی آواز میں ایک آنچ ہے ۔ اس کے اشعار میں ایک جلن ہے. جو محض اردو زبان کا کرشمہ نہیں ہے ——— سودا کی آواز بھرپور ہے. اور ذوق کی آواز رقیق ہے. سودا کی آواز کچھ بوجھل ہے اور اس لئے اس میں وزن ہے ۔ ذوق کی آواز ہلکی پھلکی ہے ——— میر عنصری شاعر ہے. اس کے سادہ بیان میں وہ سوز وساز ہے جو واقعیت کو ماورائیت کا درجہ دیدیتا ہے. درد کی سادہ اور نرم زبان ان کی روشن ضمیری سے جگمگا رہی ہے ——— مومن کی بھی وہ غزلیں جو بہت سادہ ہیں. اور جن کی زبان ذوق کی زبان کی طرح سلیس ہے. ذوق کی غزلوں سے بہت مختلف ہیں ——— غالب کے دماغ کی رگیں دل کی رگوں کی طرح حساس ہیں غالب کے جذبات اور کلام میں ایک ارتکاز ہے. ایک نوک ہے. اور ایک تیز دھار ہے. جو شعاعوں کی طرح چمکتی اور جگمگاتی ہے ——— لیکن مصحفی کے کلام کی اٹھلاہٹ. سماہٹ. اور رنگینی ذوق کے یہاں نہیں ہے. ذوق کا کلام نہایت خوش سلیقگی سے ٹکپ کئے ہوئے کپڑے کی طرح ہے. ذوق کے اشعار پر الفاظ کے لباس کا اتار *Fall* بہت سجل ہے ——— غالب و مومن کی صف میں ان کے برابر بلکہ مومن سے کچھ آگے زبان کی شاعری کے پختہ کار نمائندے کی حیثیت سے بیٹھے اور دستار فضیلت زیب سر کئے ہوئے استاد ذوق بھی نظر آ رہے ہیں ——— !"

(۳) حالی :

. . . . . . حالی کا کلام بڑا ابدن جیو کلام ہے ——— جو انسانیت وہمدردی حالی کی واعظانہ اور قومی شاعری میں باوجود اس کی سادگی کے موجود ہے. اس رنگ میں وہ سعدی کے یہاں نہیں ہے سعدی ہمارے لئے تھا.

حالی ہم میں سے ہیں —— حالی کی سادگی ایسی سادگی تھی جو زبان و الفاظ سے نہیں بلکہ خلوص و وجدانی معصومیت سے پیدا ہوتی ہے —— حالی کے کلام سے متاثر ہونے کیلئے سب سے پہلی اور آخری شرط آدمی ہونا ہے —— بیک وقت لچکدار اور ٹھوس ہونے کی صفت بھی حالی کی نثر میں ہے۔ جو ڈرائڈن Dryden کی یاد دلاتی ہے۔ ہرچند اس نثر میں وہ چیز نہیں ہے جسے چمک دمک کہتے ہیں —— حالی ایک مخصوص ملت کے افراد کو مخاطب کرتا ہوا ازلی و ابدی انسانیت کا ثبوت دے گیا ہے —— حالی اردو شاعری اور اردو نثر میں ایک حساس عقلیت کا پیغمبر ہے۔ اور اس کے کلام میں عقلیت کا تمام زور اور عقلیت کی کمزوریاں موجود ہیں۔ —— حالی میں وہ پرواز اور اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جانے والی بات نہیں ہے وہ احساس تجربہ نہیں ہے۔ جو آفاقی ادب کی خصوصیت ہے اور نہ وہ اچانک کوندے جو میر۔ غالب۔ آتش۔ انیس اور اقبال کی آوازوں سے لپک جاتے ہیں —— احتیاط حالی کے دل و دماغ کی خاص صفت ہے —— اسی طرح ہر شعر میں وہ بات ہے جسے انگریزی شاعر ورڈسورتھ کہتا ہے "نرم حیرت کا ایک ہلکا جھٹکا۔ A Gentle Shock of mild surprise —— یہی زیر لب گنگناہٹ حالی کا مخصوص انداز ہے۔ حالی کے اشعار میں بسا اوقات نشتریت آتے آتے رہ جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی آ بھی جاتی ہے —— حالی بے بسی کا شاعر ہے۔ لیکن مجہولیت کا نہیں —— حالی کوئی کشفی پیکر vision دیکھ نہیں سکتے۔ جس کے نظارہ میں وہ خود گم ہو سکیں۔ اور ہمیں گم کر دیں —— حالی بات کو کم کر کے بات کا اثر بڑھا دیتے ہیں۔ کم کر کے۔ اور نرم کر کے —— جو انتقادی وضاحت، سفاکلیس کی طرح روح کی جو معصوم تابندگی و شفافی آرنالڈ کے یہاں ملتی ہے وہی ذرا کمزور اور دھندلی شکل میں ہمیں حالی کے یہاں بھی ملتی ہے —— ہم حالی کو ہندوستان کی اداسی

کا شاعر کہہ سکتے ہیں ——— حالی نے ہمیں غزل میں سچ بولنا سکھایا ——— حالی نے غزل کو ایک ضمیر دیا ——— غزل میں پہلے پہل ایک سماجی مافیہ داخل ہوتا ہے ——— حالی کی غزلیں اس خود بینی و خود پرستی سے بالکل پاک ہیں۔ جو روحانی تغزل یا جذباتی دبستان شاعری پر چھائی ہوئی ہے ——— نظیر سچے معنوں میں جمہور اور عوام کا شاعر ہے۔ حالی متوسط طبقے یا جاگیریں کھو بیٹھنے والے طبقے بگڑے ہوئے رئیسوں اور حسب نسب والوں کے شاعر ہیں۔ دونوں کی وطنیت اور ملّیت میں فرق ہے ——— ان (نظیر) کی غزلوں میں وہ زندگی ہے جس کی اسپرٹ حالی کی غزلوں کی اسپرٹ سے وسیع ہے۔ نظیر کی شخصیت حالی کی شخصیت سے زیادہ بھرپور ہے۔ نظیر حالی سے بڑا انسان تھا۔ اور حالی سے بہت بڑا شاعر بھی — ——— درد کے یہاں انسان اور دیوتا کا ایسا امتزاج ملتا ہے۔ درد کے یہاں انسانیت میں روحانیت کی ایسی جھلک ملتی ہے جو حالی کے یہاں مفقود ہے رکاؤ کا پن درد کا رُکا تھما پن نہیں ہے۔ حالی کا پاکیزہ اور پاکیزہ سے زیادہ مہذب معیار عشق نہ اس معیاری نیکی کا پتہ دیتا ہے نہ اُس سپردگی و خلوص کا نہ اس طہارت قلب کا آئینہ دار ہے۔ جس کا آئینہ دار درد کا کلام ہے۔ حالی کی شخصیت و شعور کی ہیر یا بطن (core) میں کوئی سخت حصّہ یا عنصر تھا۔ جو حل ہونے سے رہ گیا تھا۔ اور اس امر میں ہم اس کمی، اس عدم تکمیل، اُس ناآسودگی کا راز پا سکتے ہیں، جس کا احساس حالی کی شاعری میں ملتا ہے۔ ——— حالی عمل میں وہ جلال و جمال پیدا نہیں کر سکتے جس کے لئے انسان کی روح پیاسی رہتی ہے ——— اٹکاؤ کا یہی احساس ہمیں حالی کے کلام میں ملتا ہے۔ لامحدود کا احساس حالی کو نہ تھا۔ گویا حالی کا لاشعور ان کی اس کمی پر انھیں ملامت کر رہا ہے۔ اور اسی سے انکی آواز میں ایک جھجک اور ہچکچاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ ——— حالی واقعیت کو معجزہ نہیں بنا پاتے ——— حالی کی غزلیں

پڑھتے ہوئے یہ خیال دبے پاؤں دل میں سمانے لگتا ہے کہ حالؔی کا دل حسنِ عمل یا حسنِ صورت پر لوٹ کر کیوں نہیں آیا۔۔۔۔۔۔۔۔"

ان کی کتاب "اندازے" میں مصحفؔی و ذوقؔ اور حالؔی پر مضامین کے علاوہ دو مضمون اور بھی ہیں۔ ایک ریاضؔ خیرآبادی سے متعلق ہے۔ جو بیس پچیس برس قبل کا لکھا ہوا ہے۔ اور دوسرا "غالب پھر اس دنیا میں"۔ یہ دونوں زیبِ داستان کیلئے شامل کئے گئے ہیں۔ اگرچہ ریاضؔ والے مضمون میں آج کا فراقؔ کہیں کہیں اپنا سایہ ڈالتا نظر آتا ہے۔

ذہانت کی یہ لپک یا فراق ہی کی زبان میں یہ اچانک کوندے اُردو تنقید میں کہاں دیکھے گئے ہیں؟ اردو تنقید نگاروں کے ہاتھوں شعرا اچھے سے بُرے تک اور واہ سے آہ تک بھٹکتے پھرے ہیں۔ پہلی دفعہ فراقؔ کی انگلیوں نے انھیں چھیڑا ہے۔ اور وہ اپنی پلک جھپکاتے نظر آتے ہیں۔ فراقؔ ایک حسّاس تنقیدی وجدان رکھتے ہیں۔ حسّاس تنقیدی عقلیت نہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ انکی تنقیدوں میں طوالت کے ساتھ ساتھ وہ سائنٹفک طریقِ کار نہیں ملتا۔ جو پروفیسر کلیم الدیؔن احمد یا فیضؔ احمد فیض کی تنقیدوں کا خاصہ ہے۔ اور اسی نے انھیں مختصر مضمون لکھنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ مختصر مضامین میں آدمی کو پہلے سے سب کچھ سوچ سمجھ کر اور اپنی تحریری حدود مقرر کر کے قلم اٹھانا پڑتا ہے مگر فراقؔ کے یہاں یہ بات نایاب ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض اس لئے بات کو طویل کر رہے ہیں کہ دیر تک دماغ کو سہارا دینے سے ممکن ہے کوئی خیال کی بجلی چمک جائے۔ اور مضمون کے اختتام پر تو تقریباً مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوا ہے کہ لکھتے لکھتے فراقؔ کی انگلیاں تھک گئی ہیں۔ ورنہ وہ ابھی بہت کچھ کہتے۔ اور جب میں یہ سوچتا ہوں کہ وہ کیسی کیسی عجیب باتیں کہہ رہے تھے۔ اور ابھی نہ جانے کب تک اور کتنا کچھ کہتے اور یہ کہ وہ کہتے

لکھتے رک گئے ہیں تو مجھے ہمیشہ ایک تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ کاش وہ کسی ایک ہی شاعر پر کوئی مبسوط تصنیف چھوڑ جائیں۔ موجودہ تنقید نگاروں میں وہی سب سے زیادہ اس بات کے اہل ہیں کہ کسی شاعر پر وہ اپنے احساسات اور تنقیدی مطالعے کا نچوڑ کسی مکمل تصنیف کی شکل میں چھوڑ جائیں۔ ایک کتاب کی پھیلی ہوئی ضخامت میں ہی ان کے حسّاس تنقیدی وجدان کو مکمل آسودگی حاصل ہوگی۔ اور اس میں وہ ایسی ایسی عجیب مگر سچی باتیں کہیں گے جو آج تک اردو تنقید نگاروں کی زبانی نہیں سنی گئی۔ ان کی چنچل ذہانت کتاب ہی کے حجم میں کھُل کھیل سکے گی۔ مگر شاید انکی سہل انگاری انھیں ایسا کرنے سے روکتی رہے گی۔ ان کی اسی سستی کی وجہ سے (یہ سستی ذہانت کا خاصہ ہے) کہیں کہیں لطف بیان (تنقیدی مضامین میں) میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید اس سے انھیں خود تکلیف ہوتی ہے۔ اور وہ پھر کچھ چڑ کر اور کچھ سنبھل کر چُست۔ شوخ۔ اور البیلے نظر آنے لگتے ہیں۔ اور پھر وہی سستی۔ وہی نرمی۔ اور پھر وہی گرمی۔ اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں سب سے عمدہ "دورِ حاضرہ اور غزل گوئی" ہے۔ جو حضرت "نقاد" کے ایک ایسے مضمون کے جواب میں لکھا گیا ہے جو انہوں نے "کلیم" میں اردو غزل کے خلاف لکھا تھا۔ اس میں ان کی وہ جھلاّہٹ، جو اب تک دبی، دبی، تھی پوری طرح ابھر کر سامنے آگئی ہے۔ اور ذہانت جھنّا کر اپنی انتہائی وسعت میں پھیل چکی ہے۔ اس مضمون میں غزل کی ہئیت FORM اور ردیف و قافیہ کے مسئلہ کو فراق نے تقریباً طے کر دیا ہے۔

ایک اور بات یہ بھی ہے کہ فراق کی تنقیدوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ احساسِ لامحدودیت۔ اخلاقی اقدار۔ اور روحانی نظام میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادیب کا آدمی ہونا بھی شرط ہے۔ اور جسم کے علاوہ وہ ضمیر یا روح کے بھی قائل ہیں۔ اسی لئے اس ایمانی جذبے اور شدّتِ احساس سے مل ملا کر ان کے یہاں

ایک ماورائیت پیدا ہوگئی ہے، جسکی جوت سے اکثر تنقید نگار محروم رہ گئے۔ وہ مختلف شعراء کو میر اور غالب سے ٹکرا کر دیکھنے کے عادی ہیں۔ یا چند مشہور مغربی ادباء سے اور اس طرح وہ کلاسیکت کے قائل ہیں۔ قدما میں اس حد تک دلچسپی اور کلاسیکیت کو معیار ماننے سے مختلف شعراء کو پرکھتے وقت از خود ایسی پابندیاں عاید ہو جاتی ہیں کہ آسانی سے بہک جانا دشوار ہو جاتا ہے۔ اور غیر ذمہ دارانہ بات ناممکن۔ اسی ایک گر سے اردو کے شعراء کا مرتبہ مقرر کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور بہکنے سے بچ جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ذہانت کا جو اضطراب، چہل، زندگی، ولولہ ترنگ، امنگ، اور پھر دل گداختگی، سوز، حسیاتی ادراک، ایک دوسرے کو سمجھنے کی حد تک انسانیت اور احساس لذت یہ سب کچھ فراق میں کچھ اس طرح گھل مل گیا ہے کہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔ اسی سلسلے میں اگرچہ انکی شاعری پر یہاں بحث کرنے کا کوئی موقع نہیں۔ یوں انکی شاعری بھی بہت سی نئی باتوں کی آئینہ دار ہے۔ مگر اتنا کہے بغیر گذر جانے کو جی نہیں چاہتا کہ انکی شاعری میں جادو کی کمی کھٹکنے سے بچ گئی تھی۔ تنقید میں وہ کھل کر رہ گئی ہے۔ انہوں نے اپنی تنقیدی اہلیتوں سے کام لیکر اردو تنقید کو ایک نئے اندازِ نقد سے روشناس کیا ہے جو مغرب کا امتیازی حصہ تھا۔ انہوں نے ہمارے تنقیدی شعور کو ایک نئی زبان دی ہے۔ دماغ کے ساتھ ساتھ دل کو بھی روشناس کرایا ہے اور تنقیدی حِس کے تیز کرنے میں بہت مدد دی ہے۔ کہیں کہیں وہ اپچ اور ترنگ میں بلا تکلف انگریزی تنقیدی اصطلاحات کا ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ترجمے اردو ادب میں ایک اضافہ ہیں۔ مثلاً Platitudes کا چبائی باتیں۔ Abstractness کا نظریت۔ وغیرہ وغیرہ۔ فراق اس میں شک نہیں کہ دیو ذہانت ہے۔ اور اپنی مختلف و متنوع خوبیوں کے لحاظ سے جدید اردو تنقید میں سب سے اگلی صف میں سب سے شاندار کرسی پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔

عطا محمد

اختر الایمان

تاریک سیّارہ

ہر فرد اس 'تاریک سیارہ' کی مخلوق ہے۔ ہر فرد نے اس تاریک سیارہ کو اپنے سینے میں چھپا رکھا ہے۔ کیا جانے اس تاریک چٹان سے روشنی کی کرن کب پھوٹیگی۔ آج سورج بھی اندھا ہو چکا ہے۔

کردار ....

۱۔ تخیل ____

۲۔ حقیقت ____

"جانِ من حجلۂ تاریک سے نکلو، دیکھو
کتنا دلکش ہے سیہ رات میں تاروں کا سماں
آسماں چھلکے ہوئے جام کی مانند حسیں
خُلد میں دودھ کی ایک نہر سی ہے کاہکشاں"

"آسماں خود ہی نگوں سر ہے اِسے کیا دیکھوں
رات کے پاس ہے کیا مرگِ تبسم کے سوا
جس کے ذروں میں ہے ابتک میرے ماضی کا لہو
میں نے باندھا ہے اُسی خاک سے پیمانِ وفا"

"دِن کے واماندہ ہی دامنِ شب میں اکثر
اپنی منزِل کے حسیں خواب میں کھو جاتے ہیں
یا کسی سادہ و پُرکار کی میٹھی یادیں
اپنے پہلو میں دبائے ہوئے سو جاتے ہیں"

"میں بھی کھیلا ہوں تصور سے کسی کے برسوں
میں بھی اِک حلقۂ صد رنگ کا زندانی تھا
اب مگر چاہتا ہوں ورطۂ شب سے نِکلوں
وہ بھی دِن تھے کہ کوئی وجہ پریشانی تھا"

"رات کے پاس ستارے بھی ہیں سیارے بھی
دامنِ شب میں اندھیرا ہی نہیں نور بھی ہے
ایک سیارہ تمنا کی نئی دنیا ہے
جسمیں ایمن بھی ہے۔ موسیٰ بھی ہے۔ اور طور بھی ہے"

"آسمان دُور ہے نزدیک ہے یہ تودۂ خاک
جس کی آغوش میں ہیں رنگ کے چشمے رقصاں
جسمیں ہے نکہتِ گل، بُوئے سمن، بادِ نسیم
جسمیں ہیں سبزہ و شبنم کے فسانے غلطاں"

"ہر نفس جس میں ہے پابندِ غمِ دورِ خزاں ؟
صبح کی آنکھ میں اشکوں کے سوا کچھ بھی نہیں
قسمتِ حُسن ہے رسوائیٔ ہر دو عالم،
کائناتِ عشق کی آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں ؟"

"اور وہ سیارے جو ہیں میری نظر سے اوجھل
اُن میں کیا سلسلۂ کشتی و طوفان نہیں؛
شیشہ و سنگ نہیں، شعلہ و شبنم بھی نہیں
تم یہ کہتے ہو کہ اُس دنیا میں انسان نہیں؟"

"میری نظروں سے نہاں راز ہیں لیکن اُس کے
اِتنا معلوم ہے خوشیاں ہیں وہاں مستِ خرام
حُسن و موسیقی نے اِک جال سا بُن رکھا ہے
سایۂ گل میں کوئی ہوگا مگر دست بجام"

"جی کو بہلایا فسانوں کا سہارا لیکر
خواب میں زُلف و رخِ جانِ تمنا دیکھا
آتشِ گل سے جلا ڈالے اندھیرے میں چراغ
ڈوبنے والوں نے کشتی کا تماشا دیکھا"

"ہر نفس خواب ہے، ہر خواب حقیقت کا فریب
اک تماشا ہے نگاہوں کا نہ ماضی ہے نہ حال
آج ماضی ہے وہی دور جو فردا تھا کبھی
موت ملتی ہے تمناؤں کے چہرے پہ گلال"

"جو سمجھتے ہیں حقیقت کو محض نقشِ خیال
تم بھی ہو، اور بھی ہیں، ایک ہے انبوہِ کثیر
جو ابھی تک ہے پسِ پردۂ تاریکیٔ شب
جو ابھی تک ہے زمیں چھوڑ کے تاروں کا اسیر"

"خاک داں تیرہ و تاریک ہے شمعیں بے نور
اس اندھیرے میں یہ کہتے ہو ستاروں سے نہ کھیل؟
میں اسے خواب نہیں بلکہ حقیقت سمجھوں
مجھ سے یہ کہتے ہو نادیدہ بہاروں سے نہ کھیل؟"

"ساحلِ بحر پہ تسکین خزف ریزوں سے
وادیٔ مرگ میں نادیدہ بہاروں کی لگن؟
یہ اگر زادِ سفر ہے تو مسافر کے لئے
بالشِ خواب پہ بہتر ہے ستاروں کا کفن"

"اور کیا ظلم و جہالت کے درِ دولت پر
گر پڑوں خاک بسر، ناصیہ فرسائی کروں؟
چھوڑ کر دامنِ سیارہ و ماہ و انجم
حسنِ مغرور کے قدموں پہ جبیں سائی کروں؟"

"آسمانوں کی بلندی سے ہٹا کر نظریں
ظلم پروردہ بہاروں کی طرف دیکھو تو
سب اِسی ارضِ سیہ بخت کی خاطر ہیں یہ کھیل
خاک زائیدہ نظاروں کی طرف دیکھو تو"

"چند مرجھائی ہوئی کلیاں ہیں مَسلے ہوئے پھول
درد ساماں بہاروں کی طرف کیا دیکھوں؟
جو پلے ظلمتِ و اندوہ کے گہوارے میں
اُن نظر سوز نظاروں کی طرف کیا دیکھوں؟"

"ظلمتِ خاک میں پوشیدہ ہے آبِ حیواں
قسمتِ سوختہ ساماں ہے بدلنے ہی کو رنگ
اور کچھ دیر لہو ہولے دلِ خانہ خراب
محفلِ درد سے اٹھنے ہی کو ہے نغمۂ چنگ"

"پھر تصور نے تراشی ہے پناہ گاہ نئی
تودۂ خاک ہے کیا سامنے سیاروں کے
زندگی اب تو حنائے سرِ ناخن بھی نہیں
موت لَو دینے لگی چہرے پہ بیماروں کے"

"آسماں دُور ہے اب خوابِ گراں سے اُٹھئے
ظلمتِ شب سے ہوئے پیدا سحر کے آثار
ایک سیارہ ہے یہ اپنی زمیں بھی لیکن
اِس کو اِنسان نے کر رکھا ہے خود تیرۂ تار"

نظموں کا مجموعہ
سراب
۱/۸/

امرت رائے

غفّار ماسٹر

آپ پڑھینگے کیا ؟

جی ہاں سوچا تھا، کیوں آپ لیٹنا چاہتے تھے ؟

جی ہاں سوچا تو تھا، لیکن کوئی بات نہیں میں ادہر والی برتھ پر لمبا ہوا جاتا ہوں کافی جگہ تو ہے۔

جیسی آپ کی مرضی۔

پھر تھوڑی دیر خاموشی رہی لیکن زیادہ دیر نہیں۔ انہیں صاحب نے کہا "کیوں آنکھیں پھوڑتے ہیں' وہاں روشنی کافی نہیں ہے"

میں نے کہا۔ 'مجھے تو دکھائی دے رہا ہے۔ اتنی بہت کم تو نہیں ہے روشنی'

انہوں نے کہا۔ جی نہیں روشنی تو یقیناً بہت کم ہے۔ آپکی آنکھیں ابھی مضبوط ہیں اسلئے آپ کو پتہ نہیں چلتا آگے چل کر آپ افسوس کریں گے۔

ایک بالکل اجنبی مسافر کو مجھ سے اتنی محبت کیوں ہوگئی یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اور سمجھ میں آنیوالی بات بھی نہیں تھی کیونکہ آج کل سب اپنی ہی پریشانی میں اس قدر گرفتار رہتے ہیں کہ ایک کو دوسرے کی سننے کی فرصت نہیں ہوتی یوں صلاح و مشورہ دینا تو دور کی بات ہے۔ اور وہ بھی ریل کے سفر میں ؟ وہاں تو سب اپنی اپنی دال گلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیسے ڈبے میں گھسیں پھر وہاں کھڑے رہنے کی جگہ حاصل کریں پھر بیٹھنے کی ترکیبیں کی جائیں۔ اگر رات ہو رہی ہے تو لیٹنے کا کیا انتظام کرنا چاہئے وغیرہ وغیرہ جہاں سب اسی ادھیڑبن میں لگے ہوں وہاں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کا مجھے اتنی محبت اور ہمدردی ظاہر کرنا اور یوں نصیحت کرنا جیسے خاص اپنے لڑکے ہی

کو کتنا ہوا انتہائی تعجب کی بات تو ہے ہی۔ بہر حال مجھ پر ان بزرگ کی باتوں کا بڑا اثر ہوا اور میں نے کتاب بند کر دی۔ اس طرح میری ملاقات غفار ماسٹر سے ہوئی۔

۱

غفار ماسٹر کی عمر چالیس کے قریب ہو گی مگر ان کے آدھے سے زائد بال سفید ہو چکے ہیں، گورا رنگ، میانہ قد، کشادہ جھری دار پیشانی۔ بڑی بڑی کھچڑی مونچھیں۔ پانی کی طرح شفاف آنکھیں، مجموعی طور پر وہ مجھے بڑے اچھے لگے۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ ایک قابل اعتماد آدمی ہے اور بڑا ہی شریف ہے انکی آنکھوں اور طرز گفتگو میں بڑی کشش تھی۔ انکی آواز میں ایک خاص قسم کی گہرائی اور یگانیت تھی۔ مجھے اس خیال سے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ اب جبلپور تک یعنی تین گھنٹے اور میرا اور انکا ساتھ رہیگا۔ خوب دل کھول باتیں ہونگی۔

غفار ماسٹر نے پوچھا۔ کہاں جا رہے ہیں آپ۔

میں نے کہا۔ جبلپور کل اسی گاڑی سے ساگر گیا تھا۔

آپ بہت سفر کرتے ہیں آپ کی ہمت کیسے پڑتی ہے۔

اس میں ہمت کا کیا سوال ہے۔ ضرورت کے آگے انسان لاچار ہے۔

یہ بڑی تلخ بات آپ نے کہی۔

میں نے پوچھا۔ کیوں؟

غفار ماسٹر بولے میں کٹنی کے ایک اسکول میں ماسٹر ہوں۔ لیکن مجھے نوکری سے ہمیشہ نفرت رہی۔ کیا بتاؤں آپ کو میں اس سے کتنا بھاگتا رہا لیکن آخرکار ہار ماننی ہی پڑی۔ وہی بات جو ابھی آپ نے کہی۔ ضرورت کے آگے انسان مجبور ہے۔

غفار ماسٹر اداس ہو گئے اور کچھ سوچنے لگے میں نے کہا آپ نے بتایا نہیں؟

غفار ماسٹر نے کہنا شروع کیا، نوکری سے بچنے کیلئے میں کہاں کہاں نہیں گیا بمبئی،

کلکتہ، لاہور، مدراس، کراچی۔ ملک کے چاروں کونے ہو آیا کام کی تلاش میں میں نے ٹاٹانگر میں زمین پر چادر بچھا کر بساطی کی دوکان بھی لگائی ہے ۔

میں نے پوچھا۔ آپ کو نوکری سے اتنی نفرت کیوں ہے ؟

غفار ماسٹر نے جواب دیا مجھ سے کسی کی خوشامد نہیں ہوتی اور نوکری بغیر خوشامد کے میں نے کہیں چلتے نہیں دیکھی مجھے تو بڑی شرم آتی ہے جب میں اپنے ساتھی ماسٹروں کو ہیڈ ماسٹر کے سامنے دم ہلاتے یا دبی بلّی بنے ہوئے دیکھتا ہوں۔ اپنی شخصیت کو تو وہ گھر رکھ آتے ہیں۔ کسی سوال پر اپنی رائے نہیں دے سکتے۔ ہمارے یہاں ہیڈ ماسٹر کی رائے ہی سارے اسکول کی رائے ہے ۔

میں نے انہیں چڑانے کیلئے کہا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے ماسٹروں میں بڑی محبت اور بھائی چارہ ہے ۔

غفار ماسٹر نے چونک کر کہا۔ بھائی چارہ اور وہاں ؟ توبہ کیجئے صاحب آپکو ابھی حال کا ایک واقعہ سناؤں۔ یہ قصہ اندولن کے زمانے کا ہے اس اندولن میں اسکول کے دو ماسٹر جیل گئے تھے ان کے گھر میں بیوی بچوں کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی۔ آپ جانتے ہیں کہ پیسے پیسے کی محتاجی کا دوسرا نام اسکول ماسٹری ہے۔ خیال فرمایئے ان بیچارے گھر والوں کا کیا حال ہوا ہوگا، مجھے معلوم ہے کہ بچے کو پاؤ بھر دودھ پلانے کے لئے بھی ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ میں نے اسکول میں اپنے ساتھیوں سے کہا۔ یہ دو آدمی ملک کیلئے جیل گئے ہیں۔ اگر ہم ہی انکی فکر نہ کریں گے تو بھوکے مر جائیں گے آؤ ہم لوگ اپنی تنخواہ سے ایک ایک روپیہ ماہوار ان دونوں کیلئے نکال دیا کریں۔ دو روپئے میں ہم مر نہ جائینگے اور انکی پرورش ہو جائیگی۔ ہم سولہ ماسٹر ہیں اور سولہ روپیوں میں وہ لوگ کسی طرح گذر کرلینگے ۔

میں نے بے چینی سے پوچھا۔ تو پھر دینے لگے آپ لوگ ؟

غفار ماسٹر نے بڑے درد کے ساتھ کہا۔ جی نہیں ہم میں ابھی وہ انسانیت نہیں پیدا ہوئی ہے جو دوسروں کے دکھ سے دکھی ہو جائے ہمیں بس لمبی چوڑی باتیں بنانی آتی ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ سوراج لینگے۔

دو سکنڈ کی خاموشی کے بعد غفار ماسٹر نے پھر کہا۔ ایک مسلمان ماسٹر نے پورے ایک سال تک یہ بات سب سے کہی لیکن کس کے کان پر جوں چلتی ہے۔ ہر مہینہ تنخواہ ملتے ہی لوگ اپنی جیبوں میں ٹھونستے ہوئے اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے۔ میں مہینہ کے مہینہ بھونکتا رہا لیکن بالکل بے سود۔ اور آپ یہ بھی نہ بھولئے کہ یہ دونوں ماسٹر جو جیل گئے تھے مسلمان نہیں ہندو تھے۔ اور پھر ہم کہتے ہیں کہ ہمیں سوراج ملنا چاہئے۔۔ یہی انسانیت ہے جس پر ہم سوراج مانگتے ہیں۔ اپنے بھائی کی مدد کون کرے ہم تو پھاڑ کھائیں اگر ہمارا بس چلے تو۔

غفار ماسٹر کو ان باتوں سے تھکن سی ہو گئی اور وہ خاموش ہو گئے اونکی باتوں سے مجھے بھی بڑی اذیت ہوئی اور ساتھ ہی ایک سوال میرے دماغ میں چکر لگانے لگا۔

میں نے پوچھا۔ آپ نے یہ کیوں کہا کہ ایک مسلمان ماسٹر نے؟ یہ تو انسانیت کی بات تھی اس میں ہندو مسلمان کا کیا سوال ہے۔

غفار ماسٹر ہنسے اور پھر اداس ہو کر بولے۔ آپ کیلئے نہ ہوگا مگر ہمارے یہاں تو یہی سوال ہے۔

میں نے کہا واقعی بڑے افسوس کی بات ہے۔

غفار ماسٹر کو یکایک غصہ آگیا معلوم ہو رہا تھا جیسے انکو کسی نے ایک طمانچہ کھینچ مارا ہو۔ وہ جل کر بولے۔ آپ نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ افسوس کی بات ہے اتفاق سے الگ ہو گئے لیکن اس میں آپکی غلطی نہیں ہے۔ آپکو نہیں معلوم کیا سبق ہمارے بچوں کو پڑھایا جاتا ہے کسی کو کیا معلوم بچوں کا دماغ۔ وہ نالائق اتنا بھی نہیں

سوچتے۔ اُن کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ انہوں نے اسی آواز میں نہ جانے کس سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ ان کو اتنا تو سوچنا چاہئے کہ یہی بچے کل کے دن جوان ہوں گے اور انہیں پر ملک کی جنگ آزادی کا بار ہوگا۔ ان کے دماغ میں تو 'دوئی' کا زہر نہ بھریں تم ہندو ہو وہ مسلمان ہیں۔ تم ہندو ہو وہ مسلمان ہیں۔ مگر کسے فکر ہے جناب۔

یہاں تو نہایت اطمینان کے ساتھ اس کام کو انجام دیا جا رہا ہے۔

اور مذاق یہ کہ ملک کی آزادی کے نام پر ....

"جی ہاں، دل لگی تو یہی ہے، مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ملک کے ساتھ یہ مذاق آخر کب تک چلیگا۔ کیا ابھی کافی دن نہیں ہوئے؟ ابھی ہمارے دل سیر نہیں ہوئے غلامی کی تمنا ہمارے دامن کب چھوڑیگی۔ صدیوں سے ہم غلام ہیں، جانوروں کے جیسی زندگی بسر کرتے ہیں، دانے دانے کو محتاج ہیں، اچھی زندگی تو درکنار اچھی موت بھی ہمیں میسر نہیں۔ لیکن پھر بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں؟ جو یہ کہتا ہے کہ ہندوستان آزاد ہوگا۔ جھوٹا ہے۔ میں کہتا ہوں ہندوستان کبھی آزاد نہیں ہوگا۔ ہندوستان قیامت کے دن تک غلام رہیگا۔ کیونکہ اسے غلامی پسند ہے کیونکہ وہ آزاد ہونا نہیں چاہتا۔ آزادی کا لفظ صرف اسکی زبان پر ہے ابھی وہ اس کے سینہ کا داغ نہیں بنا ہے۔ وہ دل سے آزادی نہیں چاہتا۔ وہ جی بہلانے کے لئے آزادی کے ترانے گاتا ہے۔ دل سے آزادی چاہنا آسان کام نہیں ہے جناب۔ اُس کیلئے لفظ آزادی بلکہ آزادی کا پرچم آپ کو اپنے سینے پر نقش کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ہائے رے ہم۔ یہ دوئی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی، نہیں چھوڑتی، نہیں چھوڑتی، اتنی زور سے ہم کو اپنے شکنجے میں پکڑ رکھا ہے۔ جھوٹی ہیں تمام آزادی اور سوراج کی باتیں۔ جب تک اس گرفت سے ہم نہیں نکلتے"

"اور وہی لوگ جو یہ وبا پھیلاتے ہیں اپنے کو سب سے بڑا وطن پرست سمجھتے ہیں

مسلمان بھی وطن پرست ہوسکتا ہے یہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ کہتے ہیں مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن مانتا ہی نہیں وہ تو عرب کی طرف آنکھیں لگائے رہتا ہے"۔

غفار ماسٹر کانپنے لگا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اور اپنے لفظوں کو چباتے ہوئے بولے۔ ہندوستان کا مسلمان ہندوستان ہی کو اپنا وطن سمجھتا ہے۔ ہم تو اپنے ہندو دوستوں سے یہ کہتے ہیں کہ میاں تم تو آج مرے کل دوسرا دن جلاکر نربدا میں بہا دئے جاؤگے تمہارا نام و نشان تمہاری خاک بھی ڈھونڈے نہ ملیگی اور میں مرکر بھی ہندوستان کی چھ فٹ زمین لوں گا پوری چھ فٹ"

غفار ماسٹر دل کھولکر ہنسے۔ پھر بولے۔ مجھسے بڑے پریشان رہتے ہیں: سیکر اسکول والے فوراً گردن پکڑتا ہوں ایک نہیں چلنے دیتا۔

گاڑی بھاگتی ہوئی چلی جارہی تھی ہم دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے پھر غفار ماسٹر نے سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے کہا۔ رتن بابو آپ قیاس نہیں کرسکتے کہ میرے اسکول کی فضا کس قدر گندی اور دم بند کرنے والی ہے میں تو رو دیتا ہوں مجھے اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ ہمارے یہاں آٹھ آٹھ سال کے بچوں اور پندرہ سولہ سال کے لڑکوں کو یہی تعلیم دیجاتی ہے کہ مسلمان کو مار ڈالو۔ ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ مگر میں آپسے پوچھتا ہوں کہ دس کروڑ مسلمانوں کو مار ڈالنا کوئی آسان کام ہے؟ مار سکتے تو مار دیتے۔ مسلمان بھی اپنی حفاظت تو یقیناً کریگا۔ آسانی سے تو وہ مرنہ جائیگا۔ لڑیئے، کاٹیئے ایک دوسرے کی گردن۔ یہی تو رہ گیا ہے اب۔ قیامت کے دن تک انگریزوں کے جوتے کھانا ہی تو قسمت میں لکھا ہے۔ انگریزوں کے جوتے کھانے سے ہمیں سیری نہیں ہوتی۔ ہمارے اتحاد میں کیا زور ہے اس کا اندازہ ان کو شاید نہیں ہے ورنہ وہ شاید . . . . انھیں کچھ اندازہ نہیں اور سب اندازہ ہے۔ وہ سوچنے کی قوت کا استعمال کرنا چاہتے ہی نہیں۔ ان کی حیثیت زہر پھیلانے

والی پچکاری سے زیادہ نہیں ۔

غفار ماسٹر نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ وہی تو ہیں جن سے لاج ہے وطن کی۔ مجھے تو کبھی کبھی بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ ہمارے سکول میں ایک ہندو ماسٹر ہیں جنہیں بگل بجانا آتا ہے۔ اتفاق سے وہی اسکول کے راشٹری سویم سیوک سنگھ کے افسر اعلیٰ بھی ہیں۔ ایک لڑکا ان سے بگل سیکھنے گیا۔ انہوں نے اس کو سکھانے سے انکار کر دیا اور کہا "پہلے ہمارے سنگھ کے ممبر بنو تب سکھائیں گے" اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اس سنگھ میں کیا سکھایا جاتا۔ اس بات کیلئے انہیں تیار کیا جاتا ہے کہ بلوہ ہونے پر کیونکر مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہیئے۔

"جبھی جبھی اور نام ہے راشٹری سویم سیوک سنگھ ۔" میں بولا۔

"جی ہاں اپنے نام پر بھی دھبہ لگانے سے وہ باز نہیں آتے ہیں۔ ایک دفعہ کا قصہ سنئے میں ایک لڑکے کو پتھر سینہ پر رکھکر تڑوانا سکھاتا تھا جب وہ اس فن میں اچھی طرح ماہر ہوگیا تو میں نے ایک دن اسکول کے کسی خاص موقعہ پر اس کا کھیل کروانے کی سوچی۔ بارے وہ دن آیا وہ شام آئی جب اس کا کھیل ہونیوالا تھا۔ ہال میں زبردست بھیڑ تھی۔ اُس وقت ان زہر کے سوداگروں نے یہ افواہ اڑائی کہ غفار میاں بیچارے گوپال کی جان لینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اگر آج یہ کھیل ہوا تو گوپال ہرگز زندہ نہیں بچیگا۔ مسلمان لڑکے اگر اس کے سینے پر پتھر رکھیں گے تو وہ ضرور ہی مر جائیگا۔ لڑکے کا باپ گھبرا گیا۔ عجیب صورت پیش ہوگئی۔ دیکھنے والوں کی بھیڑ شور مچا رہی تھی اور ادھر موت اور زندگی کا سوال درپیش تھا۔ میں نے گوپال کے باپ کو سمجھا دیا کہ آپ ذرا بھی پریشان نہ ہوں گوپال آپ کا نہیں میرا لڑکا ہے۔ ادھر گوپال کو بلا کر کہا بیٹا گوپال تم سن رہے ہو تمہارے وہ ماسٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟

گوپال نے کہا۔ آپ بھی کس کی بات کرتے ہیں اُنہیں اور بھی کوئی کام ہے ؟

میں نے کہا۔ سمجھ لو بیٹا۔

گوپال نے کہا۔ میں خوب سمجھتا ہوں مجھے اور کچھ نہیں سمجھنا ہے۔ ان پنڈت جی کے دل چاہتا ہے کہ . . . . میں نے اُسے بے ادبی کرنے سے روکا۔ لیکن وہ اسی وقت بھاگ ہی تو گیا۔ اُس نے جاکر ان پنڈت جی سے کیا کہا یہ تو مجھے نہیں معلوم مگر اُس روز سے میری نظریں بچایا کرتے ہیں۔ آپ نہیں سوچ سکتے، ایک ماسٹر کو کتنی خوشی ہوتی ہے جب اس کے لڑکے اس کا بتایا ہوا صحیح راستہ اختیار کرتے ہیں اور اس کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ وہ خوشی اور مسرت صرف ایک اسکول ماسٹر ہی کو نصیب ہوتی ہے اور اپنے لڑکوں کی محبت اور اعتبار اور انکی عزت ہی وہ چیزیں ہیں جنسے اسکول ماسٹر کی حد درجہ خشک اور بے لطف زندگی میں کچھ جان اور تازگی آجاتی ہے۔ اس کے بغیر تو باور کیجئے کہ ماسٹر کی زندگی ایک ریگستان ہے جہاں کوسوں تک ایک ہرا تنکا بھی نظر نہیں آتا۔ بخدا اُس دن مجھے بیحد خوشی ہوئی۔ اتنی کہ میں گا اٹھا تھا۔ غفار ماسٹر نے اس روز کا پورا نقشہ میری نظروں کے سامنے کھینچ دیا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ سب واقعات گویا میرے چشم دید ہیں۔ مگر غفار ماسٹر کو چین کہاں وہ تو اپنے پوشیدہ خزانوں کو باہر لانے کیلئے بیتاب ہو رہے تھے۔ جو باتیں ان کے دل میں کھول رہی تھیں ان کو نکالے بغیر ان کو سخت بیقراری تھی۔ کہنے لگے میں اپنے لڑکوں کا صرف ماسٹر ہی نہیں ساتھی اور دوست بھی ہوں، جس سے وہ اپنی کوئی بات نہیں چھپاتے اور یہی وجہ ہے کہ اُنکی محبت کی شکل میں مجھے جو بیش قیمت خزانہ ملا ہے اس کے آگے ہر ایک چیز ہیچ ہے۔ میں اُنہیں یہی نصیحت کرتا ہوں اور ہر وقت تعلیم دیتا ہوں کہ بیٹا تم صرف مسجد اور مندر میں جانیکے وقت ہی مسلمان اور ہندو ہو۔ ورنہ تم نہ مسلمان ہو نہ ہندو بلکہ صرف

ے

ہندوستانی ہو۔ غلام ہندوستانی۔ جس کے نصیب میں لال منہ کے انسانوں کی ٹھوکریں لکھی گئی ہیں۔ تم بھول جاؤ کہ تمہارا باپ مسلمان یا ہندو تھا۔ ہند کی سرزمین نے تم کو پیدا کیا ہے۔ ہند ہی تمہاری ماں ہے۔ تمہاری ماں کو کچھ لٹیروں نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ تمھیں کو یہ زنجیریں کاٹنی ہیں۔ تم ہی کاٹوگے اور ضرور کاٹوگے ۔

اور یقین جانئے میری یہ نصیحتیں رائیگاں نہیں جاتیں میرے لڑکوں کی ہئیت اسکول کے دوسرے تمام لڑکوں سے قطعی مختلف ہے ۔

اتنا کہکر غفار ماسٹر پھر کچھ سوچنے لگے اور پھر ایک بڑی سانس کھینچکر بولے۔ میری
ندگی سب ناکام رہی۔ وہ شخص جس نے اپنی تعلیم کے زمانے میں علیگڈھ میں پندرہ
زار روپئے پانچ سال میں پھونک دئے ہوں وہ آج چالیس روپئے پر اسکول ماسٹری
تا ہو۔ اور انہیں چالیس روپیوں میں اپنی بیوی کا علاج اور اپنے بچّوں کی
عافی کا انتظام کرتا ہو۔ انہیں کوئی خاص آرام نہیں پہونچا سکتا ہو مجھے اپنے وجود
ے شرم آتی ہے رتن بابو۔ آپ کچھ مت کہئے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا
یری زندگی محض بیکار رہے ۔

میں نے زور کے ساتھ کہا۔ نہیں آپ یہ نہیں کہہ سکتے غفار ماسٹر میں آپ کو
ی غلط بات ہرگز نہیں کہنے دونگا ۔

غفار ماسٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ رتن بابو جو حقیقت ہے اُسکے کہنے کی ہمت
طاقت انسان میں ہونی چاہئے۔ وہ طاقت مجھ میں ہے۔ میری بیوی اور بچوں
ھکے اور مرجھائے ہوئے چہرے پکار پکار کر کہتے ہیں کہ غفار میاں تمھاری زندگی
میاب رہی۔

" میں نے کہا۔ اس کے لئے آپ کو شرمندہ ہونے کی قطعی ضرورت [illegible]

کی بہترین زندگیاں اکثر برباد ہی رہیں۔ اس کے لئے اُن کو شرمندگی نہیں ہونی چاہئے اس کی لعنت ہے بھوک اور غریبی کے اُن سوداگروں پر جنہوں نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ وہی جن کی زنجیر کی کڑیاں ہماری ماں کے جسم کو لہولہان کر رہی ہیں۔"

"شاید آپ ٹھیک کہتے ہوں رتن بابو مگر یہ دلیل پیش کرکے میں اپنی ذمہ داریوں سے بچنا چاہوں تو یہ بھی تو غلط ہی ہوگا؟ یہ خیال مجھے اکثر غمگین بنادیتا ہے۔ مگر اداسی میں بھی مجھے ایک قسم کی تسکین ملتی ہے اس خیال سے کہ میں صرف چالیس روپئے ہی نہیں کماتا ملک کی آزادی کے سپاہیوں کی ایک فوج بھی تیار کر رہا ہوں جو مسلمان اور ہندو نہیں بلکہ دونوں کی ایک متحدہ دھارا ہوگی ہندوستانی۔ جو ہماری غلامی کی جڑ دوئی کو ہزاروں فٹ نیچے دفن کر دیگی۔ کبھی کبھی مجھے بڑا ترس آتا ہے اپنے ان ساتھیوں پر جو تعصب کا زہر پھیلا کر ملک کے ساتھ غداری کرتے ہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مجھے اپنے کام سے تسکین ہوتی ہے تو انھیں بھی اپنی حرکت سے کبھی نہ کبھی تکلیف ضرور ہوتی ہوگی۔ سچ عرض کرتا ہوں مجھے کبھی کبھی بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی ہے کہ لوگ اتنی آسان بات کیوں نہیں سمجھ سکتے کہ صرف اتحاد کے ذریعہ سے ہی آزادی حاصل ہو سکتی ہے، میں تو اکثر جاگتے میں خواب دیکھا کرتا ہوں کہ، دونوں بھائی مل گئے ہیں اور اپنے خون سے لکھ رہے ہیں کہ ہم اب اس ذلت کا خاتمہ کریں گے ورنہ اس کوشش میں خود ختم ہو جائینگے۔ خوشی کے مارے میرا ایک ایک رواں ناچ اٹھتا ہے، لیکن فوراً ہی میری آنکھیں کھل جاتی ہیں اور میں اپنے آپ کو پھر اسکول کی اُس دم گھوٹنے والی بدترین فضا میں پاتا ہوں۔ مجھے اپنے ہم پیشہ لوگوں کی حرکتوں پر اس قدر صدمہ نہ ہوتا اگر میں یہ نہ دیکھوں کہ وہ اپنی حماقتوں سے آزادی کے دن کو پھر بہت دور دھکیل رہے ہیں، بہت دور، کوئی اور راستہ نہیں ہے اُس پر یہ کیفیت ہے، مجھے بڑا صدمہ ہوتا ہے یقین جانئے اپنے کسی عزیز کے مرجانیکا بھی

شاید اتنا رنج نہ ہوگا۔

جبلپور اسٹیشن کے احاطہ میں پہونچکر گاڑی دھیمی ہوگئی۔ میں نے اوپر کی برتھ سے اترتے ہوئے کہا۔ بات ہی ایسی ہے لیکن آپ تو اپنا فرض ادا کرنے میں کوئی فروگذاشت نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ غفار ماسٹر کا سر اونچا ہوگیا اونکے چہرے پر ایک بڑی پیاری مسکراہٹ کھیلنے لگی اور انکی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوگئی انہوں نے کہا۔

یہی تو خوشی ہے جو مجھے زندہ رکھی ہے کہ میں بھی ملک کی آزادی کا ایک ادنیٰ سا سپاہی ہوں۔ اس لئے مجھے اپنی زندگی وبال نہیں معلوم ہوتی۔ ورنہ پہلے مجھ پر ہر وقت خودکشی کا بھوت سوار رہتا تھا۔ میں زندگی سے حد درجہ بیزار ہوگیا تھا لیکن اب وہ بات نہیں رہی۔ اسکول ماسٹری کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ لیکن پھر بھی میں خوش ہوں۔ صرف چالیس روپئے پاتا ہوں۔ بیوی بیمار رہتی ہے، بچوں کے چہرے زرد اور پژمردہ رہتے ہیں، لیکن اسپر بھی میں خوش ہوں۔ اسلئے کہ میں بھی ملک کی خدمت کر رہا ہوں۔ بچوں کے دماغ سے صدیوں کی جمی ہوئی کثافت دھو رہا ہوں۔ انہیں آزاد ہندوستان کے قابل بنا رہا ہوں، انہیں اس لائق بنا رہا ہوں کہ وہ اپنی تمام قوت اکٹھی کرکے اُس مردود کو واصل جہنم کردیں جو سینکڑوں برس سے مادر ہند کی چھاتی پر سوار رہے۔

پھر کچھ رک کر کہا۔ جی ہاں زندہ ہوں تو اسی دن کی آس میں، ورنہ میونسپل اسکول کے ایک ماسٹر کو جسے چالیس روپے ملتے ہوں زندہ رہنے کا حق چاہیے ہو لیکن ضرورت ہرگز نہیں ہے۔

ایک سکنڈ کیلئے انکے منہ پر کہرا سا چھا گیا لیکن اسکے پہلے کہ میں انہیں جواب دوں کہرا صاف ہوچکا تھا اور دھوپ نکل آئی تھی۔ غفار ماسٹر ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے میری خوش نصیبی تھی کہ آپ سے ملاقات ہوئی سفر معلوم بھی نہیں ہوا۔ اب دیکھوں کب ملاقات ہوتی ہے۔

(ہندی سے)

مہندر ناتھ

سالی! کمینی کہیں کی

شہر میں یہ خبر آن واحد میں پھیل گئی، کہ مایا کو ایک مسلمان لونڈا بھگا کر لے گیا۔ اور مسجد میں جا کر مسلمان لونڈے نے مایا سے زبردستی شادی کر لی۔ اس خبر کے پھیلتے ہی چھوٹے سے شہر میں کھلبلی مچ گئی، ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جہاں بھی چند ہندو جمع ہوتے، مایا کا چرچا ہونے لگتا۔

"ارے۔ ہندوؤں کی ریاست میں اس قسم کا قہر۔ اور پھر دن دھاڑے ایک ہندو لڑکی کا اغوا"

'ہندو بھی ہجڑے ہو گئے ہیں'

جیسا راجہ، ویسی پرجا۔

مسلمانوں کے اتنے حوصلے، کہ وہ ایک ہندو لڑکی کو بھگا کر لے جائیں، کیا ساری ریاست میں کوئی ہندو نوجوان نہ تھا، جو اس لڑکی سے شادی کر سکتا!

اور اس طرح جتنے منہ اتنی باتیں۔ آریہ سماجی حلقوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ سناتن دھرم کے پجاری پہلے ہی نیم مردہ تھے، آریہ سماجیوں نے آ کر ہندوؤں کی گری ہوئی حالت کو سنبھالا تھا۔ سوامی دیانند سرسوتی کے گیت گا گا کر ہندو نوجوانوں کی مردہ روحوں میں پھر سے زندگی پھونکی تھی، دو چار بھیلوں کو ہندو کیا تھا، شہریوں کو اکٹھا کر کے حلوا بانٹا تھا۔ اس دن سے شہریوں کی نگاہ میں سماجیوں کی عزت بڑھ گئی تھی، اور اب ریاست کے ہندو سنبھلنے لگے تھے۔ کہ واقعی یہ ریاست ہندوؤں کی ہے۔ اور مسلمان صرف غلام بن کر ہی رہ سکتے ہیں؛ لیکن اس چیز نے انھیں پھر چونکا دیا۔

جونہی آریہ سماج کے سکرٹری کو یہ خبر ملی، تو اس نے اسی وقت شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا۔ کہ شام کے چھ بجے آریہ سماج مندر میں شہریوں کا ایک بڑا بھاری جلسہ ہوگا۔ ہندو دیویوں اور سجنوں کو اطلاع دیجاتی ہے، کہ وہ وقت مقررہ پر آکر قوم کی ڈوبتی ہوئی نیا کو بچائیں۔

آریہ سماج کا مندر دیویوں اور مہا پرشوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ صرف آریہ سماجی ہی نہ آئے تھے، بلکہ سناتن دھرمی بھی تشریف لائے تھے۔ آج اس ہولناک واقعہ نے آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں کا آپس میں ملاپ کرا دیا تھا۔ چند سکھ اپنی کرپانوں کو سنبھالے ہوئے، مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہندو قوم خطرے میں تھی۔ اور حیرت تو اس بات کی تھی۔ کہ ایک ہندو ریاست میں اس قسم کا ایتھاچار ہو جائے۔ ہندوؤں کے ہوتے ہوئے، ایک مسلمان کی یہ ذلیل حرکت۔ اگر اس قسم کی حرکتوں کو روکا نہ گیا، تو ایک دن یہ ریاست مسلمانوں کی ہو جائیگی۔ پاکستان کا خواب مکمل ہو جائے گا۔ مجمع میں ایک ہنگامہ برپا تھا، لوگوں میں جوش خروش تھا، فضا نعروں سے گونج رہی تھی، سوامی دیانند کی جے، اور ہر ہر مہا دیو کا نعرہ یکے با دیگرے کانوں سے ٹکرا رہا تھا، — آج ہندو دھرم پر مر مٹنے کی تمنا تھی۔ مایا کے عاشق کو جان سے مار دینے کی سازشیں ہو رہی تھیں۔ اور مایا کو اس مندر میں واپس لانے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔

آریہ سماج کے سکرٹری نے زور سے میز پر مکا مارا، ہال میں سناٹا چھا گیا، سکرٹری کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ اس نے کھدر کی پگڑی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "سجنو، دیویو اور مہا پرشو۔" آج ہمارے دیش پر ایک بپتا آن پڑی ہے، وہ مصیبت کیا ہے۔ جس نے ہم سب کو آج یہاں اکٹھا کیا ہے، شاید آپ اس کے متعلق کچھ جانتے ہوں، لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کہ یہ ریاست ہندوؤں کی ہے۔ اس کا راجہ ہندو ہے، اس کا وزیر ہندو ہے۔ اس کا سپرنٹنڈنٹ پولیس

ہندو ہے، اس کا ہندو گورنر ہے۔ اس کا تحصیلدار ہندو، اس کا تھانیدار ہندو۔ لیکن ان باتوں کے باوجود، ایک مسلمان چھوکرا ایک ہندو لڑکی کو بھگا کر لے جائے! مگر اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، کہ اس ریاست میں ۹۵ فیصدی مسلمان بستے ہیں۔ لیکن ریاست ہندوؤں کی ہے۔۔ اور میں یہ آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں، کہ مسلمان باقی ۵ فیصدی ہندوؤں کو مسلمان بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پانچ فی صدی ہندو، مسلمان ہو جائیں تاکہ گدی پر ہاتھ صاف کیا جائے، اور مایا کا ایک مسلمان لونڈے کے ساتھ بھگایا جانا، صاف ظاہر کرتا ہے کہ مسلمان خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ہم یہ کرنے دیں گے — کیا ہم یہ کرنے دینگے (مجمع سے جواب آتا ہے) "کبھی نہیں۔ کبھی نہیں"۔ (اور پھر سوامی دیانند کی جے، اور ہر ہر مہادیو کے نعرے،) — میں مایا کو جانتا ہوں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ نہایت ہی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی ہے۔ وہ کبھی کسی مسلمان کے ساتھ بھاگ نہیں سکتی۔ اس کی رگ رگ میں ہندوؤں کا خون لہریں مارتا ہے۔ وہ دونوں وقت سندھیا کرتی تھی، اور وید منتروں کا پاٹھ کرتی تھی، اس کی زبان سے میں نے کبھی کوئی برا شبد نہیں سنا۔ پھر وہ کس طرح ایک غریب آوارہ مسلمان لونڈے کے ساتھ بھاگ سکتی ہے۔ یہ مسلمانوں کی چال ہے، انکی شرارت ہے، آج مایا گئی، کل شہر کی اور لڑکیاں بھگا لیجائیں گی۔ بھلا پرشوں یہ مایا کی عزت کا سوال نہیں۔ بلکہ قوم کی عزت کا سوال ہے۔ اس وقت ہندو دھرم خطرے میں ہے۔ ہندوؤں کی ریاست ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ راجہ ہندوؤں کی پرواہ نہیں کرتا، وہ مسلمان مشیروں کی بات پر عمل کرتا ہے۔ اب وقت آگیا ہے۔ کہ ہم آپس میں متحد ہو جائیں، — اور اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کریں۔ میں چند تجویزیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

(۱) مایا کو واپس لانے کیلئے چندہ اکٹھا کیا جائے۔ دیویوں اور سجنوں کو چاہئے

کہ وہ دل کھول کر چندہ دیں۔

(۲) مایا کو واپس لانے کیلئے ایک وفد تیار کیا جائیگا۔ اس وفد میں ایسے جانبازوں کی ضرورت ہے، جو ضرورت کے وقت جان پر بھی کھیل سکیں۔

(۳) ہر محلے میں ایک ٹولی بنائی جائے، جو رات کے وقت ہندو محلوں میں پہرہ دیا کرے۔

(۴) ہندوؤں کی لڑکیاں، مسلمان محلوں میں نہ جایا کریں۔

(۵) اگر ہو سکے، تو خفیہ طور پر، ڈنڈوں، برچھیوں اور بندوقوں سے اپنے آپ کو مسلح کیا جائے۔

کیا آپ کو یہ تجویزیں منظور ہیں۔... مجمع سے جواب آیا۔ "منظور ہیں"۔ بولو۔ سوامی دیانند کی جے۔۔ آریہ ورت کی جے۔۔ ہر ہر مہا دیو۔۔ مجمع میں سے ایک سکھ چلایا۔ جو بولے، سو نہال، مجمع چلایا، ست سری اکال ——

اور اس طرح نعروں سے سارا مندر گونج اٹھا۔— مسلمان ان تجویزوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ انہوں نے مسجد میں جلسہ کیا۔ وہ خوش تھے، کہ ایک مسلمان ایک ہندو لڑکی کو بھگا لے گیا، وہ اس مسلمان نوجوان کے گلے میں ہار ڈالنا چاہتے تھے۔ اور اگر ان کا بس چلتا، تو وہ لڑکے اور لڑکی کا جلوس نکالتے، لیکن ریاست ہندوؤں کی تھی۔ اس لئے بیچارے بے بس تھے، لیکن ان کے چہروں سے فتح اور کامرانی کے آثار ٹپکتے تھے، یہ یقیناً اسلام کی فتح تھی۔ مسلمان اخوت اور آزادی کے پرستار ہیں۔ ہر شخص کو وہ اپنا بھائی تصور کرتے ہیں۔ دنیا کا سب سے پہلا مذہب اسلام ہے، اور اسلام ہی رہیگا۔ اس واقعہ کے بعد ریاست کے مسلمان بازاروں میں اکڑ اکڑ کر چلتے۔ بنئے دکانوں پر بیٹھ کر کڑھتے رہتے۔ کاش وہ کچھ کر سکتے۔۔ وہ ان مسلمانوں کو [illegible] تھے، کتنے بدتمیز ہیں یہ لوگ۔ سود پر روپے ہم دیں، شادی بیاہ کے لئے روپیہ ہم دیں۔

جب کبھی کوئی مصیبت آئے، تو روپے لینے کیلئے، ہمارے پاس آتے ہیں۔ لیکن اب انکی یہ دلیری، کہ ہماری لڑکیوں کو اغوا کرلے جاتے ہیں۔ ہماری بلّی، اور ہم سے میاؤں —— سُنا، سیٹھ جی، شہر کے مسلمان مایا کو ایک بنگلہ بنوا کر دے رہے ہیں۔ کھیتی باڑی کے لئے انہیں زمین دے رہے ہیں، اور الیکشن میں اس چھوکرے کو امیدوار کھڑا کیا جارہا ہے،۔ اس طرح متحد ہیں قومیں، اسے کہتے ہیں اتفاق، — ....

شہر کے ایک آراستہ ڈرائنگ روم میں چند نوجوان چائے پی رہے تھے، قصہ، وہی مایا کا۔

سُنا، جگدیش، مایا کو احمد بھگا کرلے گیا، سکھ چین سنگھ نے آہ بھر کر کہا۔

ارے احمد کہاں بھگا کرلے گیا، سالی خود اس کے ساتھ بھاگ گئی۔ جگدیش نے چائے کا گھونٹ پی کر کہا۔

وہ تو مسلمان بھی ہوگئی،۔ اور دونوں کی مسجد میں شادی ہوگئی سکھ چین سنگھ نے پیالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

ارے مسلمان ہوگئی، تو کونسی آفت آگئی۔ انند نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہٹ تیرے کمیونسٹ کی،۔ تم تو لا مذہب ہو میاں"

تمہارے ایسے ہندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی۔ ارے انکی تعداد ہی کیا تھی، اب جدھر نگاہ ڈالو، ترکی ٹوپی نظر آتی ہے، اللہ اکبر کا نعرہ کانوں سے ٹکراتا ہے۔ صبح بستر سے اٹھو، تو مندر کی گھنٹی کی جگہ، اذان سُنائی دیتی ہے، تم کہتے ہو، ہوا ہی کچھ نہیں۔ دن دھاڑے ایک مسلمان ایک ہندو لڑکی کو بھگا کرلے جائے، اور مسجد میں جاکر شادی کرلے، اور تم کہتے ہو۔ ہوا ہی کچھ نہیں،۔ میں پوچھتا ہوں۔ اور ہوگا کیا۔

سُنا ہے، مایا احمد سے محبت کرتی ہے،۔ جگدیش بولا۔

"جھوٹ بالکل۔ جھوٹ۔ میں کہتا ہوں سفید جھوٹ۔۔ ارے وہ تو رنڈی ہے طوائف ہے۔ طوائف کسی سے محبت نہیں کرتی،۔ رنڈی کا کوئی مذہب ہوتا ہے؟" سکھ چین نے منکرانہ انداز سے یہ فقرے کہے۔

تو پھر تمہاری بلا سے۔ اگر وہ مسلمان ہو گئی، تو تمہیں کیا۔

'میاں وہ اپنی مرضی سے مسلمان نہیں ہوئی، بلکہ زبردستی مسلمان کی گئی ہے،۔ مسلمانوں کی بڑی گہری چال ہے، جو تم نہیں سمجھ سکتے،"

ایک لڑکی کے مسلمان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا،۔ میں کہتا ہوں، اگر سارے ہندو مسلمان ہو جائیں۔ تب بھی کچھ نہیں ہوگا!

سارے مسلمان ہندو کیوں نہ ہو جائیں؟۔ سکھ چین چلایا۔

کیا مسلمانوں کے ہندو ہو جانے سے تمہاری تکلیفیں کم ہو جائیں گی۔ بھوک اور بیکاری مٹ جائیگی،۔ ظلم اور استبداد کم ہو جائیگا،۔ ارے کوئی کام کی بات سوچو۔ ان دقیانوسی خیالات کو چھوڑ دو۔ اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل میں جگہ نہ دو،۔
(ہلکی سی ہنسی ہنستا ہے)

ہنسو اور خوب زور سے ہنسو۔ لیکن میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں،۔ کہ میں راجپوت ہوں، میری رگوں میں پرتھوی راج چوہان کا خون دوڑ رہا ہے۔ میرے باپ دادا نے یہ زمین فتح کی تھی، ان دنوں یہاں ملیچھ رہا کرتے تھے،۔ جس شخص نے سر اٹھایا، اُسے کچل دیا گیا، مسلمانوں کو زندہ درختوں سے لٹکا دیا گیا! ان کے جسموں میں بھوس بھر کر شہر بھر میں پھرایا گیا۔ نیزوں پر ان کے سروں کو رکھ کر شہر میں گھمایا گیا۔ تب جا کر یہ لوگ سیدھے ہوئے تھے،۔ سکھ چین نے فاتحانہ انداز سے کہا،۔

جب آزادی کا گلا گھونٹا جاتا ہے، تو ہر فاتح اسی طرح کرتا ہے، تمہارے باپ دادا نے کوئی نئی بات نہیں کی،۔ غزنوی، تیمور اور بابر نے بھی یہی کیا تھا۔ انگریزوں

سنے یہی کیا۔ ہٹلر نے یہی کیا۔ اگر تمہارے باپ دادا کا ظلم اُن ملیچھوں پر جائز تھا، تو آج اِس ظلم کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" انند نے جل کر کہا۔

(ان سنی کر کے) میں ہندوستان میں ہندوؤں کی حکومت چاہتا ہوں،۔ سکھ چین نے مدبرانہ انداز سے کہا۔

مسلمان پاکستان چاہتے ہیں۔

تم لوگوں نے پاکستان کا جھگڑا اٹھایا۔ اگر گاندھی جناح سے نہ ملتا، تو جناح کبھی اتنا مشہور نہ ہوتا۔

تم نہیں جانتے کہ پاکستان کے نعرے سے ہماری سیاسی زندگی میں ایک ایسی تبدیلی آگئی ہے۔ جس کی اشد ضرورت تھی،۔ انند بولا۔

اچھا بابا۔ تمہارا ہندوستان مسلمانوں کو دے دو۔ لیکن اس ریاست میں ہندوؤں کا راج رہیگا، اور مایا واپس آئیگی اور ضرور آئیگی'۔

کیا تم مایا کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہو۔

میں ایک بدچلن عورت کے ساتھ شادی کرنے کیلئے تیار نہیں

کیا اس شہر میں کوئی ایسا ہندو ہے جو مایا کے ساتھ شادی کرنے کیلئے تیار ہو۔

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ جیسے موت نے اپنے مہیب پھندے اُنکے گلوں میں ڈالدئے ہوں۔ اور وہ سب بے زبان اور گنگ ہو کر رہ گئے ہوں'۔

'اور تم جگدیش'۔ انند نے خاموش فضا کو توڑتے ہوئے کہا۔

میں۔ میں۔ مایا کو اپنی داشتہ بنا سکتا ہوں،۔ لیکن گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ سالی ہے، خوبصورت، ارے جسم دیکھو، تو تڑپ اٹھو، اس دن چشمہ پہ ملی تھی، کیا چیز ہے، اللہ، کی قسم،۔ انند۔ عورت ہے۔ عورت،۔ معلوم نہیں وہ ہندو ہے، یا مسلمان؟ —— اگر میرا باپ مرگیا ہوتا۔ تو میں نے مایا سے کب کی

[illegible]

شادی کرلی ہوتی۔ کیا بتاؤں اندر، ۔ میں مایا سے کتنی محبت کرتا ہوں، ۔ ۔ ۔ محبت! شاید یہ محبت نہیں، یہ جنون ہے، اس جنون نے میری کتنی راتوں کو برباد کیا، میں اس کے جسم کو چاہتا ہوں، ۔ اپنے بازوؤں میں بھینچنا چاہتا ہوں۔ اس کے جسم کے ہر نقش کو دیکھنا چاہتا ہوں، ۔ اس کے جسم کے لمس سے محظوظ ہونا چاہتا ہوں۔ اس تمنّا ۔ اس خواہش کو محبت کہہ لو، یا ہوس، یا جنسی بھوک، لیکن یہ نقلی چیز نہیں، ۔ خدا کی قسم یہ نقلی چیز نہیں، ۔ یہ میرے دل کی خواہش ہے، میرے خون کی جھلک ہے، میری روح کی پرتو ہے، ۔ کمبخت باپ نہیں مرتا، ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں، کہ اگر میں نے مایا سے شادی کرلی، ۔ تو باپ دادا کی جائیداد سے ہاتھ دھونا پڑے گا، ۔ اور میں زندہ بھی اسی جائیداد پر ہوں، اسی جائیداد کے سہارے جیتا ہوں، اس لئے باپ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا، میں بزدل ہوں، واقعی بزدل ہوں، ۔ میں فیصلہ نہیں کرسکتا، محبت کرتے ہوئے محبت کا گلا گھونٹ رہا ہوں، ۔ میں مایا کو جانتا ہوں ــــ اچھی طرح جانتا ہوں۔ مگر صرف جاننے سے کیا ہوتا ہے، ۔ اگر آدمی عملی طور پر کچھ نہ کرسکے، ۔ یہ والدین کتنے ظالم ہوتے ہیں؟ ۔ اور یہ آریہ سماجی، ۔ اور یہ مذہب۔ (ہنستا ہے) سکھ جن سنگھ، ــــ آج تمہیں ہندو دھرم یاد آگیا، ۔ کبھی اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھا تم نے، ۔ کتنی بار تمہاری آغوش میں مسلمان عورتیں آئیں۔ اور تم نے اُن غریب لڑکیوں کی عصمت دری کی، ۔ اور یہ بی۔ اے کی ڈگری کس طرح لی، ۔ یہ روپے تمہیں کون بھیجتا تھا۔ تمہارا بھائی۔ اور یہ روپے، یہ کس کا خون ہے، ان دہقانوں کا، ان مسلمانوں کا، جن کی آبادی اس ریاست میں ۹۵ فیصدی ہے، ۔ تمہارے گھر میں مسلمانوں کا مکھّن آیا، اُن کی کلاڑیاں آئیں، انہوں نے دودھ بھیجا، انہوں نے خون پسینہ ایک کرکے روپے رشوت کے طور پر دیئے، گائے بھینسوں کے لئے گھاس بھیجا، ۔ لیکن دھرم اس وقت خطرے میں

نہ تھا، اُس وقت راجپوتوں کی شان کو کیا ہوا، تھا ـــــ تم کہتے ہو۔ تم راجپوت ہو، سالے۔ کمینے۔ کہیں کے ـــــ نکل جاؤ۔ یہاں سے۔

اُسی شام، شہریوں کا وفد مایا کے پاس پہنچا۔ وفد میں شہر کا چودھری تھا۔ آریہ سماج کا سکرٹری اور نوجوانوں کا نمائندہ جگدیش۔ اور ایک مولوی صاحب جو ریاست کی راج کی طرف سے بھیجے گئے تھے، تاکہ ہندو مایا کو زبردستی اٹھا کر نہ لے آئیں۔

مایا اور احمد ایک کچے سے گھر میں رہ رہے تھے، ۔ جب وہ دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ تو احمد بپھرے ہوئے شیر کی طرح دروازے کی طرف لپکا۔ اس کے ہاتھ میں چھرا تھا۔

دروازہ کھلا۔

سکرٹری نے احمد سے کڑک کر پوچھا، ۔کہاں ہے مایا۔

"آیئے ۔سکرٹری صاحب آیئے،۔ تشریف لایئے، ۔ مایا اندر سے بولی

چاروں اندر چلے گئے،۔

فوراً تیار ہو جاؤ مایا، ہمارے ساتھ اسی وقت چلو۔

احمد چھرا لیکر سکرٹری کی طرف لپکا۔

"احمد" مایا چلائی،

اور احمد وہیں رک گیا، ۔" خدا کی قسم مایا، میں تمہیں کبھی نہ جانے دونگا کبھی نہیں، میں ان سب کو جان سے مار دونگا، ۔میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا،۔

ان سے کہہ دو، کہ چلے جائیں یہاں سے

چپ رہو۔ احمد،

فرمایئے سکرٹری صاحب۔ کیا کام ہے،

میں تمہیں لینے آیا ہوں ،

کس لئے ،

' ایک ہندو عورت مسلمان کے ساتھ نہیں رہ سکتی ،

' میں احمد سے محبت کرتی ہوں '

' کیا سارے شہر میں تمہیں کوئی ہندو مرد نہیں ملا ،

ملے اور بہت ملے، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ بیٹھ جائیے نا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ بھی چودھری صاحب، ۔ اور آپ جگدیش صاحب، ـــــ میں غریب ہوں، میرے پاس صوفہ سٹ نہیں، ۔ گدی نہیں، قالین نہیں، ـــ خیر اس چارپائی پر تشریف رکھئے ۔

" فوراً تیار ہو جاؤ مایا ۔ ــ مندر میں تمام شہر کے لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں، تمہیں دوبارہ ہندو بنانے کے لئے سب تیاریاں کرلی گئی ہیں،"۔

ہندو بنانے کے لئے، (ہنستی ہے) ـــ سکرٹری صاحب، میں نہیں جاؤنگی، میں اس شخص سے محبت کرتی ہوں، میں اس کے پاس رہونگی. کیا آپ کو اعتراض ہے ۔

" ہاں اعتراض ہے، ہندو دھرم یہ اجازت نہیں دیتا ۔ کہ کوئی ہندو لڑکی، کسی مسلمان کے ساتھ شادی کرلے"۔ سکرٹری صاحب نے جوش میں آکر کہا ۔

" اس سے پہلے آپ کہاں تھے ۔ کیا آپ وہ دن بھول گئے ۔ جب میں آپ کے پاس آئی تھی، اور گڑگڑا کر نوکری کے لئے درخواست کی تھی، اور یہ بھی کہا تھا. کہ میری شادی کرا دیجئے ۔ اور آپ نے گالیاں دے کر گھر سے باہر نکال دیا تھا. اور کہا تھا ۔ پہلے چال چلن درست کرکے آؤ ۔ اور پھر میں چودھری جی کے پاس گئی تھی ۔ آپ نے مجھے اپنے گھر رکھا ۔ میں ان کے گھر جھاڑو دیتی رہی، ان کے بچوں کو نہلاتی، کھلاتی رہی،

ان کے برتن صاف کرتی رہی،۔ اور ایک رات آپ شراب پی کر میرے کمرے میں گھس آئے،۔ اور زبردستی میرا منہ چوم لیا۔ رات اپنے سنگ سونے کیلئے کہا۔ میں نے انکار کیا۔ اور آپنے اسی رات مجھے گھر سے نکال دیا۔ باہر سخت سردی تھی۔ اندھیرا گھپ اندھیرا۔ اور کڑاکے کی سردی، اور میں تمام رات گھومتی رہی۔ اِدھر اُدھر۔ اس دن کے بعد میں ہر افسر کے پاس گئی ان سب لوگوں نے میری بے عزتی کی۔ اپنے ساتھ سلایا اور آوارہ عورت کہہ کر گھر سے باہر نکال دیا۔ اس شہر کے ہر شخص نے میرے ساتھ محبت کی ہے،۔ شراب پی کر میرے جسم کی تعریفیں کی ہیں۔ اپنے عاشقے سنائے ہیں۔ اپنی بدصورت بیوی کا رونا رویا، — اور جب صبح ہوتی، تو یہی لوگ مجھے گھر سے باہر نکال دیتے،۔ —— اور آپ جگدیش صاحب، آپ خاموش کیوں ہیں۔ آپ نے کہا تھا۔ کہ میں آپکی داشتہ بنجاؤں، آپ مجھے مکان لے دینگے۔ آپ پندرہ روپے خرچ دینگے، اور ہر روز مجھے آپکے ساتھ سونا پڑیگا، — کیا میں لکڑی کی بنی ہوئی ہوں، کیا میں میز ہوں، تپائی ہوں، کرسی ہوں،

— آخر آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں،۔ — اور آپ یہ کہتے رہے، کہ آپ مجھ سے بے اندازہ محبت کرتے ہیں، لیکن آپ مجھ سے شادی نہیں کر سکتے، کیونکہ آپکے والدین مجھے ایک بدچلن عورت سمجھتے ہیں، —— آخر شہر کا کونہ کونہ چھان کر مجھے یہ شخص ملا۔ — پرماتما کی قسم سکرٹری صاحب، — میں اس شخص سے محبت کرتی ہوں۔ یہ شخص مجھے اچھی طرح جانتا ہے، — یہ شخص جانتا ہے، کہ اس سے پہلے میں کافی آدمیوں کے ساتھ سو چکی ہوں، لیکن پھر بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ یہ کیسی محبت ہے۔ یہ کس قسم کا عشق ہے۔ سمجھائیے نا

آپ اسے، — ہر روز جنگل میں جاتا ہے، لکڑیاں کاٹتا ہے، اور بازار میں بیچتا ہے، ا کچھ کماتا ہے، مجھے دیتا ہے، مجھے رنڈی نہیں کہتا، مجھے طوائف نہیں کہتا، — میں ا کے لئے روٹی پکاتی ہوں، — اور جو کچھ کر سکتی ہوں، کرتی ہوں ہم دونوں خوش ہیں پرما کیلئے ہماری خوشی نہ چھینیئے —— "لیکن یہ مسلمان ہے" سکرٹری نے چیخ کر کہا۔

اس کا مجھے علم نہیں، میں نے اسکے ساتھ اسلئے شادی نہیں کی، کہ یہ مسلمان ہے

نہ میں قرآن پڑھ سکتی ہوں، نہ قرآن کی آیتوں سے واقف ہوں، نہ کبھی مسجد گئی ہوں، نہ جاؤں گی۔ میرا نام مایا ہے اور مایا ہی رہے گا۔

لاحول ولا قوۃ۔ کفر بکتی ہے، کفر، مولوی صاحب نے جل کر کہا۔

سنئے تو سہی مولوی صاحب،۔ مجھے ایک مرد چاہئے تھا، وہ مل گیا، یہ مرد مسلمان ہے یا ہندو۔ اس بحث سے مجھے کوئی سروکار نہیں، ہاں اتنا ضرور کہونگی، کہ آپ لوگوں سے یہ بہتر انسان ہے،۔ —— اب آپ جائیے۔ اور اسی وقت چلے جائیے۔ میں آپ کی صورت تک نہیں دیکھنا چاہتی،۔ — اگر آپنے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی، تو ہم اُسے جان سے ماردینگے،۔۔۔

(پھر چیخ کر کہتی ہے) چلے جائیے یہاں سے۔

دوسرے دن شہر کے مسلمان کہہ رہے تھے،۔ ارے وہ تو رنڈی ہے، رنڈی، سالی کمینی کہیں کی،۔ رنڈی کا کوئی مذہب ہوتا ہے۔

اُسی شام ہندوؤں اور مسلمانوں کا جلسہ ہوا، جس میں یہ ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ کہ احمد اور مایا کو اس شہر سے نکال دیا جائے۔ اس پاک زمین پر دونوں کے رہنے کا حق نہیں ۔

مہندر ناتھ کے افسانوں کا مجموعہ
چاندی کے تار
جن کے ہر موضوع پر افسانے
مہندر ناتھ کا انداز ... ان میں ایک ...
... اعتبار سے ...
افسانے ہیں
قیمت ۱/۱۲/۰
مکتبۂ اردو
لاہور

منظور حسین شور (علیگ)

اندیشے

نور و نکہت میں وہ بہتی ہی رہی ہے اکثر   ہمکنارِ گل و لالہ ہے ابھی اسکی نظر
وہ سمجھتی ہے کہاں برق و شرر کے تیور   دور ہر موج سے سوئی ہے وہ اک ساحل پر
دور طوفاں سے بہت دور وہ سوئی ہے ابھی
سوچتا ہوں اسے بیدار کروں یا نہ کروں

وہ اگر جاگ گئی جاگ کے پچھتائے گی   چونک اُٹھے تو اسے نیند نہ پھر آئیگی،
اپنے خوابوں کے تصور ہی سے گھبرائے گی   اپنے احساس کے شعلوں ہی میں جل جائیگی
اس نے دیکھی نہیں موجوں کی تباہی ابتک
اس کو طوفاں سے خبردار کروں یا نہ کروں

اسکی خلوت میں شفق اسکے شبستاں میں سحر   اسکے رستوں کے تو ذرے بھی ہیں الماس و گہر
اسکے تیور میں نہاں سطوتِ زار و سنجر   اس کے نغموں کی غلامی میں ہیں ناہید و قمر
وادیاں اسکی فضا اسکی ہوائیں اس کی
ایسے آہو کو گرفتار کروں یا نہ کروں

اسکی نظروں میں دہکتے ہوئے آلام کہاں   اسکی نظروں میں سلگتے سحر و شام کہاں
اسکی نظروں میں بھلا زہر بھرے جام کہاں   اسکی نظروں میں خراشِ دلِ ایام کہاں
وہ مرے دل کی دھڑک سے بھی نہ برہم ہو جائے
ایسے طوفاں میں اُسے پیار کروں یا نہ کروں

روحِ عفت گنہ جنگ سمجھتی ہی نہیں   فتنۂ افسر و اورنگ سمجھتی ہی نہیں
زندگی موت کا آہنگ سمجھتی ہی نہیں   طاعتِ عشق کو وہ ننگ سمجھتی ہی نہیں
ایسی معصوم ہے ہنستی ہی چلی جاتی ہے
اسکی آنکھوں کو گہربار کروں یا نہ کروں

چمکِ تیغ و سناں اسکے تصور میں کہاں   خون کی جوئے رواں اسکے تصور میں کہاں
زلزلے شعلہ فشاں اسکے تصور میں کہاں   جلتی لاشوں کا دھواں اسکے تصور میں کہاں
نیت فطرت خونخوار سمجھتی ہی نہیں
ایسی مدہوش کو ہشیار کروں یا نہ کروں

نور و نغمہ کی پیمبر وہ محبت کی رسول   جسکی نظروں میں نہیں جبر مشیت کا شمول
آہ جو یاسمن و گل سے بھی نازک ہے وہ پھول   کرسکی جس کو نہ میلا کبھی آلام کی دھول
جسکی دنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
اسکی دنیا سے بھی انکار کروں یا نہ کروں

مدھوسودن

شمع، پروانے، اندھیرا

تراہے کے لیمپ پوسٹ نے آنکھ کھولی !

شام ہو چکی تھی، بجلی کی اس بتی نے جل کر دھندلکے کو ایک پھیکی سی روشنی میں تبدیل کر دیا۔ تین راستوں کے سنگم پر کھڑا ہوا یہ بجلی کا کھمبا ابھی اکیلا تھا۔ ورنہ اندر محلے کے نوجوان لڑکے۔ اس کے نیچے کھڑے ہو کر اپنی ناآسودہ جنسی زندگیوں کے متعلق باتیں کرتے رہتے تھے۔ ابھی وہ لوگ جمع نہ ہوئے تھے۔ تراہے پر آمدورفت جاری تھی۔ سُنار اپنی دکان بند کر کے چلا گیا تھا۔ باقی چند دکانیں ابھی کھلی ہوئی تھیں۔ دودھ والے کی دکان پر، جو عام دکانوں کی نسبت زیادہ صاف تھی، ایک تیز بتی جل رہی تھی۔ نائی اپنی دکان کے آگے کسی سرپرست سے آج کی خبریں پوچھ رہا تھا۔ جنگ کو تیسرا سال شروع ہو رہا تھا اور نائی بھی اب خبروں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ تیسری دکان پان والے کی تھی جس پر نہ بجلی کی روشنی تھی نہ کوئی سجاوٹ۔ ایک مدھم سی لالٹین ڈوری سے باندھ کر چھوٹی سی دکان کے وسط میں لٹکائی گئی تھی۔ اس کی روشنی برابر کی دکان کی برقی روشنی کے درمیان اور بھی مفلس معلوم ہوتی تھی۔ بوڑھا پان والا جو سگریٹ، سوڈا واٹر اور اسی قسم کی دوسری چیزیں بھی رکھتا تھا، اپنے گھٹنوں کے آگے انگیٹھی میں آگ لیے بیٹھا تھا۔ سالہا سال سے اس محلے کے نوجوان اس دکان اور دکاندار کو یونہی دیکھ رہے ہیں۔ گرمیوں میں ننگے بدن، جاڑوں میں انگیٹھی آگے رکھے ہوئے۔

لیمپ پوسٹ کی بتی کے گرد پروانے آنے لگے تھے۔ ایک پروانہ بتی کے گرد چکر کاٹ رہا تھا، جیسے پہلے آنے کی خوشی میں ناچ رہا ہو۔ گلی میں سے پرکاش نکلا اور

تراہے پر آکر چند لمحوں کے لئے لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑا رہا لیکن اور کوئی ساتھی نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے سب کے سب سینما چلے گئے ہیں۔ اُس نے سوچا، اور دودھ والے سے کچھ دیر باتیں کرنے کیلئے بڑھنے ہی لگا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی مہندر بازار سے آنے والے راستے کی طرف سے آرہا تھا۔ وہ رک گیا۔ مہندر نے قریب آتے ہوئے ایک لمبا سانس لیا اور بولا۔ وہ جو بیچتے تھے دوائے دِل وہ دکان اپنی بڑھا گئے!

"کیا ہوا؟" "وہ جارہے ہیں" مہندر نے جواب دیا۔

"کہاں جارہے ہیں؟" پرکاش نے وہ کا مطلب سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"ماتھر صاحب کا تبادلہ ہوگیا؟"

"واقعی؟" پرکاش نے یقین کو پرے رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"معلوم ہونے میں کیا دقت ہے۔ کوئی راز تو نہیں ہے یہ"

"میرا مطلب ہے مجھے تو معلوم نہیں ہوا۔"

"ابھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔ مہندر بولا۔ "آج ہی کی تو بات ہے۔ شام کو دفتر سے آکر ماتھر صاحب نے بتایا کہ انکا تبادلہ ہوگیا ہے۔"

"کہاں کا؟"

"لکھنؤ جارہے ہیں۔" اور اس نے ایک لمبا سانس لیا جس میں سنجیدگی کم اور سانس زیادہ تھا، اور بولا۔ "تین سو میل دور ہو جائینگے مری جان، بولو" اب کیا کروگے!"

"تو وہ واقعی جارہے ہیں؟"

"ہاں، ہاں۔"

"پاگل ہے، مذاق کررہا ہے۔" پرکاش یقین کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مہندر ایکدم سنجیدہ ہوگیا۔ گویا اُسے پرکاش کا یقین نہ کرنا بُرا لگا۔ اتنی روح فرسا حقیقت

ہے جیسے وہ ہنسی کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اور اسے یقین ہی نہیں آتا۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں اکثر جھوٹ نہیں بولا کرتا!" وہ بولا

"مذاق تو اکثر کرتے ہو۔ واقعی بتاؤ۔ تبادلہ ہو گیا؟"

"کیا آدمی ہو، یقین ہی نہیں آتا تمہیں۔" مہندر پر تلخی غالب آ رہی تھی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ کوشل، پریم اور اوم آ گئے۔ تینوں مشتعل معلوم ہوتے تھے۔ سینما دیکھ کر آ رہے تھے۔

"ذلیل بکواس، بے ہودہ ———" کوشل نے کہا۔

"میں لیلا دیسائی کو خط لکھ رہا ہوں کہ مجھے گود لے لے اور ریٹائرڈ ہو کر گھر بیٹھے۔"

پریم بولا۔

"لیکن پریم وہ ڈانسر، ہائے!!" اوم نے عشق و مسرت کے مشترک لہجے میں کہا۔ "میں تو مر جاؤنگا! بھئی ایکبار—"

"ماتھر صاحب کا تبادلہ ہو گیا ہے!" پرکاش نے کہا۔ اسے ابتک یقین ہو گیا تھا۔

"کیا؟"

"ماتھر صاحب کا تبادلہ ہو گیا۔ جمعرات تک وہ لکھنؤ چلے جائینگے۔" مہندر کا لہجہ اتنا سنجیدہ تھا کہ باقی تینوں کو شک کرنے کی گنجائش نہیں رہی۔ مہندر کے الفاظ کے بعد ایک نہایت ہی مختصر لمحے کیلئے خاموشی چھا گئی، پھر اوم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "ہائے سنیا!" سش! اور سب نے یکبارگی اس کی طرف دیکھا۔ اوم نے اتنی اونچی آواز میں کہا تھا کہ راہ چلتے آدمیوں تک نے سن لیا ہوگا۔ دودھ والے کی تو خیر کوئی بات نہیں، لیکن پان والا بوڑھا بکٹ آدمی ہے۔ ماتھر صاحب پان بھی اسی سے لیتے ہیں۔ کہیں کہدیا کمبخت نے تو اور آفت ہو گی۔ کوشل کو تو اوم کی اس بدتمیزی پر غصہ بھی آ گیا۔ لیکن اس نے کچھ نہیں کہا اور بات کو بھول گیا۔ اور سنار کی بند دکان کے چبوترے کی طرف بڑھتے ہوئے

وہ بولا۔ "میں تو بیٹھتا ہوں بھئی، رٹز سے یہاں تک آنا تو ایک مصیبت ہے۔"

وہ تھک گیا تھا۔ تھک ہی گیا ہوگا۔ یہ خبر کتنی بھی بری ہو ایسی نہیں ہوگی کہ کوشل کی ٹانگوں میں کھڑے رہنے تک کی سکت نہ رہے۔ ممکن ہے سیتا سے اُسے واقعی عشق ہو۔ باقی چاروں یہی سمجھتے تھے کہ اسے سیتا سے دراصل محبت ہے۔ سیتا کو بظاہر کسی سے محبت نہ تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں میں باہم حسد نہیں تھی۔ وہ سیتا کو ایک مشترکہ محبوبہ سمجھ کر آپس میں بات کرتے تھے۔ یا شاید انہیں حسد تھی۔ شاید یہ حسد نہ تھی۔ اُن میں سے ہر ایک دوسرے کو سیتا کی محبت کا نااہل سمجھتا تھا، خود سے کمتر خیال کرتا تھا لیکن اس بات نے شدید رقابت کی صورت اختیار نہ کی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ سیتا اُن میں سے کسی سے بھی محبت نہ کرتی تھی اور ہر ایک کو یہی خیال تھا کہ سیتا اُس سے محبت کر سکتی ہے!

سیتا اس محلے کی واحد خوبصورت لڑکی تھی۔ کم از کم ان نوجوانوں کا یہی خیال تھا کہ سیتا سے زیادہ خوبصورت اِس محلے میں اور کوئی لڑکی نہیں۔ سب اس پر مرتے تھے، سب سیتا کے بھائی کے گہرے دوست تھے، ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ وہ سیتا کے بھائی کا دوسروں سے زیادہ دوست ہو سیتا کا بھائی بھی اُن سب کا دوست تھا اور اس کی عدم موجودگی میں انہیں تعجب ہوتا تھا کہ کیا دیوندر کو، یہ اس کا نام تھا، اُن پر بالکل شبہ نہیں ہوتا، کیا وہ یہ سمجھتا ہی نہیں کہ یہ سب دوست سیتا کی وجہ سے اس کے گھر آتے ہیں۔ اُس کے کمرے میں چندے کر کے پارٹیاں کی جاتی ہیں، تاکہ چائے سیتا بنائے!

دیوندر کو اس بات کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہ بالکل معصوم تھا اور یہ سب اُسے بیوقوف سمجھتے تھے۔

"دیوندر ملا تھا تمہیں؟" پرکاش نے ہندر سے پوچھا۔

"نہیں" ہندر نے جواب دیا۔ آج گفتگو میں کھوکھلا پن تھا، جان نہ تھی۔ گفتگو کا انداز وہی تھا، الفاظ وہی استعمال کئے جاتے تھے، لیکن اُن میں وہ شگفتگی ناپید تھی، یہ

شگفتگی دیویندر کے کمرے میں اپنی معراج پر ہوتی تھی، حالانکہ وہاں بیٹھے ہوئے فقروں کی بناوٹ میں ضبط سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن ایک زندہ دلی سی اُمڈی چلی آتی تھی، جس کی آمد کا احساس نہ ہوتا تھا لیکن جو گفتگو کو رنگین اور دلچسپ بنا دیتی تھی۔ آج گفتگو میں وہ زندگی نہیں تھی۔ جیسے اُس کا اندر ہی گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔

"پاگل یہ بھی اب کیوں روتا ہے" اوم نے پریم کی سنجیدہ صورت دیکھ کر گاتے ہوئے کہا۔ "پریم کا تو ایسا ہی چلن ہوتا ہے"

"میں اِس رس کا مریض نہیں ہوں، تم اپنی صورت دیکھو" پریم نے جواب دیا۔ پریم ہی ان میں ایک ایسا نوجوان تھا جو سیتا سے دلچسپی سے انکار کرتا تھا۔ کسی کو اسکی بات پر یقین نہ تھا۔ سب اُسے جھوٹا سمجھتے تھے۔

"اور تم کوشل" اوم نے کہا۔ "جانے سے پہلے شادی کا پیغام کیوں نہیں دے دیتے"

کوشل کو وہ ہمیشہ شادی کے ذکر سے چھیڑا کرتے تھے، جس کی تہ میں ہمیشہ ایک طنز ہوتا تھا۔ کوشل ہی ان میں ایک ایسا نوجوان تھا جو ملازمت کرتا تھا۔ باقی سب ابھی طالب علم تھے۔ شادی صرف وہی کر سکتا تھا اور سب جانتے تھے کہ کوشل کی شادی یہاں نہیں ہو سکتی۔ اقتصادی بنا پر یہ ناممکن تھا۔ کوشل انکی باتیں سنتا ہوا مسکراتا رہا اور آج تو خاص طور سے مسکرانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ سیتا کے جانے کی خبر نے اُسے واقعی متاثر کیا ہے۔ اِس وقت سب یہی چاہتے تھے کہ بات کو مذاق میں رفع کر دیں۔ دیر تک وہ یونہی باتیں کرتے رہے۔ گھوم پھر کر بات وہیں آجاتی تھی۔ اسی موضوع پر بار بار گفتگو کرنے کے باوجود انہیں دہرانے کا احساس نہ ہوتا تھا۔ شام کی سیر، سنیما میں نظر آئی ہوئی کوئی عورت، محلے کی لڑکیاں، اور پھر سیتا، سیتا، سیتا!

دیر تک وہ باتیں کرتے رہے۔ دس بج چکے تھے۔ نائی اپنی دکان بند کر کے چلا گیا تھا۔ تراہے پر آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ اچانک کوشل کو خیال آیا کہ اُسے صبح جلدی دفتر پہنچنا ہے، یعنی اسے صبح جلدی اٹھنا ہے۔ یعنی اسے رات کو جلدی سونا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے اٹھتے ہی سب کو خیال آیا کہ اب جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ کوشل چل دیا۔ پرکاش نے چلتے چلتے مذاق کے طور پر اس سے ہمدردی ظاہر کی۔ کوشل نے مسکرا کر فقرہ لوٹا دیا۔ لیکن دونوں کے کہنے کے انداز سے یہ عیاں تھا۔ کہ آج جذبات میں تبدیلی ہے۔ آج جذبات میں تبدیلی تھی۔ سیتا جا رہی تھی، مہند کو خیال آیا اور جیسے یہ خیال پہلی مرتبہ آیا ہو!

کوشل جا چکا تھا۔ باقی سب بھی اندر چلے گئے۔ تراہے کا لیمپ پوسٹ اکیلا رہ گیا۔ بتی کے گرد کئی پروانے گھوم رہے تھے۔ متواتر ایک جنون میں چکر لگائے جا رہے تھے، اور بتی بے نیاز تھی، ساکت، جامد! دودھ والے نے بھی اپنی دکان کی بتی بجھا دی۔ وہ دکان بند کر رہا تھا۔ تراہے پر اب اندھیرا سا ہو گیا تھا، کبھی کبھی کوئی اکا دکا آدمی گزر جاتا تھا۔ پان والا مدھم لالٹین کی روشنی میں ابھی تک انگیٹھی پر ہاتھ سینک رہا تھا، پان والا انگیٹھی پر ہاتھ سینکتا رہا۔ تراہے کا لیمپ پوسٹ اکیلا کھڑا رہا اور بتی کے گرد پروانے گھومتے رہے۔ خاموشی چھا گئی تھی۔ گیارہ بج گئے تھے۔

سیتا پرسوں چلی جائے گی اور زندگی یک لخت محور سے محروم ہو جائیگی!

سیتا کب اُنکی زندگیوں کا محور بن گئی تھی یہ انہوں نے جانا ہی نہیں۔ انجانے میں، بالکل نامعلوم طریق سے وہ سب کے تخیل کا مرکز بن گئی تھی۔ ہمیشہ سے وہ اسی محلے میں رہی تھی۔ انہیں وہ زمانہ بھی یاد ہے جب سیتا فراک پہنا کرتی تھی۔ وہ کب جوان ہو گئی۔ کب ان سب کے تخیل پر ایک مکڑی کا جالا بن کر چھا گئی۔ یاد نہیں۔ یہ معلوم نہ ہوا، خبر نہ ہوئی، اور محیط کے سب نقطے دائرے کے مرکز پر سمٹ آئے۔

سیتا پرسوں چلی جائیگی!

وہ کسے چاہتی ہے؟ وہ کس سے ——

محبت کا لفظ اُن کے ذہن میں نہ آتا تھا۔ یہ لفظ ان کے ذخیرۂ الفاظ میں سے خارج ہو گیا تھا۔ محبت کا تصور ہی اُن کے ذہن میں بدل گیا تھا۔ اگر کوئی لڑکی کسی لڑکے میں دلچسپی لینے لگے تو اُسے پھنس جانے کے نام سے یاد کیا جاتا تھا یا عشق سے جس کا مطلب صرف پھنس جانا ہوتا تھا، جذبات، روحانیت اور محبت سے خالی۔

لیکن آج، بستر پر لیٹے ہوئے ہمندر نے محسوس کیا، ایک ہیجان، ایک اضطراب، ایک بے کلی۔ سینے میں پھیل گئی ہے۔ اور اس اضطراب اور بے کلی وہ سینے میں لئے پڑا رہا۔ اسے سیتا سے محبت ہے۔ سیتا کسے چاہتی ہے، یہ شبہ اُسے بے چین کر رہا تھا۔

اکثر ایسا ہوا تھا کہ دیوندر کی غیر حاضری میں اُس نے سیتا سے کچھ دیر گفتگو کی تھی۔ دیوندر کی موجودگی میں بھی اس سے باتیں ہوئی تھیں، وہ بات کرنے میں جھجکتی ہے، لیکن اُس کے بولنے کا انداز کتنا پیارا ہوتا ہے۔

سیتا سے بات کرتے ہوئے ان سب کو اپنے اندر ایک ضبط کا احساس رہتا تھا۔ او سیتا ایک بھول بھلیاں تھی، جس کے دل کا راستہ نہیں ملتا۔ جس کے جذبات کی تھاہ نہیں ملتی، یہ پتہ ہی نہیں لگتا کہ اُن کے متعلق وہ کیا سوچتی ہے، کیا محسوس کرتی ہے، کیا چاہتی ہے، وہ ایک بھول بھلیاں ہے اور اُن سب کے تخیل پر مکڑی کا جالا بن کر چھائی ہوئی ہے۔

سیتا اُن سب سے مسکرا کر بات کرتی تھی، اس کی مسکراہٹ میں وہی مٹھاس ہوتی تھی، جیسے وہ سب کی بہن ہے، سب کی محبوبہ ہے، ایک طوائف ہے۔ سیتا کی مسکراہٹ گو بظاہر بالکل آسان، نرمل، شفاف معلوم ہوتی تھی۔ اُن کے دماغ

کو پریشان کئے رکھتی۔ اگر سیتا کسی کے سامنے نہ مسکرائے اور کسی ایک سے مسکرا کر بات کر لے تو فیصلہ ہو جائے۔ لیکن وہ سب کا اپنی پیاری مسکراہٹ سے خیر مقدم کرتی تھی، جیسے کہتی ہو کہ مجھے یہ جان کر خوشی ہے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔

دوسرے دن صبح مہندر نے دیویندر کے مکان پر آواز دی۔ اُسے معلوم تھا کہ دیویندر کالج چلا گیا ہوگا، اسی لئے وہ اس وقت اسکے گھر گیا تھا۔ سیتا دہلیز میں آئی۔

"وہ تو کالج گئے۔" وہ بولی۔ مہندر نے اس کے ہونٹوں پر اس خفیف سی مسکراہٹ کو دیکھا۔

"بہت جلدی چلا گیا آج"۔ اس نے کہا۔

"نہیں تو۔ دس بج چکے ہیں اب!"

وہ کیوں مسکرا رہی ہے، مہندر نے سوچا۔ وہ جانتی ہے کہ میں دیویندر کے لئے نہیں آیا!

"یہ ٹھیک ہے کہ آپ لوگ لکھنؤ جا رہے ہیں؟"

"جی ہاں" کہتے ہوئے سیتا نے اپنی پلکیں جھکائیں، پھر آنکھیں اٹھاتی ہوئی وہ بولی "کل رات کو جانا ہوگا" اور اُس کی آنکھوں میں [illegible] سی مسکراہٹ تھی۔ جیسے پانی کی لہروں پر سورج کی کرنیں ناچتی ہوں۔ اگر وہ جانتی ہے۔ مہندر نے سوچا۔ کہ مجھے اس سے محبت ہے تو کہہ کیوں نہ دیا جائے۔ لیکن اس نے کہا نہیں اور ایک عجیب سی کیفیت اُس کے دل میں اُبھر آئی، جیسے جسم کی تمام رگیں ایک سنسناہٹ سے لرزاں ہوں، اور دل ایک ہیجان سے پُر ہو گیا ہو۔

"لیکن یوں اچانک کس طرح جا سکیں گے آپ؟" اس نے کہا۔

"جی؟"

"میرا مطلب ہے" مہندر نے وضاحت کی۔ "لکھنؤ تو پہلے وہاں پہنچ

کا انتظام بھی تو کرنا ہوگا۔"

"کوارٹر ملیگا وہاں"۔ سیتا نے جواب دیا اور جیسے بات ختم ہوگئی، جیسے کنارہ آگیا اور آگے خلا ہے

مہندر کہنا چاہتا تھا کہ —— لیکن بیکار، اس نے سوچا، اب کہنے سے فائدہ کیا ہے، وہ کل جا رہی ہے، وہ کل چلی جائیگی۔

در اصل اسے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

"آپ ——" سیتا کہنے لگی تھی۔

"سیتا!" اندر سے آواز آئی۔ ماں سیتا کو بلا رہی تھی۔ مہندر کو ایک جرم کا سا احساس ہوا۔

"اچھا کہہ دیجئے گا کہ میں آیا تھا"۔ اس نے چلتے ہوئے کہا۔ "نمستے"۔

"نمستے"۔

اور سیتا کی مسکراہٹ کے احساس کو اپنے سینے میں لئے وہ لوٹ آیا۔ جب وہ دہلیز سے باہر آرہا تھا تو پرکاش ملگیا۔ اور وہ اندر جا رہا تھا۔ مہندر کو دیکھ کر چشم زدن میں گویا ایک خفت کا سایہ اس کے چہرے پر سے گزر گیا۔

"دیوندر نہیں ہے اندر؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں"۔ مہندر نے جواب دیا۔ اور یکبارگی دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ خیالات نے دغا دی اور چہروں پر ظاہر ہوگئے۔ وہ مسکرانا نہ چاہتے تھے لیکن یہ مسکراہٹ آپ ہی آپ ہونٹوں پر نمودار ہوگئی۔

"جان کر ایسے وقت آتے ہو، جب وہ گھر پہ نہ ہو، پرانی ٹکنیک استعمال کر رہے ہو نہ!"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔" پرکاش نے ہونٹوں کی مسکراہٹ کو چھوڑے بغیر کہا۔

"ارے میں خوب جانتا ہوں تمہیں، کل سے سوچ رہے تھے تم کہ اس وقت ٹھُنگا۔ چلو آؤ اب پھر کبھی موقعہ ڈھونڈ لینا۔" اور وہ پرکاش کی کمر میں ہاتھ ڈال کر لے چلا۔ یہ چند فقرے جو اس نے کہے تھے محض پیش بندی کے طور پر تھے۔ ایسا نہ ہو کہ پرکاش یہی الزام اسکے سر تھوپ دے، خود کہہ کر اس نے پرکاش کیلئے گنجائش نہ چھوڑی تھی۔ پرکاش نے بظاہر مسکرا کر ٹال دیا تھا۔ لیکن اپنے اندر اُسے ایک تلخی کا احساس ہو رہا تھا۔ حالانکہ آج یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو ہمیشہ اسی طرح چھیڑا کرتے تھے۔ اپنے دل کے چور کو دوسرے پر چسپاں کرتے تھے اور حیرت تھی کہ سب کے دل میں ایک ہی چور تھا۔ ایک دوسرے کی ناواقفیت میں سب سے ایک سے فعل سرزد ہوتے تھے، ہر شخص اپنی کارگذاری کا فاعل دوسرے کو ٹھہراتا تھا اور یہ صحیح ہوتا تھا۔ سیتا کے معاملے میں اُن سب کے خیالات و احساسات میں غیر معمولی مطابقت تھی، وہ ایک سا سوچتے تھے، ایک سا محسوس کرتے تھے، ایک سورج سے روشنی لیتے تھے۔

شروع شروع میں نہندر سب کا اس بات کو لے کر مذاق اڑایا کرتا تھا کہ وہ سب محض سیتا کی وجہ سے دیوندر کے گھر جاتے ہیں۔ ان دنوں کی بات تھی جب سیتا سے دلچسپی کو سب نے اپنے اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپا رکھا تھا اور ایک دوسرے پر حقیقت کو ظاہر نہ کیا تھا۔ اُن دنوں نہندر طنزاً اس حقیقت کو گفتگو میں لے آتا تھا۔ دلچسپی سیتا سے اُسے بھی تھی لیکن دیوندر کے ہاں جا کر یوں دوستی کے پردے میں اُس کی بہن سے عشق لڑانا وہ مناسب نہ سمجھتا تھا۔ ضمیر اجازت نہ دیتا تھا۔ یہ روایتی احساس ابھی اس کے دل میں مردہ نہ ہوا تھا کہ ہندستان میں محبت صرف دشمنوں کی بہنوں اور بیٹیوں سے کی جا سکتی ہے وہ خود بھی دیوندر کے گھر جانا چاہتا تھا لیکن جا نہ سکتا تھا لہٰذا سطۂ جانے والوں پر طنز کے نشتر استعمال کرتا تھا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ اس نے اس احساس پر قابو پا لیا۔ وہ خود بھی جانے لگا۔ اور آہستہ آہستہ سب کا عشق ایک دوسرے پر ظاہر ہو گیا۔

انہوں نے اپنے آپ کو چھپانا چھوڑ دیا۔ سیتا ایک مشترک محبوبہ بن گئی اور باہمی گفتگو کا موضوع۔ صرف پریم ایسا تھا جو سیتا سے کسی قسم کے لگاؤ سے انکار کرتا تھا۔ سب اُسے جھوٹا سمجھتے تھے، ہر ایک اسی بات کی وجہ سے ایک قسم کی مخاصمت کا جذبہ رکھتا تھا کہ جیسے وہ کسی گناہ میں اُن کا ساتھ نہ دے رہا ہو۔ انہیں یقین تھا کہ پریم کو سیتا سے دلچسپی ہی نہیں محبت ہے، تو پھر ہنستا کیوں ہے وہ، چھپانے سے کیا فائدہ۔ پس اسی بات سے جلتے تھے سب اور پریم کو خاص طور سے چھیڑا کرتے تھے۔ ایک اور بات جو انہیں ناگوار تھی یہ تھی کہ پریم سیتا کے متعلق گفتگو میں کبھی اپنا حصہ ادا نہیں کرتا تھا۔ وہ صرف سنتا تھا۔ گویا باقی سب کے خرچ پر لطف لیتا ہو۔ ایک حمام میں صرف وہ ننگا کیوں نہیں ہے، یہ بات انہیں بری لگتی تھی۔

شام کو اتفاقاً سب دیوندر کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ ہر شخص کو یہ امید تھی کہ باقی سب وہاں ہوں گے، ہر ایک یہی دیکھنے کیلئے آیا تھا کہ دوسرے دوست وہاں ہوئے تو محفل گرم ہو گی۔ پرکاش سب سے پہلا آدمی تھا جب وہ آیا تو اور کوئی موجود نہ تھا، لیکن وہ اس خیال سے کہ اب آیا ہے تو تھوڑی دیر گپ ہی رہے دیوندر سے باتیں کرنے بیٹھ گیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اور سب بھی آگئے۔ اوم مہندر اور پریم، پریم سب سے بعد میں آیا تھا۔

"سب کے سب یہاں بیٹھے ہو؟" اُس نے آتے ہی کہا۔ "بڑی دیر تک میں تراہے پر انتظار کرتا رہا کہ کوئی آئے۔"

لیکن کوئی نہیں آیا تھا اور اب اس خیال سے کہ سب دیوندر کے ہاں پہنچے وہ بھی یہیں چلا آیا تھا۔ طے ہوا کہ آج آخری پارٹی کی جائے اور چائے حسب معمول اندر بنے۔ دیوندر کو کوئی اعتراض نہ تھا، ہو بھی کیا سکتا تھا۔

چائے اندر ہی بنی اور اس دوران میں باتیں ہوتی رہیں اور   اور فقرے اور

قہقہے بلند آواز میں، جو اندر تک سنائی دیتے تھے۔ دیوندر کے کمرے میں بیٹھ کر یہ لوگ خواہ مخواہ اونچی آواز میں بولتے تھے، بلند قہقہے لگاتے تھے۔ ایکبار ماسٹر صاحب نے دیوندر سے کہا بھی تھا کہ یہ لوگ اتنی زور سے کیوں ہنستے ہیں۔ چند روز تک قہقہے مدھم رہے تھے، لیکن پھر آہستہ آہستہ بلندی کی اسی سطح پر آ گئے تھے۔ ماسٹر صاحب نے دوبارہ تاکید نہیں کی اور قہقہے جاری رہے تھے۔

آج بھی یونہی مذاق ہوتا رہا۔ چائے آنے پر شور ہوا کہ شکر کم ہے۔ شکر کم تھی، اوم نے اپنی طرف سے مذاق کرتے ہوئے بولا کہ شاید شکر کی بجائے چائے میں آٹا پڑ گیا ہے۔ پرکاش نے بھی اپنی دماغی بساط کے مطابق کچھ کہا، لیکن پریم آج پھر حد سے آگے بڑھ گیا۔ چائے کا پیالہ لیکر وہ اندر چلا گیا۔ کہنے لگا، ماتجی آج تو آخری بار پی رہے ہیں چائے، پھیکی تو نہ پلایئے اور سیتا، بھئی یہ چلتے چلتے پھیکی چائے کا کیا مذاق ہے۔

باقی سب کو پریم کے اس فعل پر دل ہی دل میں بہت غصہ آیا۔ پریم اکثر ایسا ہی کرتا تھا۔ بظاہر اُسے سیتا سے ایسی کوئی دلچسپی نہ تھی اس لئے وہ بات کرنے میں نہ جھجکتا تھا اور اکثر بے تکلفی سے کچھ کہہ ڈالتا تھا۔ پرکاش، اوم اور ہندر، سب اسے اسکی مکاری پر محمول کرتے تھے اور دل ہی دل میں کڑھ کر رہ جاتے تھے یا کبھی کہہ بھی ڈالتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جہاں پریم کو موقع ملا، وہ سیتا سے باتیں کرنے لگتا تھا، اس کا امتحان کب ہوگا، امید ہے وہ فیل ہو جائیگی، اس کی ساڑھی کا رنگ بالکل دیہاتی ہے۔

سیتا جواب دے دیتی تھی۔ قدرتی بات ہے، وہ سوچتے تھے، جواب دینے کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے۔ لیکن پریم پر غصہ آتا تھا۔ اگر کبھی سیتا اس سے کہہ دیتی کہ آپ کیوں بکواس کرتے ہیں۔ میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتی تو انہیں حقیقی خوشی ہوتی، لیکن سیتا نے کبھی انہیں اس طرح خوش نہیں کیا۔ خود وہ تینوں سیتا سے بات کرنے سے جھجکتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ وہ سیتا سے شرماتے تھے، اس لئے بھی نہیں کہ انہیں سیتا سے

جواب کی اُمید نہ تھی۔ حقیقت میں وہ اپنے جذبات کے اظہار سے ڈرتے تھے۔ کوشل تو دیوندر کے کمرے میں بھی بہت کم آتا تھا۔ اس وقت بھی نہ آیا تھا۔ وہ ویسے ہی جذباتی طبیعت کا نوجوان تھا۔ لیکن جب سے اُسے ملازمت کرنی پڑی تھی، وہ بہت ہی خاموش ہو گیا تھا۔ ایک عجیب سا احساس کمتری اس میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ چند مہینے پہلے وہ بھی دیوندر کے کمرے میں قہقہوں میں شریک ہوتا تھا، لیکن ملازمت کے بعد اس نے آنا بہت کم کر دیا تھا۔ شاذ ہی کبھی آتا تھا، صرف کوشل کے معاملے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسے سیتا سے واقعی محبت ہے۔ خود وہ سیتا پر مرتے تھے!

چائے وغیرہ کے بعد جب محفل برخاست ہوئی تو باہر آنے پر پتہ لگا کہ کوشل بیمار ہو گیا ہے ایسی شدید قسم کا دردِ سر جس کی وجہ سے وہ دفتر سے جلدی آ گیا تھا۔

کل سیتا چلی جائے گی۔

دیوندر کے کمرے میں یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ ہو سکا تو وہ اُسے اسٹیشن پر چھوڑنے جائیں گے پرکاش اور پریم کو بالکل فرصت نہ تھی۔ مہندر نے "ہو سکا" یونہی کہہ دیا تھا۔ وہ یہ ظاہر کرنا نہ چاہتا تھا کہ اُسے اسٹیشن پر ساتھ جانے کا بہت اشتیاق ہے۔ اس فیصلے کے بعد وہ منتشر ہو گئے تھے۔ ہر ایک دل میں یہی خواہش لے چلا تھا کہ کل اسٹیشن پر وہ اکیلا ہو۔

لیکن کسی کی خواہش پوری نہ ہوئی۔ اگلے دن شام کو سب اسٹیشن پر جمع ہو گئے دیوندر سے نجانے پھر کب ملاقات ہو! صرف کوشل نہیں آیا تھا۔ سب کو اپنے طور پر اس بات پر تعجب تھا، وہ چاہتا تو آ سکتا تھا۔ دفتر چھ بجے بند ہو جاتا تھا اور گاڑی آٹھ بجے جاتی تھی لیکن کوشل نہیں آیا اور گاڑی آٹھ بجے چلی گئی۔

سیتا چلی گئی

وہ اسٹیشن پر سیتا کو چھوڑنے گئے تھے لیکن تمام وقت دیوندر کے ساتھ گزر گیا پلیٹ فارم پر اِدھر سے اُدھر گھومتے ہوئے۔ وہ چاہتے تو سیتا کے آس پاس رہ سکتے تھے

وہ یہ چاہتے بھی تھے۔ لیکن اس کے ارد گرد منڈلانا بے ڈھنگا سا لگتا تھا۔ اور یونہی پلیٹ فارم پر گھومتے ہوئے آٹھ بج گئے۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ سیتا کے پاس رہنے سے ماتھر صاحب کو شبہ ہو جائے! ان آخری لمحوں میں بھی انہیں اس بات کا ڈر تھا۔ اور وہ ڈرتے رہے اور وقت گزرتا گیا اور آٹھ بج گئے۔ گاڑی کی روانگی سے چند لمحے پہلے وہ کمپارٹمنٹ کے سامنے آ گئے تھے۔ اور چند لمحے دیوندر سے باتیں کرتے ہوئے گزر گئے۔ پھر گاڑی نے سیٹی دی۔ گاڑی جا رہی تھی، سیتا جا رہی تھی۔ گاڑی چلنے لگی۔ انہوں نے دیوندر سے ہاتھ ملایا۔ ماتھر صاحب سے آداب عرض کا تبادلہ کیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی تھی، صرف پریم نے سیتا کو نمستے کی، پھر سب نے۔ سیتا نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے۔ اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور ایک اداسی کا سایہ۔ جیسے وہ ان سب کے لئے اداس ہو۔ ان سب کیلئے اس کے دل میں افسوس ہو۔ جیسے وہ جانتی ہو کہ وہ انہیں چھوڑ کر جا رہی ہے۔

گاڑی آگے چلی گئی تھی۔ وہ دیکھتے رہے۔ دیوندر کھڑکی سے رومال ہلا رہا تھا، انہوں نے جواب میں ہاتھ اور رومال ہلائے اور گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ کر انہیں اکیلا چھوڑ گئی۔ اور دلوں کے طول و عرض میں ایک خلا پھیل گئی، سناٹا، ویرانی۔

سیتا چلی گئی تھی۔ خلا سے پر کئی لمحوں کے بعد اوم نے لمبا سانس لیکر اپنے مخصوص انداز میں کہا، ہائے سیتا!

اسٹیشن سے واپس آ کر چند منٹ کے لئے وہ تراہے پر رک گئے۔ تراہے پر آج اندھیرا سا تھا، صرف حلوائی کی دکان پر بتی جل رہی تھی، لیمپ پوسٹ کا بلب جو کل سے سنبھالے لے رہا تھا، خراب ہو گیا تھا اور روشن نہ تھا۔

کچھ دیر تک وہ باتیں کرتے رہے۔ کوشل کا درد سر بخار ہو گیا تھا، بیچارہ کوشل، پریم نے رقیبانہ ہمدردی سے کہا۔ وہ تو مر جائے گا بیچارہ۔ پھر چند لمحے کیلئے کوشل کی بات چلی۔ لیکن آج بات کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دل کی ویرانی تنہائی

جاہتی تھی ۔ حلوائی نے اپنی دکان کی بتی بجھا دی تھی اور ترا ہے پر اندھیرا ہوگیا تھا ۔ طبیعت بجھ گئی تھی اور تنہائی چاہتی تھی ۔ ایک ایک کرکے وہ منتشر ہو گئے ۔ ترا ہے کا لیمپ پوسٹ اکیلا رہ گیا ۔ بتی بجھ گئی تھی اور خلا اندھیرے سے بھر گئی تھی ! +

قطعہ

سینۂ تیرہ شب کی ظلمت ہم
ہم طلوعِ ضو سے بدل جاتی
جب کبھی صبح و رد کی آس پنہاں ہیں
قالبِ اشک میں ڈھل جاتی ہم

سید جابر علی سیالکوٹی

اُجالے سے پہلے " اندھیرا ہے " اور اس اندھیرے میں لوگ
" بھوکے پیاسے " ہیں

اُجالے سے پہلے

مدھوسودن کے منتخب افسانوں کا مجموعہ

مدھوسودن افسانہ نگاری کی دنیا میں نسبتاً نئے ہیں لیکن انکی پختہ فن کاری اس مجموعہ کو اس دور کا ایک نمائندہ مجموعہ بناتی ہے

اردو محل ، حیدرآباد دکن

عبدالقادر سروری

سید احتشام حسین

خورشید الاسلام

"دیکھ دامِ سراب کا عالم"

عشرتِ بے حساب کا عالم ۔ صبحِ غم اور شامِ تنہائی
اب کہاں ضبطِ شوق کی دنیا ۔ اب کہاں طاقتِ شکیبائی
اب کہاں وہ ہوائے جامہ دری ۔ اب کہاں شیوہ ہائے برنائی
ساغرِ گل نہ وہ لبِ لعلیں ۔ وہ خلش اور نہ وہ دل آسائی ۔
لذتیں ہیں نہ لذتوں کا خمار ۔ تشنگی ہے نہ بادہ پیمائی
یاں کسے ہے دماغِ لالہ و گل   بس کر اے ذوقِ عالم آرائی

ہو چکی آرزو کی بے تابی ۔ دیکھ لی زندگی کی پہنائی
ہے کرم یہ کہ نازشِ بیجا   "چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی"
رقصِ پاکوب ہے، نہ بیش نہ کم   گردشِ جام و چرخِ مینائی
مژدۂ گل، پہ ہے وہی شبنم   داغِ لالہ میں ہے جو رعنائی

عاشقی کیا، تلاشِ آوارہ ۔ منزلیں کیا، غبارِ صحرائی
برتر از ہر قیاس و وہم و گماں   خوب ہے آپ کی شناسائی

کیا خبر کیا خبر کی پردہ دری　　کیا نظر کیا نظر کی سلمائی

دیکھ دامِ سراب کا عالم　　دیکھ ساقی کی نازفرمائی
اس کو کہتے ہیں شانِ محجوبی　—　اس کو کہتے ہیں کاکُل آرائی
کیوں لبوں تک یہ حرفِ راز آیا　　کیوں زباں تک یہ داستاں آئی
موج نے کیوں خرام فرمایا　　کیوں حبابوں کی آنکھ بھر آئی
رات کیوں موجِ رنگ اِٹھلا کر　　اپنے سایہ سے آپ شرمائی
ماہ و پرویں کو گود میں لے کر　　کس لئے شب نے زلف بکھرائی
کیوں ہے یہ رسم و راہ میخانہ　　کس لئے ہے جہاں کی سقّائی
شادمانی ہے کیوں رمِ آہو　　کس لئے ہے غموں میں گیرائی
بے نشاں، بے مراد، بے تنویر　　خضر نے خاک سے زندگی پائی

نہ کیا التفات پر نہ کیا　　دور پہونچی ہے اپنی رسوائی
نُور کی سرفرازیاں نہ گئیں　　خاک مجبوریوں سے شرمائی
ہوا جاتا ہے آئینہ پانی　　یہ قیامت ہے باخود آرائی
ظلمتوں کے چراغ جلتے ہیں　　آسمانوں سے کیا خبر آئی
زحمتِ یک نفس گوارا ہو　　کب سے خاموش ہے یہ تنہائی

- عبدالقادر سروری

مولانا ظفر علی خاں اور ان کی شاعری

مولانا ظفر علیخان، جن کی جری صحافتی اور سیاسی خدمات کی شہرت نے، انکی شہرتِ شاعری کو پس منظر میں ڈال دیا ہے۔ حقیقت میں ایک نمایاں انفرادی مسلک کے شاعر ہیں۔ لیکن انکی شاعری وہ شاعری نہیں ہے، جو مشاعرے کی زینت یا وقت گذاری کا ذریعہ ہو۔ بلکہ انہوں نے شاعری کو ہمیشہ اپنے سیاسی مسلک کے معاون کے طور پر استعمال کیا۔ اسی لئے انکی شاعری، ان کے مذہبی جوش اور ان کے سیاسی عقائد کی بڑی حد تک ترجمان ہے۔ ”شعر کے پردے میں“ اور بعض وقت شعر کی بے پردگی میں“ غرض وہ ہر طرح اپنا رازِ دل سناتے ہیں اور ان کا مقصد بھی اقبال کی طرح شعر کے اثر، شعر کے اعجاز سے سونے والوں کو جگانا ہوتا ہے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اقبال سے زیادہ متنوع اسالیب سے کام لے سکتے ہیں۔ کبھی تو وہ راست ناصحانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں اور کبھی حالی کی طرح، قوم کو اسلاف کی عظمت اور اس کے کارنامے یاد دلا کر، اس کی ڈوبتی ہمتوں کو سہارا دیتے ہیں۔ لیکن جب ان ترغیبوں سے کام چلتا نظر نہیں آتا، تو پھر ان کے پاس ایک اور ہتھیار ہے، ایک بے پناہ حربہ۔ یہ حربہ طنز اور مزاح کے زہر میں بجھے ہوئے تیر ہیں، جن کو چلانے میں وہ نہایت چابک دست ہیں۔ غرض ہر پہلو سے ان کا خلوص وہ کام کر جاتا ہے، جو بعض وقت شاعری نہیں کر سکتی۔

مولانا ظفر علی خاں کی طباعی کو اردو کے کم شاعر پہنچ سکتے ہیں، اور جو شاعر حقیقت میں طباع کہلا سکتے ہیں، وہ انکی مخصوص ذہانت اور انفرادی فطرت

سے محروم ہیں۔ ان کا اشہب قلم مشکل سے مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں بھی بلا مہمیز اڑا چلا جاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انکی روانی طبع کے سامنے کوئی رکاوٹ سدراہ نہیں بن سکتی اور ہر موضوع ان کے لئے پیش پا افتادہ ہے۔ سیاست مولانا کا مخصوص موضوع ہے. لیکن یہ کوئی آخری حد نہیں، بلکہ انکی فکری دنیا سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ اسلامی تاریخ، اخلاق و فلسفے کے نکات، ہندوستان کی سیاست و معاشرت، ہندو تاریخ اور دیو مالا سے لے کر شہنشاہ ہندوستان کی مدح، ادبی لطائف اور ظرائف تک، ہر چیز ان کے قلم کی زد میں ہے۔

موضوعات کے اس وسیع تنوع کے ساتھ ساتھ اسالیب اور لفظیات کا تنوع بھی جاذب نظر ہے. موضوع اور موقع و محل کے اعتبار سے، وہ الفاظ کو کہاں کہاں سے لاکر بٹھاتے ہیں کہ اجنبیت کے باوجود مصرعے میں وہ نگینے کی طرح جڑ جاتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کی بھی یہ ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ لیکن اکبر بعض وقت لفظ گھڑتے تھے، اور جو لفظ اجنبی لاکر بٹھاتے تھے. ان سے محض مزاح کی افزائش مقصود ہوتی تھی۔ ظفر علیخان کی لفظیات کا خزانہ بے حد وسیع ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہند، حجاز اور فارس کے لفظی خزانے اور اس سے بھی پرے "کوہ قاف" کے پرے کے پرے جمائے ان کے تخیل کے آگے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں" نصیب اس کے کہ جس کو نوازشکار کریں"۔ مثال کے لئے ان کی نظم "حجت اسلام کا اتمام" دیکھئے۔ اس کے الفاظ، الفاظ کی بندش، بندش کی چستی اور خاص طور پہ، ان کے قافیئے ملاحظہ ہوں، جو مولانا کے ذہن کی سریع السیری کا ثبوت ہیں۔

آدم کی نسل پر ہوئی حجت خدا کی ختم ۔۔۔ دنیا میں آج دین کی تکمیل ہوگئی
پیشینوں کی سلک میں دولت تھی جس قدر ۔۔۔ اسلام کے خزانے میں تحویل ہوگئی
آفاق اعتدال کے سانچے میں ڈھل گیا ۔۔۔ ارکان کائنات کی تعدیل ہوگئی

اصحاب فیل ارض حرم سے ہوئے فرار ہر کنکری حجارۂ سجیل ہوگئی
نقشہ زمین کا چشم زدن میں بدل گیا اور ہیئت آسمان کی تبدیل ہوگئی
مرزائیوں کا نام ذرا دیر سے مٹا حق کے جلال سے یہی اک ڈھیل ہوگئی

یا ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں :-

جلوہ گہ بیاس کو لگ گئے چار چار چاند بھیج رہا ہے قادیاں ماہ وشوں کی ٹولیاں
دل زدگان بے بصر جن سے لگا رہے ہیں دل حور کی بچیاں نہیں، سانپ کی ہیں سپنولیاں
آپ کو کچھ خبر بھی ہے کون ہیں یہ گورنیں دیکھنے کو ہیں رس بھری، چکھنے میں ہیں نبولیاں

حلقہ گردن نیاز بن گئے گیسوئے دراز قطع ہوا ہے سلسلہ شرع کے پاہنگ کا

جھنڈے کو حریم جاں میں جلا جھنڈے کو کلیساؤں پہ اڑا
ڈنڈے کو بتوں کے سر پہ گھما پھر ساری دنیا تیری ہے

پھول پر بھونرے کی گونج، ابر پہ بادل کی جھلک
سازِ قدرت کے یہ سُر ہیں ایک پنچم اک کھرج

مولانا ظفر علیخاں، اکبر اور اقبال کے معاصر ہیں۔ ماحول کے بہت سے مضامین ایسے ہیں، جن پر ہر ایک نے طبع آزمائی کی ہے، مثال کے لئے مولانا کی نظمیں "ایک بیرسٹر کی آپ بیتی" "لندنی معشوقہ اور دہلوی عاشق" میں اکبر کا انداز تنقید اور مزاح دونوں ملتے ہیں، لیکن یہ نہ تو اکبر کی تقلید ہے اور نہ تاثیر، بلکہ مضمون جگہ جگہ مشترک ہے۔ "مضحکہ خیز موضوع کیلئے مضحکہ خیز اسلوب ہی موزوں

ہوتے ہیں"۔ اس طرح اکبر اور ظفر علیخاں کا انداز بعض وقت ملجاتا ہے۔ لیکن اکبر میں اور ان میں فرق یہ ہے کہ اکبر کی۔ اح عموماً قہقہہ ریز ہوتی ہے۔ اور ظفر علیخاں کی مزاح ایک دبی ہوئی چنگاری ہے جو رہ رہ کر بھڑکتی ہے۔ اس لئے وہ محض تبسم زا ہوتی ہے۔ یہ بھی مولانا کی طباعی کا ایک ثبوت ہے کہ جس طرح وہ اکبر کے رنگ میں بند نہیں ہیں، اقبال کے مخصوص انداز میں بھی قاصر نہیں ہیں۔ چنانچہ مولانا کی نظمیں "یورپ کا بین الاقوامی قانون"، "عقل جنوں خیز" اور "تہذیب نو کا بت خانہ" پڑھئے تو بادی النظر میں ایسا معلوم ہوگا کہ یہ اقبال کی کسی نظم کے پارے ہیں۔ لیکن جس طرح اکبر کے مقابلے میں، ظفر علیخاں کا انداز ممیز ہے۔ اقبال کی طرز فکر اور مولانا کی طرز فکر میں بھی بین فرق ہے اقبال گہرائی کی طرف مائل ہیں اور مولانا کے انداز میں روانی بلا کی ہے۔ دونوں کی ہم موضوع نظموں کے بالمقابل مطالعہ سے یہ فرق بخوبی ظاہر ہو سکے گا۔

مولانا ظفر علیخاں، ان وسیع نظر اہل فکر میں سے ہیں، جو اردو زبان کی وسعت پذیری کے مدنظر، اس کے چلن پر، کسی مقام کا ٹھپہ لگانا، اس کے وجود کے لئے خطرناک سمجھتے ہیں۔ مولانا وحید الدین سلیم کی طرح وہ بھی اردو کو ہندوستان بھر کی زبان دیکھنا چاہتے ہیں اور ہر گوشے میں اس کے پھولنے پھلنے کے متمنی ہیں مولانا حالی۔ مولانا سلیم اور دوسرے سچے بہی خواہان اردو کی طرح وہ بھی ان کوتاہ بین، نام نہاد ہمدردان زبان سے جز بز ہیں جو زبان کو اپنی خانگی ملک کی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

۱۹۱۲ء میں، شفیق عماد پوری کی ایک نظم کا جواب دیتے ہوئے، ہیں، دہلی کی زبان سے عصبیت اور لکھنؤ سے تعصب مترشح ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں

ہم کو نہیں ہے ایسے عقیدے سے اتفاق ٭ ہم اس کی ایسی ہاں میں ملا سکتے ہاں نہ

دہلی و لکھنؤ پہ نہیں حصر شاعری ؛ وہ خطہ کونسا ہے، یہ دولت جہاں نہیں

مولانا ظفر علیخاں فطرتاً سپاہی واقع ہوئے ہیں، کیونکہ انکی رگوں میں راجپوت خون دوڑ رہا ہے۔ وہ میدان صحافت میں ایسے ہوتے ہیں، جیسے میدان مصاف میں سربکف سپاہی۔ جس بات کو وہ حق سمجھتے ہیں، اس کے ظاہر کرنے سے کوئی چیز انہیں باز نہیں رکھ سکتی۔ اسی لئے انہیں بعض وقت سیاسی الجھنوں میں بھی پڑنا پڑا، جس کا اثر انکی نظموں سے بھی ظاہر ہے۔ تنگ نظر ملاؤں اور سیاسی معاصرین سے مولانا کی بگڑتی رہی۔ ان کی طبیعت میں جرأت کے ساتھ ساتھ، ظرافت کا مادہ بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ جب طبیعت مشتعل ہو جاتی ہے، تو اخبار کے صفحات پر معاصرین کی شان میں وہ گلفشانیاں ہوتی ہیں کہ دیکھا چاہیئے۔

مذہب اسلام کے خلاف فساد پھیلانے والوں کے بارے میں ان کا لب ولہجہ سخت اور ان کے طنز میں تندی اور تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس اشتعال میں بھی ادبی سلامت روی کی عادت کبھی انہیں جادۂ اعتدال سے تجاوز کرنے نہیں دیتی، مولانا کی طبیعت کی اسی افتاد کا نتیجہ ہے کہ اردو میں بعض عمدہ ہجویں یادگار رہ جائیں گی۔

انقلابی تصورات کی چنگاریاں، جو چند سال بعد، انگارے اور شعلے بن کر چمکیں، وہ سب سے پہلے، مولانا ظفر علیخاں کی شاعری میں دبی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے ایک نظم "انقلاب اے انقلاب" کے عنوان سے لکھی تھی، جس کے چند شعر ہیں:۔

آ رہی ہے باغ گیتی میں بہار انقلاب ؛ کھب گیا آنکھوں میں رنگ لالہ زار انقلاب
قالب مشرق میں پھونکی جا رہی ہے روح نو ؛ نغمہ ہائے قم سے ہے معمور تار انقلاب
جان اتحاد کھینچی جا رہی ہے ہند میں ؛ کس بلا کا روح فرسا ہے فشار انقلاب

نوجوان شعرا کا وہ گروہ، جو بعد میں اشتراکی تصورات کے زیر اثر زیادہ سے زیادہ آتا گیا، اس کی بڑی ہمت افزائی، اقبال، مولانا ظفر علیخاں اور جوش جیسے کہنہ مشق اساتذہ کے ابتدائی رجحانات سے ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں مولانا نے "روٹی روٹی روٹی" کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی، جس کے چند شعر یہ ہیں:۔

آپہنچا لاہور میں روس   شملے کی چھاتی کا کابوس
ہیں یہی لینن کے درباں   پیٹ کے بھوکے آ پہنچے
آپہنچے بھئی آ پہنچے   پیٹ کے بھوکے آ پہنچے

اسی زمانے میں لکھی ہوئی چند نظمیں "الکاسب حبیب اللہ" جو در اصل سرمایہ اور محنت کا عمدہ مناظرہ ہے، اور "دعوت و ارشاد" وغیرہ بھی ہیں۔ جن میں اشتراکی اور انقلابی رجحانات ملتے ہیں۔ یہ انقلاب پسند دیتاں کی بہترین شاعری کا نمونہ کہلا سکتی۔ ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

"سرمایہ نے محنت سے یہ کہا اس شور و شغب سے کان نہ کھا
تو کچھ بھی کرے ہوتا ہے وہی، جو ہم نے جی میں بچارا ہے۔
تیرے لئے ہے خون ناب جگر اور میرے لئے ہے لقمہ تر
تقدیر کی انگلی اٹھ اٹھ کرتی یہی روز اشارا ہے
سرمایہ نے یوں جب ڈوں کی لی محنت نے چمک کر اس سے کہا
اس وقت تو بے شک گردش میں، ہم فاقہ کشوں کا ستارا ہے
جس ڈھلتی پھرتی چھاؤں کو تو اپنا ہی اجارا سمجھا ہے،
آج اس پر اگر قبضہ ہے ترا کل دعویٰ اس پر ہمارا ہے
اسلام نے جب یہ بحث سنی سرمایہ کو ڈانٹا اور کہا
لٹے گا وہ اک دن ٹھاٹ ترا مزدور خدا کا پیارا ہے

مولانا ظفر علیخاں کا اشتراکیت کی طرف رجحان، دراصل ان کی جنگِ آزادی کے بہت سے حربوں میں سے ایک حربہ ہے، لیکن ان کے اشتراکی رجحان کو، بعد کے دور کے رجحان سے کوئی مناسبت نہیں، وہ خود اپنے مذہب کو سب سے زیادہ موثر اشتراکیت پسند سمجھتے ہیں جیسا کہ اوپر کے اقتباس میں آخری شعر سے واضح ہوگا۔

مولانا ظفر علی خاں کی شاعری بہ حیثیت مجموعی، ان کی سیاسی کش مکش کی تاریخ ہے، سیاست شاعری کیلئے بہت دلچسپ موضوع تو نہیں ہے۔ لیکن ان کے اندازِ بیان کی دلکشیوں نے اسے کافی دلچسپ بنا دیا ہے۔ سیاست، مولانا ظفر علیخاں کی زندگی کا لاینفک جزو ہے۔ اور جنگِ آزادی میں انکی سرفروشانہ مساعی، ان کی زندگی کا اہم ترین کارنامہ ہے، اس لحاظ سے انکی شاعری، انکی زندگی سے ہمیشہ قریب رہتی ہے۔

لیکن مولانا کی شاعری میں سب کچھ سیاست ہی نہیں ہے، وہ جتنے اچھے سیاسی شاعر اور سماجی نقاد ہیں اس سے کہیں زیادہ دلکش منظر نگار ہیں۔ مناظر کے مرقع، ان کے کلام میں بہت زیادہ نہیں ہیں، لیکن چند نظمیں، جیسے "وادیٔ جہلم" "از میمونا بہ مانڈلے" وغیرہ، منظر نگاری کے نفیس مرقعے ہیں۔ عاشقانہ رنگ میں بھی انکی چند نظمیں نہایت بلند پایہ ہیں۔ ان کا دلکش اندازِ بیان، تشبیہوں کی ندرت، استعارے اور کنائے، مرصع اور متوازن ترکیبیں، ایسی خصوصیات ہیں، جو مخصوص غنائی نظمیں لکھنے والے شعرا کے پاس بھی کم ملینگی۔ "اطالوی حسینہ" کے عنوان سے جو نظم انہوں نے لکھی ہے، اس میں سراپا کی خوبی، اس نوع کے بہترین پاردں سے ٹکر کھاتی ہے۔ اس نظم کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

پیغمبرِ جمال تری دلربا ادا   پروردگارِ عشق ترا چلبلا چلن

الجھے ہوئے ہیں دل تری زلفِ سیاہ میں   ہیں جیسے ایک تار سے وابستہ سوختن
پروردۂ فسوں ہے تری آنکھ کا خمار   آوردۂ جنوں ہے تری بوئے پیرہن
پیمانۂ نشاط تری ساق صندلی   پیمانۂ سرور ترا مرمری بدن
رونق ہے ہوٹلوں کی ترا حسن بے حجاب   جس پر فدا ہے شیخ تو لٹو ہے برہمن
جب قادیاں پہ تیری تجلی نظر پڑی   سب نشۂ نبوتِ ظلی ہوا ہرن

سب سے آخری مگر سب سے اہم پہلو مولانا کی شاعری کا نوع انسان کی محبت ہے، جو ان کے جذبات قوم پرستی اور وطن دوستی کو بھی، عام پسند تخیل کے دھارے میں بہنے نہیں دیتی۔ " مردِ مومن کی سرشت " میں فرماتے ہیں :۔

وطن کے پوچھنے والو تعلق نوع انساں کا   محبت کا سمندر ہے، تلیا ہو نہیں سکتا

آزاد نظم اور معرا نظم کی تحریکوں کا دور، بلاشبہ بعد کا دور ہے، لیکن اور خود ان کے کلام میں بھی قدیم اصناف شعر میں تبدیلی کی خواہش، نئے نئے صور شعریہ کے اختیار کرنے سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ چنانچہ شعر کی نئی نئی صورتیں اس عہد کے اکثر اساتذہ جیسے اقبال، سیماب اور مولانا ظفر علی خاں کے کلام میں راہ پانے لگی تھیں۔ اس کا اثر لازمی طور پر بعد کی نسل کے شعرا پر پڑنا چاہئے تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ راستہ کھل جانے کے بعد، نوجوان شعرا کے لئے آسانی سی ہوگئی۔

اس میں شبہ نہیں کہ مولانا ظفر علیخاں کی زندگی کا بڑا کارنامہ میدانِ سیاست میں انکی سرفروشانہ مساعی ہیں، لیکن یہ کوئی نہیں کہسکتا وہ محض اسی کام کیلئے موزوں بنا کر پیدا کئے گئے تھے۔ کیونکہ زندگی کے ابتدائی ایام میں، انہوں نے علمی اور ادبی خدمت کی طرف جو قدم اٹھایا تھا اور جس کے نمونے " معرکۂ مذہب و سائنس " " جنگل میں منگل " اور چند نظموں کے ترجمے جیسے " ندی کا گیت " باقی ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ اگر وہ سیاسی سرگرمیوں سے کٹ کر ادب اور شاعری کے لئے

وقف ہو جاتے، تو اُردو ادب میں کیا کچھ نہ کرسکتے۔ اور کس پایہ کے ادیب ہوتے! ان کے ذوقِ ادب، جدت نگاری، فکر کی انفرادیت اور یگانہ روی کا تقاضا تھا کہ وہ اس میدان میں بھی، اس بلندی پر ہوتے، جس پر آج وہ سیاست صحافت اور سیاسی ادب کے میدان میں نظر آتے ہیں ؏

سیّد جابر علی

"تضاد"

نفس فشاں ہے فضاؤں میں ایک روحِ عظیم
ہر اک ادا میں ہے جس کی مسرتوں کا پیام
اسی کی چشمِ فسوں سازی سے بخشا ہے
گلوں کو ذوقِ تبسم، صبا کو شوقِ خرام
اسی نے دی ہے خنک روشنی ستاروں کو
اسی کے فیض سے ہیں جلوہ ہائے ماہ تمام
ہر ایک پھول میں وہ رازِ زیست ہے پنہاں
بیاں سے جس کے ہے معذور آنسوؤں کی زباں

(ورڈزورتھ)

~~~~~~~~

حنائے دستِ پرافسونِ فطرتِ قاتل
حنا نہیں ہے حقیقت میں خونِ انساں ہے
بجا کہ ہے مئے فطرت سکوں نواز مگر
اسی میں تلخیٔ آلام کا بھی ساماں ہے

(ٹینی سن)
~~~~~~~~

علی عباس حسینی

"اُردو ناول نویسوں کا نیا دَور"

دورِ حاضر کے ناول نویسوں میں کچھ تو ایسے ہیں جو اپنے کو "ترقی پسند" کہتے ہیں اور کچھ ایسے جو اپنی "ناسمجھی" سے "ترقی پسندی" کو ایک طرح کا الزام سمجھ کر شرماتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں ترقی پسندی کے جراثیم موجود ہیں۔ یعنی وہ قومی اور اجتماعی المیات کو محسوس کرتے ہیں اور اسے دور کرنے اور انسانیت کو فروغ دینے کے خواہشمند ہیں۔ "کھلے بند" ترقی پسندوں میں سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، اور اپندر ناتھ اشک خاص طور سے ممتاز ہیں۔ آیئے ان عناصرِ اربعہ پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

اپندر ناتھ اشک کے ناول "ستاروں کے کھیل" میں ترقی پسندی تو کم ہے، رومانیت زیادہ۔ ہیرو کا وفورِ محبت سے توازن دماغی کھو بیٹھنا، پرانی شراب کو نئی بوتل میں پیش کرنا ہے۔ مجنوں وہی قدیم ہے، صرف اس نے بیسویں صدی کا جدید لباس پہن لیا ہے! پھر بھی یہ ناول موجودہ معاشرہ کی روایات پر کافی تیز ضرب لگاتا ہے، اور ہمیں یہ غور کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس طرح کے المیہ واقعات کے انسداد کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔

عصمت کے "ضدی" کا ہیرو پورن ایک جذباتی اور ضدّی نوجوان ہے "مصنفہ نے اس کے ضدّی بن جانے کے جو وجوہ دکھلائے ہیں۔" ان میں سب سے بڑا سبب اس مصنوعی اخلاق کی پابندی ہے جو متوسط طبقے میں شرافت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے"! اس ناول کا مجموعی اثر اصلاحی ہے۔ اور اس کا خاتمہ بالکل اس طرح کا ہے،

جو رومانوں کی خصوصیت ہے۔ پورن کی غریب دیہاتی محبوبہ اپنے عاشق کو مردہ پاکر اس کی لاش کے ساتھ ساتھ اپنے جسم کو بھی مٹی کے تیل سے تر کر لیتی ہے اور کمرہ بند کر کے اس کے ساتھ جل کر مر جاتی ہے۔ ممکن ہے غیر معمولی مزاجوں کے لوگ اسے حقیقت نگاری کہیں، ہمیں تو اس میں ایک خالص صنوعی کردار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ پروانہ و شمع کی روداد عشق روزانہ کا مشاہدہ ہے لیکن پورن کی محبوبہ کا اپنے ہاتھوں ستی ہونا نہ تو روزانہ زندگی ہے اور نہ اس سے دل پر کوئی خاص اثر پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ ایک طرح کا اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ چلو اس سمجھنے سے یہ دونوں دیوانے ہی نہیں چھوٹے بلکہ ہم بھی!

کرشن چندر کے ناول "شکست" میں بھی تانا بانا رومانی ہے، لیکن اس کے ضمن میں کشمیر کی سماجی حالت بھی آگئی ہے۔ وہاں کے نیم مردہ دیہاتیوں میں دیرینہ رسم و رواج کے خلاف بغاوت کرنے کی خواہش اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ ان میں اپنے حالات بدلنے کا احساس ہونے لگا ہے۔ کرشن چندر کے اس ناول میں بقول پروفیسر احتشام "خیال ہے، عمل ہے اور تصادم ہے۔ اس عمل اور تصادم میں زندگی عریاں و رقصاں نظر آتی ہے"۔ لیکن یہ زندگی وہی ہے جو رومانیت سے پر ہے، جس میں محبت کرنے کی آزادی نہ ملنا ہی سب سے بڑی مصیبت ہے، اور جس میں جنسی تعلقات پر سے ہر طرح کی پابندی اٹھ جانا ہی سب سے بڑی راحت ہے! کرشن چندر اپنے اس ناول میں ڈی، ایچ، لارنس سے بہت متاثر ہیں۔ اور یہی تقاضائے سن بھی ہے!۔

سجاد ظہیر کا ناول "لندن میں ایک رات" کوئی پولتاریہ ناول نہیں۔ یہ ناول ۳۹ء میں سجاد ظہیر نے اس وقت لکھا ہے جب وہ انگلستان و فرانس میں اشتمالی مصنفین کے دوش بدوش کام کر رہے تھے۔ اس کے کردار خوش حال

گھرانوں کے ایسے نوجوان ہیں، جو انگلستان میں تعلیمی مقاصد کے زیرِ نظر اکٹھا ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک ذاتی رائے رکھتا ہے۔ نعیم الدین ایک ہی بے فکرا ہے۔ بس ناول پڑھتا ہے، سگریٹ پیتا ہے اور لونڈیوں کو گھورتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے۔ اعظم جبین کی محبت میں سرشار ہے۔ اسے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں۔ راؤ نہایت ذہین ہے لائق ہے، سمجھدار ہے لیکن پھر بھی وہ اشتمالیت کا قائل نہیں ہے۔ عارف انگریزی حکومت میں ایک بڑی اسامی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ احسان مارکسی ہے۔ وہ محنت کش طبقے کا حامی ہے اور اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ تعلیم یافتہ گروہ کو پولتاریہ میں مدغم کرا دے۔ کریمہ بیگم انگریزی خواتین کی آزادی میں ریس کرنے سے ڈرتی ہیں، لیکن دل کی تہوں میں یہی چھپی ہوئی خواہش ان میں ایک جلن اور ڈاہ سی پیدا کر دیتی ہے۔ یہ سب کردار زندہ ہیں۔ ان کی آپس کی گفتگو، ان کی بحث کے موضوع، اور ان کی ذہنی و جذباتی کش مکش وہی ہے۔ جو ہندوستان کے پڑھے لکھے متوسط طبقے میں پائی جاتی ہے۔ سجاد ظہیر نے یہ ناولچہ جیمس جوائس کا یولیسس دیکھنے کے بعد لکھا ہے۔ وہاں ڈبلن کا ایک دن تھا، یہاں لندن کی ایک رات۔ وہ تحت الشعور کی "انسائیکلو پیڈیا" ہے، "یہ جیمس ڈکشنری"۔ پھر بھی اس چھوٹے سے ناول میں نفسیاتی تحلیل اچھی پیش کی گئی ہے، اور اشتمالیت کا پروپیگنڈا فن کارانہ طور پر کیا گیا ہے۔ سجاد ظہیر فطری طور پر ایک آرٹسٹ کا دل و دماغ لائے تھے۔ اگر سیاست نے انہیں ادب سے چھین نہ لیا ہوتا تو وہ ہندوستان کے گورکی بن سکتے تھے۔

دوسرے ناول نگار :-

ان ترقی پسندوں کے علاوہ کچھ دوسرے ناول نگارو
نے بھی چھوٹے بڑے ناول لکھے ہیں۔ ان میں قیسی رامپو
عزیز احمد، رشید اختر ندوی، فضل حق قریشی، اشرف صبوحی، صادق الخیری،

انصار ناصری، ظفر قریشی اور نجم الدین شکیب خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں۔

قیسی رامپوری خاصے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ وہ انگریز ناول نگار ہال کین سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ان کے ہاں ایک خاص قسم کی روحانی رومانیت ہے۔ وہ کردار و معاشرہ کے بیان سے زیادہ پلاٹ پر زور دیتے ہیں۔ انکی تصانیف بکثرت زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہیں۔ وہ ریلوے انسپکٹر کے فرائض انجام دینے کے سلسلے میں چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر مارے مارے پھرتے ہیں، مگر بقول خود "لکھنے کا بخار وہاں بھی تیز ہی ہوتا" انہوں نے سب سے پہلا ناول سنہ ۳۹ء میں لکھا اور اس چھ برس کے عرصے میں ایک درجن سے زیادہ ناول لکھ چکے ہیں۔ ان میں سے "چوراہا" تو آزاد ترجمہ ہے، لیکن "آخری فیصلہ"، "دل کی آواز"، تسلیم، نکہت، دھوپ، سزا، دوشیشے، خطا، خیانت، گردپوش، برہنہ اور اپاہج طبع زاد ہیں:

قیسی صاحب نہ تو سیاست میں الجھنا چاہتے ہیں۔ اور نہ طبقاتی کشمکش کا صراحت کے ساتھ تذکرہ کرتے ہیں۔ پھر بھی وہ ایک تندرست قسم کی ترقی پسندی کے قائل ہیں۔ اور وہ اسے کسی "ہیئت" کی کنیز خاص نہیں سمجھتے۔ ان کے ذہن میں جو اس نظریہ کا مفہوم ہے، اُسے انہوں نے دھوپ، خطا، سزا، خیانت، گردپوش، برہنہ اور اپاہج میں بہت اچھی طرح واضح کیا ہے۔

آخرالذکر ناول اس لحاظ سے بھی قابل مطالعہ ہے کہ اسکے ذریعہ کشوری نام ایک سیرت کا ہمارے ادب میں اضافہ کیا گیا ہے۔

ہماری سب سے پہلی ملاقات جب اس کردار سے ہوتی ہے تو وہ اس صورت سے "ایک لڑکا شکل سے گیارہ بارہ سال کا، مریل، گندہ اور جان سے بیزار ..... بسورتا ہوا سسکیاں لیتا ہوا، گرد اور [illegible] ہوا۔ اس کا سر لاتوں اور گھونسوں کی مار سے چکرا رہا تھا۔ آنکھیں رونے سے قبل ہی رویا کرتی تھیں اور

آنسوؤں کی تیزابیت نے آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ڈالدیئے تھے۔ جنکو فاقوں اور رات دن کی مار نے اور گہرا کر دیا تھا۔ لیکن آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی ان مری آنکھوں میں فتح کی ایک بجھی ہوئی سی چمک تھی کیونکہ اس کی جیب میں چرائی ہوئی وہ چیز اب بھی موجود تھی جسکی وجہ سے وہ ابھی پٹا تھا"۔

یہ لاوارث لڑکا نندی اور بدری کی بیدردی کا شکار تھا، لیکن وہ لوہے اور ٹین کے ٹکڑے چرا چرا کر مختلف قسم کے بھدّے کھلونے اور مشینیں بناتا تھا۔ اس نے اپنا یہ خزانہ ایک ریلوے پل کے نیچے جمع کر رکھا تھا۔ مگر بدری شکاری کتّے کی طرح سونگھتا وہاں بھی پہنچ گیا۔ اس کے بعد کے واقعات اسی کی زبانی سنئے۔

بیان بہت مختصر ہے۔ مگر اختصار میں ہزاروں نشتر پوشیدہ ہیں۔

" اس نے مجھے اتنا مارا کہ میں زندگی سے بیزار ہو گیا۔ دریا میں جا کودا۔ مگر پولس والے نے نکال لیا۔ بہت دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ دور کے رشتے کی میری ایک بہن بہت دور پنجاب میں رہتی ہے۔ میں اس کے پاس چلا گیا جب ذرا بڑا ہوا تو ایک روز چپکے سے مکان سے نکل کھڑا ہوا۔ بمبئی پہونچا اور ایک جہاز پر کوئلے اٹھانے پر نوکر ہو کر جاپان چلا گیا۔ کئی سال وہاں رہا۔ پھر ترکی جا پہونچا۔ اور وہاں سے انسانوں کو اچھا کرنا سیکھ کر آیا۔"

بمبئی میں جب اس نے مطب کھولا تو سارے بڑے ڈاکٹروں نے اس کی مخالفت کی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ کسی میڈیکل کالج کا سند یافتہ نہ تھا، پھر غریب بھی تھا۔ اس مخالفت نے اس کے مزاج میں حد درجہ خشونت، تلخی اور خود پنداری بڑھادی۔

بالآخر اس نے وہاں کے سب سے بڑے ڈاکٹر سر جوشی، کی حسین مگر اپاہج لڑکی کو، جسے سارے ڈاکٹروں نے ناقابل علاج بتایا تھا، اچھا کر کے اپنے سارے حریفوں کو جیت لیا۔ سر جوشی تو اپنی اس شکست پر اس قدر مسرور ہوئے کہ انہوں

نے اپنی اس لڑکی ارملا کو بطور انعام کے کشوری کے سامنے پیش کر دیا۔ لیکن اپنے فن کے عاشق کشوری نے باوجود ارملا سے افراط محبت کے اس انعام سے انکار کر دیا۔

مصنف نے اس ایثار کے وجوہ بڑے حسین الفاظ میں بیان کئے ہیں۔ لیکن اس صبیح و ملیح پارۂ انشاء میں حقیقت طراز کے دماغ کی جلا نہیں، بلکہ ایک ارمان نواز کے دل کی تڑپ ہے۔

کشوری کے کردار میں ہمیں جو بات سب سے زیادہ پسند آئی وہ اس کا اُردو ناولوں کے ہیرو کے مسلمہ خصوصیات سے معرّا و مبرّا ہونا ہے۔ نہ تو اسکی صورت و شکل غلمانوں کی سی ہے اور نہ اس کی سیرت و فطرت فرشتوں کی سی۔ اس کا حلیہ بھدا ہے، اس کا لباس دیہاتی ہے اور اس کی سیرت کھُردری ہے۔ پھر بھی اس کی مضبوط شخصیت ناظر کے دل پر ایک نقش مرتسم چھوڑ جاتی ہے۔ یہی مصنف کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اور اس پر وہ جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

کشوری کے علاوہ دوسرے کردار بھی زندہ ہیں، سر جوشی، سر حکیم، سر جمشید جی، اور ان کے ساتھ کے ڈاکٹر مستند و کامیاب پیشہ وروں کی انانیت کی تصویریں ہیں، ہریش دولت مند تعلیم یافتہ نوجوان کی مثال ہے، ارملا ذکی الحس و درد مند ہونے پر بھی مغرور ہے، اپنے کو بڑے باپ کی بیٹی تصور کرتی ہے، رنجی ایک چھوٹے طبقے کی احسان مند عورت ہے، مگر ان سب پر کشوری کی شخصیت غالب ہے، خواہ اسے پسند کریں یا ناپسند اس کے چشم و آبرو کے اشارے پر سب ناچتے ہیں۔

قیسی صاحب کے اس ناول میں سیرتوں میں آویزش ہے، تصادم ہے، اور ہندوستان کے معاشرہ کو اشتراکیت و اشتمالیت، شہنشاہیت و فسطائیت

کے نظریوں سے الگ کرکے سمجھنے کی کوشش ہے۔ یہ ضرور ہے کہ پلاٹ کو عام زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں، اور اس میں دیسی عطر کی جگہ بدیسی فنائل کی بو آتی ہے۔ لیکن وہ محض اس لئے قابل توجہ ہے کہ فرسودہ جادہ سے ہٹی ہوئی چیز ہے۔

ہمیں حضرت قیسی سے صرف ایک شکایت ہے۔ وہ بہت زیادہ زود رقم ہیں۔ غالباً وہ اپنے مسودات پر نظر ثانی نہیں فرماتے اور انھیں طبع میں بھیجنے کے بعد نہ تو کاپی پڑھتے ہیں اور نہ پروف دیکھتے ہیں۔ اسی لئے انکی سنگ مرمر و سنگ رخام کی تیار کردہ عمارتوں میں بھی بہت سا بیکار ملبہ پڑا رہ جاتا ہے۔ انکی صفائی کی بھی ضرورت ہے اور قلعی کی بھی۔ لیکن یہ کام انجنیر کا نہیں بلکہ فراش کا ہے، یعنی مصنف کا نہیں بلکہ مطبع کا۔ اور ہمارے مطابع کا جو حال ہے وہ ظاہر ہے۔

عزیز احمد صاحب نے مغربی دیومالائیں بہت غور سے پڑھی ہیں۔ وہ مصوری، موسیقی، اور سنگ تراشی کی باریکیوں سے بھی واقف ہیں، وہ ایک اعلیٰ ناول نگار کی ساری صلاحیتیں رکھتے ہیں لیکن انکی تصنیفات (مرمر اور خون، ہوس، گریز) پر موجودہ جنسی عریاں نگاری کا رنگ غالب ہے۔ غالباً وہ بھی ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی طرح صرف جنسیات کی بحث ہی کو ناول کا صحیح موضوع سمجھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ عمر و تجربہ کی زیادتی اس افراط میں تفریط کرکے انھیں مستقبل قریب ہی میں اُردو کا فلوبرٹ بنا دیگی۔

رشید احمد اختر ندوی کے ناول "ساز شکستہ، سوز دروں، سودائی، ہرجائی" وغیرہ بھی قیسی رامپوری اور عزیز احمد کے رنگ کے ہیں۔ حسن و عشق کی دا اور جنسیات کے کارنامے۔ ان کے قلم میں بھی زور ہے۔ اور ان سے بھی ترقی کی امیدیں ہیں۔

فضل حق قریشی کا سگ لیلیٰ طنزیہ ہے۔ ایک کتا دنیا کو دیکھتا ہے اور اپنے آقاؤں کے کرتوتوں پر اظہار رائے کرتا ہے۔ صادق الخیری کا ناول "دوشیزہ صحرا" اور اشرف صبوحی کا "بغداد کا جوہری" اور بن باسی مغرب سے ماخوذ ہے۔ انصار ناصری کا "وحشی" اور ظفر قریشی کا "جہاں آرا" رومان ہے۔ نجم الدین شکیب کا "یہ دنیا ہے" ایک بڑے "کینوس" پر لکھا گیا ہے۔ وہ ہر طبقہ اور نمونے کے انسان پیش کرتا اور ان کا طنزیہ تجزیہ کرتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ وہ ہکسلے اور ونڈھم لوئس کو اور غور سے پڑھیں۔

ان تمام مصنفین نے مستقبل کی امیدیں وابستہ ہیں۔ انہیں سے ہر ایک تعلیم یافتہ ہے۔ غور و فکر کا عادی ہے اور ہر ایک کے ہاں قلم میں زور ہے۔ اگر دنیا نے انھیں موقع دیا تو ہمیں یقین ہے کہ ان میں سے اکثر زندہ جاوید چیزیں پیش کریں گے۔

دو خواتین نے بھی ادھر دو ناول لکھے ہیں جنکی بڑی شہرت ہے۔ ایک تو بیگم احمد علی اور دوسرے اے، آر، خاتون۔ بیگم احمد علی کا "ماہ درخشاں" ایک مصری خاندان کے ذریعے اطالیہ و سوئٹزرلینڈ میں اسلامی تبلیغ کا ایک قصہ پیش کرتا ہے۔ زیادہ تر کردار مغربی ہیں اور ان میں اسی طرح کی افراط مذہبیت ہے جو مبلغوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ ناول اس انگریزی دان طبقہ کیلئے لکھا گیا ہے جو مذہب سے ناواقف ہے اور اُسے تفریحی قصوں کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ اسلامی مدرسوں کی درسیات میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ اسے ادب میں کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔

اے، آر، خاتون صاحبہ کا ناول "شمع" نسوانی ادب میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، مرزا سعید صاحب کے تعارفی نوٹ نے اس کے وزن کو اور

بڑھا دیا ہے۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اختر حسن و بدر الحسن دو بھائی ہیں اختر حسن جج ہیں اور بدر الحسن زمیندار۔ اختر حسن کی لڑکی شمع بی اے ہے اور بدر الحسن کا لڑکا قمر الحسن جاہل۔ پھر بھی انکی بیوی حلیمہ یہی چاہتی ہیں کہ قمر کی شادی شمع سے کرا دیں اور پوری جائیداد پر قبضہ کرلیں۔ ادھر اختر حسن شمع کی شادی منصور محمود اپنے ایک تعلیم یافتہ عزیز سے کرنا چاہتے ہیں۔ آپس میں مخالفتیں بڑھیں اور بالآخر اختر حسن غائب ہوگئے اور شمع تنہا رہ گئی۔ اب حلیمہ نے وہ تمام حرکتیں کر ڈالیں جو ڈاکو اور بدمعاش کرتے ہیں۔ شمع کو دھوکا دیکر ایک مکان میں محبوس کیا اور قمر سے زبردستی عقد کرنا چاہا۔ وہ وہاں سے بھاگ نکلی اور اختر کے دوست شرما صاحب اور انکی بیوی کی پناہ میں چلی گئی۔ بالآخر حلیمہ ہر طرح ذلیل ہوئیں، قمر مر گیا۔ انکی لڑکی جہاں آرا بہت بُری جگہ بیاہی گئی۔ اختر حسن پاگل ہوکر در بدر پھرے، بالآخر اچھے ہوکر بیٹی سے ملے۔ منصور محمود و شمع کی شکر رنجیاں دور ہوئیں اور دونوں میں عقد ہوگیا۔

قصہ کی ہیروئن شمع گریجویٹ ہونے پر بھی بیوقوف ہے۔ اسکی قطع "چار پایہ بروئے کتابے چند" کی ہے۔ بدر الحسن بالکل بیل ہیں۔ سب کچھ بیوی کے کانوں سے سنتے اور انہیں کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ خان بہادر غلام مصطفےٰ سلجھے ہوئے آدمی ہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ انہوں نے خالد مصطفےٰ سے جھوٹا عقد کیوں کرایا۔ شرما اور انکی بیوی کی سیرت مثالی ہے۔ اتنے نیک، سچے اور مصیبت میں کام آنے والے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ منصور محمود بھی مثالی عاشق ہیں۔ ایکے ہوکر رہنے والے۔ انکی رگوں میں گرم خون کی کمی ہے۔ اختر حسن ضرورت سے زیادہ متین و سنجیدہ ہیں اور بیوی کے انتقال سے دل و دماغ کی کمزوری کا شکار۔ پھر بھی مصنف نے ان کے لئے کچھ دنوں کیلئے گم ہونا اور پاگل ہونا ضروری

سمجھا۔ پلاٹ کا الجھاؤ یہی چاہتا تھا، مگر ان بیچارے کے ساتھ یہ کوئی اچھا سلوک نہ ہوا۔ قمر الحسن کی سیرت میں وہ تمام کمزوریاں موجود ہیں جو ایک جاہل خود پسند شخص میں ہوتی ہیں۔ وہ ماں کے بہکانے سے مذموم سے مذموم حرکات کرنے پر محض اسلئے تیار ہو جاتا ہے، کہ اسکی خودبینی کو شمع نے مجروح کیا ہے۔ اسکی تربیت غلط ہوئی۔ اسکی طبیعت بُری نہ تھی۔ وہ مرنے سے قبل اپنے حرکات پر اظہار ندامت کرتا ہے۔

عورتوں میں دو سیرتیں پائدار اثر چھوڑتی ہیں۔ ایک تو خورشید جہاں۔ دوسری علیمہ بیگم۔ خورشید جہاں اختر حسن کے مزاج کی عورت ہیں۔ متین، سنجیدہ، ہر بات سوچ سمجھ کر کہنے والی۔ ان کی سیرت میں بلا کی استقامت اور غضب کا استقلال ہے۔ ایسی ہی بیویوں کی ذات سے نسوانی طبقے کا وقار قائم ہے۔

علیمہ بیگم بڑی جھوٹی، مکّار اور عیّار ہے۔ اس کو اپنے لڑکے قمر الحسن سے بے پناہ محبت ہے وہ اُسے شمع کا کفو ہی نہیں سمجھتی بلکہ اس سے بہتر و برتر بیوی کا شوہر بننے کا مستحق سمجھتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ اس جائداد کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی ہے جو اختر حسن نے باپ دادا سے ورثہ میں پائی ہے یا جو اپنے بازو کی قوت سے اکٹھا کی ہے۔ مصنف نے اگر اس کی حرفتوں کے بیان کے سلسلے میں شمع کے اغوا کا واقعہ نہ بڑھا دیا ہوتا تو علیمہ بیگم کا کردار فطری ہوتا۔ یہ امر بھی واضح نہیں ہوتا کہ علیمہ بیگم نے جس ماحول میں تربیت پائی تھی اس نے اس کو طرح طرح کی سازشیں، شرارتیں اور بدمعاشیاں کیسے سکھا دیں۔ ہماری رائے میں علیمہ بیگم کی پشت پر ایاگو کی طرح ایک ہوشیار بہکانے والا ہونا چاہئے تھا، جو اسکی تربیت اور خاندانی روایات کے خلاف اس کو اس طرح کے اقدامات پر مائل کرتا رہتا۔

ہم مرزا سعید صاحب کے اس بیان سے تو متفق ہیں کہ انکے ناول کی

تاریخ کو ملاحظہ کیا جائے تو اسکی ترقی میں عورتوں کا حصّہ خاصا نمایاں معلوم ہوتا ہے. آج سے کئی سو سال پہلے ایک جاپانی خاتون نے ایک حیرت انگیز ناول گینجی کی داستان (The Tale of genji) کے نام سے لکھا تھا. فرانس میں جارج سینڈ اور انگلستان میں جین آسٹن اور جارج ایلیٹ کا افسانہ نگاری میں جو پایہ ہے اس کی توضیح کی ضرورت نہیں. اس زمانے میں بھی یورپ میں اتنی عورتیں ناول لکھنے والی ہیں کہ نقاد ناول نویسی کو طنز و مزاح کے طور پر "نسوانی فن" کہنے لگے ہیں." لیکن ہم یہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں کہ اے، آر، خاتون صاحبہ کا ناول "شمع" مذکورۂ بالا خواتین کی کسی تصنیف کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے. یا اس میں وہ ادبی ضیاء ہے جو اُسے ابد تک روشن رکھے گی. ہمیں تو یہ شمع بہت جلد ہی بجھ جانے والی معلوم ہوتی ہے.

اردو ناول کا مستقبل :-

اردو ناول کا مستقبل یقینی درخشاں ہے. علم عام ہوتا جاتا ہے. مسائل زندگی پہ غور و فکر کی پبلک میں صلاحیت آ جاتی ہے. وطن پرستی جزو ایمان بنتی جا رہی ہے. اُردو کی سرپرستی کا خیال بھی روز افزوں ہے. نوجوان مصنفین کا مطالعہ وسیع و عمیق ہے. ان کے دماغ میں ندرت اور مزاج میں جدّت ہے صرف چند نمایاں اور واضح نقائص و معائب ہیں. ایک تو یہ کہ اصول معنی و بیان سے بے پروائی وبا کی طرح بڑھ رہی ہے. زبان کو سادہ، رواں اور لوچدار بنانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انشاء کے مسلّمہ کلیوں سے اغماض و انحراف تجدد پسندی کی علامت خاص بنا لیا جائے. فی الحال تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "اردو کو چت پٹ کر دینا" نئے لکھنے والوں کیلئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے. انھوں نے خشکہ پاگندہ بیروزہ اگرچہ گندہ گرایجا د بندہ" کو محل تفاخر پہ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے. انکی ان حرکتوں سے ادب کے کاکل سنورتے نہیں دکھائی دیتے.

دوسرے حقیقت نگاری کا وہ جنون ہے کہ فحاشی و ابتذال نئے ادب کا مارکہ بن رہا ہے۔ وہ علم النفس کا یہ کلیہ بھول گئے کہ انکی بیجا چرب زبانی انکی اعصابی کمزوری کے پول کھولتی۔ اور انکی جسمانی بے بسیوں کی غمازی کرتی ہے۔ بقول اناطول فرانس "جنسی تعلقات کو چٹخارے لے لیکر بیان کرنے والوں کی گرمیاں حقیقی زندگی میں ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں۔ انکی عاشقانہ مزاجی قلم دوات ہی تک محدود رہتی ہے!"

روس کے سب سے بڑے حقیقت نگار اور ترقی پسند ادیبوں کے استاد، گورکی نے بھی شیخ سعدی کی طرح اس نوع کی "راستی فتنہ انگیز" کو مردود قرار دیا ہے۔ اس کا ارشاد ہے۔ "میری رائے میں راست و حق کی اس حد تک اور اس تکمیل کے ساتھ ضرورت نہیں ہے جتنا کہ بعض حضرات کے خیال عالی میں وہ لازمی و ضروری ہے۔ جہاں بھی میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ فلاں فلاں حقایق روح کو مجروح کرتے ہیں اور ان سے کوئی سبق حاصل نہیں ہوتا یا یہ کہ وہ انسان کو مجھ پر زیادہ واضح کرنے کی جگہ اُسے ذلیل و رسوا کرتے ہیں، تو میں نے ان کے بیان کو ترک کر دینا ہی بہتر سمجھا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت سے حقائق ایسے ہیں جن کا نہ یاد رکھنا ہی زیادہ اچھا ہے۔ ایسی سچائیاں جھوٹ کے پیٹ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان میں اس زہریلے دروغ کے وہ تمام عناصر موجود ہوتے ہیں، جنھوں نے ایک انسان کے دوسرے انسان سے تعلقات کو ایک ایسا جہنم بنا دیا ہے جو مہمل بھی ہے اور غلیظ و متعفن بھی۔ آخر انسانیت کو ایسی چیزوں کے یاد دلانے کا فائدہ ہی کیا ہے، جنھیں جلد سے جلد فنا ہو جانا چاہئے؟ زندگی کے گندے پہلوؤں کو نمایاں کر کے بیان کرنا ایک گندہ کام ہے"۔

تیسرے اظہار رائے میں لب و لہجہ تند و سخت ہوتا جاتا ہے۔ ادبی مباحثہ مذہبی مناظرہ بنتا جاتا ہے نہ وہ اگلی سی تہذیب ہے اور نہ گزشتہ بزرگ

داشت ۔ چنانچہ گورکی تک اس امر سے نالاں ہے۔ وہ کہتا ہے پرانے مارکسی جب بزروا ناقدین سے بحث کرتے تھے اور ان کے رجحانات کی پول کھولتے تھے تو وہ اس درجہ متین و سنجیدہ انداز تکلّم اختیار کرتے تھے کہ ان کے مضامین پڑھ کر انکی سچائی پر یقین بڑھ جاتا تھا۔ لیکن ہمارے نوجوان ناقدین سیدھے سادے نظریات کی بحث میں بھی ایسا نہیں کرتے۔" وہ نوجوانی کی عجلت پسندی میں یہ بھول جاتے ہیں کہ لفاظی و خطابت اکثر اصول پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اور انکی بحثیں زیادہ تر نوجوان ناظرین کی سمجھ سے بالا تر ہو جاتی ہیں۔" ہمارے نئے ادب میں حریف مقابل کیلئے: "متعصب، اندھا، بیوقوف، غلام، جاہل، بے سواد و تنگ نظر، قدامت پرست، سرمایہ کا پجاری، جاگیرداری نظام کا شیدا، شہنشاہیت کا کاسہ لیس" کے سے خطابات کا عطیہ عام ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان تلخ گوئیوں کا باعث زندگی کی ناکامیاں، "نئی قدروں" کی بے قدریاں اور خواہش انقلاب کی عجلت پسندیاں ہیں۔ جلے دل کے پھپھولے توڑے جاتے ہیں اور سارا غم و غصہ غیروں کی جگہ اپنوں پر اتارا جاتا ہے۔ مگر

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اسقدر ؍ کی جس سے بات اسنے شکایت ضرور کی!

اگر یہ خامیاں دور ہو گئیں تو مستقبل قریب ہی میں ہماری زبان، مختصر افسانوں کی طرح ناول کے میدان میں بھی دوسری زبانوں سے بازی لیجائیگی۔ اور اس طرح کی چیزیں پیش کریگی جو ٹالسٹائی کے ناول "وار اینڈ پیس" گورکی کے ناول "مدر" شالوخوف کے "اینڈ کوائٹ فلوز دی ڈان" نٹ ہمسن کے "گروتھ آف دی سوائل" وکی بوم کے "نیٹکنگ روڈ" مان کے "بڈن بروکس" سلن پا کے "میک ہریٹیج" اناطول فرانس کے "پنگوئن آئیلنڈ" رومن رولاں کے "جین کرسٹوفر" ہارڈی کے "ٹس ڈوبرولی" گالسوردی کے۔

"فورسائٹ ساگا"۔ ڈرائیزر کے "سسر کیری" اور پرل بک کے "گڈ ارتھ" کا ہی مقابلہ ہی نہ کریں گی بلکہ انھیں ہر طرح شرمائیں گی۔

مؤلف کا کام صرف دعا ہے۔ اردو ناول کا مستقبل نوجوان مصنفین کے ہاتھوں میں ہے!*

---

* زیر طبع کتاب نَاوَلْ نَامَہ کا ایک باب۔

نصیر حیدر

ٹھنڈا الاؤ

جس دَمکتی ہوئی رنگینیِ غم کا پَرتَو
تیرے بلّور پہ پڑتا تو دَمک اُٹھتا تھا
آج اس آگ کے شعلوں میں بھی وہ رنگ نہیں۔
حیف وہ آتشِ جذبات —— وہ غم
اور وہ تصویرِ خیالی تیری۔
سب کے سب جل بھی چکے —— بُجھ بھی چکے
اور اک تودۂ خاکستر و خاشاک کے پاس
کوئی بیٹھا ہے ابھی ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے —— !!!”
سرد، ٹھٹھرے ہوئے جھلسے ہوئے ہاتھ
سینک رہا ہے اب تک ——

احمد مجتبیٰ وامق

"فرار"

ریگ ساحل سے جو اٹھتی ہے بگولہ بن کر
اپنی دوشیزگی و رقص کا طوفان لئے ،
سرنگوں ہو کے کسی دشت سے جا ملتی ہے

راہ میں نقش قدم روپ بدل دیتے ہیں
کس لئے شام و سحر رہتے ہیں سرگرم خرام
نہ کبھی دیکھتے ہیں مڑ کے نہ تھکتے ہیں کبھی

ایسے بیکار سوالات میں کیا رکھا ہے ؟
چاند کو چھونے کی بے سود تمنائے حسیں
ایک طفلانہ تجسس کے سوا کچھ بھی نہیں

شعلۂ فکر میں جلتی ہوئی نبضوں کی پکار
ہاتھ پھیلائے ہوئے تنگیٔ زنداں سے ڈھال
بے حسی تیرے سوا کوئی نہیں جائے فرار
تو نے بخشا ہے ابوالہول کو صدیوں کا جمود
تجھ سے وابستہ ہے خوابیدہ چٹانوں کا قرار
کتنی آسودہ و بے ہوش ہے تیری آغوش
جس طرح یخ کے پہاڑوں میں ہوائیں خاموش
کاش ہو جاتے یونہی سرد یہ انگارے بھی

کس لئے چیخ رہے ہیں یہ بھکاری بالک
کتّوں کے جبڑوں میں روٹی پہ جھپٹتے ہوئے ہات
خاک میں لتھڑی ہوئی لاش پہ اک جمِ غفیر
دستِ جلّاد پہ اک خون کی بھدّی سی لکیر
پانی پانی ہوا جاتا ہے مصوّر کا قلم

"تند احساس میں جکڑی ہوئی روحوں کی پکار
ایک زنجیرِ حسیں ایک طلائی حلقہ
دشمنِ جاں نظر آنے لگا ہر بازیچہ
سنگ و آہن پہ ابھر آئے لہو کے قطرے
گھاؤ پھٹنے لگے، بہنے لگے، ناسور ہوئے

میرے احساس کی خوش رنگ طلائی زنجیر
ایک دو جرعے میں تیزاب کے گلتی ہے کہیں
میل کٹ جائیگی کچھ اور نکھر جائے گا رنگ
پیچ در پیچ خلش پہلے سے بڑھ جائے گی
اور میں چلاتا ہی رہ جاؤں گا جرعے، جرعے
تلخیِ فکر سے بڑھ کر نہیں مے کی تلخی
غرق ہو جاؤں تو جذبات بھی سو جائیں گے
بے حسی چھائیگی زنجیر بھی گل جائے گی
چند گام اور ابھی چلنے کی تمنا ہے مجھے

[illegible]

عزیز حامد مدنی

تصویریں

میں نے سوچا ہے کہ خورشید کا ماتم نہ کروں!
شب کی آغوش میں میخانے ہیں سیّارے ہیں   جن کا پرتو مری بے خواب نگاہوں پہ رہا
ابھی افلاک کی محراب میں وہ تارے ہیں   جو خلاؤں میں لٹاتے رہے کرنوں کی ضیا
آتشیں ہو کے اُفق روز پگھل جاتی ہے   روز نظاروں کی اک لاش سی جل جاتی ہے
دور کرنوں سے لپٹتا ہوا پُرپیچ دھواں   رقص کرتا ہے دھندلکوں کے سہارے اب بھی
میں نے جلتے ہوئے سورج کا محل دیکھا ہے   سرخ ہو جاتے ہیں گردوں کے کنارے اب بھی
روز اُٹھتی ہے فضاؤں میں اُفق کی دیوار   گرتی جاتی ہے کھنڈر ہوتی چلی جاتی ہے
جیسے تاریخ کے گرتے ہوئے ایوانوں میں   موت آدم کا لہو چاٹ کے گھبراتی ہے
ناگزشتہ ہے اگر شام کا غمناک سکوت   کون اٹھائیگا نگاہوں سے بھلا یہ تابوت
چھوڑ دوں اِس خورشید کو نظروں سے پرے   شب کے خاموش اندھیرے بھی تو بے نور نہیں
رنگ لوں آج نگاہوں کے تحیّر کی خلا
آتشیں لب سے دہکتے ہوئے رخساروں سے   چاندنی رات کے خاموش چمن زاروں سے
اجنبی دخترِ دہقاں کی نگاہوں سے کبھی   کارواں ہو گئے جن پہ انھیں راہوں سے کبھی

کسی وادی کے خم و پیچ سے دریاؤں سے
کچھ چراغوں کی قطاروں سے کلیساؤں سے
پرفشاں گیسوئے پرخم کے ربابوں سے کبھی
دف کی آواز سے لرزیدہ نقابوں سے کبھی
کچھ پرندوں کی مچلتی ہوئی پروازوں سے
کچھ پس پردہ لرزتی ہوئی آوازوں سے
لب و رخسار میں کھوئے ہوئے افسانوں سے
نیم خوابیدہ نگاہوں کے شبستانوں سے
حمد و تحلیل کی ٹوٹی ہوئی زنجیروں سے
موت کے پیار سے افلاس کی تحقیروں سے
ان نگاہوں کیلئے اور بھی ساماں ہیں یہاں
کتنے جلوے ابھی مجروح و پریشاں ہیں یہاں
زرنگاہوں کا سلگتا ہوا دامن ہے ابھی
آدمی اپنی ہی امید کا رہزن ہے ابھی
کتنے بے نام جنازے ہیں ابھی راہوں پر
کتنے ناسور ہیں تہذیب کے ان باہوں پر
لب پہ چھوٹے ہیں تبسم کے ابھی خواب بہت
ابھی احباب کی آنکھوں میں ہے زہراب بہت
موت کہتی ہے کہ سورج کی شعاعیں دَل دو
ماہ و انجم کی جبینوں پہ اندھیرے مل دو
کسی خیام کے آنسو کسی چنگیز کے خواب
چاہتے ہیں کہ الٹ دیں رخِ گیتی سے نقاب
خون آلود فضا زمزمۂ بانگِ رحیل
جنبشِ دستِ تغیر سے نہ منزل ہے نہ میل

یہ اندھیرا ہے اسیرِ غمِ خورشید تو کیا
کسی آنسو کسی اُمید کا ماتم نہ کروں

ان تصاویر کی خاموش فضاؤں میں مگر
کسی نقاش کے بے صوت تصور تو نہیں؟
آتش و خون کے ہیجانِ جنوں خیزی میں
رات کے دوش پہ اک دامِ تحیر تو نہیں؟

قرۃ العین حیدر

ہم لوگ

'ہاؤ' — 'ہوّرہ' — 'ہلو لیفٹیننٹ' — 'اہم — ٹٹ ٹٹ'
'فلکس' — 'ٹیپ' — 'او نیل — ؟ 'یاہ' —
'اوکے' — 'ٹیڈل اُوو سویٹی پائی' — 'چیریو نسیم' —

———— اور دوسرے لمحے ریٹا میری این نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہے۔ جیسے آپ ایک بار پلک جھپک کر کہیں "جیک روبنسن" — یا پیکرڈ میری آٹھ سلنڈروں والی موٹر پانی کے تیز چھینٹے اڑاتی زنّاٹے کے ساتھ موڑ پر سے گذر کر جنوبی مال کی طویل اور اندھیری خاموشی میں کھو جائے اور پیچھے رات کے بھاری کہرے میں ڈوبی ہوتی سڑک کی اونچی اور زرد اور دھندلی روشنیوں کی کی قطاریں بے بسی سے جھلملاتی رہیں۔ ریٹا اور پیکرڈ اور ہم، رائل انڈین نیوی کے گلفام "سب لیوٹ" اور تھکی ہوئی، سکون اور آرام کی خواہاں یہ خوابیدہ جنوبی مال جو ہم کو مے فیئر لئے جا رہی ہے آج رات "تمام سڑکیں مے فیئر کو جا رہی ہیں کیونکہ وہاں گالا نائٹ ہے ایک روسی اوپیرا کی نقل — سمجھے؟ کم وَن کم آول — ہم نے سٹیج اور بار اور گیلریاں اور گرین روم سب کے سب ہتھوڑے اور درانتوں والے سرخ کاغذی پرچموں سے سجائے ہیں۔ پچھلی مرتبہ جب ہم نے مے فیئر کی اسٹیج پر ہندوستانی رقص پیش کئے تھے تو نیلی اور سرخ دھاریوں اور ستاروں اور لکیروں والے جھنڈے سارے میں آراستہ کئے تھے۔ سمجھے کامریڈ۔ اوہو معاف کرنا تم تو کامریڈ نہیں ہو بلکہ آر۔ آئی۔ این کے ایک بیحد گلفام سب لفٹنٹ۔

ہو جو جنرل اسٹیل ول کا جام صحت تجویز کرنے کے بعد" ہی از اے جولی گڈ فیلو" خوب زور زور سے اس لئے گاتے ہو کیونکہ ہم ہندوستانیوں کا امریکہ اور امریکنوں سے بہت ہی گہرا قلبی تعلق ہے۔

لیکن کیسی فضول سی اور اکتا دینے والی باتیں ہیں یہ۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ اور میری بہن ریٹا بھی۔ مگر میری آٹھ سلینڈرز والی کار کبھی نہیں تھکتی۔ اس کے ٹائروں کے نیچے کہر آلود لیمپوں کی مدھم روشنی میں مال تیزی سے بہہ رہی ہے۔ سے فیر ابھی بہت دور ہے۔ میرا چھوٹا اور خوبصورت سا نیند سے بوجھل سر اپنے شانوں پر رکھ لو۔ جنوبی مال تک۔ صرف شمالی مال سے لیکر جنوبی مال تک۔ یعنی کسقدر مختصر یہ شرح زندگی ہے۔ سوچو تو۔

اور ہماری دنیا ذرا اعلیٰ پیمانے پر کتنا کار آمد ہے پٹ مینز شورٹ ہینڈ انسٹیٹیوٹ۔ ریٹا خاموش ہے۔ ریٹا بہت سے اہم مرحلے اسی شورٹ ہینڈ میں طے کر لیتی ہے اور پھر اطمینان سے چیونگ گم کھاتی رہتی ہے اور اپنی بڑی بڑی سبز آنکھیں اس طرح جھپکتی ہے جیسے پوچھ رہی ہو معاف کیجئے گا لیکن کیا آپ کو زندگی بسر کرنے کا فن آتا ہے؟ اگر نہیں، تو پھر سے جا کر کنڈر گارٹن میں داخل ہو جائیے ورنہ میرے ساتھ آکر ناچئے۔

ارے آپ کو ناچنا بھی نہیں آتا۔ اور سوسائٹی میں یونہی داخل ہو گئے آپ۔ چچ چچ اچھا آپ مادام والگا کے اسکول میں شامل ہو جائیے جو نیو انڈیا کافی ہاؤس کے اوپر ہے۔ اور آپ نے اس نکتہ پر بھی غور نہیں فرمایا۔ جسے امریکن بہت اچھی طرح سمجھ چکے ہیں (فرق یہ امریکن تمہارے اعصاب پر کیسے سوار ہو گئے ہیں بھئی) یعنی زندگی تجارت ہے، تجارت اشتہار بازی ہے اور اشتہار بازی زندگی۔ یہ سب اچھی طرح شیک اور مکس کئے ہوئے کوک ٹیل کی طرح

ایکدوسرے سے لازم و ملزوم ہیں دیکھئے مادام وانگاکے رقص کے اسکول کا اشتہار کس خوبصورتی سے صرف ایک سطر میں میں نے آپ تک پہنچا دیا ہے۔ یہ فن میں نے یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ایک کمرشیل کالج کی شام کی کلاسوں میں شغل بیکاری کے طور پر سیکھا ہے۔ آپ حضرات بھی اس طرف توجہ فرمائیے اور گھر بیٹھے ہزاروں روپیہ کمائیے۔ اس کے علاوہ ہماری فرم سے آپ امریکن یونیورسٹیوں کی اعلیٰ ڈگریاں بذریعہ خط وکتابت حاصل کرسکتے ہیں۔ فیس بالکل واجبی پھر آپ دیکھئے ڈبلیو اے سی (آئی) کی زندگی کس قدر دلچسپ ہے اور اس وقت ہندوستانی شاہی بحری بیڑے کو آپ جیسی لڑکیوں کی کتنی ضرورت ہے۔ یہ مس صبیحہ امام ہیں۔ اور یہ سینیئر کمانڈر لتیکا بنرجی۔

چنانچہ ہماری پیکرڈ اسی طرح اسی تیز رفتاری سے مے فیئر کیطرف بڑھتی جا رہی ہے اور ہم بہت مطمئن ہیں۔ ہمیں تھکن کبھی محسوس نہ کرنی چاہئے یہ جانتے ہوئے بھی کہ "منزل" مے فیئر کی ان نیلگوں روشنیوں سے بہت دور کہیں دھندلکوں کے پرے چھپی ہوئی ہے۔ منزل ـــ فش سب ہی لغو اور بے معنی لفظ ہے یہ۔ زندگی ذوقِ سفر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ خصوصاً جب یہ سفر ایک پیکرڈ میں کیا جاتا ہو۔

لیکن ریٹیا اسلام احمد تم جو زندگی کی شورٹ ہینڈ میں ماہر ہو اوڈپی انسٹیٹیوٹ کا بہترین اشتہار ـــ آہستہ آہستہ مت ناچو ـــ کیونکہ برسات کی یہ کالی راتیں بہت جلد گذرتی جا رہی ہیں اور بادلوں کے اوپر تاریک آسمانوں میں نقرئی ستارے تیزی سے گھوم رہے ہیں۔

اور صبح صبح جب کھڑکی کے نیچے پھیلی ہوئی کچی رس بھری کی مدھم خوشبو ناک میں گھستی ہے تو سبزے کے پرے رہنے والے کپتان عثمان اپنے دریچے میں کھڑے

ہوکر یونہی بے فکری اور بے نیازی سے سیٹی بجانے لگتے ہیں۔ (یہ ایک اہم سائیکلوجیکل نکتہ ہے کہ انسان کھڑکی میں کھڑے ہوکر سیٹی کیوں بجاتا ہے) اس وقت ریٹا میری بہن کی آنکھ کھل جاتی ہے اور چند لمحوں تک اپنی بڑی بڑی سبز آنکھیں کاہلی سے جھپکانے کے بعد وہ دوسری کروٹ لیکر خوابوں کے نقرئی تار کو وہیں سے ملا دیتی ہے جہاں سے کیپٹن صاحب کی سیٹی نے اسے توڑ دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ بجھتے تاروں کی چھاؤں میں جنم لینے والے سپنے ہمیشہ خوشگوار اور سچے ثابت ہوتے ہیں۔ رس بھری کی سوتی ہوئی خوشبو کی لپٹوں جیسے۔ ان دھندلے سنہری پانیوں میں اپنی خوابوں کی کشتی کھیتی رہو ریٹا رانی انجانی چٹانوں اور اجنبی ساحلوں سے بچا کے۔

دیکھتے ہو کامریڈ۔ اس بورژوا لڑکی اس جاگیردارانہ نظام اور ذہنیت کی فروزاں قندیل کا وجود کتنا فضول اور بے مصرف ہے۔ اٹھ او خوبصورت کاہل عورت۔ تجھے اسکیٹنگ ہاکی ٹورنامنٹ کی شیلڈ حاصل کرنے کے حد سے زیادہ لغو اور غلیظ خواب دیکھنے کا کیا حق ہے جبکہ — جبکہ — جاگ کہ سرخ سویرا آتا ہے — ("سرخ سویرا" اور دیگر تمام کمیونسٹ لٹریچر آپ کو قومی کتاب گھر مقابل پلازا سینما مل سکتا ہے) — گومتی کے پار، نارنجی کے افق پر صبح کی پہلی کرنیں بکھرنے لگی ہیں اور ریٹا میری بہن ہلکی ہلکی سیٹیوں کی آوازوں کے سہارے خواب میں مسوری کی رنک کی سطح پر شیلڈ کی جانب بڑھتی جا رہی ہے۔ اسکے نئے آوبیرائے کے اسکیٹس ہر سال اسیطرح اسے جیتنے میں مدد دیتے ہیں (ہمیشہ اوبیرائے کے یہاں کے اسکیٹس اور ہاکیاں استعمال کیجئے) اور مسوری کا چیمپئن ایچ۔ کے۔ خواجہ جسے ریٹا نے پچھلے سیزن میں ہرایا تھا، کہتا ہے کہ ایک سخت میچ کے بعد روزیز اسکویش کا ایک گلاس مجھے ہمیشہ بجد ریفرشنگ ثابت ہوا ہے۔ روزیز اسکویش کے علاوہ اگر آپ ہوٹیل برلنگٹن کے نیگوں کیفے میں تشریف لائیے تو ہم آپ کو

رس بھری کی بہترین خوشبو سنگھوائینگے ۔

اس لئے بھئی ریٹیا اب جاگ اٹھو۔ آتنی آہستگی سے رقص نہ کرو۔ سمجھیں
کیونکہ زندگی بہت مختصر ہے اور ہم بہت مصروف۔ اور ابھی ہم کو کتنے بیحد ضرور
کام کرنے باقی ہیں۔ تمہیں این کے، خواجہ کو ہرانا ہے۔ میں ہندوستانی کلچر سوسا
کے ایٹ ہوم میں مانی پوری رقص پر انگریزی میں جو تقریر کرنے والی ہوں۔ اس کے
لئے کتابوں میں سے خوبصورت جملے چرانے میں مشغول ہوں (کیونکہ ابھی ہندو
میں فن تقریر سکھانے کے کالج قائم نہیں ہوئے) اور کیپٹن عثمان کے سیرینیڈ بیکا
جا رہے ہیں۔ اب جاگو رادھا رانی ۔

کیونکہ صبح ہوگئی ہے۔ اور سنہری مشعلوں کے راستے تمہارے منتظر ہیں ۔

صبح نو! نوّہ ۔ صبح نو ۔

پھر ایک اور صبح اور ایک اور شام ــ یہ دن اور یہ راتیں ــ حماقت
کے افسانوں کے کارواں ـــ بے بس و بے معنی ۔ آیئے کامریڈ میں آپ کو ایک نئی
داستان سناؤں۔ امید ہے آپ کو معلوم ہوگا کہ میں ایک بڑی سحر طراز افسانہ نگا
ہوں ۔

جی ہاں ۔ جی ہاں ۔ خوب ۔ مس حیدر آپ کی تو نثر میں نظم کی سی حلاوت
لچک اور روانی ہے ۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے تازہ ترین قطعات آپ کے
گوش گذار کردوں جو میرے نئے مجموعے "چھچھر" میں بھی شامل ہیں۔ عرض کرتا ہوں
کہ ۔ مجھ کو منظور نہیں چاند ستاروں کا سفر

میرے کھوئے ہوئے، ویراں ہے ـــ

اوفوہ ــ بہت بہت شکریہ ــ واقعی کس قدر خوبصورت نظم ہے آپکی
لیکن اب مجھے باہر جانا ہے ۔ اگر آپ کسی اور دن تشریف لائیں تو کیسا ہے خدا حاف

کامریڈز۔ کمم ایلونگ کیپٹن۔

اف یہ سرمایہ دار۔

اف یہ لڑکیاں۔

اف یہ لوگ۔

عثمان، عثمان، سچ مچ میں بہت تھک گئی ہوں۔ سچ مجھے منظور نہیں چاندستاروں کے سفر بالکل سچ ــــ مجھے منظور نہیں ــــ میں نے صاف جھوٹ بولا تھا کہ مجھے ان سایہ دار خاموش سکون بخش راستوں، اس سوتی ہوئی موسیقی، اس تیسرے درجہ کی، پٹی ہوئی رومان پرستی، سے شدید نفرت ہے۔

نجانے کیا کیا کہتی رہتی ہو۔ کبھی مجھ سے افسانوں والی کے علاوہ جو دوسری اُردو ہوتی ہے اس میں بولا کرو۔ سمجھیں؟ لیکن وہ جانتا ہے کہ میں نہیں سمجھ سکتی۔ نہیں سمجھنا چاہتی۔

پھر گومتی کے کنارے آموں کے سائے میں رکی ہوئی پیکارڈ کے فٹ بورڈ پر بیٹھے بیٹھے کیپٹن عثمان دنیا جہان کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ شبنمی خوابوں کی باتیں۔ قطعی غیر ضروری اور بالکل بے معنی۔ جنکی کوئی اہمیت نہیں۔ جنہیں سنجیدگی سے لینے کا ذرا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی آموں کے سائے بڑھتے جاتے ہیں، گومتی بہتی رہتی ہے اور یہ باتیں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔

زندگی کے سوال کو ہم ابتک حل نہیں کر سکے ہیں۔

لیکن وہ متجسس متلاشی اور حساس آنکھوں اور بوجھل پلکوں والی زرد رو عیسائی لڑکی جو بھائی میاں کے پاس ریڈیو کی ملازمت کی درخواست لیکر آئی تھی بہت آسانی اور صفائی سے اس سوال کو حل کر چکی ہے۔

وہ سوتی ہوئی سی لڑکی جو اس روز برآمدے میں پہنچکر بھائی میاں کے

سامنے جانے سے قبل ہیٹ ریک کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے کیلئے ایک لمحے کو ٹھٹھک گئی تھی۔ مجھے اندر آرام کرسی پر "لائف" کے صفحوں میں ڈوبا دیکھ کر جیسے اسکی آنکھیں کہہ رہی تھیں تم روکنگ چیر پر جھولتی رہو مگر یقین کرو کہ میں تم سے زیادہ عقل رکھتی ہوں۔ حالانکہ میرے پاس یہی ایک بہترین ساری ہے جسے میں نے انٹرویو کے لئے اتنے دنوں سے سنبھال رکھا ہے۔ اس سے بھائی میاں نے پوچھا تھا آپکو پہلے بھی کوئی کام کرنے کا تجربہ رہ چکا ہے ؟ اور اسکی سایہ دار پلکیں لرز اٹھی تھیں، کیسا بھونڈا اور غیر ضروری سوال ہے وہ ہمیشہ سے کچھ نہ کچھ کرتی آتی ہے۔ اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتی رہیگی۔ کیونکہ اسے زندہ رہکر زندگی کے سوال کا حل تلاش کرنا ہے، اور زندہ رہنا روکنگ چیئر پر جھولنے والوں کے علاوہ دوسروں کے لئے خاصا مصیبت کا کام ہے۔

پھر بھائی میاں نے اس سے پوچھا تھا، آپ کس قسم کی ملازمت زیادہ آسانی اور دلچسپی سے کرسکیں گی ؟

ٹیلی فون اوپیریٹر۔ ڈرامہ آرٹسٹ۔ ریسپشنسٹ۔ Any Thing -

Any Thing — بھائی میاں نے اس کے الفاظ دہراتے ہوئے اس کا نام کاغذ پر بے فکری سے گرا دیا اور چلتے وقت اس نے بھائی میاں پر شکریہ کا ایک تبسم پھینکا جو کہہ رہا تھا کہ تم نہیں جانتے زندگی کے پٹ منیز شورٹ ہینڈ انسٹیٹیوٹ کا ایک اشتہار میں بھی ہوں جو گھر بیٹھے ایک ہزار ماہوار کمانے کی دعوت دیتا ہے لیکن یہ اشتہار پیکارڈ کے کشنوں اور اسکیٹنگ رنک پر پھسلنے والی نفاست کا حامل نہیں بلکہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر شائقین کو مخاطب کرتے ہوئے "چترا" اور "بیسویں صدی" میں شائع ہونے والے اعلانوں کی قسم میں سے ہے جس کو سب نہایت آسانی اور بے تکلفی سے پڑھ سکتے ہیں اور جو زندگی سے زیادہ قریب

اور زیادہ صحیح ہے۔

لیکن ہم اس عیسائی سوتی ہوئی سی لڑکی سے شکست ماننے کو تیار نہیں
ہو سکتے۔ ہم جو چار ہیں۔ اور اس سے بہت بلند اور اعلیٰ وارفع ہیں۔
ہم لوگ، جو ستاروں سے پرے رہتے ہیں۔ شیشے کے رنگ محلوں میں۔
اور شیشے کا رنگ محل بہت جلد ٹوٹ سکتا ہے۔

مگر ہم چاروں نیچے زمین کی بستیوں میں بسنے والوں پر پتھر پھینکتے رہتے
ہیں اور چوئنگ گم کھاتے چلتے ہیں۔

شکنتلا وارشنے جو ہیڈی لیمار کی طرح آنکھیں نیم وا کر کے فرصت
کے لمحوں میں سوچا کرتی ہے کہ جب وہ فلائیٹ لیوٹیننٹ روجرز کے ساتھ
شادی کر کے زمانہ بعد از جنگ کے بین الاقوامی تعلقات استوار کرتی ہوئی،
فلاڈلفیا یا میامی جائیگی تو کس قسم کا بالوں کا اسٹائل بنایا کریگی۔

اور طلعت جو کمیونسٹ ہے اور ہندوستان کی قومی مشترکہ زبان کے
لئے صبح سے شام تک فکرمند رہتی ہے۔ اور جب سے ہمارے صوبے میں
"قومی جنگ" پر پابندی عاید کی گئی ہے اس کا وزن پورا آدھ پونڈ کم ہو گیا ہے
پارٹی کے حکم کے مطابق مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد سے اس نے بے حد مستعدی
سے پاکستان کی اقتصادیات اور حکومت الٰہیہ پر کتابیں پڑھنی شروع کر دی
ہیں۔ روزانہ ہمیں فرسکو اور شملہ کانفرنسوں کے متعلق ضروری باتوں سے واقف
کراتی ہے۔ اس قدر مخلص اور سوئیٹ بچی ہے۔ خدارا آپ ہی اس سے شادی
کر لیجئے۔

اور ریٹا جو میری ماموں زاد بہن ہے جس کی آنکھیں شاہ بلوط کے
جنگلوں کے کنارے کسی جھیل کے پانیوں کی طرح گہری سبز ہیں اور جب وہ

سیٹی بجاتی ہے تو کائنات زیر و زبر اور فضائیں تہ و بالا ہو جاتی ہیں اور بربطِ دل کے تار لرز اٹھتے ہیں۔ اور نیلی آنکھوں والے امریکن اپنی چمکیلی ڈاج یا نیش کے بریک کھینچ کر اسے لفٹ دینے کو رک جاتے ہیں اسیطرح جیسے اسکی بلونڈ ماں میری آنٹ ربیکا کے گرم یہودی خون کی کشش سے مجبور ہو کر میرے ماموں میاں نے استغفارانہ سیٹی بجا کے بین الاقوامی نسلی مسائل کی گتھی میں ایک اور چھوٹی سی، کبھی نہ کھل سکنے والی گرہ کا اضافہ کر دیا تھا۔ آنٹ ربیکا جو برلین کے ایک دھکتے بھکتے ہوئے قہوہ خانے کی ویٹرس تھیں اور میرے ماموں میاں جنہوں نے اعلیٰ طبی تعلیم حاصل کرنے کیلئے جرمنی مراجعت فرمائی تھی اور وہاں سے واپس آ کر ہندوستان میں آفتابی اور بنفشی شعاعیں پھیلانے کے بجائے ایک میڈیکل کالج میں محض تھرڈ گریڈ لکچرر ہو گئے تھے اور جو بر وجہ جرمن خیالات رکھنے کی بنا اتبک نینی تال میں نظر بند ہیں۔ آنٹ ربیکا عرصہ گذرا اسی میڈیکل کالج کے ایک انگریز پرنسپل کے ساتھ بھاگ چکی ہیں۔ اور انکی سبز آنکھوں والی بیٹی ریٹا سیٹیاں بجاتی ہے اور تاروں کی چھاؤں میں رس بھری کی ٹھنڈی کونپلوں کے خواب دیکھتی ہے۔ اپنی ماں جیسے۔ اور اس کی ماں کی ماں نے بھی یونہی ہلکی ہلکی سیٹیاں بجائی ہوں گی — نجانے میں یہ سب کیا لکھ رہی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ یونہی ہوتا آیا ہے۔ نظام عالم کی تشکیل و تنظیم اسیطرح ہوئی ہے بھئی۔

لیکن حماقت دیکھئے کہ فرسکو کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ نسلوں کے اختلاط سے منتج مسائل کے حل کے لئے انٹرنیشنل ہیلتھ بیوریو اور لیگ آف نیشنز قائم کی جاتی ہیں لڑائیاں لڑی جاتی ہیں۔ حالانکہ اس ساری دردسری کے باوجود ان پروبلمز کو نہایت آسانی اور اطمینان کے ساتھ نہایت نفاست سے انڈیا گیٹ کے آس پاس، تاج کے سوتوں اور درسوا کی کانجوں میں کر حل

کردیا جاتا ہے۔ غور فرمائیے کہ انہی سیٹیوں اور جابی مسکراہٹوں کے نقرئی اور غیر مرئی تار کے سہارے یہ دنیا رقصاں ہے۔ ورنہ ہم سب کب کے ختم ہو چکے ہوتے۔ کرّے میں حرارت کی نورمل ڈگری برقرار رکھنے کیلئے یہ ساری باتیں بے حد ضروری ہیں۔ اور اس نکتے کو وہ زرد رو عیسائی لڑکی، اور میری بہن ریٹا اور شاہدہ اکرام جو چند ماہ میں جونیر آفیسر سے ایکدم سینئر کمانڈر ہوگئی، اور میری آنٹ ربیکا، سب اچھی طرح سمجھ چکی ہیں۔

چنانچہ یہ ہم لوگ ہیں، غور فرمایا آپنے؟ اگر غور نہیں فرمایا تو اور بھی اچھا کیا۔

مجھ سے ملئے۔ میں جو اپنی گوناگوں قابلیتوں پر بہت نازاں ہوں۔ بچپن میں کونونٹ میں تھوڑی سی فرنچ سیکھی تھی اب وہ بالکل یاد نہیں رہی مگر ٹ کے رومانتیک تلفظ کے ساتھ انگریزی کے چند خاص خاص الفاظ اس طرح استعمال کرتی ہوں جیسے مجبوراً انگریزی بولنی پڑ رہی ہے۔ بچپن میں ایک دفعہ والدین کے ہمراہ یورپ گئی تھی شاید دو مہینے کیلئے۔ اب جو کسی نئے شخص سے تعارف ہوتا ہے تو میں اسے کہتی ہوں ــ مجھے یاد پڑتا ہے شاید میں نے کونٹینٹ (continent) میں کہیں آپ کو دیکھا تھا۔ وہ بیچارہ فوراً مرعوب ہو جاتا ہے۔ دیگر اوصاف حمیدہ یہ ہیں کہ بہترین conversationalist ہوں۔ پہلے جب ٹینس کا بیحد شوق تھا تو آپ پر ثابت کر سکتی تھی کہ ابھی ابھی سمنت مصرا کو ہرا کر چلی آرہی ہوں۔ اب کچھ عرصے سے افسانہ نگاری شروع کر دی ہے۔ اور اپنے ہر افسانے میں ایک پیکارڈ یا ایک اسٹوڈی بیکر کار کا ذکر کر دینا ضروری خیال کرتی ہوں۔

اور ان چمکیلے دنوں اور سنہری راتوں کا کارواں اس طرح گذر رہا ہے

ہم بڑھتے جاتے ہیں۔ اسی منزل کی جانب جو مے فیئر کی نیلی روشنیوں سے کہیں آگے، چھپی ہوئی ہے۔ طلعت کی "قومی جنگ" اور دیہاتی گیتوں کے مجموعے، شکنتلا کا تان پورہ، ریتا کی کے اسکیٹس، میرے ٹینس ریکٹ اور افسانے — ہم سمجھتے ہیں جیسے ان چیزوں نے ہماری گہرائیوں کو پالیا ہے یہ ہماری شخصیتوں، ہماری طبیعتوں کی نمائندگی اور رہنمائی کرتی ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے۔ ہمیں ان چیزوں سے بھی اتنی ہی نفرت ہے جتنی دنیا کی کسی اور معمولی چیز سے ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم اپنی جگہ سے ہٹ کر اپنی ہار ماننے کا خیال بھی نہیں کرنا چاہتے۔ دنیا کتنی بے انتہا اکتا دینے والی گھسی ہوئی اور گھٹیا جگہ ہے۔

طلعت "ذہن پرست" ہے (اس اصطلاح سے میں ابھی چند روز ہوئے اشک کے ایک ڈرامے کے ذریعے واقف ہوئی ہوں) یونیورسٹی میں بھی سب اسے انٹلکچوئل اور جانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔ لیکن اس وقت میں اس سے کہوں کہ اگر وہ مستقل اس پوز سے اکتا گئی ہو تو کوئی دوسرا زیادہ دلچسپ مشغلہ شروع کر دے تو وہ یقیناً رو پڑنے کے علاوہ اور کچھ نہ کریگی۔ حالانکہ وہ کہتی ہے کہ وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔

وہ "قومی جنگ" پر عائد پابندی کے خلاف ایک زوردار احتجاجی مقالہ لکھنے میں محو ہے۔ شکنتلا تان پورے کو ٹیون کرنے کی کوشش میں مشغول اور میں اس پر مصر کہ چونکہ میں موسیقی کے میرس کالج میں سیکنڈ ایئر تک رہ چکی ہوں اسلئے تان پورے کے سُر درست کرنے کا حق قانوناً مجھ تک زیادہ پہنچتا ہے خصوصاً جبکہ بارش میں لالہ کے پودے نکھر رہے ہیں اور کیپٹن عثمان کی سیٹیاں برساتی ہواؤں میں تیر رہی ہیں۔ آسمان پر ایک طویل و وسیع اکتاہٹ طاری ہے۔

رم جھم جھم بدروا برسے۔ رم جھم —

شکنتلا وارشنے جو تان پورے سے سر ٹیک کر گوڑ ملہار کا خیال گاتی ہے۔
طلعت جو سامراج اور فاشیت کے خلاف قہوے کی پیالیوں کے ذریعے لڑ رہی ہے
اور رتیا جس کی آنکھوں کی سبزی میں ہمیشہ سکون اور خاموشی جھلکتی ہے
—— محمد شاہ پیا سدا رنگیلے —— محمد شاہ آہ پیا سدا رنگیلے — ان جن جیراترے
جیراترے کا ساون کے مہینے سے کیا خاص تعلق ہے؟

ہیولاک ایلس کا مطالعہ کرو۔

اوُف —— اے خدا —— کاش وہ سارے بکھرے ہوئے نغمے ایک مضراب سے جاگ اٹھیں جو صدیوں سے تان پورے کے تاروں میں سمٹے ہوئے ہیں۔ وہ پرانے تار جو ہندوستان کے رنگیلے پیاؤں کے درباروں میں چھیڑے جاتے تھے وہ رنگیلے پیا جنہوں نے ہندوستان کی تاریخ کو اتنا ضخیم بنا دیا کہ مقابلے کے امتحانوں میں ان کے متعلق جواب لکھ کر پی سی ایس بنا جا سکے۔

دیکھا آپ نے۔ ہم چاروں کو سیاسیات میں بھی دخل ہے۔

مجھے تمہارے میر قاسم اور تمہارے آصف الدولہ اور تمہارے جان عالم سے قطعی کوئی ہمدردی نہیں۔ طلعت بیٹھے بیٹھے نجانے کیا سوچتے ہوئے یکلخت کہہ اٹھتی ہے۔ وہ عوام کی کہاوتوں اور گیتوں کی ریسرچ کر رہی ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔

برسو رام دھڑاکے سے۔ بڑھیا مر گئی فاقے سے۔

کتنا زبردست اور عظیم الشان انکشاف ہے کہ عہد زرّیں میں سامراج اور بنگال سے پہلے، بڑھیاں فاقے سے بھی مرا کرتی تھیں۔

قش —— کیپٹن عثمان۔

ایک نقطے پر ہم ہر پھیر کے آتے آتے رک جاتے ہیں۔

جہنم میں جائیں تمہارے کیپٹن عثمان اور جانعالم پیا — سب کے سب۔ اور میری بادام جیسی آنکھوں میں پانی چھلک آتا ہے۔ مجھے اپنی بیکار تاریخ، مردہ بادشاہوں سے عشق ہے۔ میں انھیں مورد الزام ٹھیرتے دیکھنا برداشت نہیں کرسکتی۔ اودھ کے وہ پرانے بادشاہ جن کی عطا کی ہوئی جاگیروں کی آمدنی اور معجونیں کھاتے کھاتے میرے سارے بزرگوں نے مسہریوں پر انتقال کیا۔ وہ بزرگ جنکی خلعتوں والی روغنی تصویریں۔ ڈرائنگ روم کی شان میں اضافہ کرتی ہیں اور پکار پکار کر کہتی ہیں کہ اے آنے والے تم ایک تعلقہ دار کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہے ہو جسکے پردادا کے پاس پینتالیس گاؤں تھے اور جس کے پرپوتے نے فروخت اور ضبطی کے سلسلے کی چوالیسویں کڑی تک پہنچکر آخری گاؤں کے روپے سے ایک رولس خریدی جس کو "Village on wheels" کہلاتا سنکر وہ اتنا خوش ہوتا تھا جیسے وہ خود جانعالم کا بھتیجا ہے، وہ جانعالم جس کا ملک ویلزلے اور ڈلہوزی کی کوچ کے پہیوں کی رگڑ سے ترش ترشا کے سات سمندر پار کے جگمگاتے "تاج کا کوہ نور بن چکا ہے۔ اور وہ ملک جس پر کبھی غروب نہ ہونے والے آفتاب کی کرنیں تین سو سال سے مستقل برس رہی ہیں جن کی تمازت سے کھیت اور وادیاں سونا اگلتی ہیں اور انسان سڑک کے کنارے پٹریوں پر نیم برہنہ سوتے ہیں اور اکثر وہیں مرتے بھی ہیں —

اور "مدر انڈیا" کے گرد پوش والی دیوداسی کے پازیب کی جھنکار گونج اٹھتی ہے۔

ریٹا چپ چاپ سے فیئر کے نئے رقص کے متعلق سوچ رہی ہے۔ کیپٹن عثمان کی کوٹھی میں ریڈیو گرام بجا رہتا ہے۔ ایف کیسا نووا کا آرکیسٹرا اور اسکے ساتھ پنکج ملک کا گیت — پران جا ہیں — نینا نہ جا ہیں — پران جا ہیں کیپٹن عثمان جنہیں

اپنی خوبصورتی اور قابلیت کیوجہ سے مغالطہ ہے کہ سارے جہاں کی لڑکیاں ان پہ ایک ساتھ جان دیتی ہیں۔ کیپٹن عثمان آئی اے ایم سی میں ہیں۔ ایک دفعہ ایکٹنگ میجر رہ چکے ہیں اور کہتے ہیں کہ بہت جلد لفٹنٹ کرنل ہو جائینگے جو یقیناً بہت بڑی بات ہے کیونکہ میڈیکل کالج سے نکلے ابھی انہیں پورے تین سال بھی نہیں ہوئے۔ ان کے باپ بھی فوج میں تھے اور دادا بھی اور پردادا بھی۔ انکا راجپوت خاندان جان لارنس کے زمانے سے دولت انگلیشیہ کا جاں نثار و وفادار رہا ہے۔ اور پنجاب میں ستلج کے کنارے ان کے بہت سے چک ہیں۔ جو غالباً انہیں بھی کسی پرچے پر خون سے لکھے ہوئے الفاظ میں ان کے پردادا کی غدر کی فوجی خدمات کے اعتراف کے صلے میں ملے تھے (ستلج کے وہ کنارے جہاں آلاؤ کے گرد اور بیریوں کے نیچے اور چوپال میں بانسریاں بجتی ہیں اور احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی قسم کے رومان جنم لیتے ہیں)۔ کیپٹن عثمان دلاور و سورماؤں کی اسی زرخیز سرزمین کے فرزند ہیں وہ جاپانی شہنشاہیت اور فسطائیت کے خلاف نہایت تندہی سے سرگرم عمل ہیں۔ زخمیوں کو تندرست کرکے دوبارہ محاذ پر بھیجتے ہیں اور اپنی یونٹ کی سرخ ہونٹوں اور نارنجی بالوں والی نرسوں سے فلرٹ کرتے ہیں۔ ان کا بیٹا بھی اپنی خاندانی بہترین روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے آئندہ پچیس سال بعد بین الاقوامی سیاست کی لیبورٹری میں تیار شدہ کسی نئی "ازم" کے خلاف لڑے گا اور فلرٹ کریگا۔

تو آپ کیپٹن سے ملیں؟ مے فیئر تشریف لائیے۔ یہ آپکے ساتھ بہترین پولکا کریں گے۔ اور رُمبا۔ اور فوکس ٹروٹ۔ اگر آپ کو واپس گھر لوٹنے میں خنکی کیوجہ سے زکام ہوگیا ہو تو یہ ہسپتال سے دن میں پندرہ مرتبہ فون کرکے آپ کو یقین دلائیں گے کہ آپ کے زکام کی وجہ سے انہیں فکر کے مارے رات بھر

نیند نہیں آئی۔ اور آپ رات بھر چاندنی میں رس بھری کی خوشبوؤں کے خواب دیکھتی رہیں گی۔ پران جا ہیں۔ ممکن ہے اخلاقی جرأت کی کمی کی وجہ سے نینا نہ چاہتے ہوں۔ اسی وجہ سے طلعت پوسٹ وار ورلڈ کے مضامین کے ڈھیر پر چڑھی بیٹھی رہتی ہے۔ یہ بھی بقول شکنتلا ایک بڑا اہم سائیکولوجیکل نکتہ ہے۔

لہذا اے میرے گلفام سب کیوٹ۔ ہم سارے کے سارے رات کے کہرے میں چھپی ہوئی اس مآل پر رواں ہیں۔ ایک دوسرے کی نظروں سے بچتے ہوئے۔ میں اور تم۔ اور ریٹا میری بہن اور پیکرڈ میری کار۔ اور ہمارے پیچھے پیچھے ان کہی پہیلیوں اور جانے بوجھے سوالیہ نشانوں کا عظیم الشان کارواں دبے دبے قدموں سے، گرتا پڑتا چلا آرہا ہے۔ ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ مڑکر ا[illegible] دیکھ سکیں۔ ہم اس سے چھپنے کیلئے مے فیر کے نیلگوں دھندلکوں میں پناہ لیتے ہیں بال روم کے ٹیریس پر کھلے آسمان اور چمکیلے ستاروں کے نیچے اپنی بلندی پر سے جھک کر دیکھئے۔ زندگی کا یہ مارچ پاسٹ۔ تازہ ڈانس نمبر کے یہ اداس نغمے — ریٹا رنگین برقی قمقموں جاپانی قندیلوں اور کاغذی ربنوں کے رقصاں و لرزاں سائے تلے آہستہ آہستہ ناچ رہی ہے۔ نپے تلے، تھکے تھکے قدموں سے۔ آج فتح برلین کے جشن کی رات ہے۔ ڈانس کے دوسرے نمبر کے لئے اپنے پارٹنر کا انتظار کرتے کرتے ٹیریس کے ریلنگ کے سہارے مجھے مدھم سی نیند آجاتی ہے۔ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ریلنگ کتنی پرسکون جائے پناہ ہے —

ہم لوگ —— !

بیچارے —— !!

الطاف مشہدی

کِسان

آرزؤں کی کمر جھکتی ہوئی
سانس چلتی ہے مگر رکتی ہوئی
تیرہ و تاریک سائے آس پاس
حال مرجھایا ہوا ماضی اُداس
غم کا مرکز، آرزوؤں کا مزار
پیٹھ پر لادے ہوئے نسلوں کا بار
ایک بوڑھا نوجواں
ہل کی ہتھّی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اِک کِسان
خامشی اِک مضطرب فریاد ہے
مسکراہٹ ظلم کی رُوداد ہے
ہونکتے سینے میں کچھ چنگاریاں
غیر کی بخشی ہوئی بیماریاں
جبر کی زنجیر جس کے پاؤں میں
پل کے نکلا سُود جس کی چھاؤں میں
بن چُکا جو داستاں
ہل کی ہتھّی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اِک کسان
خون جس کا غازۂ لیل و نہار
جس کی محنت سے وقارِ شہریار
جس کے بیلوں کا پسینہ سیم و زر
جس کے کھیتوں میں اُگیں لعل و گہر
جس کی مٹھی میں حیاتِ ملک و قوم
جس کی ہستی کائناتِ ملک و قوم
وہ جسے بے آب و ناں
ہل کی ہتھّی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

ہل قلم ہے کاتب تقدیر کا کھیت نقشہ زیست کی تصویر کا
نرم رو ہریالیاں ہیں مست خواب جانفزا منظر اُگلتے ہیں شراب
خلد در دامن ہیں سادہ نکہتیں، میکدہ نغمے ہوئے ہیں نزہتیں

اور بھوکا ہے کسان
ہل کی ہتھّی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

جو لہو مجبوریوں کا پی گیا موت نے مارا اُسے وہ جی گیا
جو حوادث پر مسلّط ہو گیا غم کے کانٹوں پر مچل کر سو گیا
ظلم کی آندھی چلی تو ڈٹ گیا خم نہ گردن میں پڑا اور کٹ گیا

غیرتوں کا پاسبان
ہل کی ہتھّی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اِک کسان

سوچتا ہے کس قدر مجبور ہوں زندہ رہ کر زندگی سے دُور ہوں
خامشی میری مگر طوفان ہے میرے سینے میں بپا ہیجان ہے
پیشگوئی ہے یہ اِک بھونچال کی یہ علامت ہے کسی جنجال کی

پھٹ پڑے گا آسمان
ہل کی ہتھّی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

علامہ تاجور نجیب آبادی: "اقبال کے بعد زمانہ نے ایک کروٹ بدلی اور شعرا کے نوجوان طبقے میں جوش اور الطاف جیسے نبض شناس شاعر پیدا ہوئے"
"دگر" الطاف مشہدی کی انقلابی نظموں کا تازہ مجموعہ ہے۔ قیمت عہ
لاجپت رائے اینڈ سنز لوہاری دروازہ لاہور

فکر تونسوی

جاؤ، کہدو! —

ساز کی اوٹ میں دبکے ہوئے نغموں سے کہو
تم کہ باندھے رہے جس ضرب پہ اُمیدِ حیات
وہی مضراب، جو ناپیدا دبلے ساز رہا
وہی طوفاں، جو فضاؤں میں اُچھالیگا تمھیں
تمہیں پہنائیاں بخشے گا جو سیلِ بے وجود
وہی پردہ جسے تکتی ہیں سمٹتی نظریں
رنگ و ریشم کا وہ افسوں، جسے توڑا نہ گیا۔
وہ سحر، ہے جو اندھیرے میں لگائے ہوئے گھات
جس کے چہرے پہ ہے ہر لحظہ دُھندلکوں کا ورود

وہی مضراب، وہ پردہ، وہ سحر، وہ طوفاں
(وعدہ و وہم کے ذرّات کی تسبیح حسیں)
اور کچھ ہے بھی سہی —؟ کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں
گوشہ ساز میں دبکے رہو یا بہ جولاں
آرزوؤں کی یہ مالائیں پھراتے جاؤ — !

بے طلب — "تا بہ ابد، "تا بہ ابد، "تا بہ ابد
دکھ سہو دکھ — ! کہ اسی رتیلے صحرا سے کبھی
سکھ کا اک چشمۂ سرمست اٹھے گا شاید
جو تمہیں کربِ مسلسل سے رہا کر دے گا۔

ختم ہو جائیگا یہ معرکۂ زیست و اجل

اور وہ بازیگر کو نغمں، جسے تاب نہیں
کسی مضراب کی، طوفان کی تخلیق کرے
اک نئے ساز سے بہلائیگا پھر محفل کو
ساز کی اوٹ میں دبکے ہوئے نغموں سے کہو
—— جاؤ، کہدو!

نیا دور کی چند ایجنسیاں

لاہور: مکتبۂ جدید، انارکلی چوک
گجرانوالہ: ادبی کتب خانہ، چوک نیانی
امرتسر: اخبار گھر، ہال گیٹ۔
انبالہ: انگلش بک ڈپو، نیوز ایجنٹ،
انبالہ چھاونی
ہوشیارپور: میم چراغ الدین،
نیوز ایجنٹ، کلارین گیٹ
کیمبلپور: پروگریسو بک ڈپو۔
راولپنڈی: ہومی بک شاپ، بازار تلواڑاں
پشاور: صادق کمیشن ایجنسی، بازار قصہ خوانی
بنگلور لشکر: فردوسی بک ڈپو،
اولڈ پور ہوز روڈ

حیدرآباد (دکن): دکن بک ڈپو، عابد روڈ،
پٹنہ: نیا سنسار کتاب گھر، بانکی پور
بمبئی: احمد بخش بک سیلر، جے جے ہسپتال ناکہ، بمبئی ۳
دہلی: ریجنٹ نیوز ایجنسی، نئی سڑک۔
ناگپور: قریشی بک ڈپو، ہنسا پوری
جمشید پور: محبوب صدیقی ۲۲ آم بگان روڈ
آرہ: ذوالفقار حیدر، نیوز ایجنٹ، محلہ مہادیو
پونہ: شیخ چاند یوسف، نیوز ایجنٹ،
۵۵ وٹھل پیٹھ، پونہ سٹی۔
کلکتہ: عثمانیہ بک ڈپو، ۱۵۴ لوور
چت پور روڈ
بنگلور سٹی: سنٹرل پبلشنگ ہوز،
سلور جوبلی روڈ

سرلا دیوی

کلنک

سمشان میں مٹی کے بیکار تودوں کیطرح تمام قصبہ دوپہر کی گرمی میں خاموش پڑا لرز رہا تھا۔ آشا اپنے مکان کی سب سے اونچی چھت پر بیٹھی ہوئی افق تک پھیلے خشک مٹیالے کھیتوں میں ناچتے بگولوں کو دیکھ رہی تھی۔ قصبہ کے ایک کونے پر آسمان میں بہت سے چیل کوے منڈلا رہے تھے اور وہاں سے ڈھول نقاروں کی گھمی گھمی آوازیں کبھی کبھی ابھر کر سنائی دیجاتی تھیں۔

"آج رمیش کی شادی ہے" ان منڈلاتی چیلوں کے نیچے وہ نوشہ بنا بیٹھا ہوگا" —— آشا نے ادھر سے منہ ہٹا لیا۔ سورج کی گرمی سے پیپل کے پتے مرجھا کر مردوں کی ہتھیلیوں کیطرح اداس لٹک رہے تھے اور پیڑ پر ایک کوا زور زور سے کائیں کائیں کر رہا تھا۔ "پٹ" —— یکایک مٹھائی کا ایک ٹکڑا آشا کے سامنے چھت پر آگرا۔ اور ایک چیل فوراً ہی جھپٹ کر اسے اڑا لے گئی۔ "رمیش کی شادی کی مٹھائی کا ٹکڑا" —— اور چلچلاتی ہوئی دھوپ میں آشا کو محسوس ہوا اس کے سینے میں متلی کے ہلکے ہلکے بگولے چکرا رہے ہیں اور پسینے چیونٹیوں کیطرح جسم پر رینگ رہے ہیں۔ "ارے تیرے تو پیٹ میں بچہ ہے" —— پیپل پر کائیں کائیں کرتا کوا ڈاکٹرنی کے الفاظ کو طشت از بام کر رہا تھا۔ "ہاں میرے پیٹ میں بچہ ہے۔ جس کا تعلق اس مٹھائی کے ٹکڑے کیطرح رمیش سے ہے" —— یکایک آشا کا کلیجہ ایک بھیانک تخیل کی دھمک سے دہل اٹھا۔ "ابھی تک بچہ کی بات کوئی نہیں جانتا۔ مگر کل جب......" اور پسینے کی موٹی بوندیں ننھے آبلوں کی طرح اس کی پیشانی پر چھلک آئیں!

. . . . . اور اس رات جب جاڑا کہرے اور دودھیا چاندنی میں گھل کر لان پر اوس کے قطروں میں ڈھل رہا تھا۔ اور نارنگی کے جھنڈوں میں چٹخنی ہوئی کلیوں نے اپنی خوشبو سے فضا میں خاموش جھنکاریں پیدا کر دی تھیں گو رات رانی کے کنج کی اوٹ میں وہ رمیش کی آغوش میں پڑی تھی . . . . . اب وہ سوچ رہی تھی۔ اس رات کے نیلے کہرے اور ان چکراتے بگولوں میں۔ اس رات کی خنک چاندنی اور اس چلچلاتی دھوپ میں۔ لان کی تازہ اوس اور پیشانی کے ان پسینوں میں۔ اس رات کی شرابی دھڑکنوں اور کلیجہ کی اس دہل میں کتنا بھیانک فرق ہے ان دو حدود کے درمیان اس کی زندگی نے کس قدر بھیانک کروٹ لی ہے۔ آشا کا سر چکرا اٹھا۔

× × × × × × × × ×

اس رات رمیش کے پاس سے آنے کے بعد تمام رات وہ ایک انجان لذت ایک ناقابل برداشت نشہ کی وجہ سے سو نہ سکی تھی ذہن پر نشہ اور خواب کہرے کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ مگر سویرا ہوتے ہی اس نشہ کی کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ لان میں اسی رات رانی کے کنج کے قریب محلے والے جمع تھے۔ "کہیں رات کا راز کسی پر افشا تو نہیں ہو گیا؟" ـــ مگر ایک بچہ کی چیخ نے اسے سہارا دیا۔ کمرے سے باہر آکر اس نے دیکھا ـــ لان کی ہری گھاس پر ایک نوزاد بچہ ننگا پڑا بلک رہا تھا۔ اور خون اس کے گرد لال چیتھڑوں کی طرح پڑا تھا۔

"ارے اس حرامزادی کو اپنا کلنک پھینکنے کیلئے یہی جگہ ملی تھی"۔ اس کی ماں بلند آواز میں کہہ رہی تھی۔ کوئی عورت اپنے نوزاد بچہ کو لان پر پھینک گئی تھی۔

"اجی دیکھئے۔ بچہ کسی اچھے خاندان کا معلوم ہوتا ہے جسم سے لپٹا ریشمی رومال یہی ظاہر کرتا ہے"۔ اس کے والد کہہ رہے تھے اور محلے کے پنڈت جی

رام نام پڑھ کر اعلان کر رہے تھے۔

"اجی یہ آج کل کے لڑکے لڑکیاں پڑھ کر اور سیکھتے ہی کیا ہیں؟ یہ انگریزی تعلیم......."

اور کلنک کا نشان بڑا چیخ رہا تھا۔ لیکن یہ بچہ آخر اس طرح پھینکا کیوں گیا؟ کیا اسکی ماں کے سینہ کا دودھ خشک ہو گیا تھا؟ کیا اسکے باپ کے پاس پرورش کیلئے پیسے نہ تھے؟ کیا اس بچہ کی معصومیت چھلکتے ہوئے ہاتھوں کو اسے سینے سے لگا لینے کیلئے مجبور نہ کر سکی؟ —— آشا کے ذہن میں ایک ساتھ یہ سوالات اٹھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں پولیس کے لال پگڑی والے سپاہی آ گئے اور بچّہ کا بڑے غور سے معائنہ کرنے لگے۔ بچّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور پولیس والوں کی رہبری کرنے والے ساٹھ سالہ سیٹھ ہری چند کہہ رہے تھے۔ "بچّہ کو غور سے دیکھئے۔
.... باقی یہ آج کل کی تعلیم یافتہ لڑکیاں......."

اور غیر شعوری طور پر آشا کے دل میں آیا کہ ان تمام آدمیوں کے منہ نوچ ڈالے اور ناک پر انگلیاں رکھ کر آنکھیں مٹکاتی عورتوں کی پتلیاں نکال لے۔ "تنقید اور تبصرہ آرائی کے بجائے یہ لوگ اس بچّہ کو کیوں نہیں اٹھا لیتے۔ اور یہ سیٹھ جی....." آشا کا تمام غصہ ان سیٹھ جی پر برس پڑا۔ "آخر یہ سیٹھ جی اس بچہ کو اٹھا کر گھر کیوں نہیں لے جاتے؟ — خاندان چلانے کیلئے یہ ایک لڑکی اگلے مہینے خرید کر لا رہے ہیں۔ کیا یہ بچہ ان کے خاندان کو نہیں چلا سکتا؟ کیا انکی عنقریبی موت کے بعد اس لڑکی کی تا عمر بیوگی ہی ان کے خاندان چلانے کے لئے ضروری ہے؟" آشا کے خیالات ایک لمحہ کیلئے اس نوجوان لڑکی پر منتقل ہو گئے جس کو بیاہ کر سیٹھ جی لانے والے تھے، ماں باپ کے دروازے بند پا کر بھوک۔

عصمت دری اور موت کے دہانے کھلے پاکر وہ لڑکی خود کو سیٹھ جی کی آغوش میں ڈال دے گی۔ تب ایک طوائف کیطرح وہ اپنا بدن ان سیٹھ جی سے کچلوائے گی انکی دہندلی آنکھوں میں اپنے جذبات کی نئی لو کو ہمیشہ کے لئے بجھا دے گی۔ اس کی آرزوئیں اس ناجائز بچے کیطرح ہمیشہ کیلئے ممنوعہ اور ناجائز قرار دے دی جائیں گی۔ ان حالات میں پیدا ہونے والا بچہ کیا "جائز" کہلانے کا حقدار ہوگا؟ کیا وہ بچہ پھر ناجائز نہیں ہوگا؟ اس کی ماں اس بچہ کی ماں کی طرح کلنکنی اور باپ بدمعاش نہیں ہوگا؟ محض اسلئے کہ پنڈتوں اور کمینوں کو چند آنے رشوت کے مل جائیں گے وہ بچہ جائز ہو جائے گا —— آشا کا چہرہ انگاروں کیطرح دہک اٹھا۔ بچہ اب روتے روتے تھک گیا تھا۔ صرف سردی سے ٹھٹھر کر کبھی کبھی سسک اٹھتا تھا۔

پولیس والے لوٹ گئے اور اپنے ساتھ یتیم خانے والوں کو لے کر دوبارہ آپہونچے۔ یتیم خانے والوں نے بچے کو ایک کمبل میں لپیٹا اور اٹھا کر لے جانے لگے۔ آشا کے جی میں آیا وہ زور سے چیخ پڑے۔ بچہ اب یتیم خانے میں پلے گا۔۔۔ وہیں بڑا ہوگا اور جب وہ اس قابل ہو جائیگا کہ بینڈ کے ساتھ گا سکے اور راہگیروں سے بھیک مانگ سکے تب اس کے سر پر پیلی ٹوپی منڈ دی جائے گی۔ نازک کندھوں پر بینڈ کی پیٹی چڑھا دی جائے گی۔ ہاتھ میں قفل صندوقچی پکڑا دی جائے گی اور تب شہر کی سڑکوں پر قصبوں کے محلوں میں بینڈ بجا کر وہ گاتا پھرے گا۔ "یہ غم کی کہانی ہے سن لیجئے"۔ "اے سیٹھ جی ایک پیسہ" "اے مائی ایک پیسہ"۔ "اجی حرامخوروں سے محنت مزدوری کر کے پیٹ بھرا نہیں جاتا" لوگ کہتے گذر جائیں گے۔ اور شام کو جب وہ منیجر کے سامنے خالی ہاتھ لوٹے گا تو اس کی روٹی بند کر دی جائے گی۔ "پیسہ مانگا بھی نہیں جاتا۔ جاؤ

آج کی روٹی بند ـــــ کھڑے کھڑے آشا کی آنکھوں سے آنسو ٹپک گئے۔ انسانیت کے ایک جزو ایک نفس کو آج ناجائز کہکر فقیر اور گداگر بنایا جا رہا ہے۔ کل فقیر اور حرامخور کہکر ٹھکرایا جائے گا اور پرسوں وہ تمام رات بھوکا تڑپ کر کسی کو پکارنا چاہے گا مگر کسی کو قریب نہ پاکر خود ہی روتے روتے سو جائے گا اور پھر صبح کو ـــ "ہم اناتھ یتیم۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس رات جب اس کی ماں کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا تو وہ خود کہنے لگی۔ "ان دونوں کا کیا بگڑا۔ اگر کچھ بگڑا تو ننھی سی جان کا۔ لڑکے نے کہیں شادی کرلی ہوگی۔ لڑکی رو پیٹ کر بہانے بنا کر شادی کرلے گی اور بس ـــــ مگر ماں کا کلیجہ بھی تو اس بچہ کو پھینکتے وقت پتھر کا ہوگیا تھا ـــــ عورت نہیں کوئی چڑیل ہوگی"۔ اور آشا نے بھی سوچا یہ تمام قصور اسی عورت کا تھا۔

* * * * * * *

ایکدن اسکول جاتے اس نے دیکھا۔ سڑک کے کنارے تین چار بچوں کے درمیان ایک بھکارن پڑی چلّا رہی تھی۔ "میم صاب ایک پیسہ" رانی صاب ایک پیسہ"۔ آشا جل اٹھی۔ "اگر بھوکی مرتی ہے تو بچے کیوں پیدا کرتی ہے۔ بے شرم"۔ مگر وہ صرف ایک بھکارن تھی ـــــ

"رانی صاب۔ میرا آدمی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ ان بچوں کی محبت مجھے تو تھی۔ انکو چھوڑ کر مزدوری کرنے کیسے جاتی۔ ابھی جسم پر مالش ہے۔ لوگ جاتے جاتے روٹی دئیے جاتے ہیں اور ساتھ میں ایک بچہ بھی"۔ آشا نے غور سے دیکھا ـــ چیتھڑوں سے اس کا ابھرا ہوا پیٹ جھانک رہا تھا" ارے کیا تیرے بچہ ہونے والا ہے" شیلا چونک اٹھی۔

اور پھر وہ تمام دن سوچتی رہی اس لغو مہمل فقرہ کے معنی ـــــ

'ماں کی محبت'۔ 'ماں کا کلیجہ'۔ ــــــ آدمی کے دھوکا کھا جانے پر اس عورت نے بچے کو لان میں پھینک کر بہت ہی اچھا کیا۔ وہ بیچاری کہاں تک ان ذلیل آدمیوں کے درمیان رہ سکتی تھی۔ 'جب یہ محبت کرتے ہیں تو اس کا ثمر ایک ناجائز بچہ' جب یہ رحم کھا کر ایک غریب ماں کو روٹی دیتے ہیں تو اس کی قیمت ایک بھکاری بچہ' ـــــــــ آشا بہت عرصہ تک سوچتی رہی یہ ذلیل غدّار انسان کس وقت تک اپنی ہی نسل کو طوائفوں۔ فقیروں اور یتیموں میں تبدیل کرتا رہے گا۔

× × × × × ×

آشا کو وہ دن بہت اچھی طرح یاد تھا جب وہ اپنے بھائی کے ساتھ بنگال گئی تھی۔ قحط پورے زوروں پر تھا۔ سینکڑوں مائیں طوائفیں بن گئیں۔ آدمی فقیر بنکر لقمۂ اجل بن گئے۔ اور کلکتہ کی سڑکوں سے گذرتے ہوئے اس نے دیکھا بہت سے ماں باپ اپنے بچوں کو زمین پر پٹک کر چلے جا رہے تھے۔ بہت سے والدین اپنے بچوں کو فروخت کر رہے تھے۔ اور آشا نے سوچا۔ 'یہ بچے تو ناجائز نہیں ہیں۔ انکی ماؤں کے کلیجہ تو پتھر کے نہیں ہیں۔ انکے باپوں نے، تو انکی ماؤں کو دھوکا نہیں دیا۔ پھر یہ بچے سڑکوں پر کیوں پڑے ہیں؟ فروخت کیوں کئے جا رہے ہیں؟ ان کو تو سماج کا کوئی خوف نہیں۔ پھر یہ کیوں؟ ــــــ "روٹی اور پیسہ" بنگال کا سوال اور جواب یہی تھا۔ اور اس وقت اسے معلوم ہوا۔ دھوکا۔ سماج کا خوف۔ ناجائز اور کلنک محض اس حالت کا نام ہے جب پیٹ میں بھوک لگتی ہے اور ہاتھ خالی ہوتے ہیں۔ انسان کی تہذیب' اس کا اخلاق' اسکی محبت خود اس چیز کے محتاج ہیں جس کو روٹی کہتے ہیں۔

× × × × × × ×

کئی دنوں سے آشا کا بدن ٹوٹا جا رہا تھا۔ گیلے آٹے کیطرح اس کا تمام جسم کچا کچا معلوم دیتا تھا۔ اسکی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور دل یونہی بار بار بری طرح دہل اٹھتا تھا۔ گویا اس کا جسم ایک بوسیدہ پرانی قبر بنگیا تھا —— اور ایکدن جیسے قبر دھم سے بیٹھ گئی۔

"ارے آشا تو نے یہ کیا ناش کر ڈالا۔ تیرے پیٹ میں تو بچہ ہے" اس کی دوست ڈاکٹرنی چلا اٹھی ....

"رمیش اب تم ہی میری عزت اور زندگی بچا ...."

"آشا میں بڑا شرمندہ ہوں۔ تم جس ڈاکٹر کی امداد لینا چاہو لو میں خرچ ادا کر دوں گا۔ مگر شادی .... دیکھو میرے والد کی ناک .... اور زبردستی انہوں نے میری شادی طے کر دی ہے .... دیکھو میں واقعی کتنا مجبور ہوں ورنہ ...."

آشا نے اس کی طرف دیکھا —— رمیش ..... محبت .... وہ .. دو انسانوں کے درمیان ایک رشتہ۔ فریب ... ناجائز بچہ .....

سچی محبت —— دو انسانوں کے درمیان ایک معصوم انسان کی تباہی اور ایک لمحہ کیلئے اسکی خواہش ہوئی کہ وہ رمیش کے گلے میں اپنا آنچل ڈالکر اس زور سے کھینچے کہ ..... مگر دوسرے لمحے اسے یاد آگئی انسانوں کی وہ تصویر جو اس نے بنگال میں دیکھی تھی۔ اس آدمی کو اپنے کتوں کی طرح ایکدوسرے سے روٹی ٹکڑے پر لڑتے مرتے دیکھا تھا۔ اپنی عورتوں کو راستے میں چھوڑتے پایا تھا، اور بے دردی سے بچوں کو سڑک پر پٹختے دیکھا تھا —— دن کی روشنی میں، ایک اعلیٰ پیمانہ پر۔ پھر وہ کیا پرواہ کرے گا اس عورت کی جو خود دنیا کی نظروں سے چھپنا چاہے گی۔ اس بچہ کی جو ابھی پیدا نہیں ہوا ——

" جاؤ رمیش شادی کرلو۔ باپ کی ناک برقرار رکھو۔ اور جب میں ایک بھکارن بنکر سڑک پر تم سے پیسہ مانگوں تو اپنے ہونے والے بچہ کیطرف اشارہ کرکے کہنا ـــــ " ابے بچہ پیدا کیوں کرتی ہے۔ جاؤ نکل جاؤ یہاں سے!!۔

× × × × × × × ×

اور بھورے خشک کھیتوں میں ایک بگولہ ہمہ تن رقص آسمان میں چڑھ رہا تھا۔ ایک زخمی گدھا اپنی پیٹھ کے زخم سے ایک کوّے کو اڑانے کی کوشش میں رینک رہا تھا۔ آشا ایک گاڑی میں پڑی ہوئی اپنی ماں کے ساتھ اپنے "کلنک کو دھونے کیلئے کسی دور کے گاؤں میں جا رہی تھی۔" نہ جانے بچّہ لڑکا ہوتا یا لڑکی" ـــــ ایک لمحہ کیلئے وہ جذباتی ہو اٹھی۔ مگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آسمان میں بہت سے چیل کوّے منڈلا رہے تھے۔ اور اسکی ماں گرمی سے پریشان ہوکر کہہ رہی تھی۔ " ہائے تونے سارے خاندان کی ناک کاٹ ڈالی ـــــ ورنہ ایسی آگ برستی دوپہری میں یوں کیوں اپنی تقدیر پھوڑتی ہوتی"۔ اور معصوم گاڑی وان ہائوں کے سلسلہ کو گرمی کی شدت سے متعلق سمجھ کر کہہ رہا تھا۔

" مائی گھبرا مت۔ چیلیں منڈلا رہی ہیں۔ جلدی ہی بارش ہوجائے گی"۔

اور آشا کی آنکھ سے کھسک کر ایک سہما سا آنسو پسینوں میں چھپ کر آہستہ آہستہ بہنے لگا ۞

[illegible] گوری [illegible]
[illegible] چودہ لطیف [illegible] مضامین
[illegible] منتخب [illegible] مجلد [illegible]
افسانوں اور ڈراموں سے [illegible] ایک روپیہ بارہ آنہ
سرورق [illegible]
ساقی بک ڈپو دہلی

صمد شاہین

جنگ اور ادب

یہ تقریر جولائی ۱۹۴۴ء کے آخری ہفتہ میں آل انڈیا اردو کانگریس حیدرآباد کے اجلاس شعبۂ ترقی پسند ادب میں جس کی صدارت جناب سید سجاد ظہیر صاحب نے فرمائی، کی گئی۔

جنگ اور ادب کے بارے میں مجھے چند شکوک ہیں وہ میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیدی جملوں میں میں وقت صرف کرنا نہیں چاہتا۔ کچھ عرض حال کہکر بڑھ جاتا ہوں۔ کوئی بیس دن پہلے جب میں نے اردو کانگریس کے دعوت نامہ کا جواب بھیجا تھا تو "جنگ اور ادب" کے عنوان پر مقالہ پڑھنے کی اطلاع دی تھی۔ پھر جب ڈاکٹر زور صاحب سے بنگلور میں ملاقات ہوئی تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کانگریس میں بہت سے مشہور اور مانے ہوئے ادیب بھی تشریف فرما ہوں گے۔ مجھے امید نہ تھی کہ اس مجلس میں میرے لئے بھی کچھ وقت نکالا جائے گا۔ اور میں نے مقالہ پڑھنے کا خیال قریب قریب ترک کر دیا۔ لیکن تین دن پیشتر جب مجھے اس اجلاس کا پروگرام ملا۔ اور میں نے اپنا نام بھی اس میں شامل دیکھا تو مجھے میرے اس بہانہ بنا کر پیچھا چھڑانے کے خیال پر سخت افسوس ہوا۔ مقالہ میں نے کوئی تیار نہیں کیا ہے۔ اور مقالہ شاید اس مضمون کو کہتے ہیں۔ جو تحقیقی ہو اور جس میں کوئی نیا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہو۔ اس لحاظ سے تخلیقی بھی۔ ظاہر ہے میں اپنے خیالات کو ایک مضمون کی صورت دے بھی دیتا تو اس میں یہ چیزیں کہاں سے ہوتیں۔ اس میں بھی جنگ اور ادب کے بارے میں وہی شکوک اور شبہات ہوتے جو میں اب آپ کے سامنے رکھوں گا۔

دو سال پہلے ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر میں نے اردو میں پانچ چھ

افسانے لکھے۔ میں انہیں ترقی پسند کہہ لیا کرتا تھا۔ اس لئے کہ ان افسانوں کا مو میں نے زندگی سے لیا تھا۔ نچلے متوسط طبقے کی زندگی سے اور ان میں حقیقت کو سم اور سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ اس وقت سب سے زبرد حقیقت تو جنگ ہے اور اگر حقیقت نگاری کا مجھے دم بھرنا ہے تو جنگ کے بارے میں چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ سرزمین ہندوستان ابھی جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں نہیں گو اس آگ کا ایک تیز جھکڑ آسام کی راہ سے اس کے دامن تک پہنچ چکا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گنتی کے چند بم جو کلکتہ اور مدراس کے ساحل پر گرائے گئے۔ اس تباہی کے مقا میں جو جنگ زدہ ملکوں پر چھا رہی ہے۔ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ لیکن اس سے کس کو انکار ہے کہ جنگ کے روز اول ہی سے ہندوستان جنگ میں شریک ہے۔ اپنی مرضی سے نہیں تو زبردستی۔ اور جنگ کے اثرات ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں رونما ہیں ایک اشیاء کی گرانی ہی کا مسئلہ لے لیجئے۔ جس کی انتہائی اور بھیانک صورت ہمیں بنگال کے قحط میں ملتی ہے۔ ہندوستان کی زرخیز زمین سونا اگلے لیکن اس کے بیٹے بھوکوں مریں۔ اس دھرتی کی کوکھ سے اناج کے ڈھیر پیدا ہوں۔ اور اس کے سپوت دانہ دانہ کو ترستے ہوئے بے بسی کے عالم میں دم توڑیں۔ اس کا فوری سبب کچھ ہی ہو لیکن ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ اس کا اصل سبب تو جنگ ہی ہے۔ اور پھر ہم نے ہندوستان کے ہونہار نوجوانوں کو برما اور ملایا کے محاذ پر جاتے دیکھا ہے۔ ان میں تو اکثر واپس بھی نہیں لوٹے۔ انہیں آفریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں کو بھیجا ہے۔ اٹلی اور فرانس کے ساحل پر بھی وہ ہمیں نظر آتے ہیں۔ وہ وہاں کیسے رہتے ہوں گے، کیسے لڑتے ہوں گے۔ ان کے جذبات کیا ہونگے؟ جنگ کے بارے میں ان کا ردعمل کیا ہوگا؟ ان سب پر تو قیاس آرائی ہو سکتی ہے۔ لیکن اصل حقیقت سے میں ناآشنا ہوں گا۔ ہاں، یہاں ان کے خاندانوں پر جو بیتتی ہے، اس کے متعلق مجھے کچھ ذاتی علم ہے۔ میں نے ان کی ماؤں کو روتے

دیکھا ہے، انکی بیویوں کو سر پیٹتے دیکھا ہے۔ اکثروں کو پاگل ہوتے بھی دیکھا ہے۔ وہ زندگی سے یکلخت مایوس نظر آتے ہیں۔ ان کے مستقبل سے انہیں کوئی واسطہ نہیں انہیں امید کی ایک کرن بھی نظر نہیں آتی ان کو معلوم ہے کہ ان کے چہیتے صرف چاندی کے چند ٹکوں کے لئے اپنی جان جوکھم میں ڈال رہے ہیں۔

تو یہ حقیقت میرے سامنے تھی۔ اگر میں اس کا اظہار اپنی کہانیوں میں کرتا۔ اس سماجی ماحول کا نقشہ پیش کرتا اور پڑھنے والوں کی ہمدردی ان خارجی حالات کی طرف منعطف کرانا چاہتا تو مجھے یقین ہے کہ یہ رجعت پسند ذہنیت کا مظاہرہ ہوتا۔ کیونکہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جنگ ہندوستان کے لئے بھی قومی جنگ ہے اور اکثر اس بات کے قائل ہیں کہ شروع ہی سے یہ جنگ قومی جنگ ہے۔ اس جنگ کے دو دور نہیں ہیں ایک سامراجی دور۔ اور دوسرا سوویٹ روس پر جرمنی کے حملہ کے بعد کا دور۔ بلکہ شروع ہی سے یہ جنگ قومی جنگ ہے۔ شاید یہ بحث طلب مسئلہ ہے۔ جب کبھی مجھے اس جنگ کی نوعیت کے بارے میں شک ہوتا تھا۔ تو میرے دوست پروفیسر جی۔ ڈی پریکھ آف بمبئی اپنے زور استدلال سے مجھے منوا لیتے کہ یہ واقعی قومی جنگ ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی دل میں وہی شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے۔ اگر یہاں آپ مجھے یہ بتائیں کہ یہ ذہنی کشمکش میرے سیاسی شعور کے پختہ نہ ہونے کے سبب سے ہے تو میرا جواب ہوگا شاید ہو۔ لیکن میں اشارۃً کہہ دوں کہ ایسے نیم سیاسی شعور رکھنے والوں کی تعداد ادیبوں میں بھی بہت زیادہ ہے۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میرے ذہن میں الجھنیں پیدا ہو جاتیں کہ اس ہندوستانی خون کی جو اس جنگ میں بہا ہے آخر قیمت کیا ہوگی؟ ان قربانیوں کا کیا صلہ ہوگا اگر جنگ کے بعد بھی ہندوستان کی وہی حالت رہی جو اب تک رہی ہے؟ اگر یہ "آزادی آزادی" کی پکار جنگ کے جیتنے تک ہی رہی۔۔۔۔۔ جب ساری دنیا کے ملکوں پر آزادی کا پرچم لہرائیگا اور

بدنصیب ہندوستان محکوم ہی رہیگا۔ سامراجی نظام میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی، تو ہندوستانی اس جنگ میں کیوں دلچسپی لیں، اور ہندوستانی ادیب جنگ کے بارے میں کیا لکھیں۔

ہندوستانی کیونسٹ پارٹی میں عملی حصہ لینے والوں کے سوا۔ مخدوم محی الدین کی نظمیں اور علی سردار جعفری کا ڈرامہ "یہ کس کا خون ہے؟" جو واقعی جنگ سے متعلق ہیں۔ ہمارے وہ ادیب جو ترقی پسند کہلاتے ہیں۔ انہوں نے جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ مجھے شعر و شاعری سے کم دلچسپی ہے۔ مجھے افسانے پسند ہیں اور اردو افسانہ نگاروں میں کرشن چندر۔ احمد علی، بیدی اور منٹو بہت پسند ہیں۔ ان سب نے جنگ کی ابتدا سے ابتک جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ خود کرشن چندر نے جو ترقی پسند افسانہ نگاروں کے سرگروہ ہیں۔ اور جنہوں نے ہندوستانی ادیبوں کو اس جنگ کے بارے میں بے حسی کا احساس دلایا ہے۔ خود انہوں نے جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کے تازہ افسانے "بالکونی" اور "آن داتا" میں جنگ کے متعلق ہلکے پھلکے اشارے ملجاتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس نے اپنی انگریزی ناول Tomorrow is Ours میں دور حاضر کے ہندوستان کی تصویر کھینچتے ہوئے جابجا جنگ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر یہ کچھ سطحی سا ہوکر رہ گیا ہے۔

اور منٹو نے تو صاف کہہ ہی دیا کہ میں جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھونگا۔

صرف ہندوستانی ادیب ہی جنگ کے بارے میں خاموش نہیں ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے اکثر ممالک میں بھی جنگ کے متعلق پروپگنڈا پمفلٹ شائع ہوتے ہوں۔ لیکن کوئی قابل قدر جنگی ادب نہیں شائع ہوا۔ دو ایک ناول جن کا موضوع براہ راست جنگ ہے، میری نظر سے گذرے ہیں۔ ان میں John Steinbeck کا The Moon is Down سب سے مشہور ہے اور ایک حد تک

C. S. Foster کا The Ship بھی اس میں شامل کیا جا سکتا
ہے۔ جان لیہمن مرتب نیو رائٹنگ کا کہنا ہے کہ انگلستان کے ادب پر جنگ کا کوئی خاص
اثر نہیں پڑا ہے۔ جو کچھ بھی جنگ سے متعلق لکھا گیا ہے۔ وہ ڈائریوں کی صورت میں ہے
صحافتی رپورتاژ ہے۔ جو تخلیقی ادب نہیں کہا جا سکتا۔ میری اس ذہنی کشمکش کو دور
کرنے کیلئے New writing کے سوا انگریزی کے دوسرے ترقی پسند رسائل
بھی میں بغور مطالعہ کرتا رہا ہوں Modern Reading, Life
Letters Today, New Horizons احمد علی اور راجہ راؤ کا
Tomorrow تامبی متو کا poetry وغیرہ لیکن ان میں اب بھی
قریب قریب وہی ادب پیش ہو رہا ہے جو جنگ سے پہلے پیش ہوتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے
سٹیفن سپنڈر کا یہ خیال درست آتا ہے کہ جنگ کے بارے میں حقیقی ادب تو جنگ کے
کئی سال بعد ہی پیش ہوگا۔ جیسے ٹالسٹائی کا War and peace جو نپولینی
جنگ کے بارے میں ہے وہ اس جنگ کے ستر۔ اسی سال بعد لکھا گیا۔ یا Eric
Remarque کا ناول All Quiet on the western front,
Ernest Hemingway کا A farewell to Arms
ملک راج آنند کا Across The Black waters جو گذشتہ جنگ عظیم کے
بارے میں ہیں اور جو جنگ کے آٹھ سال بعد لکھے گئے۔ اور موخر الذکر تو غالباً ۱۹۴۰ء
میں شائع ہوا۔ یا مائیکل شولوخاف کا ناول Quiet Flows The Don
یا الکزی ٹالسٹائی کا Road to calvary جو روسی انقلاب کی داستان ہیں اور جو انقلاب کے کئی سال بعد لکھے گئے
For whom the Bell tolls — Hemingway جو ۱۹۳۶ء کی
اسپینی جنگ کا ایک یاس انگیز باب ہے اور جو غالباً ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ یا
راجہ راؤ کا Kanthapura جس کا پس منظر تحریک سول نافرمانی ہے

اور جو غالباً ۱۹۳۸ء میں لکھا گیا۔ سرل کونولی کی بھی یہی رائے ہے جو انہوں نے اپنے رسالہ HORIZON میں دی ہے کہ "جنگ تخلیقی ادب کی دشمن ہوتی ہے"۔

لیکن Wh in the canonsroar, The Muses are [illegible] کے نظریہ کو جھٹلاتے ہوئے، سویٹ روس کے ادیبوں کی کانفرنس میں جو پارسال ماسکو میں منعقد ہوئی تھی ایلیا اہرنبرگ نے کہا کہ جنگ میں ادب "روحانی گولہ بارود ہے" 9nd on lit is spiritual ammunitione اور کوئی تعجب نہیں کہ جنگ کے بارے میں خود ایلیا اہرن برگ نے ایک معیاری ناول۔ The fall of paris لکھا ہے۔ دراصل حقیقی جنگی ادب ہمیں روس ہی میں ملتا ہے۔ ——— وانڈا واسلیکا کا Rainbow اور ان کی مختصر کہانی Hut اکیل شالوخاف کی طویل مختصر کہانی His only son سیموناف کی کہانی Hate کاٹیوف کا Tanya پی لی ڈوف کی سچی کہانی The flag سب جنگ کے بارے میں ہیں۔ لیکن یہ صرف موجودہ ادب ہی میں نہیں، ہمیشہ کیلئے شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ روس کے بعد چین کا نمبر آتا ہے۔ وہاں بھی حقیقی جنگی ادب ہمیں ملتا ہے لن یوٹانگ کا ناول A leaf in the storm اور A moment in peking پال ینگ ہائی کی کہانی۔ برما روڈ۔ اور ایک نامعلوم لکھنے والے کی کہانی Third Rate Gunner اور تن لونگ کی کہانیاں جو چین اور جاپان کی جنگ سے متعلق ہیں۔ ایسی چیزیں ہیں، جو اس جنگ کے ہنگامہ کے بعد بھی ادب میں شامل رہینگی۔

چین اور روس میں جنگی ادب کا پیدا ہونا ہماری سمجھ میں آسکتا ہے، اس لئے کہ یہ جنگ ان کے لئے واقعی قومی جنگ ہے۔ روس کی سرزمین میں خون کی

ہولی کھیلی جا رہی ہے، روسی ادیب کی آنکھوں نے یہ خونین تماشہ دیکھا ہے اس نے لینن گراڈ کے محاصرے میں مہینوں روسیوں کو ہمت و استقلال سے نازیوں کا سنگدلانہ بہیمانہ ظلم کا مقابلہ کرتے دیکھا ہے۔ اس نے اسٹالن گراڈ میں خون کی ندیاں بہتی دیکھی ہیں۔ اس نے ہموطنوں کو فسطائیوں کے وحشیانہ بربریت کا شکار ہوتے دیکھا ہے اس نے اپنے محبوب ادیبوں۔ پشکن۔ گوگول۔ ڈسٹاوسکی، چیخوف، طالسطائی، گورکی کے تبرکات کو نذر آتش ہوتے دیکھا ہے۔ فسطائیوں کے خلاف نفرت کی آگ ہر روسی کے دل میں بھڑک رہی ہے۔ وہ اس جنگ میں سچے دل سے حصہ لے رہا ہے لئے اس کے مستقبل کے بارے میں مایوسی نہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس ماحول میں روسی ادیبوں نے ادب سے روحانی گولہ بارود کا کام لیا ہے۔ بجنسہ یہی حالت چین کی ہے، کوئی تعجب نہیں کہ چینی ادیب بھی روسی ادیبوں کی طرح جنگ کے بارے میں شہ پارے پیش کئے ہوں۔

لیکن ہندوستان پر ایک سیاسی جمود طاری ہے ذی حس اصحاب جنگ کے بارے میں اس شدت سے نہیں سوچ رہے ہیں۔ جیسا کہ وہ سوچتے اگر ہندوستان کے مستقبل کے متعلق بھی انہیں کچھ اطمینان ہو جاتا۔ اور پھر ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ بھی تو حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس حالت میں جنگ کے بارے میں وہ لکھیں تو کیا لکھیں؟ آنکھوں سامنے کی حقیقت بیان کرنا رجعت پسندی ہے۔ اور جنگ کی تلخ حقیقت کو چھوڑ کر۔ کسی اور موضوع پر لکھنا رومان پسندی ہے۔ حقیقت سے راہ فرار اختیار کرنا ہے۔ میں نے اس گتھی کو آپ کے سامنے اسلئے رکھا ہے کہ اس مجلس میں، جناب صدر، آپ، اور علی سردار سبط حسن رضا انصاری موجود ہیں۔ اور آپ صاحبان کا ترقی پسند تحریک سے شروع سے تعلق ہے شاید آپ اس گتھی کو سلجھانے میں مدد دیں۔ اس معاملہ میں، روشنی کی صرف ایک کرن بھی اگر مجھے نظر آجائے تو میں سمجھونگا اردو کانگریس میں میرا اشتراک بے فائدہ نہ رہا +

س۔ م۔

ترجمہ: صمد شاہین

تیسرے درجہ کا بندوقچی

دیکھو! وہ ہے تیسرے درجہ کا بندوقچی۔ ہم اس کو رائفل کھرپہ کی طرح پکڑے پیار سے پالش کرتے دیکھتے تو ہمیشہ قہقہے لگا کر ہنس پڑتے۔

"ایسی ہنسی کی بھی کیا بات ہے؟" ہمارے دستہ کا سردار، مچھلی کی طرح آنکھیں نکالے ہمیں ڈانٹتا۔ لیکن جونہی وہ مڑکر دیکھتا وہ خود بھی کھکھلا اٹھتا۔

'ہی ...... ہی ...... ہی'

ہو نے کچھ اس طرح اس کی تعریف کی تھی کہ لوگ کہتے ہیں ایک اندھی بلّی پھر بھی مرا ہوا چوہا پکڑ لیتی ہے۔ لیکن یہ بدّھو —— اس اندھے آدمی کی طرح ہے جو جُوں پکڑنے کی کوشش کرتا ہے —— یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔

اس کا نام لی تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی۔ لیکن سب اسے تھرڈ ریٹ بندوقچی کہکر پکارتے تھے، یہ غریب کھیتوں میں کام کرتا تھا اور پھر اس کی رہی سہی ملکیت، ایک چھوٹی کچی مٹی سے بنی ہوئی جھونپڑی۔ اسے بھی جاپانیوں نے جلا کر خاک کر دیا تھا۔ ایک دن جب ہم اس کھیت سے گذر رہے تھے۔ جہاں وہ کام کر رہا تھا۔ کھرپہ پھینک کر وہ ہمارے ساتھ ہو لیا۔

جب کبھی ہم نشانہ بازی کے لئے باہر جاتے تو سپاہی اس سے پوچھتے۔

'اوہ، تھرڈ ریٹ بندوقچی کہو آج کتنے کٹورے چاول چٹ کئے؟'

"کچھ زیادہ نہیں، دو کٹورے سے کچھ زیادہ" وہ ہمیشہ بے پروائی سے جواب دیتا۔

پھر اسے طعنہ دیا جاتا۔ ’اتنا کیوں کھاتے ہو؟ کچھ ہی دنوں میں پھر بھینس“ مین پاؤ” کھانے کو مل جائیگی‘ ایہہ‘ کہتے ہو کچھ ایسا زیادہ نہیں کھایا۔“

ہمارے چھاپہ مار دستہ میں صرف اول اور دوم درجے کے نشانہ باز ہوتے تھے ——— تیسرے درجہ کا نکما ہرگز کوئی نہیں۔ تازہ بھرتی ہوئے کسان ”دوم درجے کے بندوقچی‘ کہلاتے تھے، مگر اس کسان نے جسے ہمارے ساتھ رہتے مدتیں گذر چکی تھیں، ابھی تک بندوق چلانا نہ سیکھا تھا۔ اس کے ساتھ داخل ہوئے سپاہی سب نایک کے درجے پر پہنچ چکے تھے یا مشین گن چلانے تھے۔ لیکن یہ وہی نکما بندوقچی کا نکما بندوقچی ہی رہا۔ جب کبھی نشانہ بازی کا مقابلہ ہوتا‘ ہمیشہ تینوں دفعہ اس کا نشانہ خطا جاتا‘ ——— تا یہ کبھی نہیں‘ ——— محض سلامی اتار دیتا۔

شروع کے چند مہینے۔ اس کسان کے لئے بہت مشکل کے تھے۔ افسروں نے اسے سکھانے کی بہت کوشش کی۔ انہوں نے اسے خاص ہدایات دیں۔ سزا بھی دی، اور پھر سے قواعد سکھائے، ہر ممکن کوشش کی، لیکن سب بیکار۔ انکی اتنی محنت اکارت گئی، ٹھیک سے اسے رائفل پکڑنا بھی نہ آیا۔ بڑے افسروں نے خود اُسے سکھایا، کس طرح بندوق پکڑنی چاہئے، وہ بندوق کو مضبوط تھام کر، ہشیاری سے نشانہ لیتے، ٹھیک ”چاند“ (ٹارگٹ) کے بیچ میں گولی لگتی ——— لیکن وہ بندوق کو ایسے ڈھیلے تھامتا‘ جیسے وہ کھرپہ ہو، یا گھبراہٹ کی وجہ پسینہ سے تر ہو کر اس قدر سخت پکڑتا جیسے وہ ہل کو پکڑے ہوئے ہے۔

جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو افسروں نے اُسے پھر سے ابتدائی مشق شروع کرائی۔ یہ اس میں آٹھ مہینے پہلے ناکامیاب رہ چکا تھا۔

”رائفل سیدھا پکڑو!“

وہ سیدھا پکڑتا۔ ایک منٹ گذرتا، پھر دو، اس دوران میں، رائفل کی نالی آہستہ آہستہ سامنے جھکنے لگتی —— اور وہ خود سمجھ نہ سکتا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ افسر اس کی پھولی ہوئی توند میں ٹہوکے مارتا، تو توند اندر دھنستے ہی ایک کولھا باہر نکل پڑتا، اور جب وہ اس کے کولھے کو اندر دھکیلتے تو فوراً اس کی توند سامنے نکل آتی۔ افسر کے لئے یہ بڑی صبر آزما چیز تھی اور وہ اسکے بے تکے پن پر جھنجھلا کر چیخ اٹھتا۔

" رائفل سیدھا تھامو، ایک دفعہ اور کوشش کرو"

تو وہ سیدھا تھامنے کی کوشش کرتا، اور بہت شرمندہ ہوتا، اسکے پاؤں لڑکھڑاتے چہرہ لال ہو جاتا۔ کچھ سنبھل کر سانس لیا تو اس کی توند پھر پھول جاتی۔

" ذرا اپنی طرف تو دیکھو" افسر ڈانٹتا۔ "کھڑے ہونے کا یہ طریقہ ہے! کیا تم سیدھے بھی نہیں کھڑے ہو سکتے۔ اپنی بندوق کو دیکھو —— ہوا میں جھول رہی ہے!"

لیکن اناڑی بندوقچی سیدھا کھڑا نہ رہ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی اور رائفل زمین پر گر پڑتی۔ افسر اس پر برس پڑتا ایک اور بندوق ضائع کر دی۔ سزا کے طور پر، اسے صرف ایک کٹورا چاول کا اور کھاری پانی کا ایک پیالہ، رات کے کھانے میں ملتا۔

دوسرے ایک افسر کا خیال تھا کہ یہ مشکل پٹھوں پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ اسلئے وہ سانس تک نہیں روک سکتا، پھر اس افسر نے اس کے سامنے یہ سارا فارمولا دھرایا۔ بندوقچی نے کم سے کم پانسو دفعہ یہ فارمولا سنا ہوگا۔

"سانس اندر کھینچو! ٹھیک ہے! اچھا — اب ذرا سانس چھوڑو، اب سانس روکو۔ روکو"۔

بندوقچی نے ایسا ہی کیا، اور افسر نے سر ہلا کر کہا "ہاں۔ ٹھیک ہے، لیکن یاد رکھو، آئندہ بھی بالکل ایسا ہی کرنا"۔

مگر جیسے وہ نشانے کے سامنے آیا، ساری ترکیب بھول گیا۔ اور بغیر سوچے سمجھے اپنا رائفل اس طرح تھاما جس طرح اسے اپنا گھر پہ تھامنا سکھایا گیا تھا۔

"ایہہ۔ گھامڑ" اور اب کی سزا بندوقچیوں کے رائفلوں کو پاک کرنا تھی۔ جنہوں نے نشانہ بازی میں سب سے زیادہ پائنٹ لئے تھے۔ صرف چار رائفل پاک کرنے تھے لیکن اس نے ان پر تیل لیپ کر رکھ دیا اور اس کام پر آدھا دن صرف ہو گیا۔

ایک دفعہ دستہ کے کپتان نے مذاق سے کہا۔ "تم جیسا گوریلا دوسرے درجہ کا بندوقچی بھی نہیں کہلایا جا سکتا۔ تم تو تیسرے درجہ کے بندوقچی ہو!"

تب سے وہ تیسرے درجہ کا بندوقچی مشہور ہو گیا۔

رفتہ رفتہ ان لوگوں نے اس کی غلطیوں کی طرف دھیان چھوڑ دیا۔ افسر اس پر اب چلاتے نہ تھے، اور سپاہی بھی جب اسے دیکھتے تو صرف ہنس دیتے یا اس کا نشانہ خطا جانے پر "مین یاؤ کا ایک ٹکڑا اور" پکار دیتے۔ ہمارا افسر کبھی کبھی ٹھنڈا سانس بھر کر کہتا:

"تمہیں احساس ہے کہ ان گولیوں پر ہمارے ملک کو کتنا خرچ کرنا پڑتا ہے"

اس وقت 'تیسرے درجہ کا بندوقچی' بری طرح بوکھلا جاتا اور اپنی بیوقوفیوں پر شرمندہ اور پریشان ہوتا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد خود اس نے بھی پروا کرنا چھوڑ دیا اور جب کوئی سپاہی اسے 'تیسرے درجہ کا بندوقچی' کہکر پکارتا تو یہ ایک حقیقی بھائی کی طرح جواب دیتا۔

جب فوجی تعلیم کی معیاد ختم ہوئی اور گوریلا سپاہی جاپانیوں پر چھاپہ مارنے کیلئے نکلے تو دستہ کے کمانڈر نے 'تیسرے درجہ کے بندوقچی' کو بلایا اور اس سے پوچھا:

"تم کیا کرسکو گے کامریڈ؟ ہمارے پاس گولیاں بہت کم رہ گئی ہیں —— یہ ہماری جانوں کی طرح قیمتی ہیں۔ تمہیں کیا کام پسند ہے؟ ہمارا خیال ہے، تم زخمیوں کو اٹھا لے جانے کیلئے ٹھیک ہو۔"

سو، زخمیوں کو اٹھا لیجانے کا کام اس کے سپرد ہوا۔

لیکن اس کے فوراً ہی بعد وہ پھر باقاعدہ سپاہی بن گیا، کیونکہ وہ فوج میں کئی مہینوں سے تھا، بہرحال نو آزمودہ لڑکوں سے تو بہتر ہی تھا۔ مگر نئے بھرتی شدہ جوں ہی بندوق چلانا سیکھ جاتے تو وہ بھی اُسے 'تیسرے درجہ کا بندوقچی' ہی پکارنے لگتے۔ لیکن بدلہ لینے کا اسے خیال ہی نہ آتا۔ وہ ان سے دوستوں کا سا برتاؤ رکھتا اور نئے آنے والوں سے نشانہ بازی اور فوجی زندگی کے بارے میں جو کچھ اسے معلوم تھا انہیں بتاتا رہتا۔

ایک مہینہ گذر گیا۔ جاپانیوں سے ہماری گیارہ دفعہ مٹ بھیڑ ہوئی۔ ایک جاپانی سپاہی بھی اس بندوقچی کے نشانہ سے ہلاک نہ ہوا۔ بہت سے نئے بھرتی ہوئے نوجوان کسانوں نے جلد جلد ترقی کر لی۔ اور 'تیسرے درجہ کا بندوقچی' ایک سرد آہ بھر کر، اپنے آپ سے کہتا۔

'غریب کسان جو ہوں میں، آخر میں کس کام کا ہوں؟ مجھے تو صرف ہل چلانا آتا ہے۔ یہ کم بخت رائفل ہل کی طرح میرا حکم تو مانتا نہیں۔

ایک دفعہ چھ سپاہیوں کی ٹولی دشمن کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کیلئے نکلی۔ اس میں 'تیسرے درجہ کا بندوقچی'، 'ہو' وانگ ایک نیا بھرتی ہوا کسان، اور دو کار آزمودہ سپاہی تھے۔ انہیں ایک پاس کے گاؤں کی دیکھ بھال

کرتی تھی جس پر حال ہی میں جاپانیوں نے قبضہ کر لیا تھا، لیکن یہ پہلی ہی چھوٹی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچے تھے کہ ہو نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور جھٹ درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ درخت کے تنے سے لگ کر، جھاڑی میں سے نالی نکال، اس نے رائفل تان لی۔ ٹھائیں! پتوں میں سے دھواں اٹھا۔

تیسرے درجہ کے بندوقچی نے اگلی پہاڑی پر ایک جاپانی سپاہی کو زمین پر گرتے دیکھا۔ بہت سے جاپانی سپاہی چھڑے ہوئے ٹڈوں کی طرح چاروں طرف بکھر گئے۔ لیکن انہوں نے جلد ہی جھاڑیوں کا آسرا لیکر مناسب جگہوں پر مورچے قائم کر لئے۔ ان میں سے چھ ٹیلے کے پیچھے دبک گئے اور انہوں نے ہماری طرف گولیاں برسانا شروع کیں لیکن سب کی سب، ہمارے سروں پر سے گذر گئیں۔

شوں، شوں . . . . . .

تیسرے درجہ کا بندوقچی بھی جھٹ سے زمین پر لیٹ گیا، اور پھر ایک بڑے مینڈک کیطرح، رینگ کر ایک ٹیلے کے پیچھے جا دبکا۔ راستہ پر ایک جاپانی کو بھاگتے دیکھ لیا، اپنی بندوق سنبھالی اور فیر کیا —— ٹھان!

نشانہ خطا گیا، اور جاپانی سپاہی صحیح سلامت واپس بھاگ گیا۔

وانگ بڑے جوش سے فیر کر رہا تھا۔ جب کبھی کسی جاپانی نے سر اٹھایا، ہم اُسے رائفل ہوا میں چھوڑ کر وہیں پیچھے گرتا دیکھتے، کوئی اور ٹوپی ابھرتی تو وہاں بھی گولی ٹھیک لگتی۔ ایک اور، پھر تیسرا، پھر چوتھا۔

تیسرے درجہ کے بندوقچی کو بھی جوش آگیا، وہ بڑی ہوشیاری سے اپنا رائفل تانتا۔ کندے سے کلّا لگاتا، سانس روکے رکھتا جس طرح کہ ہم کو سکھایا گیا تھا، پھر، بڑی احتیاط سے کل دبا دیتا لیکن نشانہ ہمیشہ خطا جاتا —— اس وقت بھی جب دشمن بالکل صاف نظر آتا تھا۔ اس کی ہتھیلی بھیگی ہو جاتی اور پیٹھ

سے پسینہ بہنے لگتا اس سراسیمگی کے عالم میں، اس نے ایک زخمی جاپانی کو گھاس پر رینگتے دیکھا۔ اس پر چار دفعہ فیر کیا، لیکن اس بھوت کا کچھ نہ بگڑا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے وہ زخمی رینگتا ہوا ایک کھائی میں اتر کر غائب ہو گیا —— وہ خود گولیوں کو اس زخمی سے پرے زمین پر لگتے دیکھ رہا تھا۔

جب ہم نے اس جھڑپ کے بعد ہمارے کارنامہ کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ ہو نے پانچ جاپانیوں کو ہلاک کیا ہے اور ایک کو زخمی، اور وانگ نے دو کو مارا ہے، لیکن کہنہ مشق گوریلا ' تیسرے درجہ کے بندوقچی نے صرف ہوا کو کاٹا تھا۔

' حرامزادے کہیں کے! تم تو نادیدہ پیٹو ہو . . . محض پیٹو، ہو جتنا زیادہ زعم سے دکھلا رہا تھا، مارے شرم کے، ہمارے تیسرے درجہ کے بندوقچی کا سر اتنا ہی نیچے جھکتا جا رہا تھا۔

وانگ نے بھی ہو کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی۔

" پیٹو، پیٹو! —— ہا، ہا! کمانڈر نے اس کو اس طرح چھیڑنے سے منع کیا تھا، لیکن یہ تھے کہ اسے برابر دق کر رہے تھے ' ہا، ہا، ہا! تم پیٹو ہو! '

غریب ' بندوقچی ' مسکرایا تک نہیں، کہنے کیلئے اسے کوئی لفظ بھی نہ مل سکا۔ ' ننگے بندوقچی ' دیکھو، آج رات کو چاول کا ایک کٹورا کم کھانا، بتاؤ تم کتنا کھاتے ہو؟ ایک وقت کے کھانے پر چار کٹورے؟ ہا، ہا، ہا!

یہ بندوقچی کی ضبط سے باہر تھا۔ اس کی آنکھیں نکلی پڑ رہی تھیں، اسے طیش آگیا، اس نے ترش روئی سے ہو کو ڈانٹنا شروع کیا۔

' تمہارے مذاق اڑانے سے فائدہ؟ کیا فائدہ ہے آخر؟ اگر میں جاپانیوں کو مار نہیں سکتا تو تم کیوں خوش ہوتے ہو؟ تمہیں اس میں کیا حرام کا مزہ ملتا ہے؟ جب میری گولیاں ضائع جاتی ہیں تو ہم سب کے لئے گولیاں کم

ہوتی ہیں، اس سے کیا خوشی ہوتی ہے تمہیں ؟

ایک لمحہ کے بعد وہ پھر بولا۔ کئی دفعہ میں نے چاہا کہ اس رائفل کو اٹھا کر پھینک دوں — 'تیسرے درجہ کے بندوقچی' ہونے سے، جیسا کہ تم سب مجھے پکارتے ہو، یہ کہیں بہتر ہے کہ فوج میں رہوں ہی نہیں۔ لیکن خود کو میری جگہ خیال کرو۔ جب تم سب جاپانیوں پر فیر کر رہے ہوتے ہو اور میں کچھ نہیں کرتا ہوں تو تم سمجھتے ہو میں ڈھونگ کرنا ہوں — اس غلط فہمی میں ہوں کہ سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے ؟ میں کر بھی کیا سکتا ہوں ؟ تم خیال کرتے ہو میں جان بوجھ کر نشانہ خطا کرتا ہوں ؟ اب تم دیکھو گے۔ ہر دفعہ میرا وار نشانہ پر بیٹھے گا۔ ہر گولی ایک دشمن کو نیچے لا دیگی۔

'مارو۔ تو سہی ایک جاپانی کو، پھر دیکھیں،' ہو نے حقارت سے کہا۔

'جب تک تم میری توہین نہیں کرتے، تمہیں خوشی نہیں ہوتی،' تیسرے درجہ کے بندوقچی نے اپنا بیان جاری رکھا۔ 'بارہا میں اپنی انگلیاں کاٹتا ہوں، اپنے آپ کو کوستا ہوں، رائفل کو مار کر توڑ دینا چاہتا ہوں، تم سمجھتے ہو مجھے اپنے پھوہڑپن پر ناز ہے ؟ لیکن تم مجھ پر ہنستے ہو اور اس سے جام کا لطف اٹھاتے ہو۔ تمہاری نشانہ بازی پر مجھے رشک آتا ہے — جبھی تو تمہاری بندوق صاف کرنے سے مجھے عار نہیں۔ کاش، میں بھی تمہاری طرح نشانہ لگا سکوں — لیکن میں کیا کروں ؟ ہر جھڑپ میں جب تم کسی جاپانی مار لیتے ہو تو مجھے ایسی ہی خوشی ہوتی ہے جیسے کہ خود میں نے اسے مارا ہے۔ لیکن تم تو صرف مجھ پر ہنستے ہو۔ یہ دشمن کا کام ہے میری کمزوری پر ہنسنا۔ اگر میں برسوں کھیتوں میں کام کیا ہوا کسان نہ ہوتا تو میرے پٹھے دوسرے کام کرنے کے لئے بھی ٹھیک رہتے، تب تو میں اتنا ہی اچھا نشانہ باز ہوتا جتنا تم ہو...'

ہو جھینپ گیا، زبان سے کچھ نہ کہا، وانگ نے بھی خیال کیا کہ مذاق ختم ہوگیا۔ وہ خموشی سے چلتے رہے ـــــ پھر ہر ایک نے یہ راگ چھیڑا۔

'اپنی تلوار گھماکر، جاپانی شیطانوں کے سر اڑادو . . . . .'

اس کے بعد، اس بندوقچی کے خلاف ہو کے دل میں بیر پیدا ہوگیا، اس نے اس سے بات چیت چھوڑدی، اور تیسرے درجہ کا بندوقچی، پکارنا بھی بند کردیا۔ تیسرے درجہ کے بندوقچی نے بھی خاموشی اختیار کرلی۔ اپنے کپتان سے، اسے پہرہ پر لگادینے کے لئے کہا تاکہ ہو کے ٹھٹے سننے سے اس کا لمبوترا چہرہ دیکھنے سے اسے چھٹکارا تو ملے۔

اسے نہر کے کنارے بانس کی جھاڑی میں پہرہ پر لگادیا گیا۔ نہر کے اس طرف اس گاؤں کو سڑک جاتی تھی جس پر اب جاپانیوں کا قبضہ تھا۔ اگرچہ یہ جو کی بستی سے صرف ایک میل پر تھی، کسی جاپانی نے یہاں تک آنے کی ہمت نہ کی تھی۔ چنانچہ تیسرے درجے کے بندوقچی کو نشانہ بازی کی مشق کے لئے بہت فرصت ملی۔ اس نے ان تمام قاعدوں کو جو اسے سکھائے گئے تھے، یادرکھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی جان توڑ کوشش کی۔

یونہی دو مہینے گذر گئے، اب اسے محسوس ہوا کہ اس کے پٹھے اس کے قابو میں ہوتے جارہے ہیں۔ اب وہ اتنے اکڑے ہوئے نہ تھے بلکہ ان میں کافی لوچ لچک تھی، ایک دن دوپہر کے وقت، نشانہ بازی کی طویل مشق کے بعد وہ اونگھ رہا تھا کہ جھاڑی سے اُدھر کسی کے بات کرنے کی آواز سن کر وہ ایکدم چونک پڑا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بڑی ہوشیاری سے پتوں میں سے جھانکا ـــــ یہ کون تھے؟ یہ دو جاپانی افسر تھے جو سبز وردیاں پہنے نہر سے

کچھ دور کھڑے سر ہلا ہلا کر مسکراتے کاغذ پر کچھ نقشہ کھینچ رہے تھے ۔

اس نے سوچا "یہ کوئی خواب تو نہیں"۔ لیکن اس نے اپنی رائفل سنبھال لی۔ "آج! میں —— 'تیسرے درجہ کا بندوقچی' —— دشمن صاف نظر آرہا ہے ۔ دیکھوں کیا کرسکتا ہوں!"

اس کا دل دھڑکنے لگا، اس کے ہاتھ تھرتھرانے لگے اور بندوق اس کے ہاتھوں میں جھونکے لینے لگی۔ بالآخر اس نے اپنے آپ پر قابو پا ہی لیا اور مضبوطی سے رائفل تھامے، اس نے نشانہ لیا۔ لیکن غریب کسان، وہ سانس روک نہ سکا۔

'شاید یہ بھی خالی جائے' اس نے سوچا۔ لیکن یہ موقع تو میں ہرگز نہ کھوؤں گا۔"

ٹھائیں! ۔ فیر ہوئی ۔

چھوٹی مونچھوں والا جاپانی چند قدم لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ اس موقع پر تیسرے درجے کے بندوقچی نے خوشی سے چیخنا چاہا، لیکن جلد بندوق بھر کر، پھر فیر کیا۔ دوسرا جاپانی چھپ جانا چاہتا تھا، لیکن ایک بانس سے ٹھوکر کھا کر گرا اسکے کولھے پر ایک گولی آلگی، تیسری گولی نے اسے ختم ہی کر دیا۔

فیر کی آواز سن کر گوریلا فوج کے کمانڈر نے ایک دستہ بھیجدیا۔ ان دونوں جاپانیوں کی لاشوں کو اٹھا کر ہیڈ کوارٹر لایا گیا۔ ان کے پاس سے چند بہت اہم کاغذات نکلے اور دو بہت ہی خوبصورت پستول بھی، ایسے جو چھاپہ مار فوج کے ہتیار بنانے کا کارخانہ تو ہرگز نہیں بنا سکتا تھا۔

کچھ دنوں بعد ہم سب گاؤں میں جمع ہوئے۔ کپتان کمانڈر نے باجرہ کی شراب سے، جو ہمارے علاقہ کے دیہاتیوں نے تازی کھینچی تھی، ہماری تواضع کی،

اس موقع پر ہو تیسرے درجے کے بندوقچی سے اپنی پرانی دشمنی بھول گیا۔ اور ظاہر طور پر دوستی اور احترام کا اظہار کیا۔ اس کی بیشہ شوخی، سب کے سامنے اس خوب ہی تعریف کی۔

' ہو نے کہا' اب تو تم باقاعدہ چھاپہ مار ہو، بھائیو، اس کے بعد اسے تیسرے درجہ کا بندوقچی نہیں کہینگے ــــ یہ تو بہترین نشانہ باز ہے!"

" مانتے ہو!"

ہر شخص نے کہا " مانتے ہیں "

' ہم سب نے دشمن کے کتنے ہی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا لیکن وہ سب مل کر ان کا پاسنگ بھی نہیں جنھیں اس نے مارا ہے!" ہو نے اپنا جام شراب اٹھاکر، گرمجوشی سے پکارا۔ " ہمارے لاجواب بندوقچی کی صحت کا جام پیو"

لاجواب بندوقچی نے بھی اپنا جام اٹھایا۔ لیکن از خود اسکی نظر اپنے پاؤں اور توند پر پڑی۔ آہ! اس کے پاؤں کتنے بڑے تھے اور اس کی توند کتنی بے ڈھنگی کہ وہ ان پھرتیلے نوجوان چھاپہ ماروں کی ہرگز برابری نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے انکسارانہ کہا، جیسے ایک شریف دیہاتی کو کہنا چاہیئے،

" نہیں بھائیو، میں تو سیدھا سادہ کسان ہوں.... ہی، ہی، ہی!"

پھر اس نے ایک گھونٹ چڑھایا اور فخر سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

(چینی کہانی) ـــــــــــــــ (پینگوین نیو رائٹنگ نمبر ۲ سے)

نقد و نظر

آئینے:- رامانند ساگر۔ لالہ لاجپت رائے اینڈ سنز پبلشرز لاہور۔ قیمت تین روپئے

جہاں رامانند ساگر کے پہلے مجموعے "جوار بھاٹا" نے ہمیں یہ احساس دلایا تھا کہ وہ کبھی شہ پارے پیش کرتے ہیں، تو کبھی فنی لحاظ سے کمزور افسانے بھی۔ ان کے دوسرے مجموعے "آئینے" نے انہیں اُردو کے ایک بہت اچھے فن کار کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ساگر کی شعریت سے بھری دلکش و رنگین تحریر اور پسِ منظر میں کشمیر کا "حسن" ان افسانوں کی اعلیٰ فن کاری کے محض جزو ہیں۔ در اصل بعض افسانے تو ایسے ہیں کہ انکی فن کاری کا تجزیہ ہی نہیں کیا جا سکتا ان میں ہم فن کو مجسم دیکھتے ہیں۔ چنانچہ دل کو خون کرنے کی فرصت ہی سہی۔ ٹنگ مرگ کے اڈے پر' اور گھراٹ' ہر لحاظ سے فن کے دلاویز ترین نمونے ہیں انکی تکنیک، پیش کرنے کا انداز، اختصار میں بھی ویسے نقشے کھینچے ہیں کہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے پھر جائے، پھر ان کے انجام، افسانہ کی تعمیر میں ہر ہر موڑ پر فن کا احساس ہے۔ لیکن ان افسانوں میں محض فن کا احساس ہی نہیں بلا کا تاثر بھی ہے۔ "ردعمل" میں عام جنسی بے راہ روی کے افسانوں کے بخلاف حیوانیت پر انسانی شرافت کا جذبہ غالب ہے۔ ساتھ ہی بدصورت شوہر کی اپنی بیوی سے محبت اور اس کی بے بسی کی تصویر کھینچکر ساگر نے اس افسانے کو اور بلند پایہ بنا دیا ہے۔ اس تیسرے پہلو کو ہمارے اکثر افسانہ نگار نظر انداز کر جاتے ہیں۔ "پسپائی" اور "دل کے خوش رکھنے کو" کامیاب افسانے ہیں۔ 'آب و آتش' میں بوڑھے مالک کا کیرکٹر سکیچ بڑے خلوص سے کھینچا گیا ہے۔ 'جنگ کے باعث' اور "ناقابل برداشت" کا آغاز اور درمیانی تفصیلیں بہت خوب ہیں۔ لیکن ان کے اختتام اچھے نہیں ہیں۔ دو ایک افسانے ایسے بھی ہیں۔ چنانچہ 'ایک اور تازیانہ' اور 'آب حیات' جو اگر مجموعے میں شامل نہ کئے جاتے تو کتاب کا مجموعی اثر بہت ہی اچھا ہوتا۔ کتاب کا نام اور سرورق معنی خیز ہے۔ 'آئینے' جن میں ہم زندگی کی مختلف تصویروں کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔

اُجالے سے پہلے : مدھوسودن ۔ ناشر، اردو محل معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن۔ قیمت 2/10/-

یہ مدھوسودن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں دس افسانے ہیں۔ مصنف نے مجموعے میں ایک بھی ایسا افسانہ شامل نہیں کیا ہے جسے پڑھکر یہ احساس ہو کہ یہ نذر کرنے کے قابل نہ تھا۔ بحیثیت مجموعی کتاب بہت اچھی ہے اور فرداً فرداً بھی قریباً سب افسانے اچھے ہیں۔ گو مدھوسودن بھی زیادہ تر جنس پر لکھتے ہیں انکے افسانوں میں گھنا تفصیلیں نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے نوجوان کرداروں کے جذبات اور احساسات کا اتنا صحیح اور اتنا اچھا تجزیہ کرتے ہیں کہ اگر وہ (کردار) سیدھی راہ سے بھٹک بھی جائیں تو ان سے نفرت کی بجائے ہمدردی ہوتی ہے۔ اپنے کرداروں کو 'ابنارمل' بتانے یا انہیں غیر معمولی حالات سے دوچار کرنے سے مدھوسودن کو ہمیشہ احتراز ہے۔ ان کے کردار اس دنیا کے عام نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔ ان کے افسانوں میں اعتدال، سنجیدگی، اور توازن ہے۔

'دوسری زندگی'، 'جذباتی کیڑے' اور 'سرخ روشنی' اچھے افسانے ہیں۔ 'طوائف' اس مجموعہ کا ایک ہی کمزور افسانہ ہے۔ مواد اچھی طرح نہیں ڈھالا گیا اور آخری نکتہ جو بہت اہم تھا یعنی، عورت کا بچہ میں تسکین ڈھونڈنا شوہر کی محبت کا بدل بچہ کی محبت میں ڈھونڈنا ـــــ زور نہیں دیا گیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ افسانہ نگار کا مقصد ہی یہ بتانا ہے لیکن دوسری تفصیلات میں یہ نکتہ کھو کر رہ گیا ہے۔ "سمندر اور تین کمرے" "انتقام" اور "ناجائز تعلقات" میں عورت کے جذبات کی نہایت صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ خصوصاً "ناجائز تعلقات" میں مصنف نے ایک لڑکی کو جس نے پہلی دفعہ ایک مرد سے اظہارِ محبت سنا ہے اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ اس کے ہر رگ و ریشہ کا دل کے ہر تار کا ہلکے سے ہلکا ارتعاش بھی ان کے موقلم سے نہیں چوکا۔ اور لڑکی کی اس ہیجان خیز حالت میں ریل گاڑی کے گذرنے کا ذکر بہت برمحل ہے۔ شارٹ سٹوری پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ سٹیفن سپنڈر نے لکھا ہے کہ ریل گاڑی کو جنس کی ایک علامت 'Symbol' کی طرح پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ H.E.Bates کی ایک کہانی 'The Loved One' میں ایک لڑکی

جو اپنے شوہر سے ملتی نہیں ہر روز اسٹیشن جاکر ریل کو گذرتے دیکھتی ہے۔ اس میں اسے یک طرح کی تسکین ملتی ہے۔ لیکن یہ بھی ذرا 'اب نارمل' ہی ہے۔ مدھوسودن کی کہانی ں ریل گاڑی کا ذکر اور بھی فن کارانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ مختصر سا افسانہ بہت خوبصورت پاکیزہ ہے۔ اس کے لئے "ناجائز تعلقات" کا سا ثقیل عنوان ٹھیک نہیں تھا کتاب مدھوسودن نے چند افسانوں کے ناموں کو بدل دیا ہے۔ میرے خیال میں پہلے عنوان ٹھیک تھے۔ چنانچہ انتقام کی بجائے پہلا نام 'اعتراف' ہی ٹھیک تھا۔

موضوع اور مواد کے علاوہ فنی لحاظ سے بھی جو افسانے بہت کامیاب ہیں۔ وہ "ناجائز تعلقات" "ایک عورت" "مکتی سے پہلے" اور "بھوکے پیاسے" ہیں۔ "مکتی سے پہلے" اس بات کا شاہد ہے کہ مدھوسودن جنس کے علاوہ دوسرے موضوعوں پر بھی اچھا لکھ سکتے ہیں۔ "بھوکے پیاسے" میں نچلے متوسط طبقے کی رہن سہن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے، ایک ہی صحن، اسکے گرد کمرے، کمروں کے اندر کمرے، ان کمروں کے رہنے والے، یہاں تک کہ صحن میں ایک جامن کا درخت، شام میں اس پر بولتی ہوئی چڑیاں، وہ ایک نل جس پر سب منہ دھوتے ہیں اور پانی بھرتے ہیں،۔ رات کو جلنے والے چراغ اور دیواروں پر سے گذرتی ہوئی روشنیاں یہ سب اس زندگی کے جزو اور اپنی اپنی جگہ کردار بن گئے ہیں۔ شوشو کے کردار نے افسانے کو جلا دیدی ہے۔ اختتام اچھا ہے۔ افسانہ کی تعمیر میں ہر جگہ فن کا احساس ہے۔ میرے خیال میں مجموعے کا یہی بہترین افسانہ ہے۔

"مکتی سے پہلے" اور "سرخ روشنی" کے علاوہ دوسرے افسانوں میں ہم آہنگی ہے۔ سب میں جنسی ناآسودگی کی رو بہتی چلی گئی ہے۔ "اجالے سے پہلے" کتاب کے نام میں مستقبل کی امید جھلکتی ہے۔

کتاب کا گیٹ اپ اچھا نہیں ہے۔ سرورق بالکل پرانی طرز کا ہے۔ البتہ لکھائی چھپائی کافی اچھی ہے۔

ممتاز شیریں

نئے نئے ڈزائن کی عمدہ اور جاذب نظر

ریشمی اور بنارسی ساڑیاں

بہترین ویدہ زیب

بارڈروں کے ساتھ

LATEST SILKS

UP TO
DATE
SAREES

125733
14.11.91

Specialists in Benares Sarees
Brocades & Borders

چنڈی رام برادرس

نمبر ۴ سوتی پیٹ
بنگلور

[illegible]